سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

علامہ شبلی نعمانی

BOOK NO 60

جلد اول

ناشران قرآن لمیٹڈ لاہور

2

Boo K No 60

468

347

17
18
20
20
20
2
2
20
21
2
22
22
22
2
23
2
23
25

36/86

إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا

کتاب مستطاب

سِیرۃُ النبی

یعنی

سوانح اقدس حضرت سید عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

جلد اوّل

از ولادت تا ختم سلسلۂ غزوات، مع مقدمہ مشتمل بر نقد فن سیرۃ و تاریخ عرب قبل ظہور بعثت

تالیف

حجۃ الملۃ والدین علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

ناشران قرآن لمیٹڈ اردو بازار لاہور

کتاب .. .. .. سیرۃ النبیؐ

جلد .. .. اوّل

مصنّف .. .. .. علامہ شبلی نعمانیؒ

طابع .. .. کاروان پریس

دربار مارکیٹ، لاہور

ناشر .. .. ناشرانِ قرآن لمیٹڈ

اردو بازار، لاہور

کتابی سائز پر پہلا ایڈیشن

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دیباچہ طبعِ اوّل

سیرۃ نبویؐ جس کے غلغلے سے ہندوستان کا گوشہ گوشہ گونج رہا ہے، آج سات سال کے بعد اس کی پہلی جلد شائقین کے ہاتھ میں جاتی ہے۔ میں اپنا دل اس وقت مسرت آمیز اطمینان سے لبریز پاتا ہوں کہ اُستاد مرحوم نے اپنی زندگی کے آخری لمحے میں جو فرض میرے سپرد کیا تھا، الحمد للہ کہ اُس کے ایک حصہ سے آج سبکدوش ہوتا ہوں، ع

شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

لیکن اس مسرت اور اطمینان کے ساتھ یہ حسرتناک منظر بھی سامنے ہے کہ مصنف اپنی چار سال کی جانکاہ محنت کا ثمرہ خود اپنے ہاتھ سے قوم کی نذر نہ کرسکا اور حسنِ عقیدت کے جو پھول سیکڑوں چمن کدوں سے چُن کر اُس کے ہاتھ آئے تھے، اُن کو آستانۂ نبوت پر وہ خود نہ چڑھا سکا۔

مصنف مرحوم کو سیرۃ نبویؐ کے لکھنے کا خیال الفاروق کے بعد ہی پیدا ہوگیا تھا، چنانچہ ۱۳۲۳ھ میں اس کا ایک مختصر سا حصہ یعنی غزوۂ احد تک وہ لکھ بھی چکے تھے[1]، کہ بعض مشکلات کی بنا پر رُک گئے، لیکن ملک کا تقاضائے شوق برابر جاری رہا۔ بالآخر انھوں نے ۱۳۳۰ھ میں اس بارِ امانت کے اٹھانے کا آخری فیصلہ کرلیا۔ چنانچہ پچاس ہزار روپے کے سرمائے کے لیے اُنھوں نے قوم میں مرافعہ پیش کیا۔ سیکڑوں مسلمان اس خدمت کے لیے آگے بڑھے۔ ان میں فقرائے اُمت

---

[1] یہ مسودہ اب تک موجود ہے۔

بھی تھے اور اُمرائے ملت بھی، لیکن یہ سعادت اُخروی ازل ہی سے خادمۃ الملۃ النبویۃ مخدومۃ الاُمۃ المحمدیۃ نواب سلطان جہاں بیگم تاج الہند فرمانفرمائے بھوپال متع اللہ المسلمین بطول بقائہا و دوام ملکہا کے لیے مقدر تھی، اس لیے وہ سب سے آگے بڑھیں اور سوانح نگارِ نبوت کو دوسرے آستانوں سے بے نیاز کر کے اس سرمایہ سعادت کو اپنے خزانۂ عامرہ میں شامل کر لیا۔ فرمانروا خواتین اسلام نے جو مذہبی کارنامے اب تک انجام دیے ہیں، آئندہ مورخ غالباً اس کارنامے کو ان میں سب سے بڑا قرار دے گا، کہ اس کا تعلق اُس ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے جو اسلام کی تاریخ میں کائنات کی سب سے بڑی ہستی ہے۔

مصنف مرحوم کی وفات کے بعد شاید دوبارہ اس خدمت گزاری کے لیے مسلمانوں میں قرعہ اندازی ہوتی، لیکن فرمان فرمائے بھوپال نے مصنف کے جانشینوں کے لیے بھی سلسلہ رفیض کو برابر جاری رکھا۔ مصنف مرحوم کے منشا کے مطابق[1] اس موقع پر منشی محمد امین صاحب مہتمم تاریخِ بھوپال کا نام لینا بھی ضروری ہے جن کی مرحمت جنبانی سے نسیم سعادت کے یہ جھونکے اس باغِ اقدس میں دوبارہ آئے۔

مصنف مرحوم نے جو مسودہ چھوڑا تھا اُس میں اس حصہ تک مبیضہ صاف تھا، البتہ تین چار مقامات پر اضافہ کی علامت بنی تھی اور مطالب کا اشارہ تھا، ان کو بڑھا دیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے، کہ اس حصہ کی تکمیل کے بعد ان کو خیال آیا کہ قدیم مورخین کی طرح سنہ وار واقعات کی ترتیب رکھ کر ہر سنہ کے آخر میں جزئی حالات "واقعاتِ متفرقہ" کے عنوان سے لکھ دیے جائیں،

---

[1] مکاتیب شبلی جلد اول صفحہ ۲۶۱۔

چنانچہ مبیضہ پر سنہ ۳ھ تک اپنے قلم سے وہ لکھ سکے۔ یہ امانت جب میرے سپرد ہوئی تو میں نے بقیہ سنین کے آخر میں اسی قسم کے جزئیات متفرقہ کا اضافہ کر دیا۔ حواشی یا حوالے کہیں کہیں چھوٹ گئے تھے، وہ ڈھونڈ کر لکھے۔ لیکن اس کی کامل احتیاط کی گئی کہ جامع کا کوئی لفظ بلکہ کوئی حرف مصنف کی عبارت میں نہ ملنے پائے۔ چنانچہ ان تمام جزئی اضافوں کو قوسین کے اندر جگہ دی گئی ہے۔ اس بنا پر لفظ "صلعم" یا جملہ ہائے معترضہ کے سوا جو چند فقرے اور عبارتیں قوسین میں ہیں، وہ اضافہ ہیں۔

یہ پہلے خیال تھا کہ جلد اول کو وفات تک وسعت دی جائے۔ لیکن جب کتابت شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ ضخامت ۸۰۰ صفحہ کو پہنچ جائیگی، اور اس سے جلد کی نفاست کو صدمہ پہنچے گا۔ سامانِ طبع کی گرانی سے جو تعویق پیدا ہو رہی تھی، اس نے مجبور کیا کہ اس کو دو جلدوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ چنانچہ پہلی جلد سلسلۂ جنگ و غزوات پر ختم کر دی گئی اور دوسری جلد اسلام کی امن کی زندگی، تنظیم و تنسیق، اشاعت اسلام، وفات اور اخلاق کی الگ کر دی گئی۔ خداوند تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کی طبع و اشاعت کی توفیق عطا فرمائے، حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ۔

مصنف مرحوم کتاب کا سرنامہ لکھنے نہ پائے تھے۔ ان کے مسودات میں اتفاقاً یہ تحریر قلم زدہ مل گئی۔ اس کو غنیمت سمجھ کر تبرکاً داخل کتاب کیا جاتا ہے۔

جامع

سید سلیمان، ندوی

دار المصنفین اعظم گڑھ

۲۰ ربیع الثانی ۱۳۳۹ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ طبع دوم

سیرۃ نبوی جلد اول طبع اول کو شائع ہوئے آج چار برس ہوئے، اس اثنا میں خداوند تبارک و تعالیٰ نے اس کو جو مقبولیت عطا فرمائی وہ ہم خاکساران دارالمصنفین کے لیے فخر و نازش کا سرمایہ ہے۔ نہ صرف یہ کہ عام قدردانوں نے اس کو جان و دل سے خریدا اور امراء اور والیان ممالک نے اس کی خدمت کو سعادتِ دارین سمجھا بلکہ خواص اور علماء کے طبقے نے بھی اس کی قدرشناسی کی۔

ہندوستان میں اہل علم کا کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جس نے اپنے اپنے فن کی میزانِ نقد میں سیرت کے مضامین و تحقیقات کو نہ تولا، حفاظ نے اس کی آیاتِ قرآنی کو پڑھا۔ محدثین نے اس کی حدیثیں جانچیں، ادیبوں نے اس کے عربی اشعار اور ترجموں پر نقد کیا؛ علمائے انساب نے اسماء کی تنقیح کی، منجموں اور حساب والوں نے اس کے زائچوں اور تاریخوں پر نظر ثانی کی، اہل تاریخ و سیر نے واقعات کی جانچ پڑتال کی۔ اور ہم ممنون ہیں کہ نہایت خلوص و محبت سے انھوں نے اپنے نتائج افکار سے ہم کو مطلع کیا اور ہم نے ان سے فائدہ اٹھایا۔

طبع اول میں جیسا کہ خاتمہ میں ہم نے اقرار کیا تھا۔ چھاپہ کے

اغلاط اور سہو کے چند مسامحات رہ گئے تھے، اس طبع میں جہاں تک امکانِ انسانی ہے تصحیح کی انتہائی کوشش کی گئی ہے۔ اور یقین ہے کہ انشاء اللہ یہ اغلاط اور مسامحات سے پاک ہوگا۔ جو لوگ سیرت پر نقد کرنا چاہتے ہوں اُن کو یہی نسخہ پیشِ نظر رکھنا چاہیے +

طبع اول بڑی تقطیع پر شائع ہوئی تھی، لوگوں کا اصرار تھا کہ طبع ثانی کتابی تقطیع پر شائع ہو، تاکہ وہ بہ آسانی ہر وقت استعمال میں آسکے، یہ ان کی تعمیل ہے۔ انشاء اللہ ہر جلد کے طبع اول کی بڑی تقطیع کے بعد طبع ثانی چھوٹی تقطیع پر شائع ہوتی رہے گی +

سید سلیمان ندوی

۲۸ ذلقعدہ ۱۳۳۹ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ طبع چہارم سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم جلد اوّل

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے کو اللہ تعالیٰ نے جو مقبولیت بخشی وہ مصنّف اور جامع دونوں کے لیے بڑی نعمت ہے، جس پر اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے۔

نومبر ۱۹۱۴ء میں مصنّف کی وفات کے بعد جب سیرۃ کا مسودہ مصنّف کی وصیّت کے مطابق اس ہیچمدان کے ہاتھ آیا تو اس عقیدت کی بنا پر جو ایک شاگرد کو اپنے اُستاد سے ہونی چاہیے، اُستاد کے مسودے پر اُنگلی رکھتے ہوئے بھی ڈر معلوم ہوتا تھا۔ اگر کبھی بہ ضرورت ایسی گستاخی کرنی پڑتی تھی تو خواب میں بھی ڈر جاتا تھا۔ مسودے کا مبیّضہ مصنّف کے سامنے ہوچکا تھا، اس لیے اس مبیّضہ کا مقابلہ مسودہ سے اور نہ مسودہ کا مقابلہ اصل ماخذوں سے مَیں نے کیا، بلکہ مصنّف کی امانت جُوں کی تُوں ناظرین کے سپرد کر دی، بجز اس کے کہ بعض مقامات پر مصنّف کے اشارہ کے مطابق بعض چیزوں کا اضافہ ہلالین میں کر دیا، جس کی تصریح دیباچہ میں موجود ہے۔

اس کے بعد اس نسخہ کی نقل در نقل چھپتی رہی، اور مقابلہ اور تصحیح ماخذ کی ضرورت نہیں سمجھی۔ لیکن اس اثنا میں کبھی کبھی مراجعت کے وقت بعض مقاموں پر تصحیح اور اضافہ کی نئی ضرورت محسوس ہوتی رہی

اور اس کے مطابق ایک نسخہ پر یہ تصحیحات اور اضافے وقتاً فوقتاً کرتا رہا۔

اس دفعہ جب نئے نسخہ کے چھاپنے کی ضرورت ہوئی تو خیال آیا کہ اس کتاب کے مسودے کو اصل ماخذوں سے ملا کر دیکھا جائے اور مقابلہ اور مطابقت کی جائے۔ یہ بڑا مشکل کام تھا۔ بیسیوں کتابوں کو پھر سے دیکھنا، اور ہزاروں صفحوں کو الٹنا، متعدد مختلف روایتوں کو پرکھنا اور ضرورت کے مقام پر حاشیے لکھنا، خود ایک مستقل تصنیف کے برابر محنت تھی مجھے یہ لکھتے میں بڑی خوشی ہے کہ لائق عزیز مولانا محمد اویس صاحب نگرامی ندوی اس کام میں میرے دست و بازو ثابت ہوئے۔ واقعات کی تلاش اور جانچ، روایتوں کی چھان بین، اصل عبارتوں سے مسودہ کی تطبیق اور حدیث اور سیرت کی کتابوں کی طرف از سر نو مراجعت میں ان سے بڑی مدد ملی۔

کچھ مقام ایسے بھی تھے جہاں اس ہیچمدان جامع کو مصنف کے نظریے سے اختلاف تھا، اس دفعہ وہاں حاشیے بڑھا کر اختلاف کو ظاہر کر دیا۔ کہیں کسی واقعہ کے اجمال کی تفصیل یا دفع شبہہ کی ضرورت تھی، وہاں اس ضرورت کو پورا کیا گیا۔ بعض مسامحات پر تنبیہ مناسب تھی وہ کی گئی۔ کہیں فروتر ماخذ کا حوالہ تھا اور اثنائے مطالعہ میں اس سے بالاتر ماخذ ملا تو اس کا حوالہ دے دیا گیا۔

یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ دو چار مقام میں عدد کی غلطی جو اردو ہندسوں میں اکثر ہو جاتی ہے اصل مبیضہ میں بھی موجود تھی، مراجعت کے وقت ان کی غلطی معلوم ہوئی، اور اب ان کی تصحیح کر دی گئی۔ مثلاً حضرت فاطمہ

رضی اللہ عنہا کی شادی کے سلسلے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زرہ کی قیمت سوا روپے چھپ گئی تھی، حالانکہ وہ سوا سو ہے۔ اسی طرح غزوہ احزاب میں کفار کے لشکر کی تعداد ۲۴ ہزار درج ہوئی تھی، حالانکہ وہ بعض روایت میں ۱۴ ہزار، لیکن صحیح روایات میں دس ہزار ہے۔

مولانا کی زندگی میں اس کی تصنیف کے وقت ان کو بعض کتابیں قلمی ملی تھیں، جیسے روض الانف جس سے پورا استفادہ دقت طلب تھا، اب وہ چھپ گئی ہے۔ بعض کتابوں کی ان کو تلاش ہی رہی مگر ان کو نہ مل سکی، جیسے کتاب البدایہ والنہایہ ابن کثیر۔ مصنف سے اکثر حسرت کے ساتھ سنا کہ افسوس تاریخ ابن کثیر نہیں ملتی، وہ مل جاتی تو ساری مشکلیں حل ہو جاتیں، اللہ کا شکر ہے کہ اب وہ چھپ کر عام ہو گئی۔ مستدرک حاکم اس وقت تک ناپید تھی، اب طبع ہو کر گھر گھر پھیل گئی۔ غرض ان کتابوں کے ہاتھ آجانے سے بہت سی نئی معلومات بڑھ گئیں۔ چنانچہ اس نسخہ کی تصحیح و اضافہ میں ان سے کام لیا گیا۔

اس نسخہ کی تیاری میں جن خاص باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے، وہ یہ ہیں:

۱۔ پوری کتاب کے واقعات کو از سرِ نو حدیث و سیر کی کتابوں سے ملا کر دیکھا گیا ہے، اور اس میں جہاں نقص نظر آیا دور کیا گیا ہے۔

۲۔ تصحیح بیان، دفعِ شبہہ، رفعِ ابہام اور تشریح کے لیے بہت سے توضیحی حواشی بڑھائے گئے ہیں۔

۳۔ مصنف کا کوئی بیان اگر نقد اور تنبیہ کے قابل معلوم ہوا تو اس پر نقد اور تنبیہ کی گئی ہے۔

۴۔ کہیں کہیں حوالے چھوٹ گئے تھے، اس نسخہ میں ان کو بڑھا دیا گیا ہے کہیں صرف کتابوں کے نام تھے، اس دفعہ ان کے صفحے یا باب بھی لکھ دیے گئے۔

۵۔ جہاں صرف صفحوں کے حوالے تھے، ابواب اور فصول کے حوالے بھی دے دیے گئے، تاکہ جس کے پاس ماخذ کی کتاب کا جو اڈیشن ہو اس میں نکال کر دیکھ لیا جا سکے۔

۶۔ طبع اوّل کے بعد سے سیرت یا حدیث کی جو نئی کتابیں چھپی تھیں اُن سے استفادہ کر کے اگر کوئی نئی بات ان میں ملی ہے تو اس کا اضافہ کیا گیا۔

۷۔ اگر کوئی حوالہ پہلے کسی نیچے درجے کا، اور بعد کو اُس سے اعلیٰ درجے کا حوالہ ملا تو اس کو بڑھایا گیا۔

۸۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے نامِ مبارک کے ساتھ صلعم کے اختصار کے بجائے پورا صلی اللہ علیہ وسلم لکھنے کا اہتمام کیا گیا، تاکہ اس تساہل سے درود پڑھنے کی برکت سے ناظرین کو محرومی نہ ہو۔

غزوۂ بدر کی روایتوں کی تنقید کے سلسلے میں ایک مقام پر اس نافہم ہیچمدان کے خطاکار قلم سے حضرت کعبؓ بن مالک صحابی کی روایت پر نامناسب تنقید نکل گئی تھی، جس سے ایک گونہ ایک جلیل القدر صحابی کی شان میں سوءِ ظن کا پہلو پیدا ہوتا تھا، جس پر مجھے شرمندگی ہے۔ اور اب میں اپنی اس غلطی و نادانی کو مان کر اس عبارت کو قلم زد کر کے صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی براءت کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے عفو کا خواستگار ہوں۔

بندہ ہماں بہ کہ ز تقصیر خویش

عذر بہ درگاہِ خدا آورد

جن لوگوں کے پاس اس سے پہلے کے نسخے ہوں، وہ اپنے نسخہ[۱] سے ان سطروں کو کاٹ دیں تو بڑی مہربانی ہو۔ اب یہ موجودہ نسخہ طبع اوّل سے بہت سی باتوں میں بہتر ہوگیا ہے۔ اس موجودہ نسخہ میں انسانی استطاعت کے مطابق پوری طرح تصحیح کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ تاہم انسان انسان ہے، خطا و نسیان اس کا خمیر ہے، کسی ناظرِ کتاب کو اب بھی کوئی غلطی معلوم ہو تو وہ ضرور مطلع فرماکر ممنونِ کرم کریں۔

آخر میں پاک پروردگار کی بارگاہِ عالی میں دُعا ہے کہ وہ میری خطا و نسیان سے درگزر فرماکر اس خدمت کو قبول کا شرف بخشے، اور مسلمانوں کو اس سے بیش از بیش مستفید فرماکر اس گنہگار کے لیے بخشایش کا ذریعہ بنائے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین۔

ہیچمدان

سیّد سلیمان ندوی

یکم جمادی الثانیہ ۱۳۶۴ھ

۱؎ یہ عبارت سیرۃ النبیؐ جلد اوّل طبع اوّل کے صفحہ ۲۵۵ کی سطر ۹ و ۱۰ و ۱۱ و ۱۲، اور طبع مابعد کے صفحہ ۳۲۳ کی سطر ۱۴۔ ۱۵۔ ۱۶۔ میں ہے۔

فہرست مضامین

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم حصہ اوّل

مضمون	صفحہ
مقدمہ	
(فن روایت)	
سیرۃ نبویؐ کی تالیف کی ضرورت	۳
پیغمبروں پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخی فضیلت،	۴
سیرت کی ضرورت علمی حیثیت سے	۸
علم کلام کی حیثیت سے سیرت کی ضرورت	۹
سیرت اور حدیث کا فرق،	۱۰
فن سیرت کی ابتدا اور تحریری سرمایہ،	۱۵
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کی تحریریں،	۱۸
مغازی،	
تصنیف و تالیف کی ابتدا سلطنت کی طرف سے،	۲۴

مضمون	صفحہ
حضرت عائشہ رضؓ کی روایتیں،	۲۴
مغازی پر خاص توجہ،	"
امام زہری اور فن سیرت،	۲۵
امام زہری کے تلامذہ سیرت،	"
موسیٰ بن عقبہ اور سیرت،	۲۶
محمد بن اسحاق اور سیرت،	۲۷
واقدی اور سیرت،	"
ابن ہشام اور سیرت،	۲۸
ابن سعد اور سیرت،	"
امام بخاری اور سیرت،	۳۰
امام طبری اور سیرت،	"
فہرست متقدمین علمائے سیرت،	۳۱
فہرست متاخرین علمائے سیرت، صحت بانعقد،	۳۱
اسلامی فن روایت کا پہلا اصول،	"
اسماء الرجال کی تدوین،	۳۲

مضمون	صفحہ
اسماء الرجال کی پیش نظر کتابیں،	۴۴
تحقیق روایت کا اصول قرآن و حدیث میں،	״
دوسرا اصول،	۴۴
درایت کی ابتدا،	״
محدثین کے اصولِ درایت،	۴۵
روایت کے اصول،	۴۷
موضوع حدیثوں کی شناخت کے اصول،	۴۸
فنِ سیرت پر تبصرہ	۵۱
امہات کتب سیرت،	״
کتب حدیث و سیرت میں فرق،	۵۲
فنِ سیرت میں محدثین کی مسامحت،	
تصانیف سیرت میں کتب حدیث سے بے اعتنائی،	۵۷
مصنفین سیرت کی تدلیس،	۵۸
اصولِ روایت سے ہر جگہ کام نہیں لیا گیا،	۵۹
رواۃ کا اختلافِ مراتب،	״
تمام صحابہ کے عدول ہونے کی بحث،	۶۰
واقعات میں سلسلۂ علت و معلول	۶۰
نوعیت واقعہ کے لحاظ سے شہادت کا معیار،	۶۱
کم سن راویوں کی روایت،	۶۳
راویوں میں فقاہت کی شرط،	۶۴
روایت میں راوی کے قیاس کو دخل،	۶۷
فن روایت پر خارجی اسباب کا اثر،	۶۹
قیاس و درایت،	۷۱
صحابہ میں دو گروہ،	۷۳
محدثین اور درایت حدیث،	۷۶
روایت بالمعنی،	۸۰
روایت آحاد،	۸۲
نتائج مباحث مذکورہ،	۸۵
یورپین تصنیفات سیرۃ پر	۸۷
یورپ کی پیغمبر اسلام ؐ سے ابتدائی واقفیت،	״
سترھویں اور اٹھارھویں صدی،	۸۹

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۹۱	اخیر اٹھارھویں صدی کی تصنیفات،	۱۱۰	عرب کی قدیم حکومتیں،
		۱۱۲	تہذیب و تمدن،
۹۵	مصنفین یورپ کی تین قسمیں،	۱۱۸	عرب کے مذاہب،
۹۷	یوربین مصنفین کی غلط کاریوں کے اسباب،	۱۲۰	اللہ کا اعتقاد،
		۱۲۲	نصرانیت اور یہودیت اور مجوسیت،
۹۹	یوربین تصنیفات کے اصول مشترکہ،	۱۲۳	مذہب حنیفی،
۱۰۰	اس کتاب کی تصنیف و ترتیب کے اصول،	۱۲۶	کیا عرب میں ان مذاہب نے کچھ اصلاح کی،
۱۰۱	کتاب کے حصے،	۱۲۸	**سلسلۂ اسماعیلی**
۱۰۳	استناد اور حوالے،	۱۲۹	حضرت اسماعیلؑ کہاں آباد ہوئے؟
	مقدمہ ۲ (تاریخ عرب قبل اسلام)	۱۳۳	ذبیح کون ہے؟
		۱۳۹	مقام قربانی،
		۱۴۱	قربانی کی یادگار،
		۱۴۵	قربانی کی حقیقت،
۱۰۴	عرب،	۱۵۰	**مکہ معظمہ**
〃	عرب کی وجہ تسمیہ،	۱۵۴	خانۂ کعبہ کی تعمیر،
〃	عرب کا جغرافیہ،	۱۵۸	حضرت اسماعیلؑ کی قربانی،
۱۰۵	عرب کی قدیم تاریخ کے ماخذ،		
۱۰۷	عرب کے اقوام و قبائل،		

مضمون	صفحہ
سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم	
سلسلۂ نسب	۱۶۱
سلسلۂ نسب نبوی ص،	۱۶۱
سلسلۂ نسب نبوی کی تحقیق،	″
خاندانِ قریش،	۱۶۳
قصی،	۱۶۴
ہاشم،	۱۶۶
عبدالمطلب،	۱۶۸
عبداللہ،	۱۶۹
آمنہ رض،	″
ظہورِ قدسی	۱۷۱
ولادت،	۱۷۱
تاریخ ولادت،	۱۷۲
رضاعت،	۱۷۳
ثوبیہ،	″
حضرت حلیمہ رض سعدیہ،	۱۷۴

مضمون	صفحہ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی باپ، حضرت حارث رض،	۱۷۶
رضاعی بھائی بہن،	″
مدینہ کا سفر،	″
حضرت آمنہ کی وفات،	۱۷۷
عبدالمطلب کی کفالت،	″
ابوطالب کی کفالت،	۱۷۸
شام کا سفر،	۱۷۹
بحیرا راہب کا قصہ،	۱۸۰
اس قصہ کی تنقید،	۱۸۱
حرب فجار کی شرکت،	۱۸۳
حلف الفضول میں شرکت،	۱۸۴
تعمیر کعبہ،	۱۸۵
شغلِ تجارت،	۱۸۷
تزویج خدیجہ رض،	۱۸۹
جستہ جستہ واقعات (قبل نبوت)،	۱۹۱
حدود سفر (قبل نبوت)،	″
مراسم شرک سے اجتناب،	۱۹۲
موحدین کی ملاقات،	

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ

- قس بن ساعدہ کے قصے کی تنقید، ۱۹۶
- احباب خاص (قبل نبوت)، ۱۹۸

آفتاب رسالت کا طلوع ۲۰۲

- مراسم جاہلیت اور لہو و لعب سے فطری اجتناب، ۲۰۳
- غار حرا میں عبادت، ۲۰۴
- یہ عبادت کیا تھی؟ ″
- رویائے صادقہ سے نبوت کا آغاز، ۲۰۵
- فرشتے کا پہلی بار نظر آنا، ″
- ورقہ بن نوفل کے پاس جانا اور اس کا تسکین دینا، ۲۰۶
- وحی کا کچھ دن کے لیے رک جانا، ″
- ورقہ کے تسکین دینے کی روایت کی تنقید، ۲۰۷
- دعوت اسلام کا آغاز، ۲۰۸
- تین سال تک دعوت کا اخفاء، ۲۱۳
- سب سے پہلے جو لوگ اسلام لائے، ۲۰۸
- حضرت ابوبکرؓ کا اسلام، ۲۰۹
- ان کے اسلام لانے کا دیگر معززین قریش پر اثر،
- اسلام کیوں کر پھیلا؟ ۲۱۰
- پہلا سبب، ″
- دوسرا سبب، ۲۱
- تیسرا سبب، ″
- دعوت کا اعلان، ۲۱۳
- قریش کے سامنے کوہ صفا پر آپؐ کی سب سے پہلی تقریر، ″
- قریش کی مخالفت اور اس کے اسباب، ۲۱۴
- پہلا سبب، ۲۱۶
- دوسرا سبب، ۲۱۷
- تیسرا سبب، ۲۱۹
- چوتھا سبب، ″
- پانچواں سبب، ۲۲۰
- مدت تک قریش کے تحمل کے اسباب، ۲۲۴

مضمون	صفحہ
ابوطالب کی نصیحت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب،	۲۲۴
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کو ایذا رسانی،	۲۲۵
عتبہ کی آپؐ سے درخواست اور آپؐ کا جواب،	″
حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کا اسلام،	۲۲۶
تعذیب مسلمین،	۲۳۰
مسلمانوں پر ظلم وستم کے طریقے،	۲۳۱
بلاکشانِ اسلام،	″
مسلمانوں کے استقلال اور وفاداری کی تعریف ایک عیسائی کے قلم سے،	۲۳۵
ہجرت حبشہ (۵ نبوی)،	۲۳۶
اس ہجرت کا فائدہ،	۲۳۷
مہاجرین حبش،	″
قریش کی سفارت نجاشی کے پاس،	۲۴۰
دربار میں حضرت جعفرؓ کی تقریر اور اس کا اثر،	۲۴۲

مضمون	صفحہ
مسلمانوں کی وفاداری نجاشی کے ساتھ،	۲۴۳
مہاجرین حبش کی واپسی،	″
تلک الغرانیق العلی کی بحث،	۲۴۴
اہل مکہ کی ایذا رسانی،	۲۴۶
حضرت ابوبکرؓ کا ارادۂ ہجرت،	۲۴۷
شعب ابی طالب میں محصور ہونا	″
(محرم ۷ نبوی)،	۲۴۸
حضرت خدیجہؓ اور ابوطالبؓ کی وفات،	۲۵۰
آنحضرتؐ کا غمزدہ ہونا، اور قریش کی ایذا رسانی،	″
طائف کا سفر اور واپسی،	۲۵۴
مطعم کا آپؐ کو اپنی پناہ میں لینا،	۲۵۵
قبائل کا دورہ،	۲۵۶
قریش کی آپؐ کو ایذا رسانی،	۲۵۸
مسلمانوں کا گھبرانا اور آپؐ کا تسلی دینا،	″

مضمون	صفحہ
مدینہ منورہ اور انصار	٢٦٢
انصار کی قدیم تاریخ،	"
اہل مدینہ کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلی ملاقات،	٢٦٥
انصار کے اسلام کی ابتدا،	٢٦٦
بیعت عقبۂ اولیٰ ۱۱ نبوی،	٢٦٨
بیعت عقبۂ ثانیہ ۱۲ نبوی،	٢٦٩
نقبائے انصار،	٢٧٠
صحابہ کی ہجرت مدینہ،	"
سنہ ۱ھ ہجرت	٢٧٢
ہجرت کی خدا کی طرف سے اجازت	٢٧٣
آپؐ کے قتل کے مشورے،	"
حضرت علیؓ کو امانتیں سپرد کرنا اور ان کو بستر پر لٹانا،	٢٧٥
کفار کا محاصرہ اور ناکامی،	٢٧٦
ہجرتِ مدینہ،	"
حضرت ابوبکرؓ کی معیت،	٢٧٧

مضمون	صفحہ
غارِ ثور میں چھپنا اور کفار کا تعاقب،	٢٧٧
بعض روایتوں کی تنقید،	
مدینہ کی طرف کوچ اور راستہ کا حال،	"
قریش کا آپ کی گرفتاری کے لیے اشتہار،	٢٧٨
سراقہ بن جعشم کا واقعہ،	٢٧٩
آپؐ کی آمد کی خبر مدینہ میں پہنچنا،	٢٨٠
سامانِ استقبال،	"
قبا میں نزول،	"
حضرت علیؓ کا آکر مل جانا،	
قبا میں مسجد کی تعمیر،	٢٨١
قبا میں داخلے کی تاریخ،	٢٨٣
مدینہ میں داخلہ،	"
آپؐ کی پہلی نماز جمعہ اور پہلا خطبۂ نماز،	"
انصار کا ترانۂ مسرت،	"
حضرت ابو ایوبؓ کے گھر اترنا،	٢٨٤
اہل بیت کا مکہ سے بلوانا،	٢٨٥
مسجد نبوی اور حجروں کی تعمیر،	"

مضمون	صفحہ
اذان کی ابتدا اور رکعات نماز،	۲۸۸
مواخاۃ اور طریقہ مواخاۃ،	۲۸۹
انصار کا ایثار،	〃
صفہ اور اصحاب صفہ،	۲۹۸
مدینہ کے یہود اور ان سے معاہدہ،	۳۰۰
سنہ ۱ھ کے واقعات متفرقہ،	۳۰۲
حضرت کلثوم و اسعد کی وفات،	〃
حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی ولادت،	۳۰۳
چار رکعت کی فرضیت،	۳۰۴
سنہ ۲ھ	
تحویل قبلہ و آغاز غزوات	۳۰۵
تحویل قبلہ شعبان سنہ ۲ھ	〃
اس کے اسباب،	
سلسلۂ غزوات	۳۱۰
مدینہ کی مشکلات،	۳۱۱
قریش کی برافروختگی،	〃
منافقین اور یہودیوں کی سازش،	〃

مضمون	صفحہ
مدینہ میں مسلمانوں کی بے اطمینانی،	۳۱۴
سامان،	
آیت جہاد کا نزول،	۳۱۵
بدر سے پہلے کی مہمیں،	۳۱۶
قبائل سے معاہدہ،	۳۱۰
حلفائے قریش کا حملہ،	〃
سریۂ ابن جحش،	۳۱۹
حضرمی کا مسلمانوں کے ہاتھ سے قتل،	〃
غزوۂ بدر	۳۲۱
قریش کی مدینہ پر حملہ کی تیاری،	〃
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ سے نکلنا اور صحابہ سے مشورہ،	۳۲۲
چاہ بدر پر قیام،	۳۲۴
میدان جنگ،	۳۲۶
قریش پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ترحم،	۳۲۷
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ الٰہی میں مناجات،	۳۲۷
لڑائی کا آغاز،	۳۲۸

مضمون	صفحہ
ابو جہل کا قتل،	۲۲۱
امیّہ کا قتل،	۲۲۲
مسلمانوں کی فتح اور اس کے اسباب،	۲۲۴
مقتولینِ بدر کی تدفین،	۲۲۵
گرفتارانِ بدر اور اُن کے ساتھ مسلمانوں کا سلوک،	″
قیدیوں کی نسبت مشورہ،	۲۲۷
فدیہ لے کر آزاد کرنا، عتابِ الٰہی کا نازل ہونا،	″
نزولِ عتاب کا سبب،	۲۲۸
حضرت عباسؓ کی گرفتاری،	۲۲۹
حضرت ابوالعاصؓ کی گرفتاری،	″
ان کی رہائی اور اسلام،	
مقتولینِ بدر کا اثر قریش پر،	۲۳۰
عمیر بن وہب کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے ارادے سے آنا اور اسلام لانا،	۲۳۱
غزوۂ بدر کا بیان قرآن مجید میں،	۲۳۲

مضمون	صفحہ
غزوۂ بدر پر دوبارہ نظر	۲۴۹
غزوۂ بدر کا اصلی سبب،	″
قرآن مجید سے اس پر استدلال،	۲۵۱
احادیث سے اس پر استدلال،	۲۵۵
قرائن سے استدلال،	۲۶۰
اوّل قرینہ،	″
دوم،	″
سوم،	۲۶۱
چہارم،	۲۶۲
پنجم،	″
ششم،	۲۶۴
ہفتم،	″
غزوۂ بدر کا اصلی سبب	″
ایک ضروری نکتہ،	۲۶۸
غزوۂ بدر کے نتائج،	۲۷۰
غزوۂ سویق، ذی حجہ سنہ ۲ھ،	″
حضرت فاطمہ زہراؓ کی شادی،	۲۷۱
روزے کی فرضیت،	۲۷۲
دوگانۂ عید،	″
غزوۂ بنی قینقاع،	″

مضمون	صفحہ
سنہ ۳ھ	
غزوۂ اُحد	۳۷۴

مضمون	صفحہ
غزوۂ اُحد	،،
اس جنگ کے لیے قریش کا سامان،	۳۷۵
خواتین قریش کی شرکت،	،،
حضرت عباس کا قریش کے ارادے سے مطلع کرنا،	۳۷۶
مسلمانوں کی مدافعت کے لیے تیاری،	۳۷۷
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مسلح ہونا،	،،
مسلمان سپاہیوں کی جمعیت،	،،
۳۰۰ منافقین کی علیحدگی،	،،
مسلمان بچوں کی شرکتِ جنگ کے لیے بیقراری،	۳۷۸
فریقین کی صف بندی،	،،
خاتونانِ قریش کا ترانۂ جنگ،	۳۷۹
آغازِ جنگ،	،،
حضرت حمزہؓ اور حضرت علیؓ کا نکلنا،	۳۸۰
حضرت حمزہؓ کی شہادت،	۳۸۱
علمبردار قریش کا قتل ہونا،	،،
مسلمان حملہ آور،	۳۸۲
مسلمان تیر اندازوں کا اپنی جگہ سے ہٹ جانا،	،،
قریش کا عقب سے حملہ،	،،
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی غلط خبر اُڑانا،	۳۸۳
مسلمانوں کا پیچھے ہٹ جانا، اور بے ترتیبی،	،،
ایک مسلمان کا مسلمانوں کے ہاتھ سے غلطی سے مارا جانا،	،،
بعض صحابہ کی جاں نثاریاں،	۳۸۴
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زخمی ہونا،	۳۸۷
مشرکین کے لیے دعائے خیر کرنا،	،،
حضرت ابوطلحہؓ اور حضرت سعدؓ کی قدر اندازی،	،،

مضمون	صفحہ
آپ کا مشرکین پر اظہار افسوس،	۳۸۶
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مع چند رفقاء کے پہاڑی پر چڑھ جانا،	"
مدینہ میں آپ کے قتل کی غلط خبر پہنچنا،	"
حضرت فاطمہ رض کا پہنچنا اور زخموں کا دھونا،	"
ابوسفیان اور حضرت عمر رض کا سوال وجواب،	"
دو مسلمانوں کی شہادت،	۳۸۷
ہند کی حضرت حمزہ رض کی لاش کے ساتھ بے ادبی،	۳۸۸
خاتونانِ اسلام کی اس جنگ میں خدمات،	"
حضرت صفیہ رض کا استقلال،	۳۸۹
ایک انصاریہ کی فدویت،	"
مسلمان شہدا کی تعداد اور ان کی تجہیز کا سامان،	۳۹۰
قریش کا تعاقب،	۳۹۱
ابوسفیان کی دوبارہ حملے کی نیت،	"

مضمون	صفحہ
مسلمانوں کا آگے بڑھنا،	۳۹۱
مدینہ کی طرف واپسی،	۳۹۲
حضرت حمزہ رض کا ماتم،	"
حضرت امام حسن رض کی ولادت،	۳۹۳
حضرت حفصہ رض سے نکاح،	"
حضرت ام کلثوم رض کا حضرت عثمان رض سے نکاح،	"
حکم وراثت کا نزول،	"
نکاح مشرکہ کی تحریم،	"
سنہ ۴ھ — سلسلۂ غزوات وسرایا	۳۹۴
قبائل کی اسلام سے دشمنی اور حملہ،	"
سرایا کی کثرت کے اسباب،	
سریۂ ابی سلمہ،	۳۹۵
سریۂ ابن انیس،	"
سریۂ بیر معونہ،	۳۹۶
واقعہ رجیع،	۳۹۷
حضرت زید رض کی شہادت،	۴۰۰

مضمون	صفحہ
واقعات متفرقہ	۴۰۰
امام حسین رضی کی ولادت،	۴۰۱
حضرت زید بن ثابت رضی کا عبری زبان سیکھنا،	"
حضرت ام سلمہ رضی کا نکاح۔	"
یہودیوں کا مقدمہ فیصلہ کیا،	"
بعض مورخین کے نزدیک حرمت شراب کی تاریخ،	"
۲ھ و ۳ھ و ۴ھ یہودیوں کے ساتھ معاہدہ اور جنگ	۴۰۲
یہودیوں کی اخلاقی حالت،	"
یہودیوں کی نفرت اسلام سے،	۴۰۴
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان کے ساتھ مدارات،	"
یہودیوں کی شرارتیں،	۴۰۵
یہودیوں کا قریش کے ساتھ اتحاد،	۴۰۹

مضمون	صفحہ
غزوہ بنی قینقاع،	۴۱۰
قتل کعب بن اشرف یہودی،	۴۱۲
غزوہ بنی نضیر،	۴۱۵
۵ھ غزوہ مریسیع، واقعہ افک و غزوہ احزاب	۴۲۱
انمار اور ثعلبہ کی تیاری اور فرار،	"
دومۃ الجندل میں کفار کا اجتماع،	"
غزوہ مریسیع یا بنی مصطلق،	۴۲۱
حضرت جویریہ رضی کا واقعہ،	۴۲۵
حضرت جویریہ کے نکاح کا اثر،	۴۲۶
واقعہ افک،	"
غزوہ احزاب یا غزوہ خندق،	۴۲۸
خندق کا کھودا جانا،	۴۳۰
خندق کھودنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شرکت،	"
صحابہ کا ترانہ	۴۳۱
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تین دن کا فاقہ،	"

مضمون	صفحہ
صف آرائی،	۴۳۱
بنو قریظہ کی معاہدہ شکنی،	"
منافقین کی جنگ سے علیحدگی،	۴۳۲
ایک مہینہ تک مدینے کا محاصرہ،	۴۳۳
غطفان سے معاہدہ کرنے سے صحابہ کی نارضامندی،	۴۳۴
کفار کا مدینہ پر عام حملہ،	۴۳۵
حضرت علیؓ اور عمرو بن عبدود کی جنگ،	"
دوسرے کافروں کا حملہ اور موتؓ،	۴۳۶
نمازوں کا قضا ہونا،	۴۳۷
بنو قریظہ کا مستورات کے قلعے پر حملے کا ارادہ،	"
حضرت صفیہؓ کی بہادری،	"
طوفان اور کفار کی شکست،	۴۳۸
حضرت نعیم بن مسعودؓ ثقفی کی تدبیر اور کفار میں پھوٹ،	۴۳۹
سبیل بازگشت،	
حضرت سعد بن معاذ کی شہادتؓ،	۴۴۱
بنو قریظہ کا خاتمہ،	۴۴۲

مضمون	صفحہ
بنو قریظہ کا خاتمہ اُن کی شریعت کے مطابق،	۴۴۵
بنو قریظہ کے اسباب قتل کی تحقیق،	۴۴۷
ریحانہ کا غلط واقعہ،	۴۴۹
حضرت زینبؓ سے نکاح،	۴۵۱
غلط واقعات کی تردید،	۴۵۲
پردے کا حکم،	۴۵۶
متبنّٰی کی بیوی سے نکاح کا جواز،	"
لعان اور ظہار،	"
تیمم	"
سنہ ۶ھ — صلح حدیبیہ اور بیعت رضوان	۴۵۸
حدیبیہ،	"
کعبہ اور مکہ معظمہ،	"
ارادۂ عمرہ،	۴۶۰
قریش کی روکنے کے لیے تیاری،	"
صلح کے پیغام،	"
بدیل اور عروہ کی سفارت،	"

مضمون	صفحہ
حضرت ابوبکر رض کا جوش،	۴۶۲
حضرت مغیرہ رض کی ڈانٹ،	۴۶۳
عروہ کا متاثر ہونا،	״
قریش کا غدّارانہ حملہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عفو،	۴۶۴
حضرت عثمان رض کا سفیر بن کر جانا،	״
بیعت رضوان،	״
سہیل کا سفیر بن کر آنا،	۴۶۵
صلح نامہ کی عبارت پر تنازع،	״
شرائط صلح،	۴۶۷
حضرت ابوجندل رض کا پابہ زنجیر قریش کی قید سے بھاگ کر آنا،	״
حضرت عمر رض اور عام مسلمانوں کا شرائط صلح سے ملال،	۴۶۸
حضرت ابوبکر رض کا ان کو سمجھانا،	״
قربانی کا حکم دینا اور صحابہ کا تعلل،	۴۶۹
قربانی کرنے کے لیے ازدحام،	۴۷۰
سورۂ فتح کا نزول،	״

مضمون	صفحہ
صلح حدیبیہ کے مصالح،	۴۷۱
نومسلموں کی واپسی کی شرائط کا منسوخ ہونا،	۴۷۲
۶ھ (آخر)	
سلاطین کو دعوتِ اسلام	۴۷۴
قیصر روم اور نامۂ اسلام،	۴۷۵
ابوسفیان اور قیصر روم،	۴۷۶
قیصر کا متاثر ہونا،	۴۷۷
نامۂ مبارک،	
اہلِ دربار کی برہمی،	۴۷۹
خسرو پرویز اور نامۂ اسلام،	״
خسرو پرویز کی برہمی اور انجام،	۴۸۰
نجاشی اور نامۂ اسلام،	۴۸۲
نجاشی کا اسلام،	״
حضرت ام حبیبہ رض سے نکاح،	۴۸۳
عزیز مصر اور نامۂ اسلام،	״
عزیز مصر کا جواب،	״

مضمون	صفحہ
حضرت ماریہ قبطیہ رضؓ،	۴۸۴
رئیس یمامہ کا جواب،	۴۸۵
رئیس غسان کی برہمی اور حملے کی تیاری،	"
حضرت خالد بن ولید رضؓ اور حضرت عمرو بن العاص رضؓ کا اسلام،	"

سنہ ۷ھ

خیبر، ادائے عمرہ ۴۸۶

مضمون	صفحہ
خیبر،	۴۸۷
غزوۂ خیبر کے اسباب،	"
ذی قرد،	۴۹۱
غزوۂ خیبر کا اہتمام شان،	۴۹۳
مدینہ سے روانگی،	۴۹۴
علمِ نبویؐ،	۴۹۵
صحابہ کا ترانہ	"
خاتونوں کی فوج میں شرکت،	۴۹۶

مضمون	صفحہ
غطفان کی روک تھام،	۴۹۷
خیبر پر حملہ،	"
بعض قلعوں کی اطاعت سے سرتابی،	۴۹۸
مرحب اور حضرت علی رضؓ کی جنگ،	۵۰۹
فاتح خیبر،	۵۰۲
مالِ غنیمت کی تقسیم،	۵۰۳
حضرت صفیہ رضؓ کے واقعے کی تحقیق،	۵۰۳
خزانۂ خیبر کے چھپانے کے جرم میں یہودی سرداروں کی سزا کی تحقیق،	۵۰۸
ماہِ حرام میں جہاد کا مسئلہ،	۵۱۱
تقسیمِ زمین،	۵۱۲
ملکی حالت اور احکام فقہی،	۵۱۳
وادی القریٰ اور فدک،	۵۱۵
ادائے عمرہ،	۵۱۶

مضمون	صفحہ
۸ھ غزوۂ موتہ، فتح مکہ غزوۂ حنین، و اوطاس و طائف	۵۱۹
غزوۂ موتہ،	۵۱۹
حضرت زیدؓ، حضرت جعفر طیارؓ اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کی شہادت،	۵۲۱
حضرت خالدؓ کی سپہ سالاری،	"
شہداء کا ماتم،	۵۲۳
غزوۃ الفتح،	۵۲۴
قریش پر فوج کشی کے اسباب،	"
قریش سے مصالحت کی کوشش،	۵۲۵
ابوسفیان کا سفیر بن کر آنا،	۵۲۶
حضرت حاطبؓ بن بلتعہ کی غلطی،	۵۲۷
فوجوں کی مکہ کی سمت روانگی،	"
ابوسفیان دربار رسالتؐ میں،	"
اُن کا ایمان لانا،	۵۲۸
کوکبۂ نبویؐ کا نظارہ،	۵۳۰
قریش کو امان،	۵۳۱
خانۂ کعبہ کی تطہیر،	۵۳۲
خطبۂ فتح،	۵۳۳
خطبہ کے اصولی مطالب،	۵۳۴
قریش کو عفوِ عام،	۵۳۵
قریش سے بیعتِ ایمان،	۵۳۶
ہندہ کا آنا،	"
ہندہ کا مکالمہ،	"
صفوان بن اُمیہ، عبداللہ بن زبعری اور عکرمہ کا اسلام،	۵۳۷
اشتہاریانِ قتل،	۵۳۸
اشتہاریانِ قتل کی تحقیق،	۵۳۹
خزائنِ حرم،	۵۴۳
فتح مکہ اور بُت شکنی،	"
غزوۂ حنین	
حنین،	۵۴۶
ہوازن اور ثقیف کا اجتماع،	۵۴۷
درید بن الصمہ شاعر کی گفتگو،	۵۴۸
عبداللہ بن حدردؓ کا تحقیق حال کے لیے جانا،	۵۴۹

مضمون	صفحہ
حنین کی طرف روانگی ،	۵۴۹
مسلمانوں کی ابتدائی شکست ،	۵۵۰
ابتدائی شکست کے اسباب ،	۵۵۳
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا استقلال اور صحابہ کو ندا ،	۵۵۷
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رجز اور مسلمانوں کا سنبھلنا ،	"
دشمنوں کی شکست	"
اوطاس	
درید کا قتل ،	۵۵۸
اسیرانِ جنگ میں حضرت شیماؓ آپ کی رضاعی بہن ،	"
محاصرۂ طائف	"
قلعہ شکن آلات کا استعمال ،	۵۵۹
محاصرہ اُٹھا لینا ،	۵۶۰
تقسیم غنائم ،	"
مؤلفۃ القلوب پر بخشش ،	"
بعض انصار کا سوءِ ظن ،	۵۶۱
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پُراثر تقریر ،	۵۶۲

مضمون	صفحہ
اسیرانِ جنگ کی عام رہائی ،	۵۶۳
واقعات متفرقہ ،	۵۶۴
حضرت ابراہیم کی ولادت اور وفات ،	"
کسوف کی نماز باجماعت ،	"
حضرت زینبؓ کا انتقال ،	"
سنہ ۹ھ **ایلاء اور تخییر، غزوۂ تبوک، مسجد ضرار، حج الاسلام**	۵۶۵
واقعہ ایلاء	
ایلاء کے اسباب کی تحقیق ،	۵۶۵
قرآن اور واقعہ ایلاء ،	"
حضرت عمرؓ کی روایت واقعہ ایلاء کی نسبت ،	۵۷۰
تخییر	
مظاہرۂ ازواج مطہرات کی تحقیق ،	۵۷۴
روایاتِ کاذبہ ،	۵۷۷

مضمون	صفحہ
غزوۂ تبوک کا سبب ،	۵۸۱
اجتماعِ افواج ،	۵۸۲
منافقین کی دراندازی ،	"
صحابہ کا جوش اور ایثار ،	"
۳۰ ہزار فوج کی روانگی ،	۵۸۳
سرحد کے عیسائی سرداروں سے مصالحت ،	۵۸۴
واپسی اور خیر مقدم کا ترانہ ،	۵۸۵
مسجد ضرار	"
حج الاسلام اور اعلان برأت ،	۵۸۶
حضرت ابوبکرؓ کا امیر الحج ہونا ،	۵۸۷
مسلمانوں کا پہلا حج ،	"
حضرت علیؓ کا اعلان برأت کرنا ،	۵۸۸
واقعاتِ متفرقہ ،	۵۹۰
زکوٰۃ کا حکم نازل ہونا ،	"
جزیہ کا آغاز ،	"
سود کی حرمت ،	"
نجاشی کی وفات اور جنازہ کی نماز غائبانہ ،	"

مضمون	صفحہ
غزوات پر دوبارہ نظر	۵۹۱
مغازی اور سیرت کا فرق ،	"
غزواتِ نبویؐ کی نسبت غلط فہمیاں ،	"
عرب اور جنگ و غارت گری ،	۵۹۲
ثار کا عقیدہ ،	۵۹۴
لوٹ کا مال ،	۵۹۷
احکام کا تدریجی نزول ،	"
جنگ میں وحشیانہ افعال ،	۶۰۲
غزواتِ نبویؐ کے اسباب اور انواع ،	۶۰۵
غزوہ اور سریہ کا فرق ،	"
غزوات اور سرایا کے مختلف اغراض ،	۶۰۶
بہ غرض تفتیش دشمن ،	۶۰۷
سریۂ ابن جحشؓ	۶۰۸
بہ غرض مدافعت ،	"
سریۂ غطفان ،	"

مضمون	صفحہ
سریہ ابوسلمہ رض،	۶۰۹
سریہ عبداللہ بن انیس،	"
غزوۂ ذات الرقاع،	۶۱۰
غزوہ دومۃ الجندل،	"
غزوۂ مریسیع،	"
سریۂ فدک،	۵۱۱
سریہ بشیر بن سعد،	"
سریہ عمرو بن العاص رض،	"
قریش کی تجارت کی روک ٹوک،	۶۱۲
امن وامان قائم کرنا،	۶۱۳
امن وامان کا فرض اور اسلام،	"
سریۂ زید بن حارثہ رض،	۶۱۵
سریۂ دومۃ الجندل،	۶۱۶
سریہ خبط یا سیف البحر،	"
غزوۂ غابہ،	۶۱۷
بے خبری میں حملہ کرنے کا سبب،	۶۱۸
مارگولیوس کی غلطی،	"
اصلی سبب،	۶۱۹
غزوۂ بنو سلیم،	"
غزوۂ ذات الرقاع،	"

مضمون	صفحہ
سریۂ عکاشہ،	۶۱۹
سریۂ علی رض بن ابی طالب،	"
غزوۂ بنو لحیان،	"
سریۂ عمر رض بن الخطاب،	"
سریہ کعب رض بن عمیر،	"
اشاعت اسلام کے لیے سرایا،	۶۲۱
سریۂ بیر معونہ،	"
سریۂ مرثد،	"
غزوۂ بنو لحیان،	"
سریۂ ابن ابی العوجا،	۶۲۲
سریۂ کعب رض بن عمیر،	"
داعیان اسلام کو حملہ کی ممانعت،	"
حضرت خالد رض کی غلطی کا معاوضہ،	۶۲۳
بت شکنی کے لیے سرایا بھیجنے کا سبب،	۶۲۴
جنگی اصلاحات،	۶۲۵
عربوں کے مقابلے میں عرب کے بعض وحشی جنگی افعال کو ابتداءً کیوں اختیار کیا گیا،	۶۲۶

مضمون	صفحہ
سپاہیوں کو احکام کہ بوڑھے، بچے اور عورتیں قتل نہ ہوں،	۶۲۶
صبر کی ممانعت،	۶۲۷
عہد کی پابندی،	″
قاصدوں کو امان،	۶۲۸
اسیرانِ جنگ کے ساتھ عربوں کا برتاؤ،	۶۲۹
صلیبی عیسائیوں کا برتاؤ،	″
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا برتاؤ قیدیانِ بدر کے ساتھ،	۶۳۰
بنت حاتم طائی کے ساتھ سلوک،	″
قرآن مجید اور اسیران جنگ،	″
سپاہیوں کو راستہ روک کر ٹھہرنے کی ممانعت،	۶۳۱
مالِ غنیمت کی تحقیر،	۶۳۲
مالِ غنیمت کی محبت،	″
غزوۂ حنین میں اسی سبب سے شکست ہوئی،	۶۳۳

مضمون	صفحہ
مالِ غنیمت کی خواہش جہاد کے ثواب کو کم کرتی ہے،	۶۳۴
اس نصیحت کا صحابہ پر اثر،	۶۳۵
لوٹ کی ممانعت،	
لڑائی عبادت بن گئی،	۶۳۶
اغراضِ جہاد،	۶۳۷
دفع فساد،	″
انسدادِ مظالم	″
فریضۂ امر معروف و نہی عن المنکر،	″
مالِ غنیمت کے مصارف کی تجدید،	″
جہاد بھی نماز ہے،	۶۳۸
ایک نکتہ،	″
جہاد عبادت بن گیا،	″
فاتح و پیغمبر کا فرق،	″
شوقِ عبادت،	۶۴۰
خاتمہ،	″

سیرۃ النبیؐ

سر نامہ

ایک گدائے بینوا شہنشاہِ کونین کے دربار
میں اخلاص و عقیدت کی نذر لے کر آیا ہے،
ز چشم آستیں بردار و گوہر را تماشا کُن

شبلی
شوال سنہ ۱۳۳۰ھ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوۡلِهٖ مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِهٖ وَاَصۡحَابِهٖ اَجۡمَعِيۡنَ،

سیرتِ نبوی ؐ کی تالیف کی ضرورت

عالمِ کائنات کا سب سے مقدّم فرض اور سب سے زیادہ مقدّس خدمت یہ ہے کہ نفوسِ انسانی کے اخلاق و تربیت کی اصلاح و تکمیل کی جائے۔ یعنی پہلے ہر قسم کے فضائلِ اخلاق، زُہد و تقویٰ، عصمت و عفاف، احسان و کرم، حلم و عفو، عزم و ثبات، ایثار و لُطف، غیرت و استغنا کے اصول و فروع نہایت صحیح طریقہ سے قائم کیے جائیں۔ اور پھر تمام عالم میں اُن کی عملی تعلیم رائج کی جائے۔

اس مقصد کے حصول کا عام طریقہ وعظ و پند ہے۔ اس سے زیادہ متمدّن طریقہ یہ ہے کہ فنِّ اخلاق میں اعلیٰ درجہ کی کتابیں لکھی جاکر تمام مُلک میں پھیلائی جائیں۔ اور لوگوں کو اُن کی تعلیم دلائی جائے۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ لوگوں سے بہ جبر محاسنِ اخلاق کی تعمیل کرائی جائے اور رذائل سے روکے جائیں۔

یہی طریقے ہیں جو ابتدا سے آج تک تمام دُنیا میں جاری ہیں، اور آج اس انتہائی ترقی یافتہ دَور میں بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جا سکتا لیکن سب سے زیادہ صحیح، سب سے زیادہ کامل، سب سے زیادہ عملی طریقہ یہ ہے کہ نہ زبان سے کچھ کہا جائے، نہ تحریری نقوش پیش کیے جائیں، نہ جبر و زور سے کام لیا جائے، بلکہ فضائلِ اخلاق کا ایک پیکرِ مجسّم سامنے آجائے جو خود ہمہ تن آئینہ عمل ہو جس کی

ہر جنبشِ لب ہزاروں تصنیفات کا کام دے، اور جس کا ایک ایک اشارہ اوامرِ سلطانی بن جائے۔ دُنیا میں آج اخلاق کا جو سرمایہ ہے، سب انہی نفوسِ قدسیہ کا پرتو ہے، دیگر اوراسباب صرف ایوانِ تمدّن کے نقش و نگار ہیں۔

لیکن اس وقت تک دُنیا کی جس قدر تاریخ معلوم ہے، اس نے اس قسم کے نفوس قدسیہ جو پیش کیے ہیں، وہ فضائلِ اخلاق کی کسی خاص صنف کے نمونے تھے۔ مثلاً جناب مسیح علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے مکتب درس میں صرف حلم وتحمل، صلح وعفو، قناعت وتواضع کی تعلیم ہوتی تھی، حکومت و فرمانروائی کے لیے جو فضائلِ اخلاق درکار ہیں مسیحی تعلیم کی بیاض میں ان سطروں کی جگہ سادی ہے حضرت موسیٰ اور نوح علیہما السّلام کے اَوراقِ عام میں عفوِ عام کے صفحے خالی ہیں۔ اس بنا پر ہر قدم پر نئے نئے رہنما کی ضرورت پیش آئی اور اس لیے[1] عالمِ انسانی اپنی تکمیل کے لیے ہمیشہ ایسے جامع کامل کا محتاج رہا جو صاحب شمشیر و

---

(1) یہاں پر کتاب کی اس عبارتِ بالا کے مخاطب اہلِ کتاب ہیں جن کے موجودہ صحیفوں میں ان انبیا کے جو احوال مذکور ہیں وہ اسی صورت میں ہیں، اس لیے مصنّف نے ان کے بیان کردہ تمام احوال کو مان کر ایک باکمال اور ہمہ کمال ہستی کی ضرورت پر ان کے سامنے حجّت قائم کی ہے۔

لیکن چونکہ از روئے اسلام ایک طرف تمام انبیاء علیہم السّلام کی صداقت پر یکساں ایمان لانا اور ان کو تمام پیغمبرانہ کمالات سے متصف جاننا ضروری ہے جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (بقرہ: ۴۰) ہم اس کے رسولوں میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے، اس لیے یہ ضروری ہے کہ تمام انبیا علیہم السّلام کو یکساں صادق اور کمالاتِ نبوت سے متصف مانا جائے، دوسری طرف ارشاد ہے:

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى یہ حضرات مرسلین ایسے ہیں کہ ہم نے ان میں سے بعضوں

نگین بھی ہو اور گوشہ نشین بھی، بادشاہِ کشور کشا بھی ہو اور گدا بھی، فرمانروائے جہان بھی ہو اور سبحہ گرداں بھی، مفلسِ قانع بھی ہو اور غنیِ دریادل بھی، یہ بزرخِ کامل، یہ ہستی جامع، یہ صحیفۂ یزدانی، عالمِ کون کی آخری معراج ہے۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴)

بَعْضٍ مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى بْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ط (بقرہ - ۳۳)

کو بعضوں پر فوقیت بخشی ہے (مثلاً) بعضے ان میں وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہوئے ہیں (یعنی موسیٰ علیہ السلام) اور بعضوں کو ان میں سے بہت سے درجوں پر سرفراز کیا۔ ہم نے عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو کھلے کھلے دلائل عطا فرمائے اور ہم نے ان کی تائید روح القدس (یعنی جبرئیل) سے فرمائی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیا علیہم السلام کے مراتب کمالیہ میں جزئی تفاوت بھی ہے ان دونوں صداقتوں کے درمیان تطبیق کے لیے تھوڑی تشریح کی ضرورت ہے۔

حضرات انبیائے کرام علیہم السلام تمام کمالات نبوت و فضائل اخلاق سے یکساں سرفراز تھے۔ مگر زمانہ اور ماحول کی ضروریات اور مصالح الٰہی کی بنا پر ان تمام کمالات کا عملی ظہور، تمام انبیاءؑ میں یکساں نہیں ہوا، بلکہ بعض کے بعض کمالات اور دوسروں کے دوسرے کمالات زیادہ نمایاں ہوئے۔ یعنی جس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے جس کمال کے اظہار کی ضرورت ہوئی وہ پوری شدت سے ظاہر ہوا اور دوسرے کمال کا جس کی اُس وقت ضرورت پیش نہیں آئی بہ مصلحت بہ کمال ظہور نہیں ہوا۔

حاصل یہ ہے کہ ہر کمال کے ظہور کے لیے مناسب موقع و محل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر کسی عارض کی وجہ سے کسی کمال کا ظہور نہ ہو تو اس سے نفس کمال کے وجود کی نفی نہیں ہوتی

عالمِ فانی کی کوئی چیز ابدی نہیں، اس لیے یہ ہستی جامع، دُنیا میں اگر ہمیشہ نہیں رہ سکتی۔ اس لیے ضرور ہے کہ اُس کی زبان کا ایک ایک حرف، اُس کی حرکات وسکنات کی ایک ایک ادا، اس کے حلیۂ وجود کے ایک ایک خط وخال کا عکس لے لیا جائے کہ مراحلِ زندگی میں جہاں ضرورت پیش آئے رہنمائی کے کام آئے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴) ہے۔ اس لیے اگر بوجہ عدمِ ضرورتِ حال ان انبیائے کرامؑ کے بعض کمالات کا عملی ظہور کسی وقت بھی نہیں ہُوا، تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ یہ حضرات (نعوذ باللہ) ان کمالات و فضائل سے مُتصف نہ تھے۔

غزوۂ بدر کے قیدیوں کے باب میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جب فدیہ لے کر اُن کے چھوڑ دینے کا اور حضرت عمرؓ نے ان کے قتل کا مشورہ دیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ نے شدت ورحمت میں لوگوں کے قلوب مختلف بنائے ہیں۔ اے ابوبکرؓ تمھاری مثال ابراہیمؑ وعیسٰیؑ کی، اور اے عمر تمھاری مثال نوحؑ اور موسیٰؑ کی ہے یعنی ایک فریق سے رحم وکرم کا اور دوسرے سے شدت کا اظہار ہُوا۔ (دیکھیے مستدرک حاکم غزوۂ بدر)۔

اس حدیث میں اسی نقطۂ اختلاف کی طرف اشارہ ہے، جو انبیاء علیہم السلام کے مختلف احوالِ مبارکہ میں رُونما رہا ہے۔ لیکن حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت چونکہ آخری اور عمومی تھی اس لیے بضرورت احوال آپؐ کے تمام کمالاتِ نبوت آپؐ کی زندگی میں عملاً پوری طرح جلوہ گر ہوئے، اور آپؐ کی نبوت کے آفتاب عالم تاب کی ہر کرن دُنیا کے لیے مشعلِ ہدایت بنی اور ظلمت کدۂ عالم کا ہر گوشہ آپؐ کے ہر قسم کے کمالات کے ظہور سے پُرنور ہُوا، (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ اس موقع پر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ان جزئی کمالات کے اظہار میں ایسا پہلو نعوذ باللہ پیدا نہ ہونے پائے، جس سے دوسرے انبیاء علیہم السلام کی توہین یا

لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس طرح دیگر داعیانِ مذاہب جامعیتِ کبریٰ کے وصف سے خالی تھے، ان کے کارنامۂ زندگی کی تصویریں بھی ناتمام لی گئیں۔ جنابِ مسیحؑ کی ۳۳ سالہ زندگی میں سے صرف ۳ برس کے حالات معلوم ہیں۔ فارس کے مصلحانِ دین صرف شاہنامہ کے ذریعے سے رُوشناس ہیں۔ ہندوستان کے پیغمبر، افسانوں کے حجاب میں گُم ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نسبت آج جو کچھ معلوم ہے اس کا ذریعہ صرف موجودہ توراۃ ہے، جو حضرت موسیٰؑ کے ۸۰۰ برس بعد عالمِ وجود میں آئی۔ یہ قدرت کی طرف سے اشارہ تھا کہ ان کے کارنامے، اور اصولِ تعلیم ابدی نہ تھے، اس لیے نقل و روایت کے آئینے میں جس قدر ان کا ناتمام عکس اُترا اس سے زیادہ ضروری بھی نہ تھا۔ قدرت خود ضرورت کی اندازہ داں ہے، اور جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ خود مہیّا کر دیتی ہے۔

تمام اربابِ مذاہب میں سے ہر ایک کو اپنا مذہب اسی قدر عزیز ہے، جس قدر دوسرے کو ہے۔ اس لیے اگر بے پردہ یہ سوال کیا جائے کہ دُنیا میں کون ہستی تھی جس میں جامعیتِ کبریٰ کا وصف نمایاں تھا؟ تو ہر طرف سے مختلف صدائیں آئیں گی۔ لیکن اگر یہی سوال اس پیرایہ میں بدل دیا جائے، کہ دُنیا میں وہ کون شخص گزرا ہے جس کا کارنامۂ زندگی اس طرح قلمبند ہُوا کہ ایک طرف تو صحت کا یہ انتظام تھا کہ کسی صحیفۂ آسمانی کے لیے بھی نہ ہو سکا، اور دوسری طرف وسعت اور تفصیل کے لحاظ سے یہ حالت ہے کہ اقوال و افعال، وضع و قطع، شکل و شباہت، رفتار و گفتار، مذاقِ طبیعت، اندازِ گفتگو، طرزِ زندگی،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴) کسرِ شان پیدا ہو کہ اس سے ایمان کے ضائع جانے کا خطرہ ہے۔

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے معارف" محرم و صفر ۱۳۵۶ھ میں مضمون "تحلیل کی بشریت") س ا

طریقِ معاشرت، کھانے پینے، چلنے پھرنے، اُٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، ہنسنے بولنے کی ایک ایک ادا محفوظ رہ گئی، تو اس سوال کے جواب میں صرف ایک صدا بلند ہو سکتی ہے، (محمّد عربی فدیتہ بابی و اُمّی)۔

یہ جو کچھ کہا گیا، مقصدِ تصنیف کا مذہبی پہلو تھا، اسی مسئلہ کو علمی حیثیت سے دیکھو، علوم و فنون کی صف میں سیرت (بیاگرفی) کا ایک خاص درجہ ہے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کے حالاتِ زندگی بھی حقیقت شناسی اور عبرت پذیری کے لیے دلیلِ راہ ہیں۔ چھوٹے سے چھوٹا انسان بھی کیسی عجیب خواہشیں رکھتا ہے، کیا کیا منصوبے باندھتا ہے، اپنے چھوٹے سے دائرۂ عمل میں کس طرح آگے بڑھتا ہے، کیونکر ترقی کے زینوں پر چڑھتا ہے، کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتا ہے، کیا کیا مزاحمتیں اٹھاتا ہے، تھک کر بیٹھ جاتا ہے، سستاتا ہے اور پھر آگے بڑھتا ہے۔ غرض سعی و عمل، جدّ و جُہد، ہمّت و عزت کی جو عجیب و غریب نیرنگیاں سکندرِ اعظم کے کارنامۂ زندگی میں موجود ہیں۔ بعینہٖ یہی منظر ایک غریب مزدور کے عرصۂ حیات میں بھی نظر آتا ہے۔

اس بنا پر اگر سیرت اور سوانح کا فن عبرت پذیری اور نتیجہ رسی کی غرض سے درکار ہے تو "شخص" کا سوال نظر انداز ہو جاتا ہے، صرف یہ دیکھنا رہ جاتا ہے کہ حالات اور واقعات جو ہاتھ آتے ہیں، وہ کس وسعت اور استقصا و تفصیل کے ساتھ ہاتھ آتے ہیں، تاکہ مراحلِ زندگی کی تمام راہیں اور ان کے پیچ و خم ایک ایک کر کے نظر کے سامنے آجائیں۔ لیکن، مگر خوش قسمتی سے فردِ کامل، اور استقصائے واقعات دونوں باتیں جمع ہو جائیں، تو اس سے بڑھ کر اس فن کی کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے۔

وجوہِ مذکورۂ بالا کی بنا پر کون شخص انکار کر سکتا ہے کہ صرف ہم مسلمانوں کو نہیں،

بلکہ تمام عالم کو اس وجودِ مقدس کی سوانحعمری کی ضرورت ہے جس کا نامِ مبارک "محمدؐ" (رسول اللہ) ہے، اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلَیْہِ وَسَلِّمْ صَلٰوۃً کَثِیْرًا کَثِیْرًا،

یہ ضرورت، صرف اسلامی یا مذہبی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ایک علمی ضرورت ہے، ایک اخلاقی ضرورت ہے، ایک تمدنی ضرورت ہے، ایک ادبی ضرورت ہے۔ اور مختصر یہ ہے کہ مجموعۂ ضروریاتِ دینی و دنیوی ہے +

میں اس بات سے ناواقف نہ تھا کہ اسلام کی حیثیت سے میرا فرضِ اوّلین یہی تھا کہ تمام تصنیفات سے پہلے میں سیرۃ نبویؐ کی خدمت انجام دیتا، لیکن یہ ایک ایسا اہم اور نازک فرض تھا کہ میں مدت تک اس کے ادا کرنے کی جراُت نہ کرسکا۔ تاہم میں دیکھ رہا تھا کہ اس فرض کے ادا کرنے کی ضرورتیں بڑھتی جاتی ہیں +

علمِ کلام کی حیثیت سے سیرۃ کی ضرورت

اگلے زمانہ میں سیرۃ کی ضرورت، صرف تاریخ اور واقعہ نگاری کی حیثیت سے تھی، علمِ کلام سے اس کو واسطہ نہ تھا، لیکن معترضینِ حال کہتے ہیں کہ اگر مذہب صرف خدا کے اعتراف کا نام ہے تو بحث یہیں تک رہ جاتی ہے۔ لیکن جب اقرارِ نبوّت بھی جزوِ مذہب ہے، تو یہ بحث پیش آتی ہے کہ جو شخص حاملِ وحی اور سفیرِ الٰہی تھا۔ اس کے حالات، اخلاق اور عادات کیا تھے؟

یورپ کے مؤرخین، آنحضرت (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ) کی جو اخلاقی تصویر کھینچتے ہیں، وہ (نعوذ باللہ) ہر قسم کے معائب کا مرقع ہوتی ہے، آجکل مسلمانوں کو جدید ضرورتوں نے عربی علوم سے بالکل محروم کردیا ہے، اس لیے اس گروہ کو اگر کبھی پیغمبرِ اسلامؐ کے حالات اور سوانح کے دریافت کرنے کا شوق ہوتا ہے تو انہی یورپ کی تصنیفات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے، اس طرح یہ زہرآلود

معلومات آہستہ آہستہ اثر کرتی جاتی ہیں، اور لوگوں کو خبر تک نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ ملک میں ایک ایسا گروہ پیدا ہوگیا ہے جو پیغمبر صلعم کو محض ایک مصلح سمجھتا ہے جس نے اگر مجمع انسانی میں کوئی اصلاح کر دی تو اس کا فرض ادا ہوگیا۔ اس بات سے اُس کے منصبِ نبوت میں فرق نہیں آتا کہ اُس کے دامنِ اخلاق پر معصیت کے دھبے بھی ہیں۔

یہ واقعات تھے جنھوں نے مجھ کو بالآخر مجبور کیا اور میں نے سیرۃ نبوی صلعم پر ایک مبسوط کتاب لکھنے کا ارادہ کر لیا۔ یہ کام بظاہر نہایت آسان تھا، عربی میں سینکڑوں کتابیں موجود ہیں، ان کو سامنے رکھ کر ایک ضخیم اور دلچسپ کتاب لکھ دینا زیادہ سے زیادہ چند مہینوں کا کام تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ کوئی تصنیف اس تصنیف سے زیادہ دیر طلب اور جامع مشکلات نہیں ہوسکتی۔

آگے چل کر ہم تفصیل سے بیان کریں گے کہ خاص سیرت[1] پر آج تک کوئی ایسی

---

[1] اس موقع پر ایک نہایت ضروری بحث طے کر دینے کے قابل ہے، جو آجکل قلتِ علم اور ناآشنائی فن نے پیدا کر دی ہے۔ بہت سے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ سیرت فنِ حدیث ہی کی ایک خاص قسم کا نام ہے۔ یعنی احادیث میں سے وہ واقعات الگ لکھ دیے گئے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات سے متعلق ہیں، تو یہ سیرت بن گئی۔ اور چونکہ حدیث میں متعدد کتابیں ایسی موجود ہیں جن میں ایک حدیث بھی ضعیف نہیں مثلاً "صحیح بخاری" "مسلم"، تو یہ کہنا کیونکر صحیح ہوسکتا ہے کہ "سیرت میں کوئی کتاب آج تک صحت کے التزام کے ساتھ نہیں لکھی گئی"۔ اس بحث کے ذہن نشین کرنے کے لیے امورِ ذیل پیشِ نظر رکھنے چاہییں:

(۱) پہلی بحث یہ ہے کہ سیرت کا اطلاق کس چیز پر ہوتا ہے۔ محدثین اور اربابِ رجال

کتاب نہیں لکھی گئی، جس میں صحیح روایتوں کا التزام کیا جاتا۔ حافظ زین الدین عراقی جو حافظ ابن حجر کے استاد تھے، سیرۃ نبوی میں لکھتے ہیں:

ولیعلم الطالب اَنّ السِّیَرَا تجمعُ مَا صَحَّ وَمَا قد اُنکِرا

یعنی طالبِ فن کو جاننا چاہیے کہ سیرۃ میں ہر قسم کی روایتیں نقل کی جاتی ہیں، صحیح بھی اور قابلِ انکار بھی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰) کی اصطلاح قدیم یہ ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خاص غزوات کو مغازی اور سیرت کہتے تھے۔ چنانچہ ابن اسحاق کی کتاب کو مغازی بھی کہتے ہیں اور سیرت بھی۔ حافظ ابن حجر فتح الباری کتاب المغازی میں یہ دونوں نام ایک ہی کتاب کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ فقہ کی بھی یہی اصطلاح ہے۔ فقہ میں جو باب کتاب الجہاد والسیر باندھتے ہیں، اس میں سیرت کے لفظ سے غزوات اور جہاد کے احکام مراد ہوتے ہیں۔

کئی صدی تک یہی طریقہ رہا۔ چنانچہ تیسری صدی تک جو کتابیں سیرت کے نام سے مشہور ہیں، مثلاً سیرت ابن ہشام، سیرت ابن عائذ، سیرت اموی وغیرہ، ان میں زیادہ تر غزوات ہی کے حالات ہیں۔ البتہ زمانۂ مابعد میں، مغازی کے سوا، اور اور چیزیں بھی داخل کر لی گئیں۔ مثلاً مواہب لدنیہ میں غزوات کے علاوہ سب کچھ ہے۔

اس بنا پر محدثین کی اصطلاح میں مغازی اور سیرت عام فنِ حدیث سے ایک الگ چیز ہے۔ یہاں تک کہ بعض موقعوں پر اربابِ سیر اور محدثین، دو مقابل کے گروہ سمجھے جاتے ہیں۔ بعض واقعات کے متعلق یہ صورت پیدا ہوتی ہے کہ تمام اربابِ سیر ایک طرف ہوتے ہیں اور امام بخاری و مسلم ایک طرف۔ ایسے موقع پر بعض لوگ امام بخاری کی روایت کو اس بنا پر تسلیم نہیں کرتے کہ تمام اربابِ سیر کے خلاف ہے۔ لیکن محققین کہتے ہیں کہ حدیث صحیح تمام اربابِ سیر کی متفقہ روایت کے مقابلے میں بھی قابلِ ترجیح ہے، ہم اس موقع پر ایک دو واقعے مثال کے طور پر لکھتے ہیں:

غزوات میں ایک غزوہ ذوقرد کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی نسبت اربابِ سیر متفق

یہی سبب ہے کہ مستند اور مسلم الثبوت تصنیفات میں بھی بہت سی ضعیف روایتیں شامل ہو گئیں۔ اس بنا پر ضرور تھا کہ نہایت کثرت سے حدیث و رجال کی کتابیں بہم پہنچائی جائیں اور پھر نہایت تحقیق اور تنقید سے ایک مستند تصنیف تیار کی جائے، لیکن سینکڑوں کتابوں کا استقصا کے ساتھ دیکھنا اور اُن سے معلومات کا اقتباس کرنا، ایک شخص کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱) ہیں کہ صلح حدیبیہ سے قبل واقع ہوا تھا، لیکن صحیح مسلم میں سلمہ بن الاکوع سے جو روایت ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد اور خیبر سے تین دن قبل کا واقعہ ہے، اس حدیث کی شرح میں علامہ قرطبی نے لکھا ہے:

لا یختلف اہل السیر ان غزوۃ ذی قرد کانت قبل الحدیبیۃ فیکون ما وقع فی حدیث سلمۃ من وھم بعض الرواۃ،	اہلِ سیر میں سے کسی کو اس امر میں اختلاف نہیں ہے کہ غزوۂ ذی قرد، حدیبیہ سے پہلے واقع ہوا تھا تو سلمہ کی حدیث جو مذکور ہے، وہ کسی راوی کا وہم ہوگا۔

حافظ ابن حجر فتح الباری (ذکر غزوہ ذی قرد) میں قرطبی کے اس قول پر بحث کر کے لکھتے ہیں:

فعلی ھذا ما فی الصحیح من التاریخ لغزوۃ ذی قرد اصح مما ذکرہ اھل السیر	تو اس بنا پر صحیح (مسلم) میں غزوہ ذی قرد کی تاریخ مذکور ہے وہ اس سے زیادہ صحیح ہے جو مصنفین سیرت نے بیان کی ہے۔

دمیاطی ایک مشہور محدث ہیں، انھوں نے سیرت میں ایک کتاب لکھی ہے جو آج بھی موجود ہے، اس میں انھوں نے اکثر موقعوں پر ارباب سیر کی روایت کو ترجیح دی تھی لیکن جب زیادہ تتبع کیا تو ان کو معلوم ہوا کہ احادیث صحیحہ کو سیرت کی روایتوں پر ترجیح ہے۔ چنانچہ اپنی کتاب میں ترمیم کرنی چاہی لیکن اس کے نسخے کثرت سے شائع ہو گئے تھے اس لیے نہ کر سکے۔

کام نہ تھا۔ اس کے ساتھ ضرورت یہ بھی تھی کہ یورپ میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے واقفیت حاصل کی جائے۔ مَیں بدقسمتی سے یورپ کی کوئی زبان نہیں جانتا، اس لیے ایک محکمۂ تصنیف کی ضرورت تھی، جس میں قابل عربی دان اور مغربی زبانوں کے جاننے والے شامل ہوں۔ خدا نے یہ سامان پیدا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲) حافظ ابن حجر خود دُمیاطی کا قول نقل کر کے لکھتے ہیں:

ودل ھذا علیٰ انہ کان یعتقد الرجوع عن کثیر مما وافق فیہ اھل السیر وخالف الاحادیث الصحیحۃ وان ذالک کان بہ قبل تضلعہ منھا ولخروج نسخ کتابہ وانتشارہ لم یتمکن من تغییرہ	اور اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ (یعنی دمیاطی) قصد کر چکے تھے کہ جن موقعوں پر انھوں نے اربابِ سیر سے اتفاق کر کے احادیث صحیحہ کی مخالفت کی ہے، ان سے رجوع کریں گے۔ اور یہ کہ یہ امر اُن سے مہارتِ فن کے قبل صادر ہوا لیکن کتاب کے نسخے شائع ہو چکے تھے اس لیے وہ اپنی کتاب کی اصلاح نہ کر سکے۔

(زرقانی بر مواہب جلد ۳ صفحہ ۱۱)

(۲) ایک غزوہ ذات الرقاع کے نام سے مشہور ہے، اس کی نسبت اکثر اربابِ سیر کا اتفاق ہے کہ جنگِ خیبر کے قبل واقع ہوا تھا، لیکن امام بخاری نے تصریح کی ہے کہ خیبر کے بعد واقع ہوا۔ اس پر علامہ دُمیاطی نے بخاری کی روایت سے اختلاف کیا، حافظ ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں:

واما شیخہ الدمیاطی فادعی غلط الحدیث الصحیح وان جمیع اھل السیر علیٰ خلافہ (فتح الباری جزء ہفتم صفحہ ۳۲۲)	باقی اُن کے شیخ دمیاطی تو انھوں نے حدیث صحیح کی نسبت غلطی کا دعویٰ کیا ہے اور یہ کہ تمام اہلِ سیر بالاتفاق اس کے خلاف ہیں۔

پیدا کر دیے تو اب مجھ کو کیا عذر ہو سکتا تھا؟ اب بھی اگر اس فرض کے ادا کرنے سے قاصر رہتا تو اس سے بڑھ کر کیا بدقسمتی ہو سکتی تھی۔

مسلمانوں کے اس فخر کا قیامت تک کوئی حریف نہیں ہو سکتا کہ انھوں نے اپنے پیغمبرؐ کے حالات اور واقعات کا ایک ایک حرف اس استقصا کے ساتھ محفوظ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳) حافظ ابن حجر نے اس قول کو نقل کر کے اس کا رد بھی کیا ہے۔

اس تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ سیرت ایک جداگانہ فن ہے، اور بعینہٖ حدیث نہیں ہے۔ اور اس بنا پر اس کی روایتوں میں اس درجہ کی شدتِ احتیاط ملحوظ نہیں رکھی جاتی جو فن صحاح ستہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ فقہ کا فن قرآن و حدیث ہی سے ماخوذ ہے لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ بعینہٖ قرآن یا حدیث ہے، یا ان دونوں کے ہم پلّہ ہے۔

(۳) مغازی اور سیرت میں جس قسم کی جزئی تفصیلیں مقصود ہوتی ہیں، وہ فن حدیث کے اصلی بلند معیار کے موافق نہیں مل سکتیں، اس لیے اربابِ سیر کو تنقید اور تحقیق کا معیار کم کرنا پڑتا ہے۔ اس بنا پر سیرت و مغازی کا رتبہ فن حدیث سے کم رہا۔

(۴) جس طرح امام بخاری و مسلم نے یہ التزام کیا کہ کوئی ضعیف حدیث بھی اپنی کتاب میں درج نہ کریں گے۔ اس طرح سیرۃ کی تصنیفات میں کسی نے یہ التزام نہیں کیا۔ آج بیسوں کتابیں قدما سے لے کر متاخرین تک کی موجود ہیں۔ مثلاً سیرت ابن اسحاق، سیرت ابن ہشام، سیرت ابن سید الناس، سیرت دمیاطی، حلبی، مواہب لدنیہ، کسی میں یہ التزام نہیں۔

تفصیل مذکورۂ بالا سے ظاہر ہوا ہوگا کہ ہماری اس عبارت کا کہ "سیرت میں آج تک کوئی کتاب صحت کے التزام کے ساتھ نہیں لکھی گئی" اس کا کیا مطلب ہے، اور کہاں تک صحیح ہے۔

رکھا کہ کسی شخص کے حالات آج تک اس جامعیت اور احتیاط کے ساتھ قلمبند نہیں ہو سکے، اور نہ آئندہ توقع کی جا سکتی ہے۔ اس سے زیادہ کیا عجیب بات ہو سکتی ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے افعال اور اقوال کی تحقیق کی غرض سے آپؐ کے دیکھنے والوں اور ملنے والوں میں سے تقریباً تیرہ ہزار شخصوں کے نام اور حالات قلمبند کیے گئے، اور اس زمانہ میں کیے گئے جب تصنیف و تالیف کا آغاز تھا۔ طبقاتِ ابن سعد، کتاب الصحابہ لابن السکن، کتاب بعبداللہ بن علی بن جارود، کتاب العقیلی فی الصحابہ، کتاب ابن ابی حاتم الرازی، کتاب الازرق، کتاب الدولابی، کتاب البغوی[1]، طبقاتِ ابن ماکولا، اسد الغابہ، استیعاب، اصابہ فی احوال الصحابہ، صرف انہی بزرگوں کے حالات میں ہیں۔ کیا دُنیا میں کسی شخص کے رفقا میں سے اتنے لوگوں کے نام اور حالات درجِ تحریر ہو سکے ہیں؟

سیرۃ نبویؐ کے متعلق قدما نے جو ذخیرہ مہیا کیا[2]، اس کی مختصر تاریخ اور کیفیت ہم اس غرض سے اس موقع پر درج کر دیتے ہیں کہ ایک کامل اور مُستند کتاب کے مرتب کرنے کے لیے اس ذخیرہ سے کیونکر کام لیا جا سکتا ہے، اور کہاں تک تحقیق و تنقید کی ضرورت ہے۔

فنِ سیرت کی ابتدا اور تحریری سرمایہ عام طور پر یہ خیال ہے کہ چونکہ عرب میں لکھنے پڑھنے

---

[1] ان کتابوں کا ذکر، استیعاب کے دیباچہ میں ہے۔

[2] یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ حدیث کی کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور اخلاق و عادات کے متعلق نہایت کثرت سے واقعات مذکور ہیں جو سیرت میں کافی مدد دے سکتے ہیں، تاہم تنہا ان سے ایک تاریخی تصنیف تیار نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ ان میں تاریخی ترتیب نہیں ہے یہاں ہم نے جن کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ حدیث کی کتابیں اُن کے علاوہ ہیں۔

کا رواج نہ تھا، اور اسلام میں تدوین و تالیف کا آغاز خلیفہ منصور عباسی کے زمانے سے (تقریباً ۱۴۳ھ میں) ہوا۔ اس لیے اُس زمانہ تک سیرت اور روایات کا جو کچھ ذخیرہ تھا، زبانی تھا، تحریری نہ تھا لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ عرب میں لکھنے پڑھنے کا رواج (گو، کم سہی) مدت سے چلا آتا ہے۔ بہت قدیم زمانہ میں حمیری اور نابتی خط تھا، جس کے کتبے آج نہایت کثرت سے یورپ کی بدولت مہیا ہو گئے ہیں۔ اسلام سے کچھ پہلے وہ خط ایجاد ہوا جو عربی خط کہلاتا ہے، اور جس نے بہت سی صورتیں بدل کر آج یہ صورت اختیار کر لی ہے۔

اس خط کی تاریخ اور اس کی ابتدا کے متعلق جو قدیم روایتیں کتابوں میں مذکور ہیں، اکثر افسانہ ہیں، مثلاً ابن الندیم نے کلبی سے نقل کیا ہے کہ اوّل اوّل جن لوگوں نے عربی خط ایجاد کیا، ان کے یہ نام تھے، ابوجاد، ہواز، حطی، کلمون، سعفص، قرشیات (یہی نام ہیں جن کو ہم آج ابجد، ہوز، حطی، کلمن، سعفص، قرشت کہتے ہیں)۔ اسی طرح کعب کا یہ قول کہ تمام خطوط حضرت آدمؑ نے ایجاد کیے تھے۔ ابن الندیم نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے جس نے عربی خط لکھا وہ تین شخص قبیلہ بولان (قبیلہ طے کی ایک شاخ) کے تھے، جو انبار میں آباد تھے، ان کے نام مرامر بن مرۃ، اسلم بن سدرۃ، عامر بن جدرۃ تھے۔

ان تمام روایتوں میں جو قرین قیاس ہے، وہ روایت ہے جو ابن الندیم نے عمر بن شبہ کی کتاب مکہ سے نقل کی ہے۔ یعنی سب سے پہلے عربی خط ایک شخص نے ایجاد کیا جو بنو مخلد بن نضر بن کنانہ کے خاندان سے تھا۔ اور غالباً یہ وہ زمانہ ہے جب قریش نے عروج حاصل کر لیا تھا اور تجارت کے ذریعے سے بیرونی ممالک میں آمد و رفت رکھتے تھے۔ ابن الندیم نے لکھا ہے کہ میں نے

مامون الرشید کے کتب خانہ میں ایک دستاویز دیکھی تھی جو عبدالمطلب ابن ہاشم (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جدِ امجد) کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی، اس کے یہ الفاظ تھے:

حقّ عبد المطلب بن هاشم من اهل مكّة على فلان ابن فلان الحميري من اهل وزل صنعا عليه الف درهم فضة كيلاً بالحديدة ومتى دعاه بها اجابه شهد الله والملكان۔[۱]

یہ عبدالمطلب بن ہاشم (جو مکہ کا باشندہ ہے) کا قرضہ فلاں شخص پر ہے، جو صنعا کا رہنے والا ہے۔ یہ چاندی کے ہزار درہم ہیں۔ جب طلب کیا جائے گا وہ ادا کرے گا۔ خدا اور دو فرشتے اس کے گواہ ہیں۔

اس دستاویز سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبدالمطلب نے کسی حمیری شخص کو ہزار درہم قرض دیے تھے۔ خاتمہ میں دو فرشتوں کی گواہی لکھی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں فرشتوں کا (اور شاید کراماً کاتبین کا) اعتقاد موجود تھا۔

ابن الندیم نے لکھا ہے کہ اس دستاویز کا خط ایسا تھا جیسا عورتوں کا خط ہوتا ہے۔

علامہ بلاذری نے تصریح کی ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جب بعثت ہوئی تو قریش میں ۱۷ شخص لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ یعنی حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابو عبیدہؓ، طلحہؓ، زیدؓ، ابو حذیفہؓ، ابو سفیانؓ، شفاؓ بنت عبداللہ[۲] وغیرہ۔

بدر کی لڑائی جو سنہ ۲ھ میں ہوئی، اس میں قریش کے جو لوگ گرفتار ہوئے،

---

۱ ابن ندیم ص ۸ طبع مصر اس ۲ فتوح البلدان ذکرِ خط صفحہ ۴۷۱ مطبوعہ یورپ۔

اُن سے فدیہ لیا گیا، لیکن بعض ایسے بھی تھے جو ناداری کی وجہ سے فدیہ نہیں ادا کر سکے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اُن کو حکم دیا کہ ہر شخص دس دس بچوں کو اپنے ذمہ لے کر اُن کو لکھنا سکھا دے۔ چنانچہ حضرت زید بن ثابت رضؓ نے جو کاتبِ وحی ہیں، اسی طرح لکھنا سیکھا تھا۔[۱]

ان واقعات سے معلوم ہوگا کہ عرب اور خصوصاً مکہ و مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے ہی میں لکھنے پڑھنے کا کافی رواج ہو چکا تھا، البتہ یہ تحقیق طلب ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں روایتیں اور حدیثیں بھی قلمبند ہوئی تھیں یا نہیں۔ اور اس بنا پر سیرت کا کوئی تحریری سرمایہ بھی موجود تھا یا نہیں، بعض حدیثوں میں جن میں سے بعض صحیح مسلم میں مذکور ہیں، تصریح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیثوں کے قلمبند کرنے سے منع فرمایا تھا۔ مسلم کے یہ الفاظ ہیں:

لا تکتبوا عنّی و مَن کتب عنّی غیرا لقراٰن فلیمحُہ۔	مجھ سے جو سنو، اس کو قلمبند نہ کرو (بجز قرآن کے) اور کسی نے قلمبند کیا ہو تو اس کو مٹا ڈالنا چاہیے۔

آنحضرتؐ کے زمانے کی تحریرات

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابتدائی زمانے کا ارشاد ہے۔ کیونکہ متعدد صحیح حدیثوں سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانے میں بعض صحابہ رضؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے آپؐ کے ارشادات قلمبند کر لیا کرتے تھے۔ صحیح بخاری (باب العلم) میں حضرت ابوہریرہ رضؓ کا قول ہے کہ "صحابہ رضؓ میں مجھ سے زیادہ کسی کو حدیثیں محفوظ نہیں۔ البتہ عبداللہ بن عمرو مستثنیٰ ہیں کیونکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے، اور میں لکھتا نہ تھا۔"

ایک اور روایت میں ہے کہ "حضرت عبداللہ بن عمرو رضؓ کی عادت تھی کہ آنحضرت

---

[۱] طبقات ابن سعد، غزوۂ بدر صفحہ ۱۴۔

صلی اللہ علیہ وسلم سے جو سنتے تھے، لکھ لیا کرتے تھے۔ قریش نے ان کو منع کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی غیظ کی حالت میں ہوتے ہیں اور کبھی خوشی میں، اور تم سب کچھ لکھتے جاتے ہو۔ عبداللہ ابن عمرو نے اس بنا پر لکھنا چھوڑ دیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ واقعہ بیان کیا۔ آپؐ نے دہانِ مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ "تم لکھ لیا کرو، اس سے جو کچھ نکلتا ہے حق نکلتا ہے"[1] خطیب بغدادی نے اپنے رسالہ تقیید العلم میں روایت کی ہے کہ اس بیاض کا نام جس میں عبداللہؓ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حدیثیں قلمبند کر لیا کرتے تھے، صادقہ[2] تھا۔

ایک دفعہ آپؐ نے حکم دیا کہ جو لوگ اس وقت تک اسلام لا چکے ہیں، ان کے نام قلمبند کیے جائیں۔ چنانچہ پندرہ سو ۱۵۰۰ صحابہؓ کے نام دفتر میں درج کیے گئے[3]۔

خطیب بغدادی نے تقیید العلم میں روایت کی ہے کہ "جب لوگ کثرت سے حضرت انسؓ کے پاس حدیثوں کے سننے کے لیے جمع ہو جاتے تھے، تو وہ ایک جنگ نکال لاتے تھے کہ یہ وہ حدیثیں ہیں جو میں نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سن کر لکھ لی تھیں"۔

متعدد قبائل کو آپؐ نے جو صدقات اور زکوٰۃ وغیرہ کے احکام بھیجے وہ تحریری تھے، اور کتبِ احادیث میں بعینہا منقول ہیں۔ اسی طرح سلاطین کو دعوتِ اسلام کے جو پیغام بھیجے گئے وہ بھی تحریری تھے۔

صحیح بخاری (باب کتابۃ العلم) میں ہے کہ فتح مکہ کے سال جب ایک خزاعی نے حرم میں ایک شخص کو قتل کر دیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ناقہ پر سوار ہو کر

---

[1] ابوداؤد جلد ۲ صفحہ،،۔ [2] جامع بیان العلم للقاضی ابن عبدالبر مطبوعہ مصر صفحہ،، میں صادقہ کا ذکر ہے۔ [3] صحیح بخاری باب الجہاد۔

خطبہ دیا۔ یمن کے ایک شخص نے آکر درخواست کی کہ یہ خطبہ مجھ کو تحریر کرا دیا جائے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اس شخص کے لیے وہ خطبہ قلمبند کرا دیا جائے۔

غرض اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک حسب ذیل تحریری سرمایہ مہیا ہو گیا تھا:

(۱) جو حدیثیں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص، یا حضرت علیؓ و حضرت انس رضؓ وغیرہ نے قلمبند کیں۔

(۲) تحریری احکام اور معاہدات (حدیبیہ وغیرہ) اور فرامین جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبائل کے نام بھیجے

(۳) خطوط جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سلاطین اور اُمرا کے نام ارسال فرمائے

(۴) پندرہ سو صحابہ رضؓ کے نام۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد اس تحریری ذخیرہ کو اس قدر ترقی ہوتی گئی کہ (بنو العباس سے پہلے) ولید بن یزید کے قتل کے بعد جب احادیث و روایات کا دفتر ولید کے کتب خانہ سے منتقل ہوا تو صرف امام زہری کی مرویات اور تالیفات گھوڑوں اور گدھوں پر لاد کر لائی گئیں۔

مغازی عرب میں علوم و فنون نہ تھے، صرف خاندانی معرکے اور لڑائیوں کے

۱۔ بخاری جلد (۱) صفحہ ۲۱ و ۲۲ صحیفہ علی و کتابۃ لرجل من الیمن۔ ۲۔ سنن ابن ماجہ صفحہ ۱۳۰ و ابو داؤد جلد ۱ صفحہ ۱۵۵ و ۱۵۶ ۳۔ بخاری جلد (۱) صفحہ ۵ و ایضاً ص ۱۵۔

۴۔ بخاری جلد (۱) صفحہ ۱۵۔

۵۔ تذکرۃ الحفاظ علامہ ذہبی، تذکرہ امام زہری۔

واقعات محفوظ رکھتے تھے۔ اس لحاظ سے قیاس یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات اور افعال و اقوال میں سب سے پہلے مغازی کی روایتیں پھیلتیں اور سب سے پہلے اسی فن کی بنیاد پڑتی لیکن روایات کے تمام انواع میں **مغازی** کا درجہ سب سے متاخر رہا۔ خلفائے راشدینؓ اور اکابر صحابہؓ نے زیادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان اقوال و افعال پر توجہ کی، جن کو شریعت سے تعلق تھا، اور جن سے فقہی احکام مستنبط ہوتے تھے۔

امام بخاری نے غزوۂ احد کے ذکر میں سائب بن یزید سے یہ روایت نقل کی ہے:

صحبتُ عبدالرّحمٰن بن عوف وطلحۃ بن عبیداللہ والمقداد وسعداً فما سمعت احداً منھم یحدث عن النبی صَلّی اللّٰہ علیہ وسلم اِلّا اَنّی سمعتُ طلحۃ یحدّثُ عن یوم اُحد۔

میں عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور طلحہ بن عبیداللہ اور مقدادؓ اور سعدؓ کی صحبت میں رہا لیکن میں نے اُن کو کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حدیث بیان کرتے نہیں سُنا، بجز اس کے کہ طلحہؓ غزوۂ اُحد کا واقعہ بیان کرتے تھے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور طلحہؓ و مقدادؓ و سعدؓ وقاص، اکابر صحابہؓ میں ہیں اور ان سے بہت سی حدیثیں مروی ہیں۔ اس لیے اس عبارت کے یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ یہ لوگ **غزوات** کے واقعات نہیں بیان کرتے تھے، بجز اس کے کہ **طلحہؓ** جنگِ اُحد کے واقعات بیان کیا کرتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ علما میں جن لوگوں نے مغازی کو اپنا فن بنا لیا تھا وہ عوام میں جس قدر مقبول ہوتے تھے خواص میں اُس قدر مستند نہیں خیال کیے جاتے تھے۔ اس فن کے اساطین اور ارکان ابن اسحاق اور واقدی ہیں۔ واقدی کو تو محدثین

علانیہ کذّاب کہتے ہیں۔ ابنِ اسحاق کو ایک گروہ ثقہ کہتا ہے لیکن اُسی درجہ کا دوسرا گروہ ان کو بے اعتبار سمجھتا ہے تفصیل آگے آئے گی۔

امام احمد بن حنبل کا قول ہے:

ثلاثة كتب ليس لها اصول: المغازی والملاحم والتفسیر۔[۵]	تین قسم کی کتابیں ہیں، جن کی کوئی اصل نہیں؛ مغازی اور ملاحم اور تفسیر۔

خطیب بغدادی نے اس قول کو نقل کر کے لکھا ہے کہ امام ابنِ حنبل کی مُراد اُن خاص کتابوں سے ہو گی جو بے اصل ہیں، پھر لکھا ہے:

اماکتب التفسیر فمن اشهرها کتابا الکلبی ومقاتل بن سلیمان وقد قال احمد فی تفسیر الکلبی من اوله الیٰ اخره کذب۔	باقی تفسیر کی کتابیں، تو ان میں سے کلبی اور مقاتل کی کتابیں بہت مشہور ہیں۔ امام احمد بن حنبل نے کہا ہے کہ کلبی کی تفسیر اوّل سے اخیر تک جھوٹ ہے۔

پھر لکھتے ہیں:

واما المغازی فمن اشهرها کتاب محمد بن اسحاق وکان یاخذ من اهل الکتاب وقد قال الشافعی کتب الواقدی کذب۔	باقی مغازی تو اس فن کی مشہور کتاب محمد بن اسحاق کی کتاب ہے، اور وہ عیسائیوں اور یہودیوں سے روایت کرتے تھے اور امام شافعی نے کہا ہے کہ واقدی کی کتابیں جھوٹ ہیں۔

باوجود ان باتوں کے یہ ناممکن تھا کہ یہ حصّہ نظر انداز کر دیا جاتا۔ اس لیے اکابر صحابہؓ اور محدّثین نہایت احتیاط کے ساتھ جو واقعات جہاں تک خوب محفوظ ہوتے تھے روایت کرتے تھے۔

---

[۵] موضوعات ملاعلی قاری، مطبع مجتبائی، صفحہ ۸۵۔

تصنیف و تالیف کی ابتدا سلطنت کی وجہ سے ہوئی صحابہؓ اور خلفاے راشدینؓ کے زمانے میں اگرچہ فقہ و حدیث کی نہایت کثرت سے اشاعت ہوئی۔ بہت سے درس کے حلقے قائم ہوے، لیکن جو کچھ تھا زیادہ تر زبانی تھا۔ لیکن بنوامیہ نے حکماً علما سے تصنیفیں لکھوائیں۔ قاضی ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں **امام زہری** کا قول نقل کیا ہے:

کنا نکرہ کتاب العلم حتی اکرھنا علیہ ھولاء الامراء۔[۱] — ہم لوگ علم کا قلمبند کرنا پسند نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ اُمرا نے ہم کو مجبور کیا۔

سب سے پہلے امیر معاویہؓ نے عبید بن شریہ کو یمن سے بلاکر قدما کی تاریخ مرتب کرائی۔ جس کا نام اخبار الماضیین ہے۔[۲]

امیر معاویہؓ کے بعد عبدالملک بن مروان نے جو ۶۵ھ میں تخت نشین ہوا۔ ہر فن میں علما سے تصنیفیں لکھوائیں۔ سعید بن جبیر جو اعلم العلماء تھے، ان کو حکم بھیجا کہ قرآن مجید کی تفسیر لکھیں۔ چنانچہ امام موصوف نے تفسیر لکھ کر بھیجی جو کتب خانۂ شاہی میں رکھی گئی۔ عطاء بن دینار کے نام سے جو تفسیر مشہور ہے اُن ہی کی تفسیر ہے۔ عطاء کو خزانہ شاہی سے یہ نسخہ ہاتھ آگیا تھا۔[۳]

حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کا زمانہ آیا تو اُنھوں نے تصنیف و تالیف کو زیادہ ترقی دی، تمام ممالک میں حکم بھیج دیا کہ **احادیث نبویؐ** مدوّن کی جائیں۔ سعد بن ابراہیم جو بہت بڑے محدّث اور مدینہ منورہ کے قاضی تھے۔ اُن سے دفتر کے دفتر حدیثوں کے قلمبند کرائے، اور تمام ممالک مقبوضہ میں بھیجے۔ علامہ ابن عبدالبر

---

[۱] مطبوعہ مصر، صفحہ ۱۳۶ [۲] فہرست ابن الندیم صفحہ ۲۴۴۔

[۳] میزان الاعتدال، ترجمہ عطاء بن دینار۔

جامع بیان العلم میں لکھتے ہیں:

عن سعد بن ابراھیم قال امرنا عمر بن عبد العزیز بجمع السنن فکتبنا ھا دفتراً دفتراً فبعث الی کل ارض لہ علیھا سلطان دفتراً۔[1]

سعد بن ابراہیم کہتے ہیں کہ عمرؒ بن عبد العزیز نے ہم کو احادیث کے جمع کرنے کا حکم دیا۔ ہم نے دفتر کے دفتر لکھے۔ عمرؒ نے جہاں جہاں اُن کی حکومت تھی، ایک دفتر بھیج دیا۔

ابو بکر بن محمد بن عمرو بن حزم انصاری جو اس زمانہ کے بہت بڑے محدث، اور امام زہری کے اُستاد اور مدینہ کے قاضی تھے، ان کو بھی خاص طور پر احادیث کے جمع کرنے کا حکم بھیجا۔[2]

حضرت عائشہؓ کی روایتیں حدیث میں حضرت عائشہؓ کی مرویات کی ایک خاص حیثیت ہے یعنی اُن سے اکثر وہ حدیثیں مروی ہیں جو عقائد یا فقہ کے مہمات مسائل ہیں۔ اس لیے عمرؒ بن عبد العزیز نے ان کی روایتوں کے ساتھ زیادہ اعتنا کیا۔ عمرۃ بنت عبد الرحمٰن ایک خاتون تھیں، ان کو حضرت عائشہؓ نے خاص اپنے آغوشِ تربیت میں پالا تھا، وہ بہت بڑی محدثہ اور عالمہ تھیں۔ تمام علما کا اتفاق ہے کہ حضرت عائشہؓ کی مرویات کا اُن سے بڑھ کر کوئی عالم نہ تھا۔ عمرؒ بن عبد العزیز نے ابو بکر بن محمد کو خط لکھا کہ عمرۃ کے مسائل اور روایات قلمبند کر کے بھیج دیں۔[3]

مغازی پر خاص توجہ اب تک مغازی وسیر کے ساتھ اعتنا نہیں کیا گیا تھا۔ حضرت عمرؒ بن عبد العزیز نے اس فن کی طرف خاص توجہ کی، اور حکم دیا کہ غزواتِ نبویؐ

---

[1] مطبوعہ مصر صفحہ ۳۷ [2] طبقات ابن سعد جزء ثانی قسم ثانی صفحہ ۱۳۴ [3] تہذیب التہذیب ترجمہ ابو بکر بن محمد، و عمرۃ بنت عبد الرحمٰن و طبقات ابن سعد جزء دوم صفحہ ۱۳۴۔

کا خاص حلقۂ درس قائم کیا جائے۔ عاصم بن عمر بن قتادہ انصاری المتوفی سنہ ۱۲۱ھ اس فن میں خاص کمال رکھتے تھے۔ ان کو حکم دیا کہ جامع مسجد دمشق میں بیٹھ کر لوگوں کو مغازی اور مناقب کا درس دیں[1]۔

اسی زمانہ میں **امام زہری** نے **مغازی** پر ایک مستقل کتاب لکھی، اور جیسا کہ امام سہیلی نے روض الانف میں تصریح کی ہے۔ یہ اس فن کی پہلی تصنیف تھی۔ امام زہری اس زمانہ کے اعلم العلماء تھے۔ فقہ اور حدیث میں اُن کا کوئی ہمسر نہ تھا۔ امام بخاری کے شیخ الشیوخ ہیں۔ انھوں نے حدیث و روایت کے حاصل کرنے میں یہ محنتیں اٹھائیں کہ مدینہ منورہ میں ایک ایک انصاری کے گھر پر جاتے۔ جوان، بڈھے، عورت، مرد، جو مل جاتا، یہاں تک کہ پردہ نشین عورتوں سے جا کر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اقوال اور حالات پوچھتے اور قلمبند کرتے[2]۔ وہ نسباً قریشی تھے۔ سنہ ۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیکھا تھا۔ سنہ ۸۰ھ میں عبدالملک بن مروان کے دربار میں گئے۔ اُس نے بہت قدر و منزلت کی۔ کتاب المغازی غالباً حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن عبدالعزیز کی ہدایت کے موافق لکھی، یہ بات خاص طور پر لحاظ کے قابل ہے کہ امام موصوف سلاطین کے دربار سے تعلق رکھتے تھے اور مقربین خاص میں داخل تھے۔ ہشام بن عبدالملک نے اپنے بچوں کی تعلیم اُن کے سپرد کی تھی۔ ۱۲۴ھ میں وفات پائی۔

امام زہری کے تلامذہ امام زہری کی وجہ سے مغازی و سیرت کا عام مذاق پیدا ہو گیا۔ ان کے حلقۂ درس سے اکثر ایسے لوگ نکلے جو خاص اس فن میں کمال رکھتے تھے۔ ان میں سے یعقوب بن ابراہیم، محمد ابن صالح تمار، عبدالرحمٰن بن عبدالعزیز،

---

[1] تہذیب التہذیب ترجمہ عاصم بن عمر بن قتادہ [2] تہذیب التہذیب ترجمہ امام زہری (محمد بن مسلم)۔

فن مغازی میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ چنانچہ تہذیب التہذیب وغیرہ میں ان لوگوں کا امتیازی وصف "صاحب المغازی" لکھا جاتا ہے۔

زہری کے تلامذہ میں سے دو شخصوں نے اس فن میں نہایت شہرت حاصل کی، اور یہی دو شخص ہیں جن پر اس فن کا سلسلہ ختم ہوتا ہے۔ **موسیٰ بن عقبہ** اور **محمد بن اسحاق**۔

موسیٰ بن عقبہ موسیٰ بن عقبہ خاندانِ زبیر کے غلام تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو دیکھا تھا۔ فنِ حدیث میں امام مالک ان کے شاگرد ہیں۔ امام مالک اُن کے نہایت مدّاح تھے، اور لوگوں کو ترغیب دیتے تھے کہ فنِ مغازی سیکھنا ہو تو موسیٰ سے سیکھو۔ ان کے مغازی کے جو خصوصیّات ہیں، یہ ہیں:

(۱) مصنّفین اب تک روایات میں صحت کا التزام نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے زیادہ تر اس کا التزام کیا۔

(۲) عام مصنّفین کا یہ مذاق تھا کہ کثرت سے واقعات نقل کیے جائیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ہر قسم کی رطب و یابس روایتیں آجاتی تھیں، موسیٰ نے احتیاط کی، اور صرف وہی روایتیں لیں جو اُن کے نزدیک صحیح ثابت ہوئیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی کتاب بہ نسبت اور کتبِ مغازی کے مختصر ہے۔

(۳) چونکہ روایتِ حدیث کے لیے کسی عمر کی قید نہ تھی، اس لیے اکثر لوگ بچپن اور آغازِ شباب ہی سے حلقۂ درس میں شامل ہو جاتے تھے اور حدیثیں سُن کر لوگوں سے روایت کرتے تھے لیکن چونکہ اس عمر تک واقعات کا صحیح طور سے سمجھنا اور محفوظ رکھنا ممکن نہ تھا، اس لیے اکثر روایتوں میں تغیّر اور اختلاط ہو جاتا تھا۔ **موسیٰ** نے بخلاف اور لوگوں کے کبر سن میں اس فن کو سیکھا تھا[۱] سنہ ۱۴۱ھ میں وفات پائی۔

۱؎ تہذیب التہذیب ترجمۂ موسیٰ بن عقبہ۔

موسیٰ کی کتاب آج موجود نہیں، لیکن ایک مُدّت تک شائع و ذائع رہی، اور سیرت کی تمام قدیم کتابوں میں کثرت سے اس کے حوالے آتے ہیں۔

محمد بن اسحاق محمد بن اسحاق نے فنّ مغازی میں سب سے زیادہ شہرت حاصل کی، وہ امامِ فنِ مغازی کے نام سے مشہور ہیں۔ شہرتِ عام میں اگرچہ واقدی اُن سے کم نہیں، لیکن واقدی کی دروغ بیانی مسلّمۂ عام ہے اور اس لیے ان کی شہرت، بدنامی کی شہرت ہے۔ محمد بن اسحاق تابعی ہیں۔ ایک صحابی (حضرت انس رضؓ) کو دیکھا تھا علم حدیث میں کمال تھا۔ امام زہری کے دروازے پر دربان مقرر تھا کہ کوئی شخص بغیر اطلاع کے نہ آئے لیکن محمد بن اسحاق کو عام اجازت تھی کہ جب چاہیں چلے آئیں۔ اُن کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے کی نسبت محدّثین میں اختلاف ہے۔ امام مالک اُن کے سخت مخالف ہیں۔ لیکن محدثین کا عام فیصلہ یہ ہے کہ مغازی اور سِیَر میں ان کی روایتیں استناد کے قابل ہیں۔ امام بخاری نے صحیح بخاری میں اُن کی روایت نہیں لی لیکن جزء القرأة میں اُن سے روایت کی ہے۔ تاریخ میں تو اکثر واقعات ان ہی سے لیتے ہیں۔

فنّ مغازی کو انھوں نے اس قدر ترقی دی، اور اس قدر دلچسپ بنا دیا کہ خلفائے عباسیہ جو زیادہ تر اور قسم کی تصنیفات کا مذاق رکھتے تھے، ان میں مغازی کا مذاق پیدا ہو گیا۔ چنانچہ ابن عدی نے اس احسان کا خاص طرح پر ذکر کیا ہے۔ ابن عدی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس فن میں کوئی تصنیف اُن کی تصنیف کے رُتبے کو نہیں پہنچی۔[1]

ابن حبان نے کتاب الثقات میں لکھا ہے کہ محدثین کو محمد بن اسحاق کی کتاب

---

[1] تہذیب التہذیب۔

پر اعتراض تھا تو یہ تھا کہ خیبر وغیرہ کے واقعات وہ اُن یہودیوں سے دریافت کرکے داخل کتاب کرتے تھے، جو مسلمان ہو گئے تھے۔ اور چونکہ یہ واقعات اُنھوں نے یہودیوں سے سُنے ہوں گے، اس لیے اُن پر پُورا اعتماد نہیں ہو سکتا۔ علامہ ذہبی کی تصریح سے ثابت ہوتا ہے کہ محمد بن اسحاق، یہود و نصاریٰ سے روایت کرتے تھے، اور ان کو ثقہ سمجھتے تھے۔ ۱۵۱ھ میں وفات پائی۔

محمد بن اسحاق کی کتاب المغازی کا ترجمہ شیخ سعدی کے زمانے میں ابوبکر سعد زنگی کے حکم سے فارسی میں ہوا۔ اس کا قلمی نسخہ الٰہ آباد میں ہماری نظر سے گزرا ہے۔

محمد بن اسحاق کی کتاب کثرت سے پھیلی، اور بڑے بڑے مشہور محدثوں نے اس کے نسخے مرتب کیے۔ اسی کتاب کو ابن ہشام نے زیادہ منقح اور اضافہ کرکے مرتب کیا، جو سیرتِ ابن ہشام کے نام سے مشہور ہے۔ چونکہ اصل کتاب آج کم ملتی ہے، اس لیے آج اس کی جو یادگار موجود ہے، وہ یہی ابن ہشام کی کتاب ہے۔

ابن ہشام ابن ہشام کا نام عبد الملک ہے، وہ نہایت ثقہ اور نامور محدث اور مورخ تھے۔ حمیر کے قبیلے سے تھے، اور غالباً اسی تعلق سے سلاطینِ حمیر کی تاریخ لکھی جو آج بھی موجود ہے۔ انھوں نے سیرت میں اضافہ کیا کہ سیرت میں جو مشکل الفاظ آتے ہیں، اُن کی تفسیر بھی لکھی۔ ۲۱۳ یا ۲۱۸ھ میں وفات پائی۔

سیرت ابن اسحاق کی مقبولیت کی بناء پر لوگوں نے اس کو نظم کیا۔ چنانچہ ابو نصر فتح بن موسیٰ خضراوی المتوفی ۶۶۳ھ و عبد العزیز بن احمد المعروف بہ سعد دیری المتوفی فی حدود ۶۰۰ھ و ابو اسحاق انصاری تلمسانی و فتح الدین محمد بن ابراہیم معروف بہ ابن الشہید المتوفی ۷۹۳ھ نے منظوم کیا۔ اخیر کتاب میں قریباً دس ہزار شعر ہیں، اور اس کا نام فتح الغریب فی سیرۃ الحبیب ہے۔

ابن سعد واقدی خود تو قابلِ ذکر نہیں، لیکن اُن کے تلامذۂ خاص میں سے

ابن سعد نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اور صحابہ رضؓ کے حالات میں ایسی جامع اور مفصل کتاب لکھی کہ آج تک اس کا جواب نہ ہو سکا۔

ابن سعد مشہور محدث ہیں۔ محدثین نے عموماً لکھا ہے کہ گو ان کے استاد (واقدی) قابل اعتبار نہیں، لیکن وہ خود قابل سند ہیں۔ خطیب بغدادی نے ان کی نسبت یہ الفاظ لکھے ہیں:

کان من اھل العلم والفضل والفھم والعدالۃ صنف کتاباً کبیراً فی طبقات الصحابۃ والتابعین الی وقتہ فاجاد فیہ واحسن۔[۱]

یہ موالی بنی ہاشم سے تھے۔ بصرہ میں پیدا ہوئے، لیکن بغداد میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ بلاذری جو مشہور مورخ ہیں، انہی کے شاگرد ہیں۔ ۲۳۰ھ میں ۶۲ برس کی عمر میں وفات پائی۔

ان کی کتاب کا نام طبقات ہے، ۱۲ جلدوں میں ہے۔ دو جلدیں خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں ہیں، اور یہ حصہ دراصل سیرۃ نبوی ہے۔ باقی جلدیں صحابہ رضؓ (و تابعین رحؒ) کے حالات میں ہیں اور چونکہ صحابہ رضؓ کے حالات میں ہر جگہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ذکر آتا ہے۔ اس لیے ان حصوں میں بھی سیرت کا بڑا سرمایہ موجود ہے۔

یہ کتاب قریباً ناپید ہو چکی تھی، یعنی دنیا کے کسی کتب خانہ میں اس کا پورا نسخہ موجود نہ تھا شہنشاہ جرمنی کو اس کی طبع و اشاعت کا خیال ہوا۔ چنانچہ لاکھ روپے جیب خاص دیے، اور پروفیسر سخاؤ کو اس کام پر مامور کیا کہ ہر جگہ سے اس کے

---

[۱] تہذیب التہذیب، ترجمہ محمد بن سعد۔

اجزا فراہم کر کے لائیں۔ پروفیسر موصوف نے قسطنطنیہ، مصر اور یورپ جا کر جا بجا سے تمام جلدیں بہم پہنچائیں۔ یورپ کے بارہ پروفیسروں نے الگ الگ جلدوں کی تصحیح اپنے ذمہ لی۔ چنانچہ نہایت اہتمام اور صحت کے ساتھ یہ نسخہ لیڈن (ہالینڈ) میں چھپ کر شائع ہوا ۔

اس کتاب کا بڑا حصہ واقدی سے ماخوذ ہے لیکن چونکہ تمام روایتیں بہ سند مذکور ہیں۔ اس لیے واقدی کی روایتیں بہ آسانی الگ کر لی جا سکتی ہیں ۔

اس زمانہ میں سیرت پر اور بھی بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ چنانچہ کشف الظنون وغیرہ میں ان کے نام مذکور ہیں۔ لیکن چونکہ نام کے سوا اُن کے متعلق اور کچھ معلوم نہیں، نہ اُن کا آج وجود ہے۔ اس لیے ہم اُن کے نام نظر انداز کرتے ہیں ۔

تاریخ صغیر و کبیر امام بخاری

سیرت کے سلسلے سے الگ تاریخی تصنیفات ہیں۔ ان میں سے جو محدثانہ طریقہ پر لکھی گئیں۔ یعنی جن میں روایتیں بہ سند مذکور ہیں۔ اُن میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حالات اور واقعات کا جو حصہ ہے وہ بھی دراصل سیرت نبویؐ ہے۔ ان میں سب سے مقدم اور قابلِ استناد امام بخاری کی دونوں تاریخیں ہیں۔ لیکن دونوں نہایت مختصر ہیں۔ تاریخِ صغیر چھپ گئی ہے۔ اس میں سیرت نبویؐ کا حصہ کتاب کا دسواں حصہ بھی نہیں۔ یعنی صرف ۱۵ صفحے ہیں، اور اُن میں بھی کوئی ترتیب نہیں۔ کبیر البتہ بڑی ہے، مَیں نے اس کا نسخہ جامع ایا صوفیہ میں دیکھا تھا، لیکن سوانحِ نبویؐ اس میں بہت کم ہیں اور جستہ جستہ واقعات بلا ترتیب مذکور ہیں ۔

امام طبری

تاریخی سلسلہ میں سب سے جامع اور مفصل کتاب امام طبری کی تاریخ کبیر ہے۔ طبری اس درجہ کے شخص ہیں کہ تمام محدثین اُن کے فضل و کمال، وثوق اور وسعتِ علم کے معترف ہیں۔ اُن کی تفسیر احسن التفاسیر خیال کی جاتی ہے۔

محدث ابن خزیمة کا قول ہے کہ دنیا میں، میں کسی کو ان سے بڑھ کر عالم نہیں جانتا، ۳۱۰ھ میں وفات پائی۔

بعض محدثین (سلیمانی) نے ان کی نسبت لکھا ہے کہ "یہ شیعوں کے لیے حدیثیں وضع کیا کرتے تھے" لیکن علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں لکھا ہے:

ھذا رجم بالظن الکاذب بل ابن جریر من کبار ائمة الاسلام المعتمدین۔	یہ جھوٹی بدگمانی ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ابن جریر، اسلام کے معتمد اماموں میں سے ایک بڑے امام ہیں۔

علامہ ذہبی نے اسی موقع پر لکھا ہے کہ "ان میں فی الجملہ تشیع تھا، لیکن مضر نہیں" تمام مستند اور مفصل تاریخیں مثلاً تاریخ کامل ابن الاثیر، ابن خلدون، ابوالفدا وغیرہ ان ہی کی کتاب سے ماخوذ اور اسی کتاب کے مختصرات ہیں۔ یہ کتاب بھی ناپید تھی اور یورپ کی بدولت شائع ہوئی۔

جو لوگ خاص فن سیرت کے ارکان اور معتمد ہیں، ان کا اور ان کی تصنیفات کا ایک مختصر نقشہ ہم اس مقام پر درج کرتے ہیں[۱]:

نام مصنف	سنہ وفات	حالات
عروہ بن زبیر	۹۴ھ	حضرت زبیرؓ کے بیٹے، اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے نواسے تھے۔ حضرت عائشہؓ کے آغوش تربیت میں پلے

[۱] ان مصنفین کی تصنیفات اکثر ناپید ہیں۔ (یہ فہرست تہذیب التہذیب وغیرہ سے مرتب کی گئی ہے۔ ان کے نام لکھنے سے یہ غرض ہے کہ آج جو تصنیفیں ملتی ہیں ان میں اکثر ان کے حوالے آتے ہیں۔ اس لیے ناظرین کو ان حوالوں کی صحت یا عدم صحت یا قوت وضعف کے فیصلہ کرنے کا کچھ موقع حاصل ہوگا۔

نام مصنف	سنہ وفات	حالات
		تھے۔ سیرت و مغازی میں کثرت سے اُن کی روایتیں ہیں۔ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں اُن کے متعلق لکھا ہے کان عالما بالسیرۃ، صاحب کشف الظنون نے مغازی کے بیان میں لکھا ہے کہ بعضوں کی رائے ہے کہ فن مغازی کی سب سے پہلی کتاب ان ہی نے تدوین کی۔
شعبی	سنہ ۱۰۹ھ	مشہور محدث ہیں۔ اکثر فنون میں کمال رکھتے تھے۔ خلافتِ دمشق کی طرف سے سفیر بن کر قسطنطنیہ گئے تھے۔ فن مغازی و سیر میں ان کو اس درجہ واقفیت تھی کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے تھے کہ "گو میں اُن غزوات میں بذاتِ خود شریک تھا۔ مگر یہ مجھ سے زیادہ ان حالات کو جانتے ہیں۔"
وہب بن منبہ	سنہ ۱۱۴ھ	یمن کے عجمی خاندان سے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے کچھ حدیثیں سنی تھیں۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق کتبِ عہدِ قدیم کی بشارت اور پیشین گوئیاں کثرت سے انہی سے مروی ہیں۔
عاصم بن عمر بن قتادہ انصاری	سنہ ۱۲۱ھ	مشہور تابعی ہیں، حضرت انسؓ اور اپنے باپ اور اپنی دادی رمیثہ سے روایت کرتے ہیں۔ مغازی اور سیر میں نہایت وسیع المعلومات تھے۔ خلیفہ عمرؓ بن عبدالعزیز کے حکم سے مسجدِ دمشق میں بیٹھ کر اس فن کی تعلیم دیتے تھے۔
محمد بن مسلم بن شہاب زہری	سنہ ۱۲۴ھ	ان کا ذکر اُوپر گزر چکا ہے۔

بن عقبہ بن مغیرہ بن الاخنس شریق بن الثقفی	۱۲۸ھ	نہایت ثقہ تھے۔ عمال اور گورنر انتظام ملکی میں ان سے مدد لیتے تھے۔ فقہائے مدینہ میں ان کا شمار تھا۔ سیرت نبوی کے عالم تھے۔ ان کا دادا اخنس بن شریق وہی شخص ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا دشمن تھا۔
موسیٰ بن عقبۃ الاسدی	۱۴۱ھ	ان کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔
ہشام بن عروۃ ابن زبیر	۱۴۶ھ	زیادہ تر اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں۔ زہری کے بھی شاگرد ہیں۔ علمائے مدینہ میں ان کا شمار ہے۔ بغداد میں جو روایتیں انھوں نے لیں، محدثین کا بیان ہے کہ ان میں تساہل سے کام لیا ہے۔ سیرت کے ذخیرۂ روایات میں ان کا بہت بڑا حصہ شامل ہے، جن کو وہ اپنے باپ کے واسطے سے حضرت عائشہ رضؓ سے روایت کرتے ہیں۔ فن سیرت میں اُن کے متعدد نامور تلامذہ ہیں۔
محمد بن اسحاق بن یسار	۱۵۰ھ	امام زہری کے تلامذہ میں امام مالک کے بعد ان کا دوسرا درجہ ہے۔ اساطین علمِ حدیث میں تھے۔ مغازی میں ایک کتاب ان کی تصنیف ہے، جس کا نام ابن ندیم نے کتاب المغازی لکھا ہے۔
عبدالرحمن بن عبدالعزیز الاوسی۔	۱۶۲ھ	زہری کے شاگرد تھے مسلم نے ان سے ایک روایت کی ہے۔ محدثین کے نزدیک ضعیف الروایت ہیں۔ فن سیرت کے عالم تھے۔ ابن سعد نے اُن کے متعلق لکھا ہے، کان عالماً بالسیرۃ وغیرھا۔

محمد بن صالح بن دینار التمار	سنہ ۱۶۸ھ	زہری کے شاگرد اور واقدی کے استاد ہیں۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ وہ سیرت و مغازی کے عالم تھے۔ اکثر محدثین نے اُن کی توثیق کی ہے۔ ابو الزناد جو بڑے پایہ کے محدث ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اگر صحیح مغازی سیکھنا ہو تو محمد بن صالح سے سیکھو۔
ابو معشر نجیح المدنی	سنہ ۱۷۰ھ	ہشام بن عروہ کے شاگرد تھے۔ ثوری اور واقدی نے ان سے روایت کی ہے۔ گو محدثین نے روایتِ حدیث میں اُن کی تضعیف کی ہے لیکن سیرت و مغازی میں اُن کی جلالتِ شان کا اعتراف کیا ہے۔ امام ابن حنبل کہتے ہیں کہ وہ اس فن میں صاحب نظر ہیں۔ ابن ندیم نے ان کی کتاب المغازی کا ذکر کیا ہے کتب سیرت میں ان کا نام کثرت سے آتا ہے۔
عبد اللہ بن جعفر ابن عبد الرحمٰن المخزومی۔	سنہ ۱۷۰ھ	مشہور صحابی مسور بن مخرمہ کے پڑپوتے تھے۔ فن حدیث خاص پایہ رکھتے تھے۔ سیرت نبوی کے اکابر علما میں تھے۔ ابن سعد نے اُن کی شان میں یہ الفاظ لکھے ہیں: "من رجال اهل المدينة علماً بالمغازی"
عبد الملک بن محمد بن ابی بکر ابن عمرو بن حزم الانصاری۔	سنہ ۱۷۶ھ	فن حدیث و سیر میں ان کا خاندان ہمیشہ نامور رہا ان کے دادا وہ شخص ہیں جنھوں نے خلیفہ عمرؓ بن عبد العزیز کے حکم سے سب سے پہلے فنِ حدیث کی تدوین کی ان کے رشتہ کی دادی عمرۃ حضرت عائشہؓ کی تربیت یافتہ تھیں۔ یہ خود سیر و مغازی کے عالم تھے۔ اپنے باپ اور

		اور چچا سے تعلیم پائی تھی۔ خلیفہ ہارون الرشید نے ان کو قاضی مقرر کیا تھا۔ لوگ ان سے مغازی سیکھتے تھے۔ اس فن میں اُن کی ایک تصنیف المغازی بھی ہے
علی بن مجاہد الرازی الکندی	بعد سنہ ۱۸۰ھ	ابو معشر نجیح کے تلامذہ میں تھے۔ امام ابن حنبل نے ان سے روایت کی ہے۔ مغازی کے جامع اور مصنف ہیں۔ لیکن اربابِ نقد کے نزدیک ان کی تصنیف اعتبار کے قابل نہیں +
زیاد بن عبداللہ ابن الطفیل البکائی	سنہ ۱۸۳ھ	ابن اسحاق کے شاگرد اور ابن ہشام کے اُستاد تھے۔ ان دونوں بزرگواروں کے واسطۃ العقد یہی ہیں۔ سیرت کے عشق میں گھر بار بیچ کر اُستاد کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے تھے، اور مدت تک سفر و حضر میں اُن کے شریک رہے۔ محدثین کی بارگاہ میں گو ان کا اعزاز کم ہے، لیکن کتاب السیرۃ کے سب سے معتبر راوی یہی سمجھے جاتے ہیں +
سلمۃ بن الفضل الابرش الانصاری	سنہ ۱۹۱ھ	ابن اسحاق کے شاگرد، اور اُن کی سیرت کے راوی ہیں۔ رَے کے قاضی تھے۔ اہلِ نقد کے نزدیک قابلِ احتجاج نہیں لیکن ابن معین جو اسمائے رجال کے بڑے ماہر ہیں مغازی میں اُن کی توثیق کرتے ہیں اور ان کی سیرت کو بہترین سیر تہائے نبوی کہتے ہیں۔ طبری میں ان کے واسطے سے اکثر روایتیں مروی ہیں +
ابو محمد یحیی بن سعید ابن ابان الاموی	سنہ ۱۹۴ھ	ہشام بن عروہ اور ابن جریج سے تلمذ تھا۔ ابن سعد نے

		لکھا ہے کہ گو قلیل الروایت ہیں لیکن ثقہ ہیں۔ صاحب کشف الظنون نے مصنفینِ مغازی میں ان کا نام بھی لیا ہے۔
ولید بن مسلم القرشی	۱۹۵ھ	شام کے مشہور محدث اور نہایت قوی الحافظہ تھے۔ شام میں ان کے زمانے میں اُن سے بڑا کوئی عالم نہ تھا۔ تاریخ و مغازی میں وکیع سے ان کا درجہ بڑا سمجھا جاتا تھا۔ ان کی تصنیفات کی تعداد ستر ہے، جن میں ایک کتاب المغازی ہے۔ کتاب الفہرست میں اس کا ذکر موجود ہے۔
یونس بن بکیر	۱۹۹ھ	ہشام بن عروہ اور ابن اسحاق کے شاگرد ہیں۔ فنِ روایت و حدیث میں ان کا متوسط درجہ ہے۔ اکثر محدثین نے ان کی توثیق کی ہے۔ علامہ ذہبی نے تذکرہ میں اُن کا نام بہ لقب صاحب المغازی لیا ہے۔ اُنھوں نے مغازی ابن اسحاق کا ذیل لکھا ہے (زرقانی مواہب جلد ۳ صفحہ ۱۰)۔
محمد بن عمر الواقدی الاسلمی۔	۲۰۷ھ	سیرت نبوی کے متعلق ان کی دو کتابیں ہیں۔ کتاب السیرۃ اور کتاب التاریخ والمغازی والمبعث، امام شافعی فرماتے ہیں کہ واقدی کی تمام تصانیف جھوٹ کا انبار ہے۔ کتبِ سیرت کی اکثر بیہودہ روایتوں کا سرچشمہ انہی کی تصانیف ہیں۔ ایک ظریف محدث نے خوب کہا ہے کہ "اگر واقدی سچا ہے تو دُنیا میں کوئی اس کا ثانی نہیں۔ اور اگر جھوٹا ہے، تب بھی دُنیا میں اس کا جواب نہیں"۔

یعقوب بن ابراہیم الزہری	۲۰۸ھ	حضرت عبد الرحمٰن بن عوف کی اولاد میں تھے۔ زہری اور ان کے تلامذہ کے شاگرد ہیں۔ مغازی میں ان کا یہ رُتبہ تھا کہ ابنِ معین جیسا ناقدِ رجال ان سے اس فن کی تحصیل کرتا تھا۔
عبد الرزاق بن ہمام بن نافع الحمیری	۲۱۱ھ	ثقات محدثین میں ان کا شمار ہے۔ مزاج میں کسی قدر تشیّع تھا۔ ابن معین کہتے ہیں کہ اگر عبد الرزاق مُرتد بھی ہو جائیں تب بھی ہم ان سے روایتِ حدیث ترک نہیں کر سکتے۔ آخر عمر میں بصارت جاتی رہی تھی، اس لیے اس زمانہ کی حدیثیں ناقابلِ سند ہیں۔ فن مغازی میں ان کی ایک تالیف ہے۔
عبد الملک بن ہشام الحمیری۔	۲۱۳ یا ۲۱۸ھ	ان کا ذکر گزر چکا ہے۔
علی بن محمد المدائنی	۲۲۵ھ	ابو معشر نجیح اور سلمۃ بن الفضل وغیرہ کے شاگرد تھے۔ تاریخ و انساب عرب میں نہایت وسیع المعلومات تھے۔ محدثین میں ان کا شمار نہیں، لیکن مورخین کے امام ہیں۔ اغانی کے دفتر بے پایاں کا مخزن یہی ہیں۔ تاریخ و انساب میں ان کی کثرت سے تصنیفات ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں ان کی کتاب نہایت مبسوط ہے، اور ابن الندیم کے بیان کے مطابق ہر قسم کے متعدد اور متنوع عنوان قائم کیے ہیں۔
عمر بن شبۃ البصری	۲۶۲ھ	حدیث، تاریخ، ادب، لغت، شاعری اور نحو کے امام

		ہیں۔ مکہ مبارکہ، مدینہ طیبہ اور بصرہ کی تاریخیں لکھی ہیں۔ علم سیر میں نہایت بلند پایہ تھے۔ حدیث میں ابن ماجہ، اور تاریخ میں بلاذری، اور ابونعیم ان کے شاگرد تھے۔
محمد بن عیسیٰ ترمذی	۲۷۹ھ	مشہور محدث ہیں جن کی کتاب صحاح ستہ میں تیسرا درجہ رکھتی ہے۔ سیرت نبویؐ میں ان کا خاص رسالہ ہے، جس کا موضوع گزشتہ تصانیف سے الگ ہے۔ اس رسالے کا نام کتاب الشمائل ہے۔ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی حالات و عادات و اخلاق کا ذکر ہے، اس بات کا التزام کیا ہے کہ تمام روایتیں معتبر اور صحیح ہوں۔ اس رسالے پر متعدد علما نے شروح و حواشی لکھے۔
ابراہیم بن اسحاق بن ابراہیم	۲۸۵ھ	محدثین کبار میں شمار ہے۔ مسند صحابہؓ ان کی تالیف ہے۔ جس کے آخر میں کتاب المغازی شامل ہے۔
ابوبکر احمد بن ابی خیثمہ البغدادی	۲۹۹ھ	حدیث میں ابن حنبل اور ابن معین کے شاگرد، اور تاریخ وسیر کے جلیل القدر عالم تھے۔ تاریخ کبیر ان کی تصنیف ہے جس میں سیرت نبویؐ کا حصہ بھی شامل ہے۔
محمد بن عائذ دمشقی		ان کی مغازی معتبر خیال کی جاتی ہے۔ حافظ ابن حجر وغیرہ اکثر ان کے حوالے دیتے ہیں۔

یہ قدما کی تصنیفات تھیں۔ مابعد کی تصنیفات کا ہم ایک مختصر نقشہ ذیل میں درج کرتے ہیں۔ یہ تصنیفات قدیم تصنیفات اور احادیث کی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ اس نقشہ میں ان کتابوں کا ذکر بھی ہے جو قدما کی تصنیفات کے متعلق شرح کے طور پر لکھی گئی ہیں۔ ان کا ذکر اس وجہ سے کیا گیا ہے کہ یہ فی نفسہٖ مستقل تصنیفات ہیں، اور ان

میں جس قدر ذخیرۂ معلومات ہے خود اصل کتابوں میں نہیں:

روض الانف: سیرت بن اسحاق کی شرح ہے مصنف کا نام عبدالرحمٰن سہیلی ہے، جنھوں نے ۵۸۱ھ میں وفات پائی۔ یہ اکابر محدثین میں سے ہیں اور تمام مصنفین مابعد سیرت نبویؐ کی تحقیقات اور معلومات کے متعلق اُن کے خوشہ چیں ہیں مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ مَیں نے یہ کتاب ۱۲۰ کتابوں کی مدد سے لکھی۔ اس کا قلمی نسخہ ہمارے استعمال میں ہے۔

سیرتِ دمیاطی: حافظ عبدالمومن دمیاطی المتوفی ۷۰۵ھ کی تصنیف ہے۔ اکثر کتابوں میں اس کے حوالے آتے ہیں۔ اس کتاب کا نام المختصر فی سیرۃ سید البشر ہے۔ قریباً سَو صفحوں میں ہے۔ پٹنہ کے کتب خانے میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔

سیرتِ خلاطی: علاء الدین علی بن محمد خلاطی حنفی کی تصنیف ہے۔ ۷۰۸ھ میں وفات پائی۔

سیرتِ گازرونی: شیخ ظہیر الدین علی بن محمد گازرونی المتوفی ۶۹۴ھ کی تصنیف ہے[۱]۔

سیرتِ ابن ابی طے: مصنف کا نام یحییٰ بن حمیدۃ المتوفی ۶۳۰ھ ہے، یہ کتاب تین جلدوں میں ہے۔

سیرتِ مغلطائی[۲]: مشہور کتاب ہے، اور مصر میں چھپ گئی ہے۔ علّامہ عینی نے اس کے ایک حصّہ کی شرح لکھی ہے جس کا نام کشف اللثام ہے۔

شرف المصطفیٰ: حافظ ابوسعید عبدالملک نیشاپوری کی تصنیف ہے۔ آٹھ

---

[۱] بمبئی کے کتب خانہ جامع مسجد میں اس کا قلمی نسخہ موجود تھا ہے۔

[۲] ان تمام کتابوں کا ذکر کشف الظنون میں سیرت کے عنوان میں ہے۔

جلدوں میں ہے۔ حافظ ابن حجر اصابہ میں اکثر اس کا حوالہ دیتے ہیں لیکن جو روایتیں حافظ موصوف نے نقل کی ہیں۔ ان میں بعض نہایت مہمل اور لغو روایتیں ہیں، جس سے قیاس ہوتا ہے کہ مصنف نے رطب ویابس کی کوئی تمیز نہیں رکھی ہے۔

شرف المصطفیٰ، للحافظ ابن الجوزی۔

اکتفاء فی مغازی المصطفیٰ والخلفاء الثلاثۃ، حافظ ابو الربیع سلیمان بن موسیٰ الکلاعی المتوفی ۶۳۴ھ کی تصنیف ہے، اکثر کتابوں میں اس کے حوالے آتے ہیں۔

سیرتِ ابن عبد البر: ابن عبد البر مشہور محدث اور امام ہیں۔ اس کتاب کے حوالے اکثر آتے ہیں۔

عیون الاثر ابن سید الناس کی تصنیف ہے۔ ابن سید الناس اندلس کے مشہور عالم ہیں۔ ۷۳۴ھ میں وفات پائی۔ یہ کتاب نہایت متین اور جامع ہے۔ معتبر کتابوں کو ماخذ قرار دیا ہے اور جس سے کچھ نقل کیا ہے، سند بھی نقل کی ہے۔ اس کا قلمی نسخہ (جلد دوم) کلکتہ کے کتب خانے میں ہے اور ہمارے پیش نظر ہے۔

نور النبراس فی سیرۃ ابن سید الناس عیون الاثر کی شرح ہے مصنف کا نام ابراہیم ابن محمد ہے۔ یہ کتاب نہایت محققانہ لکھی گئی ہے اور بے شمار معلومات کا گنجینہ ہے۔ دو ضخیم جلدوں میں ہے، اور ندوہ کے کتب خانے میں نہایت عمدہ نسخہ موجود ہے۔

سیرتِ منظوم: حافظ زین الدین عراقی نے جو حافظ ابن حجر کے اُستاد تھے۔ نظم میں لکھی ہے، لیکن دیباچہ میں خود لکھ دیا ہے کہ اس میں رطب ویابس سب کچھ ہے۔

مواہب لدنیہ: مشہور کتاب ہے اور متاخرین کا یہی ماخذ ہے۔ اس کے مصنف قسطلانی ہیں جو بخاری کے مشہور شارح ہیں۔ حافظ ابن حجر کے ہمرتبہ تھے۔ یہ کتاب اگرچہ نہایت مفصل ہے، لیکن ہزاروں موضوع اور غلط روایتیں بھی موجود ہیں۔

زرقانی علی المواہب: یہ مواہب لدنیہ کی شرح ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ سہیلی کے بعد کوئی کتاب اس جامعیت اور تحقیق سے نہیں لکھی گئی۔ آٹھ ضخیم جلدوں میں ہے اور مصر میں چھپ گئی ہے۔

سیرتِ حلبی: مشہور اور متداول ہے۔

صحتِ مآخذ

سیرت نبویؐ کے واقعات جو قلمبند کیے گئے ہیں وہ تقریباً نبوت کے سو برس کے بعد قلمبند ہوئے۔ اس لیے مصنفین کا مآخذ کوئی کتاب نہ تھی، بلکہ اکثر زبانی روایتیں تھیں۔

اس قسم کا موقع جب دوسری قوموں کو پیش آتا ہے، یعنی کسی زمانہ کے حالات مدت کے بعد قلمبند کیے جاتے ہیں تو یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ ہر قسم کی بازاری افواہیں قلمبند کر لی جاتی ہیں، جن کے راویوں کا نام و نشان تک معلوم نہیں ہوتا۔ ان افواہوں میں سے وہ واقعات انتخاب کر لیے جاتے ہیں، جو قرائن اور قیاسات کے مطابق ہوتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد یہی خرافات ایک دلچسپ تاریخی کتاب بن جاتے ہیں۔ یورپ کی تاریخی تصنیفات اسی اصول پر لکھی گئی ہیں۔

اسلامی فنِ تاریخ کا پہلا اصول فنِ روایت

لیکن مسلمانوں نے اس فن سیرت کا جو معیار قائم کیا، وہ اس سے بہت زیادہ بلند تھا۔ اس کا پہلا اصول یہ تھا کہ جو واقعہ بیان کیا جائے اُس شخص کی زبان سے بیان کیا جائے جو خود شریکِ واقعہ تھا، اور اگر خود نہ تھا تو شریکِ واقعہ تک تمام راویوں کا نام بہ ترتیب بتایا جائے۔ اس کے ساتھ یہ بھی تحقیق کیا جائے کہ جو اشخاص سلسلۂ روایت میں آئے، کون لوگ تھے؟ کیسے تھے؟ کیا مشاغل تھے؟ چال چلن کیسا تھا؟ حافظہ کیسا تھا؟ سمجھ کیسی تھی؟ ثقہ تھے یا غیر ثقہ؟ سطحی الذہن تھے یا دقیقہ بین؟ عالم تھے یا جاہل؟ ان جزئی باتوں کا پتہ لگانا سخت مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ سیکڑوں ہزاروں محدثین نے اپنی عمریں اسی کام

میں صرف کردیں۔ ایک ایک شہر میں گئے، راویوں سے ملے، ان کے متعلق ہر قسم کے معلومات بہم پہنچائے۔ جو لوگ ان کے زمانے میں موجود نہ تھے، ان کے دیکھنے والوں سے حالات دریافت کیے۔

اسماء الرجال کی تدوین ان تحقیقات کے ذریعے اسماء الرجال (بیوگرافی) کا وہ عظیم الشان فن تیار ہوگیا، جس کی بدولت آج کم از کم لاکھ شخصوں کے حالات معلوم ہوسکتے ہیں۔ اور اگر ڈاکٹر اسپرنگر[۱] کے حسن ظن کا اعتبار کیا جائے تو یہ تعداد پانچ لاکھ تک پہنچ جاتی ہے۔

محدثین نے حالات کے بہم پہنچانے میں کسی شخص کے رتبے اور حیثیت کی پروا نہ کی، بادشاہوں سے لے کر بڑے بڑے مقتداؤں تک کی اخلاقی سراغ رسانیاں کیں، اور ایک ایک کی پردہ دری کی۔

اس سلسلہ میں سینکڑوں تصنیفات تیار ہوئیں، جن کی اجمالی کیفیت یہ ہے:

سب سے پہلے اس فن یعنی راویوں کی جرح و تعدیل میں یحییٰ بن سعید القطان نے ایک کتاب لکھی۔ وہ اس رتبہ کے شخص تھے کہ امام احمد بن حنبل نے انکی نسبت لکھا ہے کہ "میری آنکھوں نے ان کا نظیر نہیں دیکھا" ان کے بعد اس فن کو زیادہ رواج ہوا اور کثرت سے کتابیں لکھی گئیں جن میں سے چند ممتاز تصنیفات حسب

---

[۱] ڈاکٹر اسپرنگر جرمنی کے مشہور عربی دان فاضل ہیں۔ مدت تک ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں کام کیا۔ اصابہ کا نسخہ ان ہی کی تصحیح سے کلکتہ میں چھپا۔ اسی کتاب کے دیباچہ میں صاحب موصوف نے لکھا ہے کہ "نہ کوئی قوم دنیا میں ایسی گزری، نہ آج موجود ہے، جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال سا عظیم الشان فن ایجاد کیا، جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہوسکتا ہے۔"

ذیل ہیں:

کیفیت	نام مصنف
خاص ضعیف الروایۃ لوگوں کے حال میں ہے۔	رجال عقیلی
اس کتاب کا نام کتاب الجرح والتعدیل ہے۔	رجال احمد بن عبد العجلی المتوفی ۲۶۱ھ
بہت ضخیم کتاب ہے۔	رجال امام عبد الرحمان بن حاتم الرازی المتوفی ۳۲۷ھ
مشہور محدث ہیں۔ یہ کتاب ضعیف الروایۃ اشخاص کے حال میں ہے۔	رجال امام دار قطنی
اس فن کی سب سے مشہور کتاب ہے اور تمام محدثین متاخرین نے اس کو اپنا ماخذ قرار دیا ہے۔	کامل بن عدی

یہ کتابیں قریباً آج ناپید ہیں لیکن بعد کی تصنیفات جو انہی سے ماخوذ ہیں آج بھی موجود ہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ جامع اور مستند کتاب تہذیب الکمال ہے، جو علامہ مزی (یوسف بن الزکی) کی تصنیف ہے، جنھوں نے ۷۴۲ھ میں وفات پائی۔ علاؤ الدین مغلطائی المتوفی ۷۶۲ھ نے تیرہ جلدوں میں اس کا تکملہ لکھا۔

علامہ ذہبی المتوفی ۷۴۸ھ نے اس کا اختصار کیا، اور بہت سے محدثین نے اس کے خلاصے اور ذیل لکھے، اور بالآخر حافظ ابن حجر نے ان تمام تصنیفات سے ایک نہایت ضخیم کتاب تہذیب التہذیب لکھی جو بارہ ۱۲ جلدوں میں ہے اور

آجکل حیدرآباد سے شائع ہوئی ہے مصنف نے کتاب کے خاتمے میں لکھا ہے کہ اس کی تصنیف میں آٹھ برس صرف ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ کی ایک اور سب سے زیادہ متداول اور مستند کتاب میزان الاعتدال ہے جو علامہ ذہبی کی تصنیف ہے۔ حافظ ابن حجر نے اس کتاب پر اضافہ کیا جس کا نام لسان المیزان ہے۔

اسماء الرجال کی کتابیں جو ہمارے پیش نظر ہے

اسماء الرجال کی کتابوں میں سے تہذیب الکمال، تہذیب التہذیب، لسان المیزان، تقریب، تاریخ کبیر بخاری، تاریخ صغیر بخاری، ثقات ابن حبان، تذکرۃ الحفاظ علامہ ذہبی، مشتبہ النسبۃ ذہبی، انساب سمعانی، تہذیب الاسماء ہماری نظر سے گزری ہیں۔

اس اصول تحقیق کی بنیاد خود قرآن مجید نے قائم کر دی تھی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا ، (الحجرات-۱) مسلمانو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لائے تو تم اچھی طرح اس کی تحقیق کر لو۔

حدیثِ ذیل بھی اسی کی مؤید ہے:

كَفَىٰ بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ ۔ آدمی کے جھوٹے ہونے کی یہ کافی دلیل ہے کہ جو کچھ سنے روایت کر دے۔

دوسرا اصول درایت

تحقیقِ واقعات کا دوسرا اصول یہ تھا کہ جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے، عقلی شہادت کے مطابق بھی ہے یا نہیں؟

درایت کی ابتداء

یہ اصول بھی درحقیقت قرآن مجید ہی نے قائم کر دیا تھا۔ حضرت عائشہ رض پر جب منافقین نے تہمت لگائی تو اس طرح اس خبر کو مشہور کیا کہ بعض صحابہؓ تک مغالطے میں آ گئے۔ چنانچہ صحیح بخاری اور مسلم میں ہے کہ حضرت حسان رض بھی قاذفین میں شریک تھے۔ اور اسی بنا پر حدِ قذف جاری کی گئی۔ قرآن مجید میں بھی اس کی تصریح ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْکِ عُصْبَۃٌ جن لوگوں نے تہمت لگائی وہ تمہارے گروہ
مِنْکُمْ۔ (نور ۲) میں سے ہیں۔

تفسیر جلالین میں مِنْکُمْ کی تفسیر حسب ذیل کی ہے:
جَمَاعَۃٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ یعنی یہ تہمت لگانے والے مسلمانوں کا ایک گروہ ہے۔

قرآن مجید کی آیتیں حضرت عائشہ رضؓ کی براءت اور طہارت کے متعلق جو نازل ہوئیں، ان میں سے ایک یہ ہے:

وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْہُ قُلْتُمْ مَّا یَکُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَکَلَّمَ بِھٰذَا سُبْحَانَکَ ھٰذَا بُھْتَانٌ عَظِیْمٌ۔ اور جب تم نے سنا تو یہ کیوں نہیں کہ دیا کہ ہم کو ایسی بات بولنا مناسب نہیں، سبحان اللہ یہ بڑا بہتان ہے۔

(نور۔ ۲)

عام اصول کی بنا پر اس خبر کی تحقیق کا یہ طریقہ تھا کہ پہلے راویوں کے نام دریافت کیے جاتے۔ پھر دیکھا جاتا کہ وہ ثقہ اور صحیح الرّوایۃ ہیں یا نہیں؟ پھر اُن کی شہادت لی جاتی۔ لیکن خدا نے اس آیت میں فرمایا کہ سُننے کے ساتھ تم نے کیوں نہیں کہ دیا کہ یہ بہتان ہے۔

اس سے قطعاً ثابت ہوتا ہے کہ اس قسم کا خلافِ قیاس جو واقعہ بیان کیا جائے قطعاً سمجھ لینا چاہیے کہ غلط ہے۔

اس طرزِ تحقیق یعنی درایت کی ابتدا خود صحابہ رضؓ کے عہد میں ہو چکی تھی۔
فقہا میں بعض اس بات کے قائل ہیں کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کے کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضؓ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ کے سامنے جب اس مسئلہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف منسوب کیا، تو عبداللہ رضؓ بن عباس نے کہا اگر یہ صحیح ہو تو اُس پانی کے پینے سے بھی وضو ٹوٹ جائیگا جو

آگ پر گرم کیا گیا ہو۔[۵] حضرت عبداللہ رض ابن عباس رض، حضرت ابوہریرہ رض کو ضعیف الروایۃ نہیں سمجھتے۔ لیکن چونکہ ان کے نزدیک یہ روایت درایت کے خلاف تھی۔ اس لیے انھوں نے تسلیم نہیں کی، اور یہ خیال کیا کہ سمجھنے میں غلطی ہوگئی ہوگی۔

جب حدیثوں کی تدوین شروع ہوئی تو محدثین نے درایت کے اصول بھی منضبط کیے، جن میں سے بعض یہ ہیں:

قال[۵] ابن الجوزی وکل حدیث رأیتہ یخالف العقول او یناقض الاصول فاعلم انہ موضوع فلا یتکلف اعتبارہ ای لاتعتبر رواتہ ولاتنظر فی جرحھم او یکون مما یدفعہ الحس و المشاھدۃ او مباینا لنص الکتاب والسنۃ المتواترۃ او الاجماع القطعی حیث لایقبل شیئ من ذٰلک التاویل او یتضمن الافراط بالوعید الشدید علی الامر الیسیر او بالوعد العظیم	ابن جوزی نے کہا ہے کہ جس حدیث کو دیکھو کہ عقل یا اصولِ مسلمہ کے خلاف ہے تو جان لو کہ وہ مصنوعی ہے، اس کی نسبت اس بحث کی ضرورت نہیں کہ اس کے راوی معتبر ہیں یا غیر معتبر، اسی طرح سے وہ حدیث قابلِ اعتبار نہیں جو محسوسات اور مشاہدہ کے خلاف ہو، اور تاویل کی گنجائش نہ رکھتی ہو، یا وہ حدیث جس میں ذراسی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو، یا معمولی کام پر بہت بڑے ثواب کا وعدہ ہو اس قسم کی حدیثیں واعظوں اور صوفیوں کے ہاں بہت پائی جاتی ہیں، یا وہ حدیث جس میں لغویت پائی جائے۔ مثلاً یہ حدیث کہ کدو کو بغیر ذبح

---

[۴] صحیح ترمذی باب الوضوء ۔ [۵] فتح المغیث مطبوعہ لکھنؤ صفحہ ۱۱۲، افسوس یہ ہے کہ یہ کتاب نہایت غلط چھپی ہے، اس لیے بعض عبارتیں ہم نے اسی نسخہ کے موافق غلط نقل کی ہیں۔ یہ اصول خود ابن جوزی کے قائم کردہ نہیں ہیں۔ بلکہ ابن جوزی نے محدثین کے اصول کو نقل کر دیا ہے۔

على الفعل اليسير وهذا الأخير كثير موجود في حديث القصاص والطرقية ومن ركة المعنى لا تاكلوا القرعة حتى تذبحوها ولذا جعل بعضهم ذالك دليلا على كذب راويه وكل هذا من القرائن في المروي وقد تكون في الراوي كقصة غياث مع المهدي.... او انفراده عمن لم يدركه بما لم يوجد عند غيرهما او انفراده بشئ مع كونه مما يلزم المكلفين عمله و قطع العذر فيه كما قرّره الخطيب في اوّل الكفاية او بامر جسيم يتوفر الدواعي على نقله كحصر عدو والحاج عن البيت۔

کیے نہ کھاؤ، اس لیے بعض محدثین نے لغویت کو راوی کے کذب کی دلیل قرار دیا ہے، یہ تمام قرینے خود روایت سے متعلق ہیں، اور کبھی یہ قرائن راوی کے متعلق ہوتے ہیں۔ مثلاً غیاث کا واقعہ خلیفہ مہدی کے ساتھ.... یا جب کہ راوی کوئی ایسی حدیث بیان کرے جو اور کسی نے نہ بیان کی ہو، اور خود راوی جس سے روایت کرتا ہے اس سے ملا تک نہ ہو، یا وہ حدیث جس کو ایک ہی راوی بیان کرتا ہے۔ حالانکہ بات ایسی ہے کہ اس سے اوروں کو بھی مطلع ہونا ضرور تھا، جیسا کہ خطیب بغدادی نے کتاب الکفایہ کے شروع میں اس کی تصریح کی ہے، یا وہ روایت جس میں کسی عظیم الشان واقعہ کا ذکر ہے کہ اگر وہ واقع ہوا ہوتا تو سیکڑوں آدمی اس کو بیان کرتے، مثلاً یہ واقعہ کہ کسی دشمن نے حاجیوں کو کعبہ کے حج سے روک دیا۔

روایت کے اصول اس عبارت کا ماحصل یہ ہے کہ حسب ذیل صورتوں میں روایت اعتبار کے قابل نہ ہوگی اور اس کے متعلق اس تحقیق کی ضرورت نہیں کہ اس کے راوی معتبر ہیں یا نہیں:

۱- جو روایت عقل کے مخالف ہو۔

۲- جو روایت اصول مسلمہ کے خلاف ہو۔

۳- محسوسات اور مشاہدہ کے خلاف ہو۔

۴- قرآن مجید یا حدیثِ متواتر یا اجماعِ قطعی کے خلاف ہو اور اس میں تاویل کی کچھ گنجائش نہ ہو۔

۵- جس حدیث میں معمولی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو۔

۶- معمولی کام پر بہت بڑے انعام کا وعدہ ہو۔

۷- وہ روایت رکیک المعنی ہو مثلاً کدو کو بغیر ذبح کیے نہ کھاؤ۔

۸- جو راوی کسی شخص سے ایسی روایت کرتا ہے کہ کسی اور نے نہیں کی، اور یہ راوی اس شخص سے نہ ملا ہو۔

۹- جو روایت ایسی ہو کہ تمام لوگوں کو اس سے واقف ہونے کی ضرورت ہو، بایں ہمہ ایک راوی کے سوا کسی اور نے اس کی روایت نہ کی ہو۔

۱۰- جس روایت میں ایسا قابلِ اعتنا واقعہ بیان کیا گیا ہو، کہ اگر وقوع میں آتا تو سیکڑوں آدمی اس کو روایت کرتے، باوجود اس کے صرف ایک ہی راوی نے اس کی روایت کی ہو۔

ملا علی قاری نے موضوعات[۱] کے خاتمے میں حدیثوں کے نامعتبر ہونے کے چند اصول تفصیل سے لکھے ہیں اور ان کی مثالیں نقل کی ہیں، ہم اس کا خلاصہ اس موقع پر نقل کرتے ہیں:

۱- جس حدیث میں فضول باتیں ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نہیں نکل سکتیں، مثلاً یہ کہ "جو شخص لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کہتا ہے خدا اس کلمہ سے ایک پرند پیدا کرتا ہے جس کے ستّر زبانیں ہوتی ہیں۔ ہر زبان میں ستّر ہزار لغت

---

[۱] نسخہ مطبوعہ مجتبائی دہلی، صفحہ ۹۲ تا خاتمۂ کتاب۔

ہوتے ہیں ۔ الخ"

۲ ۔ وہ حدیث جو مشاہدہ کے خلاف ہو ۔ مثلاً یہ حدیث کہ "بینگن کھانا ہر مرض کی دوا ہے"۔

۳ ۔ وہ حدیث جو صریح حدیثوں کے مخالف ہو ۔

۴ ۔ جو حدیث واقع کے خلاف ہو، مثلاً یہ کہ " دھوپ میں رکھے ہوئے پانی سے غسل نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اس سے برص پیدا ہوتا ہے"۔

۵ ۔ وہ حدیث جو انبیاء علیہم السلام کے کلام سے مشابہت نہ رکھتی ہو ۔ مثلاً یہ حدیث کہ "تین چیزیں نظر کو ترقی دیتی ہیں، سبزہ زار، آب رواں، خوبصورت چہرے کا دیکھنا"۔

۶ ۔ وہ حدیثیں جن میں آئندہ واقعات کی پیشین گوئی بقید تاریخ مذکور ہوتی ہے ۔ مثلاً یہ کہ "فلاں سنہ اور فلاں تاریخ میں یہ واقعہ پیش آئے گا"۔

۷ ۔ وہ حدیثیں جو طبیبوں کے کلام سے مشابہ ہیں، مثلاً یہ کہ "ہریسہ کے کھانے سے قوت آتی ہے"۔ یا یہ کہ مسلمان شیریں ہوتا ہے اور شیرینی پسند کرتا ہے۔

۸ ۔ وہ حدیث جس کے غلط ہونے کے دلائل موجود ہیں ۔ مثلاً عوج بن عنق کا قد تین ہزار گز کا تھا ۔

۹ ۔ وہ حدیث جو صریح قرآن کے خلاف ہو، مثلاً دنیا کی عمر سات ہزار برس کی ہے ۔ کیونکہ اگر یہ روایت صحیح ہو تو ہر شخص بتا دے گا کہ قیامت کے آنے میں اس قدر دیر ہے ۔ حالانکہ قرآن سے ثابت ہے کہ قیامت کا وقت کسی کو معلوم نہیں۔

۱۰ ۔ وہ حدیثیں جو خضر علیہ السلام کے متعلق ہیں ۔

۱۱ ۔ جس حدیث کے الفاظ رکیک ہوں ۔

۱۲ ۔ وہ حدیثیں جو قرآن مجید کی الگ الگ سورتوں کے فضائل میں وارد

ہیں۔ حالانکہ یہ حدیثیں تفسیر بیضاوی اور کشاف وغیرہ میں منقول ہیں۔

ان اصول سے محدثین نے اکثر جگہ کام لیا اور ان کی بنا پر بہت سی روایتیں رد کر دیں۔ مثلاً ایک واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے یہودیوں کو جزیہ سے معاف کر دیا تھا، اور معافی کی دستاویز لکھوادی تھی۔ ملا علی قاری اس روایت کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ روایت مختلف وجوہ سے باطل ہے:

۱۔ اس معاہدہ پر سعد بن معاذ کی گواہی بیان کی جاتی ہے۔ حالانکہ وہ غزوۂ خندق میں وفات پا چکے تھے۔

۲۔ دستاویز میں کاتب کا نام معاویہ ہے۔ حالانکہ وہ فتح مکہ میں اسلام لائے۔

۳۔ اس وقت تک جزیہ کا حکم ہی نہیں آیا تھا۔ جزیہ کا حکم قرآن مجید میں جنگ تبوک کے بعد نازل ہوا ہے۔

۴۔ دستاویز میں تحریر ہے کہ "یہودیوں سے بیگار نہیں لی جائے گی۔ حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بیگار کا رواج ہی نہ تھا۔

۵۔ خیبر والوں نے اسلام کی سخت مخالفت کی تھی۔ ان سے جزیہ کیوں معاف کیا جاتا۔

۶۔ عرب کے دور دراز حصوں میں جب جزیہ معاف نہیں ہوا۔ حالانکہ ان لوگوں نے چنداں مخالفت اور دشمنی نہیں کی تھی، تو خیبر والے کیوں کر معاف ہو سکتے تھے۔

۷۔ اگر جزیہ ان کو معاف کر دیا گیا ہوتا تو یہ اس بات کی دلیل تھی کہ وہ اسلام کے ہوا خواہ اور دوست اور واجب الرعایۃ ہیں۔ حالانکہ چند روز کے بعد خارج البلد کر دیے گئے۔

تبصرہ

سیرت کی یہ ایک اجمالی اور سادہ تاریخ تھی۔ اب ہم اس پر مختلف پہلوؤں سے نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

۱۔ سیرت پر اگرچہ آج بھی سیکڑوں تصنیفیں موجود ہیں۔ لیکن سب کا سلسلہ جاکر صرف تین چار کتابوں پر منتہی ہوتا ہے۔ سیرت ابن اسحاق، واقدی، ابن سعد، طبری ان کے علاوہ جو کتابیں ہیں وہ ان سے متأخر ہیں، اور ان میں جو واقعات مذکور ہیں۔ زیادہ تر ان ہی کتابوں سے لیے گئے ہیں، (کتب حدیث کا جو ٹکڑا ہے اُس سے اس مقام پر بحث نہیں) اس بنا پر ہم کو مذکورۂ بالا کتابوں پر زیادہ تفصیل اور تدقیق سے نظر ڈالنی چاہیے۔

ان میں سے واقدی تو بالکل نظر انداز کر دینے کے قابل ہے۔ محدثین بالاتفاق لکھتے ہیں کہ وہ خود اپنے جی سے روایتیں گھڑتا ہے، اور حقیقت میں واقدی کی تصنیف خود اس بات کی شہادت ہے۔ ایک ایک جزئی واقعہ کے متعلق جس قسم کی گوناگوں اور دلچسپ تفصیلیں بیان کرتا ہے، آج کوئی بڑے سے بڑا واقعہ نگار چشم دید واقعات اس طرح قلمبند نہیں کر سکتا۔

واقدی کے سوا، باقی اور تینوں مصنفین اعتبار کے قابل ہیں۔ ابن اسحاق کی نسبت اگرچہ امام مالک اور بعض محدثین نے جرح کی ہے۔ تاہم ان کا یہ رتبہ ہے کہ امام بخاری اپنے رسالہ "جزء القراۃ" میں اُن کی سند سے روایتیں نقل کرتے ہیں، اور ان کو صحیح سمجھتے ہیں۔ ابن سعد اور طبری میں کسی کو کلام نہیں لیکن افسوس

ہے کہ ان لوگوں کا مستند ہونا، اُن کی تصنیفات کے مستند ہونے پر چنداں اثر نہیں ڈالتا۔ یہ لوگ خود شریکِ واقعہ نہیں۔ اس لیے جو کچھ بیان کرتے ہیں اوراور راویوں کے ذریعے سے بیان کرتے ہیں۔ لیکن اُن کے بہت سے رواۃ ضعیف الروایۃ اور غیر مستند ہیں۔ اس کے علاوہ ابنِ اسحاق کی اصلی کتاب (ہندوستان میں) موجود نہیں ابنِ ہشام نے ابنِ اسحاق کی کتاب کو ترتیب اور تہذیب کے بعد جس صورت میں بدل دیا وہی آج موجود ہے۔ لیکن ابن ہشام نے ابن اسحاق کی کتاب کو زیاد بکائی کے واسطے سے روایت کیا ہے۔ بکائی اگرچہ رتبہ کے شخص ہیں۔ تاہم محدثین کے اعلیٰ معیار سے فروتر ہیں۔ ابن مدینی (امام بخاری کے اُستاد) کہتے ہیں کہ "وہ ضعیف ہے اور میں نے اس کو ترک کر دیا"۔ ابو حاتم کہتے ہیں "وہ استناد کے قابل نہیں"۔ نسائی کہتے ہیں "وہ ضعیف ہے"۔

ابن سعد کی نصف سے زیادہ روایتیں واقدی کے ذریعے سے ہیں۔ اس لیے ان روایتوں کا وہی رُتبہ ہے جو خود واقدی کی روایتوں کا ہے۔ باقی رواۃ میں سے بعض ثقہ ہیں اور بعض غیر ثقہ۔

طبری کے بڑے بڑے شیوخِ روایت مثلاً سلمۃ ابرش، ابن سلمۃ وغیرہ ضعیف الروایۃ ہیں۔

اس بنا پر مجموعی حیثیت سے سیرۃ کا ذخیرہ، کتبِ حدیث کا ہم پلہ نہیں البتہ ان میں سے تحقیق و تنقید کے معیار پر جو اُتر جائے وہ حجت اور استناد کے قابل ہے۔

کتبِ حدیث و سیرۃ میں فرقِ مراتب

سیرت کی کتابوں کی کم پایگی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تحقیق اور تنقید کی ضرورت احادیثِ احکام کے ساتھ مخصوص کر دی۔ یعنی وہ روایتیں تنقید کی زیادہ محتاج ہیں جن سے شرعی احکام ثابت ہوتے ہیں۔ باقی جو روایتیں سیرت اور فضائل وغیرہ سے متعلق ہیں، اُن میں تشدد اور

احتیاط کی چنداں حاجت نہیں۔ حافظ زین الدین عراقی جو بہت بڑے پایہ کے محدث ہیں۔ سیرتِ منظوم کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

ولیعلم الطالب ان السیرا تجمع ما صح و ما قد انکرا	طالب کو جاننا چاہیے کہ سیرت میں سبھی طرح کی روایتیں ہوتی ہیں، صحیح اور غلط بھی۔

یہی وجہ ہے کہ مناقب اور فضائلِ اعمال میں کثرت سے ضعیف روایتیں شائع ہو گئیں، اور بڑے بڑے علماء نے اپنی کتابوں میں ان روایتوں کا درج کرنا جائز رکھا۔ علامہ ابن تیمیہ کتاب التوسل[۱] میں لکھتے ہیں:

قد رواہ من صنف فی عمل یوم و لیلۃ کابن السنی و ابی نعیم و فی مثل ھذہ الکتب احادیث کثیرۃ موضوعۃ لا یجوز الاعتماد علیھا فی الشریعۃ باتفاق العلماء۔	اس حدیث کو ان لوگوں نے روایت کیا ہے، جنھوں نے رات دن کے اعمال میں کتابیں تصنیف کی ہیں۔ مثلاً ابن السنی اور ابو نعیم، اور اس قسم کی کتابوں میں کثرت سے جھوٹی حدیثیں موجود ہیں۔ جن پر اعتماد کرنا ناجائز ہے۔ اور اس پر تمام علما کا اتفاق ہے۔

حاکم نے مستدرک میں یہ حدیث روایت کی ہے کہ جب حضرت آدمؑ سے خطا سرزد ہوئی تو انھوں نے کہا "اے خدا! میں تجھ کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا واسطہ دیتا ہوں کہ میری خطا معاف کر دے۔" خدا نے کہا "تم نے محمدؐ کو کیونکر جانا؟" حضرت آدمؑ نے کہا "میں نے سر اٹھا کر عرش کے پایوں پر نظر ڈالی تو یہ الفاظ لکھے ہوئے دیکھے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ اس سے میں نے قیاس کیا کہ تو نے اپنے نام کے ساتھ جس شخص کا نام ملایا ہے، وہ ضرور تجھ کو محبوب ترین خلق ہو گا۔" خدا نے کہا

---

[۱] مطبوعہ مطبع المنار، صفحہ ۹۹۔

ادم ! اور نہ ہوئے ہوں ... ا حا ا

حدیث کو نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ علامہ ابن تیمیہ حاکم کا یہ قول نقل کر کے لکھتے ہیں:

واما تصحیح الحاکم بمثل هذا الحدیث وامثاله فهذا مما انکره علیه ائمة العلم بالحدیث وقالوا ان الحاکم یصحح احادیث وهی موضوعة مکذوبة عند اهل المعرفة بالحدیث ......
وکذلک احادیث کثیرة فی مستدرکه یصححها وهی عند ائمة اهل العلم بالحدیث موضوعة۔

حاکم کا اس قسم کی حدیثوں کو صحیح کہنا ائمہ حدیث نے اس پر انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ حاکم بہت سی جھوٹی اور موضوع حدیثوں کو صحیح کہتے ہیں۔ اسی طرح حاکم کی مستدرک میں بہت سی حدیثیں ہیں، جن کو حاکم نے صحیح کہا ہے۔ حالانکہ وہ ائمہ حدیث کے نزدیک موضوع ہیں۔

علامہ موصوف ایک اور موقع پر ابو الشیخ اصفہانی کی کتاب کا تذکرہ کر کے لکھتے ہیں: صفحہ ۱۰۵ و ۱۰۶

وفیها احادیث کثیرة قویة صحیحة وحسنة واحادیث کثیرة ضعیفة موضوعة واهیة وکذلک ما یرویه خیثمة بن سلیمان فی فضائل الصحابة وما یرویه ابو نعیم الاصبهانی فی فضائل الخلفاء فی کتاب مفرد

اور اس میں بہت سی حدیثیں ہیں جو قوی ہیں اور حسن ہیں، اور بہت سی ضعیف اور موضوع اور مہمل ہیں اور اسی طرح وہ حدیثیں جو خیثمہ بن سلیمان، صحابہؓ کے فضائل میں روایت کرتے ہیں، اور وہ حدیثیں جو ابو نعیم اصفہانی نے ایک مستقل کتاب میں خلفاء کے فضائل میں روایت

لہ کتاب التوسل مطبوعہ المنار، صفحہ ۱۰۱ (نیز تذکرۃ الحفاظ ذہبی ترجمۂ حاکم)

وفی اوّل حلیۃ الاولیاء..... وما یرویہ ابوبکر الخطیب ابو الفضل بن ناصر و ابو موسیٰ المدینی و ابو القاسم بن عساکر و الحافظ عبد الغنی و امثالھم ممن لہ معرفۃ بالحدیث۔

کی ہیں اور اسی طرح وہ روایتیں جو ابوبکر خطیب اور ابو الفضل اور ابو موسیٰ مدینی اور ابن عساکر اور حافظ عبد الغنی وغیرہ اور ان کے پایہ کے لوگ، روایت کرتے ہیں۔

غور کرو، ابونعیم، خطیب بغدادی، ابن عساکر، حافظ عبد الغنی وغیرہ حدیث اور روایت کے امام تھے۔ باوجود اس کے یہ لوگ خلفاء اور صحابہؓ کے فضائل میں ضعیف حدیثیں بے تکلف روایت کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ یہ خیال عام طور پر پھیل گیا تھا کہ صرف حلال و حرام کی حدیثوں میں احتیاط اور تشدد کی ضرورت ہے۔ ان کے سوا اور روایتوں میں سلسلۂ سند نقل کر دینا کافی ہے تنقید اور تحقیق کی ضرورت نہیں +

موضوعات ملا علی قاری میں لکھا ہے کہ بغداد میں ایک واعظ نے یہ حدیث بیان کی کہ "قیامت میں خدا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ساتھ عرش پر بٹھاوے گا" امام ابن جریر طبری نے سُنا تو بہت برہم ہوئے اور اپنے دروازہ پر یہ فقرہ لکھ کر لگا دیا کہ "خدا کا کوئی ہم نشین نہیں" اس پر بغداد کے عوام سخت برافروختہ ہوئے اور امام موصوف کے گھر پر اس قدر پتھر برسائے کہ دیواریں ڈھک گئیں [1]

اس موقع پر ایک خاص نکتہ لحاظ کے قابل ہے۔ یہ مسلّم ہے کہ حدیث و روایت

---

[1] موضوعات علی قاری ص ۱۳، مطبوعہ دہلی۔

میں امام بخاری اور مسلم سے بڑھ کر کوئی شخص کامل فن نہیں پیدا ہوا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ان کو جو عقیدت اور خلوص اور شیفتگی تھی اس کے لحاظ سے بھی وہ تمام محدثین پر ممتاز تھے۔ باوجود اس کے فضائل و مناقب کے متعلق جس قسم کی مبالغہ آمیز روایتیں بیہقی، ابو نعیم، بزار، طبرانی وغیرہ میں پائی جاتی ہیں۔ بخاری اور مسلم میں ان کا پتہ نہیں لگتا۔ بلکہ اس قسم کی حدیثیں جو نسائی، ابن ماجہ، ترمذی وغیرہ میں پائی جاتی ہیں، صحیحین میں وہ بھی مذکور نہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس قدر تحقیق و تنقید کا درجہ بڑھتا جاتا ہے۔ مبالغہ آمیز روایتیں گھٹتی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ روایت کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عالم وجود میں آئے تو ایوانِ کسریٰ کے ۱۴ کنگرے گر پڑے، آتشِ فارس بجھ گئی، بحیرۂ طبریہ خشک ہوگیا۔ بیہقی، ابو نعیم، خرائطی، ابن عساکر اور ابن جریر نے روایت کی ہے۔ لیکن صحیح بخاری اور مسلم بلکہ صحاح ستہ کی کسی کتاب میں اس کا پتہ نہیں۔

سیرت پر جو کتابیں لکھی گئیں وہ زیادہ تر اسی قسم کی کتابوں (طبرانی بیہقی ابو نعیم وغیرہ) سے ماخوذ ہیں، اس لیے ان میں کثرت سے کمزور روایتیں درج ہوگئیں، اور اسی بناء پر محدثین کو کہنا پڑا کہ سیر میں ہر قسم کی روایتیں ہوتی ہیں۔

محدثین نے جو اصول قرار دیے تھے۔ سیرت کی روایتوں میں لوگوں نے اکثر نظر انداز کر دیے۔ محدثین کا سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ روایت کا سلسلہ اصل واقعہ تک کہیں منقطع نہ ہونے پائے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالاتِ ولادت کے متعلق جس قدر روایتیں مذکور ہیں، اکثر منقطع ہیں۔ صحابہ رضؓ میں سے کوئی شخص ایسا نہیں، جس کی عمر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے وقت روایت کے قابل ہو۔ سب سے معمر حضرت ابوبکرؓ ہیں، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عمر میں دو برس کم تھے۔ اسی بناء پر میلاد کے متعلق جس قدر روایتیں ہیں اُن میں سے اکثر

متصل نہیں اور اسی بنا پر بہت دُور از کار روایتیں پھیل گئیں۔ مثلاً ابو نعیم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ کی زبانی روایت کی ہے کہ " آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے تو بہت سے پرند آکر مکان میں بھر گئے۔ جن کی زمرّد کی منقار اور یاقوت کے پَر تھے۔ پھر ایک سفید بادل آیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اٹھالے گیا، اور ندا آئی کہ اُس بچہ کو مشرق و مغرب اور تمام دریاؤں کی سیر کراؤ کہ سب لوگ پہچان لیں [۵]۔"

مغازی کا بڑا حصہ امام زہری سے منقول ہے۔ لیکن ان کی اکثر روایتیں جو سیرت ابن ہشام اور طبقات ابن سعد وغیرہ میں مذکور ہیں منقطع ہیں +

تصانیف سیرت میں کُتب احادیث کی طرف سے بے اعتنائی

۲۔ نہایت تعجب انگیز بات یہ ہے کہ جن بڑے بڑے نامور مصنّفین مثلاً امام طبری وغیرہ نے سیرت پر جو کچھ لکھا اُس میں اکثر جگہ مستند احادیث کی کتابوں سے کام نہیں لیا۔

بعض واقعات نہایت اہم ہیں۔ اُن کے متعلق حدیث کی کتابوں میں ایسے مفید معلومات موجود ہیں جن سے تمام مشکل حل ہو جاتی ہے۔ لیکن سیرت اور تاریخ میں ان معلومات کا ذکر نہیں۔ مثلاً یہ امر کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے تو لڑائی کی سلسلہ جنبانی کس کی طرف سے شروع ہوئی ؟ ایک بحث طلب واقعہ ہے۔ تمام ارباب سیر اور مورخین کی تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدا کی۔ لیکن سنن ابی داؤد میں صاف اور صریح حدیث موجود ہے کہ جنگ بدر سے پہلے کفار مکہ نے عبداللہ بن اُبی

---

[۵] مواہب لدنیہ میں یہ روایت نقل کی ہے۔ اس میں بے انتہا مبالغہ آمیز باتیں ہیں۔ میں نے معمولی ٹکڑا نقل کر دیا ہے۔

کو یہ خط لکھا کہ "تم نے محمدؐ کو اپنے شہر میں پناہ دی ہے ان کو نکال دو، ورنہ ہم خود مدینہ آکر تمھارا اور محمدؐ دونوں کا استیصال کر دیں گے۔" سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں یہ واقعہ سرے سے منقول نہیں۔

مصنفین سیرت میں سے بعض لوگوں نے اس نکتہ کو سمجھا، اور جب احادیث کی زیادہ چھان بین کی تو ان کو تسلیم کرنا پڑا کہ سیرت کی کتابوں میں بہت سی روایتیں صحیح حدیثوں کے خلاف درج ہو گئی ہیں، لیکن چونکہ ان کی تصنیف پھیل چکی تھی اس لیے اس کی اصلاح نہ ہو سکی۔ حافظ ابن حجر ایک موقع پر دمیاطی کا ایک قول نقل کر کے لکھتے ہیں:

وَدَلَّ هذا علیٰ انّه کان یعتقدُ الرجوع عن کثیرا ممّا وافق فیه اهل السیر وخالف الاحادیث الصحیحة وَان ذٰلک کان منه قبل تضلّعِهٖ منها ولخروج نُسَخ کتابه وانتشاره لم یتمکّن من تغیرهٖ۔ [1]	یہ قول اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اکثر واقعات جن میں دمیاطی نے اہل سیر کی موافقت اور صحیح حدیثوں کی مخالفت کی تھی، اپنی رائے سے رجوع کیا، لیکن چونکہ کتاب کے نسخے پھیل گئے تھے، اس لیے اس کی اصلاح نہ کر سکے۔

مصنفین سیرت کی تدلیس سیرت میں اگلوں نے جو کتابیں لکھیں، ان سے مابعد کے لوگوں نے جو روایتیں نقل کیں انہی کے نام سے کیں۔ ان کے مستند ہونے کی بنا پر لوگوں نے ان تمام روایتوں کو معتبر سمجھ لیا، اور چونکہ اصل کتابیں ہر شخص کو ہاتھ نہیں آسکتی تھیں، اس لیے لوگ راویوں کا پتہ نہ لگا سکے، اور رفتہ رفتہ یہ

---

[1] غزوہ بدر کے موقع پر ہم اس حدیث کے اصل الفاظ نقل کریں گے [2] زرقانی جلد ۳، صفحہ ۱۱

روایتیں تمام کتابوں میں داخل ہوگئیں۔ اس تدلیس کا یہ نتیجہ ہوا کہ مثلاً جو روایتیں واقدی کی کتاب میں مذکور ہیں، ان کو لوگ عموماً غلط سمجھتے ہیں لیکن انہیں روایتوں کو جب ابن سعد کے نام سے نقل کر دیا جاتا ہے تو لوگ ان کو معتبر سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ابن سعد کی کتاب ہاتھ آئی تو پتہ لگا کہ ابن سعد نے اکثر روایتیں واقدی ہی سے لی ہیں۔

اصول روایت سے ہر جگہ کام نہیں لیا گیا

۴۔ روایت کے متعلق جو اصول منضبط ہوئے صحابہؓ کے متعلق ان سے بعض بعض موقعوں پر کام نہیں لیا گیا مثلاً اصول روایت کی رو سے رواۃ کے مختلف مدارج ہیں۔ کوئی راوی نہایت ضابط، نہایت معنی فہم، نہایت دقیقہ رس ہوتا ہے۔ کسی میں یہ اوصاف کم ہوتے ہیں، کسی میں اور بھی کم ہوتے ہیں۔ یہ فرق مراتب جس طرح فطرۃً عام راویوں میں پایا جاتا ہے، صحابہؓ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ حضرت عائشہ رضؓ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت ابوہریرہ رضؓ کی روایت پر، اور حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ نے حضرت ابوہریرہ کی روایت پر جو تنقیدیں کیں، اور جن کا ذکر اوپر گزر چکا، اسی بنا پر کیں۔ اختلاف مراتب کی بنیاد پر بڑے بڑے معرکۃ الآرا مسائل کی بنیاد قائم ہے، مثلاً دو روایتوں میں تعارض پیش آجائے تو اس بحث کے فیصلے میں صحیح طریقہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ایک روایت کے راوی کا دوسری روایت کے راویوں سے عالی رتبہ ہونا ثابت کر دیا جائے (گو دونوں راوی ثقہ ہیں) اور یہ اس روایت کی ترجیح کا قطعی ذریعہ ہوگا۔ لیکن صحابہؓ میں آکر یہ اصول بیکار ہو جاتا ہے۔ فرض کرو ایک روایت صرف حضرت عمرؓ سے مروی ہے اور دوسری کسی بدوی عرب سے مروی ہے، جس نے عمر بھر میں صرف ایک دفعہ اتفاقاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لیا تھا، تو اب دونوں روایتوں کا رتبہ برابر ہو جاتا ہے۔ علامہ مازری مشہور

محدّث ہیں۔ علّامہ نووی شرح صحیح مسلم میں اکثر اُن سے استناد کرتے ہیں۔
انھوں نے اس تعمیم کی مخالفت کی تھی۔ چنانچہ حافظ ابنِ حجر نے اصابہ کے دیباچہ
(صفحہ ۱۰ و ۱۱) میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے:

لسنا نعني بقولنا الصحابة عدول کل من رآه صلی اللہ علیہ وسلم یوماً ما او زاره لماماً او اجتمع به لغرضٍ وانصرف عن کثب وانما نعني به الذين لازموه وعزروه ونصروه واتبعوا الذی انزل معه اولئك هم المفلحون ۔	یہ مقولہ کہ صحابہ سب عادل ہیں، ہم اس سے ہر ایسے شخص کو مُراد نہیں لیتے جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اتفاقاً دیکھ لیا یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی غرض کے لیے ملا اور پھر فوراً واپس چلا گیا، بلکہ ہم ان لوگوں کو مُراد لیتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بالتزام رہے اور آپؐ کی اعانت و مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہُوا، یہی لوگ کامیاب ہیں۔

لیکن محدثین نے مازری کے اس قول سے عام مخالفت کی۔ علّامہ مازری نے بے شبہ یہ غلطی کی کہ عدالت کے وصف کو مطلقاً مقربینِ صحابہ رضؓ سے مخصوص کر دیا، اس بنا پر محدثین کی مخالفت اُن سے بیجا نہیں۔ لیکن اس میں کیا شبہہ ہو سکتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضؓ و عمر رضؓ و علی رضؓ کی روایتیں، ایک عام بدوی کی روایت کے برابر نہیں ہو سکتیں خصوصاً اُن روایتوں کے متعلق یہ فرق ضرور ملحوظ رکھنا چاہیے جو فقہی مسائل یا دقیق مطالب سے تعلق رکھتی ہیں۔

واقعات میں سلسلۂ علّت و معلول نہیں قائم کیا گیا

۵۔ اربابِ سیر اکثر واقعات کے اسباب و علل سے بحث نہیں کرتے، نہ ان کی تلاش و تحقیق کی طرف متوجہ ہوتے۔ اگرچہ اس میں شبہہ نہیں کہ اس باب میں یورپ کا طریقہ نہایت غیر معتدل

ہے۔ یورپین مورّخ ہر واقعہ کی علت تلاش کرتا ہے، اور نہایت دور دراز قیاسات اور احتمالات سے سلسلہ معلولات پیدا کرتا ہے۔ اس میں بہت کچھ اُس کی خود غرضی اور خاص مطمحِ نظر کو دخل ہوتا ہے۔ وہ اپنے مقصد کو ایک محور بنالیتا ہے تمام واقعات اسی کے گرد گردش کرتے ہیں۔ بخلاف اس کے اسلامی مورّخ نہایت سچائی اور انصاف، اور خالص بے طرفداری سے واقعات کو ڈھونڈتا ہے۔ اس کو اس سے کچھ غرض نہیں ہوتی کہ واقعات کا اثر اُس کے مذہب پر، معتقدات پر اور تاریخ پر کیا اثر پڑے گا۔ اس کا قبلہ مقصد صرف واقعیت ہوتی ہے، وہ اس پر اپنے معتقدات اور قومیت کو بھی قربان کر دیتا ہے۔

لیکن اس میں حد سے زیادہ تفریط ہو گئی۔ اس بات سے بچنے کے لیے کہ واقعات رائے سے مخلوط نہ ہو جائیں، وہ پاس پاس کے ظاہری اسباب پر بھی نظر نہیں ڈالتا، اور ہر واقعہ کو خشک اور ادھورا چھوڑ دیتا ہے۔ مثلاً اکثر لڑائیوں کو اس طرح شروع کرتے ہیں کہ آنحضرت (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ) نے فلاں قبیلے پر فلاں وقت فوجیں بھیج دیں۔ لیکن اس کے اسباب کا ذکر مطلق نہیں کرتے، جس سے عام ناظرین پر یہ اثر پڑتا ہے کہ کفار پر حملہ کرنے، اور ان کو تباہ و برباد کرنے کے لیے کسی سبب اور وجہ کی ضرورت نہیں۔ صرف یہ عام وجہ کافی ہے کہ وہ کافر ہیں! اسی سے مخالفین یہ استدلال کرتے ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے۔ حالانکہ زیادہ چھان بین سے ثابت ہوتا ہے کہ جن قبائل پر فوجیں گئیں، وہ پہلے سے آمادۂ جنگ، اور مسلمانوں پر حملے کی تیاریاں کر چکے تھے۔

نوعیتِ واقعہ کے لحاظ سے شہادت کا معیار نہیں قائم نہیں کیا گیا

۶۔ یہ لحاظ رکھنا ضرور ہے کہ واقعہ کی نوعیت کے بدلنے سے شہادت اور روایت کی حیثیت کہاں تک بدل جاتی ہے۔ مثلاً ایک راوی جو ثقہ ہے ایک ایسا معمولی واقعہ بیان کرتا ہے۔

جو عموماً پیش آتا ہے اور پیش آسکتا ہے تو بے تکلف یہ روایت تسلیم کرلی جائیگی۔
لیکن فرض کرو، وہی راوی ایسا واقعہ بیان کرتا ہے جو غیر معمولی ہے۔ تجربۂ عام کے خلاف ہے۔ گردوپیش کے واقعات سے مناسبت نہیں رکھتا، تو واقعہ چونکہ زیادہ محتاج ثبوت ہے، اس لیے اب راوی کا معمولی درجہ وثوق کافی نہیں ہوسکتا، بلکہ اس کو معمولی درجہ سے زیادہ عادل، زیادہ محتاط، زیادہ نکتہ دان ہونا چاہیے۔

مثلاً ایک بحث یہ ہے کہ روایت کرنے کے لیے کسی عمر کی قید ہے یا نہیں؟ اکثر محدثین کا مذہب ہے کہ پانچ برس کا لڑکا حدیث کی روایت کرسکتا ہے، یعنی مثلاً اگر کسی صحابی نے پانچ برس کی عمر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قول یا فعل کی روایت کی، تو قابلِ اعتبار ہوگی۔ محدثین کا اس پر استدلال ہے کہ محمود بن الربیع رض ایک صحابی رض تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وفات فرمانے کے وقت وہ پانچ برس کے بچے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ اظہارِ محبت کے طور پر اُن کے مُنہ پر کُلی کا پانی ڈال دیا تھا، اس واقعہ کو انھوں نے جوان ہوکر لوگوں سے بیان کیا، اور سب نے یہ روایت قبول کی، اس سے ثابت ہُوا کہ ۵ برس کی عمر کی روایت قبول ہوسکتی ہے[1]۔

اس کے برخلاف بعض محدثین کی رائے ہے کہ کمسن کی روایت قابلِ حجت نہیں فتح المغیث میں ہے:

ولکن قد منع قوم القبول هنا ای فی مسئلة الصبی خاصة فلم یقبلوا من تحمل قبل البلوغ	(لیکن ایک جماعت یہاں قبول روایت سے منع کرتی ہے۔ خصوصاً بچوں کی روایت کے مسئلہ میں، بلوغ سے پہلے جو روایت کسی بچہ

[1] یہ پوری بحث فتح المغیث صفحہ ۱۶۶ تا ۱۶۸ میں ہے۔

لان الصبی مظنة عدم الضبط وھو وجه للشافعیه.... وکذا کان ابن المبارک یتوقف فی تحدیث الصبی۔ (کتاب مذکور ص۱۶۴)	نے سُنی ہو، اس کو وہ قبول نہیں کرتی۔ شوافع کی یہی رائے ہے۔ اسی طرح عبداللہ ابن مبارک بھی بچّہ کی روایت حدیث کرنے میں توقف کرتے ہیں۔

لیکن اثبات و نفی، دونوں پہلو بحث طلب ہیں۔ بے شبہہ ۵ برس کا بچّہ اگر یہ واقعہ بیان کرے کہ مَیں نے فلاں شخص کو دیکھا تھا، اس کے سر پر بال تھے یا وہ بوڑھا تھا، یا اس نے مجھ کو گودیوں میں کھلایا تھا، تو اس روایت میں شُبہہ کرنے کی وجہ نہیں لیکن فرض کرو وہی بچّہ یہ بیان کرتا ہے کہ فلاں شخص نے فقہ کا یہ دقیق مسئلہ بتایا تھا، تو شُبہہ ہوگا کہ بچّہ نے صحیح طور سے مسئلہ کو سمجھا بھی تھا یا نہیں؟

فقہا نے اس نکتہ کو ملحوظ رکھا ہے۔ فتح المغیث میں شرح مہذب سے نقل کیا ہے:

قبول اخبار الصبی الممیز فیما طریقه المشاهدة بخلاف ما طریقة النقل کالافتاء وروایة الاخبار ونحوه (نسخہ مطبوعہ لکھنؤ ص۱۳۲)	باتمیز لڑکے کی روایت ان واقعات کے متعلق مقبول ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہوں لیکن جو باتیں نقلیات میں داخل ہیں مثلاً فتویٰ یا حدیث کی روایت ان میں اُن کی روایت مقبول نہیں۔

لیکن عام طور سے یہ اصول تسلیم نہیں کیا گیا، فتح المغیث میں ہے:

ثم الضبط نوعان ظاھرٌ وباطن فالظاھر ضبط معناہ من حیث اللغة، والباطن ضبط معناہ من حیث تعلق الحکم الشرعی	پھر ضبط[۵] کی دو قسمیں ہیں ظاہری اور باطنی، ظاہری کے یہ معنی ہیں کہ لفظ کے لغوی معنی کا لحاظ رکھا جائے۔ باطنی کے یہ معنی کہ شرعی حکم جس بنا پر متعلق ہے اس کا لحاظ رکھا جائے، اس کو فقہ کہتے

۵ ضبط کا لفظ محدثین کی ایک اصطلاح ہے جس کے معنی ہیں روایت کے الفاظ اور مطلب کو اچھی طرح سمجھنا اور ادا کرنا۔

به وهو الفقه ومطلق الضبط الذی هو شرط فی الراوی هو الضبط ظاهرا عند الاکثر لانه یجوز نقل الخبر بالمعنی فیلحقه تهمة تبدیل المعنی بروایته قبل الحفظ او قبل العلم حین سمع ولهذا المعنی قلت الروایة عن اکثر الصحابة لتعذر هذا المعنی قال وهذا الشرط وان کان ما بینا فان اصحاب الحدیث قل ما یعتبرونه فی حق الطفل دون المغفل فانه متی صح عندهم سماع الطفل او حضوره اجازوا روایته ، (ص ۱۲۱)

ہیں۔ ہے اکثروں کے نزدیک وہ صرف ضبط ہے۔ کیونکہ ان لوگوں کے نزدیک روایت بالمعنی جائز ہے۔ اسی بنا پر سننے وقت قلتِ حفظ یا قلتِ علم کے سبب سے روایت کے ادا کرتے میں راوی پر مفہوم کے بدل دینے کا شبہہ ہو سکتا ہے، یہ وجہ ہے کہ اکثر صحابہ رضؓ نے بہت کم حدیثیں روایت کیں۔ کیونکہ مفہوم کا بعینہٖ روایت میں قائم رکھنا مشکل ہے لیکن محدثینؒ بچہ کے حق میں، بے عقل کے حق میں نہیں اس کا اعتبار نہیں کرتے، بلکہ بچہ ان کے نزدیک جب سننے اور مجلس میں شریک ہونے کے قابل ہو گیا تو اس کی روایت کو جائز سمجھتے ہیں۔

ایک یہ بحث ہے کہ جو صحابہؓ فقیہ نہ تھے، اُن کی روایت اگر قیاس شرعی کے خلاف ہو تو واجب العمل ہو گی یا نہیں؟ اس کے متعلق بحر العلوم، امام فخر الاسلام کا مذہب نقل کر کے لکھتے ہیں:

ووجه قول الامام فخر الاسلام ان النقل بالمعنی شائع وقلما یوجد النقل باللفظ فان حادثة واحدة قد رویت بعبارات

امام فخر الاسلام کے قول کی وجہ یہ ہے کہ روایت بالمعنی عام طور پر شائع ہے اور ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ روایت باللفظ کی جائے۔ کیونکہ ایک ہی واقعہ مختلف الفاظ میں ادا کیا گیا ہے، اور یہ الفاظ باہم

مختلفۃ ثم ان تلك العبارات لیست مترادفۃ بل قد روی ذلك المعنی بعبارات مجازیۃ فاذا کان الراوی غیر فقیہ احتمل الخطاء فی فہم المعنی المرادی الشرعی..... ولا یلزم منہ نسبۃ الکذب متعمدا الی الصحابی معاذ اللہ عن ذالك۔ (شرح مسلم مطبوعہ لکھنؤ ص ۴۳۲)

مرادف بھی نہیں، بلکہ اکثر مجازی عبارتوں میں مطالب ادا کیے گئے ہیں، اس بنا پر جب راوی فقیہ نہ ہوگا تو احتمال ہوگا کہ اس نے مطلب مقصود شرعی کے سمجھنے میں غلطی کی ہو، اس سے معاذ اللہ یہ لازم نہیں آتا کہ صحابی کی طرف جھوٹ کی نسبت کی جائے۔

محدثین اس اصول سے کہ "واقعہ جس درجہ کا اہم ہو، شہادت بھی اسی درجہ کی اہم ہونی چاہیے" بے خبر نہ تھے۔ امام بیہقی کتاب المدخل میں ابن مہدی کا قول نقل کرتے ہیں:

اذا روینا عن النبی صلعم فی الحلال و الحرام والاحکام شددنا فی الاسانید وانتقدنا فی الرجال و اذا روینا فی الفضائل والثواب و العقاب سہلنا فی الاسانید و تسامحنا فی الرجال۔ (فتح المغیث صفحہ ۱۲۰)

جب ہم آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے حلال و حرام اور احکام کے متعلق حدیث روایت کرتے ہیں تو سند میں نہایت تشدد کرتے ہیں اور راویوں کو پرکھ لیتے ہیں لیکن جب فضائل اور ثواب عقاب کی حدیثیں آتی ہیں تو ہم سندوں میں سہل انگاری کرتے اور راویوں کے متعلق چشم پوشی کرتے ہیں۔

امام احمد بن حنبل کا قول ہے:

ابن اسحاق رجل تکتب عنہ ھذہ الاحادیث یعنی المغازی ونحوھا واذا جاء الحلال والحرام اردنا

ابن اسحاق اس درجہ کے آدمی ہیں کہ مغازی وغیرہ کی حدیثیں ان سے روایت کی جاسکتی ہیں لیکن جب حلال و حرام کے مسائل آئیں تو ہم

قومًا ھٰکذا او قبض اصابع یدیه الاربع + کو ایسے لوگ درکار ہیں، یہ کہ گر اُنھوں نے چار انگلیاں بند کر کے دبالیں + (فتح المغیث صفحہ ۱۲۰)

اس سے ثابت ہوا کہ محدثین واقعہ کی اہمیّت کی بنا پر راوی کے درجے کا لحاظ رکھتے تھے۔ اسی بنا پر ابن اسحاق کی نسبت امام ابن حنبل نے یہ تفریق کی کہ "حلال و حرام میں ان کی شہادت معتبر نہیں لیکن مغازی میں ان کا اعتبار ہے" یہ وہی اصول ہے کہ جس درجہ کا واقعہ ہو اُسی درجہ کی شہادت ہونی چاہیے۔ اور یہ کہ واقعہ کے بدلنے سے شہادت کی اہمیّت بدل جاتی ہے لیکن واقعہ کی اہمیت، احکام فقہیہ کے ساتھ مخصوص نہیں +

نوعیّتِ واقعہ کی اہمیت کا خیال، فقہائے حنفیہ نے ملحوظ رکھا۔ اسی بنا پر ان کا مذہب ہے کہ جو روایت قیاس کے خلاف ہو اس کی نسبت یہ دیکھنا چاہیے کہ راوی فقیہ اور مجتہد بھی ہے، یا نہیں! منار میں ہے:

والراوی ان عرف بالفقه و التقدم فی الاجتهاد کالخلفاء الراشدین والعبادلة کان حدیثه حجةً یترك به القیاس خلافا لمالكٍ وان عرف بالعدالة والضبط دون الفقه کانس وابی هریرة ان وافق حدیثه القیاس عمل به وان خالفه لم یترك الابالضرورة +

راوی اگر تفقہ اور اجتہاد میں مشہور ہے جیسے کہ خلفائے راشدینؓ یا عبادلہؓ تھے تو اس کی حدیث حجّت ہوگی اور اس کے مقابلے میں قیاس چھوڑ دیا جائے گا، (بخلاف امام مالک کے) اور اگر راوی ثقہ اور عادل ہے لیکن فقیہ نہیں جیسے کہ حضرت انسؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ ہیں تو اگر وہ روایت قیاس کے موافق ہوگی تو اس پر عمل ہوگا ورنہ قیاس کو بغیر ضرورت ترک نہ کیا جائے +

(نور الانوار، ص ۱۷۶، ۱۷۷)

حضرت ابوہریرہ رضؓ کی مثال اگرچہ قابلِ بحث ہے، کیونکہ اکثر علما کے نزدیک حضرت ابوہریرہ رضؓ فقیہ اور مجتہد تھے لیکن یہ جزوی بحث ہے، گفتگو اصل مسئلہ میں ہے۔

روایت میں قیاس کا کس قدر حصّہ شامل ہے

۷۔ سب سے اہم اور سب سے زیادہ قابلِ بحث یہ بات ہے کہ راوی جو واقعہ بیان کرتا ہے اُس میں کس قدر حصّہ اصل واقعہ ہے اور کس قدر راوی کا قیاس ہے تفحّص اور استقرا سے بعض جگہ یہ نظر آتا ہے کہ راوی جس چیز کو واقعہ کی حیثیّت سے بیان کرتا ہے، وہ اُس کا قیاس ہے، واقعہ نہیں، اس کی بہت سی مثالیں سیرت میں موجود ہیں۔ یہاں ہم صرف ایک دو واقعہ پر اکتفا کرتے ہیں:

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم جب ازواجِ مطہراتؓ سے ناراض ہو کر تنہا نشین ہو گئے تھے، تو یہ مشہور ہوا کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ازواج کو طلاق دے دی۔ حضرت عمر رضؓ نے یہ خبر سنی تو مسجد نبویؐ میں آئے۔ یہاں لوگ کہہ رہے تھے[۱] کہ آنحضرت (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے ازواج کو طلاق دے دی۔ حضرت عمرؓ نے خود رسول اللہ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی خدمت میں حاضر ہو کر دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ نہیں میں نے طلاق نہیں دی۔

یہ حدیث بخاری میں کئی جگہ بہ اختلافِ الفاظ مذکور ہے۔ کتاب النکاح میں جو روایت ہے اس کی شرح میں حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

وان الاخبار التی تشاع ولو کثر نافلها ان لم یکن مرجعها الی	جو خبریں شائع ہو جاتی ہیں گو اُن کے راوی کثرت سے ہوں لیکن اگر اُن خبروں کی بنیاد امر حسّی

---

[۱] صحیح مسلم باب فی الایلاء

امرٍ حسّی من مشاهدۃ او سماع لا تستلزم الصدق فانّ جزم الانصاری فی روایتہ بوقوع التطلیق وکذا جزم النّاس الذی رآھم عمر عند المنبر بذٰلک محمولٌ علی انّہ شاع بینھم ذٰلک من شخصٍ بناہ علی التوھّم الّذی توھّم من اعتزال النبی صلّی اللّٰہ علیہ وسلم نساءہ فظن لکونہ لم تجر عادتہ بذٰلک انہ طلقھن فاشاع انہ طلقھنّ فشاع ذٰلک فتحدث النّاس بہ واخلق بھذا الذی ابتداء باشاعۃ ذٰلک ان یکون من المنافقین کما تقدم۔	یعنی مشاہدہ یا استماع نہ ہو تو ان کا سچا ہونا ضرور نہیں۔ چنانچہ انصاری نے اور ان صحابہ رضؓ نے جن کو حضرت عمر رضؓ نے منبر کے پاس دیکھا، طلاق کا جو یقین کر لیا وہ یوں ہوا ہوگا کہ کسی شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپؐ نے ازواج مطہرات سے علیحدگی اختیار کر لی ہے، اور چونکہ آنحضرت صلی اللہ کی یہ عادت نہ تھی، اس لیے اس نے یہ قیاس کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طلاق دے دی، اس نے یہ خبر پھیلا دی، اور ایک دوسرے سے اس کو بیان کرنے لگے۔ اور قیاس یہ ہے کہ اوّل جس شخص نے یہ خبر پھیلائی، وہ منافق ہوگا۔

(فتح الباری شرح بخاری طبع اوّل مصر جلد ۹ صفحہ ۲۵۷)

غور کرو، مسجد نبوی صلعم میں تمام صحابہ رضؓ جمع ہیں اور سب بیان کر رہے ہیں کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے طلاق دے دی۔ صحابہ رضؓ عموماً ثقہ اور عادل ہیں۔ اور ان کی تعداد کثیر اس واقعہ کو بیان کر رہی ہے۔ باوجود اس کے جب تحقیق کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ واقعہ نہیں بلکہ قیاس تھا۔ حافظ ابن حجر نے بڑی جراٴت کر کے یہ خیال ظاہر کیا کہ راویِ اوّل منافقین میں سے ہوگا۔ حضرت عائشہ صدّیقہ رضؓ کی نسبت بہت سے ایسے واقعات روایتوں میں مذکور ہیں، جن

میں سے ایک واقعۂ افک ہے۔ ان کی نسبت بھی وہی قیاس ہونا چاہیے جو ابن حجر نے یہاں ظاہر کیا ہے یہ کہ منافقین نے ان کی طرف منسوب کر دیے ہوں گے، پھر تمام مسلمانوں میں پھیل گئے۔

فنِ تاریخ پر خارجی اسباب کا اثر

۸۔ فنِ تاریخ و روایت پر جو خارجی اسباب اثر کرتے ہیں، ان میں سب سے بڑا قومی اثر حکومت کا ہوتا ہے۔ لیکن مسلمانوں کو ہمیشہ اس پر فخر کا موقع حاصل رہے گا کہ ان کا قلم تلوار سے نہیں دبا۔ حدیثوں کی تدوین بنو امیہ کے زمانے میں ہوئی، جنھوں نے پورے ۹۰ برس تک سندھ سے ایشیائے کوچک اور اندلس تک مساجد جامع میں آلِ فاطمہ کی توہین کی اور جمعہ میں سرِ منبر حضرت علی رضؓ پر لعن کہلوایا۔ سیکڑوں ہزاروں حدیثیں امیر معاویہ رضؓ وغیرہ کے فضائل میں بنوائیں۔ عباسیوں کے زمانے میں ایک ایک خلیفہ کے نام بنام پیش گوئیاں حدیثوں میں داخل ہوئیں۔ لیکن نتیجہ کیا ہوا، عین اُسی زمانہ میں محدثین نے منادی کر دی کہ یہ سب جھوٹی روایتیں ہیں۔ آج حدیث کا فن اس خس و خاشاک سے پاک ہے، اور بنو امیہ اور عباسیہ جو ظل اللہ اور جانشینِ پیغمبر تھے، اُسی مقام پر نظر آتے ہیں جہاں ان کو ہونا چاہیے تھا۔

ایک دفعہ ایک شاعر نے مامون الرشید کے دربار میں قصیدہ پڑھا کہ "امیر المومنین! اگر تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے انتقال کے وقت موجود ہوتا تو خلافت کا جھگڑا سرے سے نہ پیدا ہوتا، دونوں فریق تیرے ہاتھ پر بیعت کر لیتے"۔ وہیں سرِ دربار ایک شخص نے اُٹھ کر کہا "تو جھوٹ کہتا ہے۔ امیر المومنین کا باپ (حضرت عباس رضؓ جو عباسیوں کے مورثِ اعلیٰ ہیں) وہاں موجود تھا، اس کو کس نے پوچھا"، مامون الرشید کو بھی اس گستاخانہ لیکن سچ جواب کی تحسین کرنی پڑی۔

تاہم یہ عالمگیر مؤثر بالکل بے اثر نہیں رہ سکتا تھا، اس لیے **مغازی** میں اس کے نشانات پائے جاتے ہیں۔ تاریخ نگاری کا قدیم طریقہ یہ تھا کہ فتوحات اور رزمیہ کارناموں کو نہایت تفصیل سے لکھتے تھے۔ ملکی نظم و نسق اور تمدن و معاشرت کے واقعات یا تو بالکل قلم انداز کر جاتے تھے، یا اس طرح پراگندہ اور بے اثر لکھتے تھے کہ اُن پر نگاہ نہیں پڑتی تھی۔ اسلام میں جب تالیف و تصنیف کی ابتدا ہوئی تو یہی نمونے پیشِ نظر تھے۔ اس کا پہلا نتیجہ یہ تھا کہ **سیرت** کا نام مغازی رکھا گیا۔ جس طرح سلاطین کی تاریخیں جنگ نامہ و شاہنامہ کے نام سے لکھی جاتی ہیں۔ چنانچہ سیرت کی ابتدائی تصنیف مثلاً سیرت موسیٰ بن عقبہ اور سیرت ابن اسحاق **مغازی** ہی کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کتابوں کی ترتیب یہ ہے کہ سلاطین کی تاریخ کی طرح، سنین کو عنوان بناتے ہیں، اور اسی ترتیب سے حالات لکھتے ہیں۔ یہ حالات تمام تر جنگی معرکے ہوتے ہیں، اور غزوات ہی کے عنوان سے داستانیں شروع کی جاتی ہیں۔

یہ طریقہ اگرچہ سلطنت و حکومت کی تاریخ کے لیے بھی صحیح نہ تھا، لیکن نبوت کی سوانح نگاری کے لیے تو ناموزوں ہے۔ پیغمبر کو ناگزیر طور پر جنگی واقعات پیش آتے ہیں۔ اس خاص حالت میں وہ بظاہر ایک فاتح یا سپہ سالار کے رنگ میں نظر آتا ہے، لیکن یہ پیغمبر کی اصلی صورت نہیں ہے۔ پیغمبر کی زندگی کا ایک ایک خط و خال، تقدس، نزاہت، حلم و کرم، ہمدردی عام اور ایثار ہوتا ہے، بلکہ عین اس وقت جب کہ اس پر سکندرِ اعظم کا دھوکا ہوتا ہے، ژرف بین نگاہ فوراً پہچان لیتی ہے کہ سکندر نہیں بلکہ فرشتۂ یزدانی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مغازی کا انداز حدیث کی کتابوں میں سیرت کی تصنیفات سے بالکل الگ ہے۔

تمام اربابِ سیر لکھتے ہیں کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جب بنو نضیر کا محاصرہ کیا تو حکم دیا کہ ان کے نخلستان کاٹ ڈالے جائیں (قرآن مجید میں بھی اس کا اجمالی ذکر ہے) اربابِ سیر یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہودیوں نے اس حکم کی نسبت یہ اعتراض کیا کہ "یہ انصاف اور انسانیت کے خلاف ہے"! لیکن مؤرخین یہ اعتراض نقل کر کے اس کا جواب نہیں دیتے اور یونہی گزر جاتے ہیں۔

قیاس و درایت ۹۔ نہایت مہتم بالشان بحث یہ ہے کہ کوئی روایت اگر عقل، یا مسلّمات، یا دیگر قرائن صحیحہ کے خلاف ہے تو آیا صرف اس وجہ سے واجب التسلیم ہوگی یا نہیں، کہ رواۃ ثقہ ہیں اور سلسلہ سند متصل ہے؟ علامہ ابن جوزی نے اگرچہ لکھا ہے (جیسا کہ اوپر گزر چکا) کہ جو حدیث عقل کے خلاف ہو، اس کی رُواۃ کی جرح و تعدیل کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس سے اصل بحث کا فیصلہ نہیں ہوتا، عقل کا لفظ ایک غیر مشخص لفظ ہے۔ حامیانِ روایت لکھتے ہیں کہ اگر اس لفظ کو وسعت دے دی گئی تو ہر شخص جس روایت سے چاہے گا انکار کر دے گا، کہ یہ میرے نزدیک عقل کے خلاف ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس بحث کا قطعی فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ جس روایت کے رُواۃ ثقہ اور مستند ہوں اور سلسلۂ روایت کہیں سے منقطع نہ ہو وہ باوجود خلافِ عقل ہونے کے انکار کے قابل نہیں۔ ذیل کی مثالوں سے اس کا اندازہ ہوگا:

(۱) تلك الغرانيق العلی کی حدیث کو، جس میں بیان ہے کہ شیطان نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبانِ مبارک سے وہ الفاظ نکلوا دیئے جن میں بتوں کی تعریف ہے بعض محدثین نے ضعیف اور ناقابلِ اعتبار کہا تھا، اس کے باطل ہونے کی ایک عقلی دلیل یہ بیان کی تھی:

لو وقع لارتدّ کثیر ممن اسلمٗ ولم ینقل ذالک ۔	اگر ایسا ہوتا تو بہت سے مسلمان اسلام سے پھر جاتے، حالانکہ ایسا ہونا مذکور نہیں ۔

حافظ ابن حجر، فتح الباری میں اس قول کو نقل کر کے لکھتے ہیں :

وجمیع ذالک لا یتمشّی علی القواعد فان الطرق اذا کثرت وتباینت مخارجھا دل ذالک علی ان لھا اصلاً [1]	یہ تمام اعتراضات اصول کے موافق چل نہیں سکتے۔ اس لیے کہ روایت کے طریقے جب متعدد ہوتے ہیں اور ان کے مآخذ مختلف ہوتے ہیں تو یہ اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ روایت کی کچھ اصل ہے۔

(۳) صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تین دفعہ جھوٹ بولے تھے۔ امام رازی نے اس حدیث سے اس بنا پر انکار کیا کہ "اس سے حضرت ابراہیمؑ کا جھوٹ بولنا لازم آتا ہے، اس لیے زیادہ آسان صورت یہ ہے کہ ہم حدیث کے کسی راوی کا جھوٹا ہونا مان لیں"۔ علامہ قسطلانی امام رازی کا یہ قول نقل کر کے لکھتے ہیں :

فلیس بشیٔ اذا لحدیث صحیح ثابت ولیس فیہ نسبۃ محض الکذب الی الخلیل وکیف السبیل الی تخطیۃ الرّاوی مع قولہ انّی سقیمٌ وبل فعلہ کبیرھم ھذا وعن سارۃ اختی اذ ظاھر ھذہ الثلاثۃ بلا ریب غیر مرادٍ [2]	امام رازی کا قول بالکل ہیچ ہے۔ اس لیے کہ حدیث ثابت ہے، اور اس میں محض کذب کی نسبت حضرت خلیلؑ کی طرف نہیں ہے۔ اور راوی کا تخطیہ کیونکر ہوسکتا ہے جب کہ حضرت ابراہیمؑ کا یہ قول موجود ہے، انی سقیم اور بل فعلہ کبیرھم ھذا اور سارہ اختی، کیونکہ ان تینوں جملوں میں ظاہری لفظ قطعاً مراد نہیں ۔

---

[1] فتح الباری، جلد ۸ صفحہ ۳۳۳ مطبوعہ مصر۔ [2] قسطلانی، جلد ۵، صفحہ ۳۸۹۔

اس قسم کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں۔ ہم نے اختصار کے لحاظ سے صرف دو مثالیں نقل کیں۔

صحابہ میں دو گروہ ان کے مقابلے میں ایک دوسرا گروہ ہے جو دلائل عقلی اور قرائن حالی کی بنا پر بعض حدیث کے تسلیم کرنے میں تامل کرتا ہے۔ اور یہ طریقہ خود صحابہ کرام رضؓ کے عہد میں شروع ہو گیا تھا، اور محدثین کے اخیر دور تک قائم رہا۔ چونکہ یہ رائے عام خیال کے خلاف ہے، اس لیے ہم اس کی متعدد مثالیں نقل کرتے ہیں:

(۱) حضرت ابوہریرہ رضؓ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ سے حدیث بیان کی کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا ہے کہ "جس چیز کو آگ چھوئے اس کے کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔" حضرت ابن عباس رضؓ نے کہا "اس کی بنا پر تو لازم آتا ہے کہ ہم گرم پانی (کے استعمال) سے بھی وضو نہ کریں۔" حضرت ابوہریرہ رضؓ نے کہا "بھتیجے جب تم آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کوئی حدیث سنو تو کہاوتیں نہ کہا کرو۔"[۱]

(۲) صحیح مسلم کے مقدمہ میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابن عباس رضؓ کے سامنے حضرت علی رضؓ کے قضایا (یعنی مقدمات کے فیصلے) پیش کیے گئے۔ حضرت ابن عباس رضؓ اس کی نقل لیتے جاتے تھے، اور بعض بعض فیصلے چھوڑتے جاتے تھے اور فرماتے تھے، کہ:

واللہ ما قضی بھذا علیؓ الا ان یکون ضل۔ خدا کی قسم علی نے یہ فیصلہ کیا ہے تو گمراہ ہو کر کیا ہے (لیکن چونکہ وہ گمراہ نہ تھے، اس لیے یہ فیصلہ بھی نہ کیا ہوگا)

اسی روایت کے بعد صحیح مسلم میں یہ روایت ہے کہ حضرت ابن عباس رضؓ کے

---

[۱] ابن ماجہ و ترمذی حدیث الوضوء مما مست النار

پاس لوگ ایک کتاب لائے۔ جس میں حضرت علیؓ کے فیصلے قلمبند تھے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ایک گز کے بقدر چھوڑ کر باقی کتاب مٹا دی۔"[1] اس سے ظاہر ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے صرف اُن فیصلوں کے مضمون سے یہ قیاس کر لیا کہ وہ صحیح نہیں ہو سکتے۔ اس بات کی ضرورت نہیں سمجھی کہ رُواۃ اور سند کا پتہ لگائیں۔

(۳) صحیح بخاری (باب صلوٰۃ النوافل جماعۃ) میں ہے کہ محمود بن ربیعؓ نے ایک جلسہ میں یہ حدیث بیان کی کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا ہے کہ "جو شخص خالصاً خدا کے لیے لا الٰہ الا اللہ کہے گا، خدا اس پر آگ حرام کر دیگا۔" اس جلسہ میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ بھی موجود تھے، جن کے مکان میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ۷ مہینے تک قیام فرمایا تھا۔ حضرت ابو ایوبؓ نے یہ حدیث سن کر کہا:

واللہِ مَا اَظُنُّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ما قلت قط۔ خدا کی قسم، میں کبھی یہ خیال نہیں کر سکتا کہ جو تم کہتے ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو گا۔

محمود بن الربیعؓ صحابی تھے اور حضرت ابو ایوبؓ کو اُن کے ثقہ ہونے میں کلام نہ تھا۔ چونکہ یہ حدیث اُن کے نزدیک قرآن کے خلاف تھی، حضرت ابو ایوبؓ اس پر یقین نہ لا سکے اور کہا کہ "آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایسا نہ فرمایا ہو گا۔" اگرچہ صحیح بخاری میں ہے کہ محمود بن الربیعؓ نے مدینہ آکر اس حدیث کی تصدیق اپنے راوی (عتبان) سے کر لی۔ لیکن اس سے اصل مسئلہ پر اثر نہیں پڑتا۔ حضرت ابو ایوبؓ کو جن اسباب کی بنا پر محمود بن الربیع کی

---

[1] نودی شرح صحیح مسلم میں لکھا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتاب "طاطفہ" کی شکل میں لکھی تھی (جس طرح اگلے زمانہ میں خطوط کو لمبان میں جوڑ کر جمع کرتے تھے اور لپیٹ کر رکھتے تھے)

روایت میں شبہہ پیدا ہوا۔ عتبان پر بھی وہی شبہہ پیدا ہوسکتا تھا۔ حضرت ابوایوب رضؓ خدانخواستہ، محمود رضؓ کو غلط گو نہیں سمجھتے تھے، بلکہ سمجھتے تھے کہ انھوں نے روایت کے مفہوم سمجھنے میں غلطی کی ہوگی۔ یہ احتمال بعینہٖ راویِ اوّل کی نسبت بھی ہوسکتا ہے، جیسا کہ حضرت عائشہ رضؓ نے بعض صحابہ رضؓ سے کہا تھا کہ "تم لوگ سچے لوگوں سے روایت کرتے ہو، لیکن سامعہ غلطی کرجاتا ہے[۱]"

(۴) حضرت عمار بن یاسر رضؓ نے جب حضرت عمر رضؓ کے سامنے تیمم کی روایت بیان کی تو حضرت عمر رضؓ کو یقین نہیں آیا، بلکہ جیسا کہ صحیح مسلم باب التیمم میں ہے، یہ الفاظ کہے اتق اللہ یا عمار، یعنی اے عمار! خدا سے ڈرو۔ چنانچہ اسی بنا پر جب حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ کے سامنے، حضرت ابوموسیٰ رضؓ نے اس روایت سے استدلال کیا، تو حضرت عبداللہ رضؓ نے کہا ہاں، لیکن عمر رضؓ کو عمار کی روایت سے تسکین نہیں ہوئی[۲]۔

(۵) حضرت عائشہ رضؓ کے سامنے جب یہ حدیث بیان کی گئی کہ لوگوں کے نوحہ کرنے سے مُردہ پر عذاب ہوتا ہے تو انھوں نے اس بنا پر انکار کیا کہ یہ قرآن مجید کی اس آیت کے خلاف ہے:

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (بنی اسرائیل) اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

(۶) اسی طرح جب اُن کے سامنے یہ حدیث بیان کی گئی کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کشتگان بدر کی نسبت فرمایا کہ میں جو کہتا ہوں یہ سنتے ہیں، حضرت عائشہ رضؓ نے فرمایا کہ ابن عمر رضؓ نے غلطی کی[۳]۔ اس روایت کے راوی اگرچہ

---

[۱] صحیح مسلم کتاب الجنائز "ر س" [۲] صحیح بخاری، باب التیمم۔

[۳] صحیح مسلم کتاب الجنائز میں یہ روایتیں متعدد طریقوں سے مذکور ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر تھے، جو مشہور صحابی ہیں۔ لیکن حضرت عائشہ رضؓ نے اس بنا پر روایت سے انکار کیا کہ اُن کے نزدیک وہ روایت قرآن مجید کے خلاف تھی۔

اکثر محدثین نے ان مباحث میں ثابت کیا ہے، کہ روایت صحیح ہے۔ اور حضرت عائشہ رضؓ کا اجتہاد جس کی بنا پر اُنھوں نے روایت سے انکار کیا، صحیح نہیں۔ ہم کو اس سے بحث نہیں، اس موقع پر صرف یہ بحث ہے کہ اکابر صحابہ میں ایسے لوگ بھی تھے جو روایت کو باوجود راوی کے ثقہ ہونے کے۔ اس بنا پر تسلیم نہیں کرتے تھے کہ وہ دلائل عقلی یا نقلی کے خلاف ہے۔

(۷) ایک مختلف فیہ مسئلہ یہ ہے کہ عورت کو جب طلاق دے دی جائے تو عدت کے زمانے تک شوہر پر اس کے کھانے پینے اور رہنے کا انتظام واجب ہے یا نہیں۔ فاطمہ بنت قیس رضؓ ایک صحابیہ تھیں جن کو اُن کے شوہر نے طلاق دے دی تھی، ان کا بیان ہے کہ وہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس گئیں تو آپؐ نے اُن کو نفقہ اور مکان نہیں دِلوایا۔ انھوں نے یہ حدیث حضرت عمر رضؓ کے سامنے بیان کی۔ حضرت عمر رضؓ نے فرمایا کہ ہم خدا کی کتاب اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سنت کو ایک عورت کے بیان پر چھوڑ نہیں سکتے، جس کی نسبت ہم کو معلوم نہیں کہ اس نے یاد رکھا یا بھول گئی۔ امام شعبی نے ایک مجلس میں فاطمہ رضؓ کی روایت بیان کی تو اسود بن یزید نے ان کو کنکریاں ماریں، کہ تم ایسی حدیث بیان کرتے ہو! پھر حضرت عمر رضؓ کا مذکورہ بالا قول نقل کیا[۱]۔

صحابہ رضؓ کے بعد بھی محدثین میں ایک ایسا گروہ موجود رہا جو عقلی یا نقلی وجوہ کی بنا پر بعض روایات کے تسلیم کرنے میں تامل کرتا تھا، گو اُن کے رُواۃ ثقہ اور مستند

---

[۱] صحیح مسلم کتاب الطلاق۔

ہوتے تھے۔

(۱) ایک ضعیف حدیث ہے کہ "جس شخص نے عشق کیا اور پاک دامن رہا، اور وفات پائی، وہ شہید ہوا۔" حافظ ابن القیم زاد المعاد میں اس حدیث کو دلائلِ عقلی سے باطل ثابت کر کے لکھتے ہیں:

فلو کان اسنادُ ھذا الحدیث کالشمسِ کان غلطاً ووھماً[۱] — اگر اس حدیث کی سند آفتاب کی طرح بھی ہوتی تب بھی وہ غلط اور وہم ہوتی۔

(۲) صحیح مسلم، کتاب الجہاد، باب الفئ، میں روایت ہے کہ حضرت عباس رضؓ اور حضرت علیؓ حضرت عمر رضؓ کے پاس آئے۔ حضرت عباس رضؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا:

اقضِ بینی و بین ھذا الکاذب الآثم الغادر الخائن — میرے اور اس جھوٹے، مجرم، دھوکا باز، خائن کے درمیان فیصلہ کیجیے۔

چونکہ حضرت علی رضؓ کی شان میں یہ الفاظ، کسی مسلمان کی زبان سے نہیں نکل سکتے، اس لیے بعض محدثین نے اپنے نسخہ سے یہ الفاظ نکال دیے[۲]۔ علامہ مازری، اس حدیث کی نسبت لکھتے ہیں:

اذا انسدّت طُرق تاویلھا نسبنا الکذبَ الیٰ رواتھا[۳]۔ — جب اس حدیث کی تاویل کے سب رستے رُک جائیں گے تو ہم راویوں کو جھوٹا کہیں گے۔

(۳) بخاری میں روایت ہے کہ خدا نے جب حضرت آدمؑ کو پیدا کیا تو ان کا قد ساٹھ گز کا تھا۔ حافظ ابن حجر اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

ویشکل علیٰ ھذا ما یوجد الاٰن — اور اس پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ قدیم

---

[۱] زاد المعاد (جزو ثانی) مطبوعہ کانپور صفحہ ۹۶۔ [۲] نووی شرح صحیح مسلم ذکر حدیث مذکور۔ [۳] نووی شرح، کتاب الجہاد، باب الفئ۔

من آثار الامم السالفة كديار — قوموں کے جو آثار اس وقت موجود ہیں، مثلاً
ثمود، فانّ مساکنهم تدلّ علیٰ — قومِ ثمود کے مکانات، ان سے ثابت ہوتا ہے
انّ قاماتهم لم تکن مفرط الطول — کہ ان کے قد اس قدر بڑے نہ تھے، جیسا کہ
علیٰ حسبما یقتضیه الترتیب السابق — ترتیب سابق سے ثابت ہوتا ہے۔۔۔۔
۔۔۔۔ ولم یظهر الآن مایزیل — اور اس وقت تک مجھ کو اس اشکال کا جواب
هٰذا الاشکال[۱] — نہیں معلوم ہوا۔

(۴) صحیح بخاری میں روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام خدا سے کہیں گے کہ اے خدا تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ قیامت میں مجھ کو رسوا نہ کریگا، اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

وقد استشکل الاسماعیلی هذا الحدیث من اصله وطعن فی صحته[۲] — اور اسمٰعیلی نے اس حدیث پر اشکال وارد کیا ہے اور اس کی صحت پر طعن کیا ہے۔

اسمٰعیلی کے اعتراض کا حافظ ابن حجر نے جواب دیا ہے لیکن اسمٰعیلی کا درجہ فنّ حدیث میں حافظ ابن حجر سے زیادہ ہے۔ اس لیے گو اسمٰعیلی کا اعتراض غلط ہو، لیکن قابلِ لحاظ ہوسکتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ حدیث استدلال کے خلاف ہے۔

(۵) عمرو بن میمون سے روایت ہے کہ مَیں نے زمانۂ جاہلیت میں ایک بندر کو دیکھا جس نے زنا کیا تھا، اس پر اور بندروں نے جمع ہوکر اس کو سنگسار کیا۔ حافظ ابن عبد البر نے جو مشہور محدّث ہیں، اس بنا پر اس حدیث کی صحت میں تامّل کیا کہ جانور مکلّف نہیں، اس لیے اُن کے فعل پر نہ زنا کا اطلاق ہوسکتا، نہ اس بنا پر سزا دی جاسکتی۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

---

[۱] فتح الباری مطبوعہ مصر جلد ۶ صفحہ ۲۶۰، بدء الخلق [۲] فتح الباری مطبوعہ مصر صفحہ ۳۸۴ جلد ۸

وقد استنکر ابن عبد البر قصة عمرو ابن میمون ھذہ وقال فیھا اضافۃ الزنا الی غیر مکلف واقامۃ الحد علی البھائم[۵]

ابن عبد البر نے عمرو بن میمون کے اس قصہ سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ اس میں غیر مکلف کی طرف، زنا کی نسبت ہے، اور جانوروں پر حد قائم کرنا بیان کیا گیا ہے۔

حافظ ابن حجر نے یہ قول نقل کرکے لکھا ہے کہ "اعتراض کا یہ طریقہ پسندیدہ نہیں ہے۔ اگر سند صحیح ہے تو غالباً یہ بندر جن رہے ہوں گے"۔

(۶) صحیح بخاری میں حضرت انس سے روایت ہے کہ ایک[۶] دفعہ عبد اللہ بن اُبی کے طرفداروں اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے صحابہؓ میں جھگڑا ہوگیا۔ اس پر یہ آیت اُتری:

وَاِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا۔ (حجرات-۱)

اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان میں صلح کرا دو۔

روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت تک عبد اللہ بن اُبی اور اُس کا گروہ ظاہر میں بھی اسلام نہیں لایا تھا، اس بنا پر ابن بطال نے اس حدیث پر اعتراض کہ آیت قرآنی، اس واقعہ کے متعلق نہیں ہوسکتی۔ اس لیے کہ آیت میں تصریح ہے کہ جب دونوں گروہ مومن ہوں، اور یہاں عبد اللہ بن اُبی کا گروہ علانیہ کافر تھا۔

حافظ ابن حجر نے اس کا جواب دیا ہے کہ تغلیباً ایسا کہا گیا۔

اس قسم کے اور بہت سے واقعات ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہت سے

---

[۵] فتح الباری، مطبوعہ مصر جلد، صفحہ ۱۲۲ [۶] صحیح بخاری کتاب العلم، روایت میں جھگڑے کی تفصیل ہے۔ ہم نے محض خلاصہ ذکر کر دیا ہے۔

محدثین سلسلۂ سند کے ساتھ یہ بھی دیکھتے تھے کہ دوسرے شواہد اور قرائن بھی اس کے موافق ہیں، یا نہیں۔

روایت بالمعنی (۶) ایک بڑا مرحلہ روایت بالمعنی کا ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یا صحابہؓ نے جو الفاظ فرمائے تھے، بعینہٖ وہی ادا کرنے چاہییں، یا ان کا مطلب ادا کر دینا کافی ہے۔ محدثین اس باب میں مختلف الرائے ہیں، اور اکثروں نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر راوی اپنے الفاظ میں اس طرح مطلب ادا کرتا ہے کہ اصل حقیقت میں فرق نہیں پیدا ہوتا، تو الفاظ کی پابندی ضرور نہیں لیکن اس کا فیصلہ کرنا کہ اصل مطلب ادا ہوا یا بدل گیا، ایک اجتہادی بات ہے۔ اسی بنا پر بعض محدثین مثلاً عبدالملک بن عمر، ابو زرعہ، سالم بن جعد، قتادہ، امام مالک، ایک ایک لفظ کی پابندی کرتے تھے[1] لیکن یہ ظاہر ہے کہ سینکڑوں راویوں میں صرف دو چار اشخاص ایسی پابندی کر سکتے تھے اور وہ بھی اس زمانہ میں کہ تحریر کا رواج ہو چکا تھا۔ عام حالت یہی تھی کہ راوی حدیث کے مطلب کو اپنے الفاظ میں بیان کرتے تھے۔ جامع ترمذی، کتاب العلل میں سفیان ثوری کا قول نقل ہے:

ان قلت لکم انی احدثکم کما سمعت فلا تصدقونی، انما ھو المعنی۔	اگر میں تم سے یہ کہوں کہ میں جو سنتا ہوں بعینہٖ وہی ادا کر دیتا ہوں، تو تم میری بات نہ مانو، میں صرف مطلب ادا کرتا ہوں۔

ترمذی نے اسی مضمون کے اور اقوال، واثلہ بن الاسقع، محمد بن سیرین، ابراہیم نخعی، حسن بصری، امام شعبی وغیرہ سے نقل کیے ہیں۔

---

[1] صحیح ترمذی کتاب العلل میں ان لوگوں کے متعلق یہ تصریح مذکور ہے۔

جو صحابہ رضؓ بہت محتاط تھے، حدیث کی روایت کے وقت ان کی حالت متغیر ہو جاتی تھی۔

سنن ابن ماجہ کے دیباچہ میں عمرو بن میمون کا قول نقل کیا ہے کہ مَیں عبداللہ رضؓ ابن مسعود کی خدمت میں ہمیشہ جمعرات کی رات کو حاضر ہوتا۔ مَیں نے کبھی ان کو یہ کہتے نہیں سُنا کہ "آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے یہ فرمایا۔" ایک دن اُن کی زبان سے یہ لفظ نکل گیا تو دفعتہً سر جھکا لیا۔ پھر میری نظر اُن پر پڑی تو دیکھا کہ کھڑے ہیں قمیص کی گھنڈیاں کھلی ہیں، آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے ہیں گلے کی رگیں پھول گئی ہیں، اور کہ رہے ہیں کہ آنحضرت (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے یُوں کہا، یا یُوں، یا اس سے کچھ زیادہ، یا اس سے کچھ کم، یا اس کے مشابہ"

امام مالک کا یہ حال تھا کہ جب حدیث روایت کرتے تھے تو خوف زدہ کہتے کہ "آنحضرت (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے یہ فرمایا تھا، یا یُوں فرمایا تھا۔" امام شعبی کہتے ہیں کہ "مَیں حضرت عبداللہ بن عمر رضؓ کی خدمت میں سال بھر حاضر رہا لیکن میں نے ان کو کبھی حدیث روایت کرتے نہیں دیکھا" سائب بن یزید کہتے ہیں کہ "مَیں نے سعد بن مالک کے ساتھ، مکّہ مبارکہ سے مدینہ طیبہ تک کا سفر کیا۔ لیکن اس تمام راہ میں انھوں نے ایک حدیث بھی آنحضرت (صلّی اللہ علیہ وسلّم) سے روایت نہیں کی" (حالانکہ وہ صحابی تھے) حضرت عبداللہ بن زبیر رضؓ نے اپنے والد سے پُوچھا کہ "مَیں نے آپ کو اور صحابہ رضؓ کی طرح حدیث روایت کرتے نہیں دیکھا" اُنھوں نے کہا "میں جب سے اسلام لایا، مَیں نے کبھی آنحضرت (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ لیکن مَیں نے آنحضرت (صلّی اللہ علیہ وسلّم) سے سُنا ہے کہ جو شخص میری نسبت کوئی روایت بیان کرے تو چاہیے کہ اپنا گھر آگ میں بنائے[۱]"

[۱] یہ تمام اقوال صحیح ابن ماجہ دیباچہ کتاب میں مذکور ہیں۔ دیکھو صفحہ ۴۔۵ مطبوعہ اصح المطابع لکھنؤ۔

ابن ماجہ نے روایت کی ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر ارشاد فرمایا تھا:

ایاکم وکثرۃ الحدیث عنی[1] خبردار! مجھ سے زیادہ حدیثیں نہ روایت کرو۔

اس موقع پر یہ امر خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے کہ اس قسم کی حدیثوں کے قبول کرنے میں جو تامل کیا جاتا ہے اس کو راوی کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے سے تعلق نہیں، مستند اور ثقہ راویوں کی دروغگوئی کا خیال نہیں ہو سکتا۔ لیکن ثقہ راوی سے بھی مطلب روایت کے سمجھنے یا ادا کرنے میں غلطی کا ہو جانا ممکن ہے۔ اور ثقات کی روایت سے جب کسی موقع پر انکار کیا جاتا ہے تو اسی بنا پر انکار کیا جاتا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سامنے جب حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی یہ روایت بیان کی گئی:

اِنَّ المیّتَ لیُعَذّبُ ببکاءِ الحیّ۔ مُردوں پر نوحہ کیا جائے نوحہ کیا جائے تو اُن پر عذاب کیا جاتا ہے۔

تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

انکم لتحدثون عن غیر کاذبین ولا مکذبین ولکنّ السمع یخطئ[2] تم لوگ نہ خود جھوٹے ہو، نہ تمہارے راوی جھوٹے ہیں، لیکن کان غلطی کر جاتا ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا:

اَمَا انّہ لم یکذب ولکنہ نسیَ او اخطأ[3] وہ جھوٹ نہیں بولے لیکن بھول گئے یا خطا کی۔

روایت احاد (۷) ایک اور بحث روایتِ احاد کی ہے۔ روایتِ احاد وہ ہے، جس کے سلسلۂ اسناد میں صرف ایک راوی پر مدارِ روایت ہو۔ یعنی کوئی دوسرا

---

[1] ابن ماجہ صفحہ ۵ [2] صحیح مسلم کتاب الجنائز [3] مسلم کتاب الجنائز۔

راوی اس کا مؤید نہ ہو، اس قسم کی روایت کے تسلیم و انکار اور یقینی و ظنی ہونے کے متعلق اہلِ فن کا اختلاف ہے۔ معتزلہ روایاتِ احاد کے تسلیم سے قطعاً منکر ہیں۔ لیکن یہ درحقیقت انکارِ بداہت ہے۔ ہم روزمرہ واقعاتِ زندگی میں اس قسم کی روایات پر اکثر بلا حجت و اصرار فوراً یقین کر لیتے ہیں۔ ہم سے ایک شخص آ کر کہتا ہے کہ "زید تم کو بلاتا ہے"۔ اور ہم فوراً اُٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ یہ نہیں کہتے کہ یہ خبر احاد ہے اور ہم اسے تسلیم نہیں کرتے۔ معتزلہ کے مقابل میں اکثر محدثین اسکی صحت اور قطعیت کے قائل ہیں۔ لیکن یہ درحقیقت تفریط ہے۔ خود صحابہ کا طرزِ عمل اس کے مخالف ہے +

ایک دفعہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ، حضرت عمرؓ کی خدمت میں گئے اور تین دفعہ اجازت طلبی کی۔ چونکہ حضرت عمرؓ کسی کام میں مشغول تھے، کچھ جواب نہ ملا، وہ واپس چلے گئے۔ حضرت عمرؓ نے کام سے فارغ ہو کر ان کو بلوا بھیجا، اور واپسی کا سبب پوچھا۔ اُنھوں نے کہا "مَیں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سُنا ہے کہ تین دفعہ اجازت طلبی کے بعد جواب نہ ملے تو واپس جاؤ"۔ حضرت عمرؓ نے کہا "اس روایت پر گواہ لاؤ، ورنہ مَیں تم کو سزا دوں گا"۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے اس پر شہادت پیش کی تو حضرت عمرؓ نے تسلیم کیا۔ حضرت عمرؓ خدانخواستہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو غلط گو نہیں جانتے تھے، لیکن چونکہ حضرت عمرؓ بارگاہِ نبوت میں برسوں رہے تھے، اور انھوں نے یہ حدیث آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے نہیں سُنی تھی، حالانکہ حدیث ایسے امر کے متعلق تھی جو عموماً پیش آتا ہے، اس لیے حضرت عمرؓ نے واقعہ کی اہمیت کے لحاظ سے صرف ایک شخص کی شہادت کافی نہیں سمجھی +

حضرت ابو بکرؓ کے سامنے ایک عورت نے جو میّت کی دادی ہوتی تھی، میراث

کا دعویٰ کیا۔ حضرت ابوبکر رضؓ نے کہا "قرآن میں دادی کی میراث مذکور نہیں اور نہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اس باب میں کوئی روایت مجھ کو معلوم ہے"! مغیرہ بن شعبہ نے شہادت دی کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) دادی کو چھٹا حصہ دلایا کرتے تھے۔ حضرت ابوبکرہ رضؓ نے ان کی تنہا شہادت ایسے واقعہ کے متعلق کافی نہیں سمجھی۔ اور جب ایک اور صحابی محمد ابن مسلمہ نے شہادت دی۔ تب حضرت ابوبکرؓ نے اس عورت کو میراث دلائی +

اسی طرح جنین کی دیت کے متعلق حضرت عمر رضؓ نے مغیرہ کی تنہا شہادت کافی نہیں سمجھی، اس قسم کی اور بیسیوں مثالیں ہیں +

(اسی بنا پر روایتِ احاد کے متعلق فقہائے احناف کا اصول ایک حد تک صحیح ہے کہ یہ ظنی الثبوت ہیں، ان سے قطعیت نہیں ثابت ہوتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ روایاتِ احاد کی صحت اور عدم صحت یا ظن و قطعیت رواۃ کے ثقہ اور معتبر ہونے کے بعد، خود اصل روایت کی اہمیت اور عدمِ اہمیت پر مبنی ہے۔ ایک شخص جب ہم سے کہتا ہے کہ" زید نے تم کو بلایا ہے" تو راوی کی ثقاہت و اعتبار کے مسلم ہونے کے بعد ہم کو کبھی اس واقعہ کی تسلیم سے انکار نہیں ہوتا۔ لیکن اگر یہی شخص یہ کہتا ہے کہ "تم کو بادشاہ نے آج دربار میں بلایا ہے" تو ہم اس واقعہ کی تسلیم میں پس و پیش کرتے ہیں، اور اس کے ثبوت کے لیے دوسروں کی شہادت تلاش کرتے ہیں +

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اگر کوئی تنہا راوی یہ بیان کرتا ہے کہ "آپ ایک بار سپید کرتہ پہن کر باہر تشریف لائے"۔ تو ہم کو اس کی تسلیم میں عذر نہیں، لیکن وہی راوی اگر یہ کہتا ہے کہ "ایک بار آپؐ برہنہ تن باہر نکل آئے"۔ (اس قسم کی ایک روایت ہے) تو قطعاً ہم تنہا شہادت اس کے ثبوت کے لیے کافی نہیں

سمجھیں گے۔

نتائج مباحث مذکورہ گزشتہ صفحات میں ہم نے روایت وحدیث کے متعلق صحابہ کبار کا جو طرزِ عمل پیش کیا ہے، اور علمائے نقدِ حدیث کے جن قواعد و اصول کی تفصیل کی ہے، ذیل میں بہ ترتیب، نتائج کے طور پر ہم اُن کا اعادہ کرتے ہیں:

(۱) سب سے پہلے واقعہ کی تلاش قرآن مجید میں، پھر احادیثِ صحیحہ میں، پھر عام عام احادیث میں کرنی چاہیے۔ اگر نہ ملے تو روایاتِ سیرت کی طرف توجہ کی جائے۔

(۲) کتبِ سیرت محتاجِ تنقیح ہیں، اور اُن کے روایات و اسناد کی تنقید لازم ہے۔

(۳) سیرت کی روایتیں بہ اعتبار پایۂ صحت، احادیث کی روایتوں سے فروتر ہیں۔ اِس لیے بصورتِ اختلاف، احادیث کی روایات کو ہمیشہ ترجیح دی جائے گی۔

(۴) بصورتِ اختلافِ روایاتِ احادیث، رُواۃِ باب فقہ و ہوش کی روایات کو دوسروں پر ترجیح ہوگی۔

(۵) سیرت کے واقعات میں سلسلہ علت و معلول کی تلاش نہایت ضروری ہے۔

(۶) نوعیتِ واقعہ کے لحاظ سے شہادت کا معیار قائم کرنا چاہیے۔

(۷) روایت میں اصل واقعہ کس قدر ہے؟ اور راوی کی ذاتی رائے و فہم کا کس قدر جُز شامل ہے۔

(۸) اسبابِ خارجی کا کس قدر اثر ہے؟

(۹) جو روایت عام وجوہ عقلی، مشاہدۂ عام، اصول مسلمہ اور قرائن حال کے خلاف ہوگی، لائقِ حجت نہ ہوگی۔

(۱۰) اہم موضوع پر مختلف روایات کی تطبیق و جمع سے اس کی تسلی کر لینی چاہیے کہ راوی سے ادائے مفہوم میں تو غلطی نہیں ہوئی ہے۔

(۱۱) روایاتِ احاد کو موضوع کی اہمیت اور قرائنِ حال کی مطابقت کے لحاظ سے قبول کرنا چاہیے۔

ان اصول کے تقرر و تفصیل کے بعد نظر آسکتا ہے کہ اسلامی فنِ روایت، عقل و درایت کی نگاہ سے کس قدر بلند پایہ ہے؟ علمائے حدیث نے تصحیحِ روایت کیلیے کتنی محنت، کتنی جانفشانی، کتنی دیدہ ریزی اور کتنی وقت رسی صرف کی ہے۔ کیا اس اہتمام و اعتنا کا دُنیا کی دیگر قوموں کے سرمایۂ تاریخ و روایت میں ایک ذرّہ نشان بھی موجود ہے؟ کیا یورپ کے سیرت نگارانِ پیغمبرِ اسلام میں سے کسی نے بھی اس جانکاہی اور نکتہ سنجی کے ساتھ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی لائف کیلیے قلم اُٹھایا ہے؟ اور کیا ایک غیر مسلم ان قواعد و اصول کی مراعات کے ساتھ قلم اُٹھا بھی سکتا ہے؟[۱]

---

[۱] زیادت از صفحہ ۷۷ تا ۹۰، "س"

یورپین تصنیفات

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیرتِ مبارک پر جو یورپین تصنیفات ہیں، اُن پر پوری بحث تو کسی اور حصہ میں آئے گی جس میں نہایت تفصیل سے بتایا جائیگا کہ یورپ میں اسلام کے متعلق سب سے پہلے یورپین مصنف ہلدی برٹ سے لے کر جو ۱۱۳۰ء میں موجود تھا۔ آج تک کیا سرمایہ مہیا ہوا ہے؟ ان کا کیا عام انداز ہے؟ اُن کی مشترک اور عامۃ الورود غلطیاں کیا ہیں؟ اُن کے وسائل معلومات کس درجہ کے ہیں؟ اغلاط کے مشترک اسباب کیا ہیں؟ تعصب اور سوءِ ظن کا کہاں تک اثر ہے؟ یہاں ہم ان تصنیفات پر صرف اجمالی گفتگو کرتے ہیں۔ کیونکہ اس حصہ میں بھی ہم کو جا بجا ان تصنیفات سے کام لینا، یا اُن سے تعرض کرنا پڑا ہے۔

یورپ، ایک مدت تک اسلام کے متعلق مطلق کچھ نہیں جانتا تھا، جب اس نے جاننا چاہا تو مدت دراز تک عجب حیرت انگیز مفتریانہ خیالات اور توہمات میں مبتلا رہا۔ ایک یورپین مصنف لکھتا ہے:

"عیسائیت، اسلام کی چند ابتدائی صدیوں تک اسلام پر نہ تو نکتہ چینی کر سکی اور نہ سمجھ سکی، وہ صرف تھرّاتی اور حکم بجالاتی تھی۔ لیکن جب قلب فرانس میں عرب پہلے پہل روکے گئے۔ تو اُن قوموں نے جو اُن کے سامنے سے بھاگ رہی تھیں منہ پھیر کر دیکھا جس طرح کہ مویشیوں کا گلہ جب کہ اس کا بھگا دینے

والا کتنا دور نکل جاتا ہے۔"

یورپ نے مسلمانوں کو جس طرح جانا، اس کو فرانس کا مشہور مصنف "ہنری دی کاستری" جس کی تصنیف کا عربی زبان میں ترجمہ ہوگیا ہے، یوں بیان کرتا ہے:

"وہ تمام قصص اور گیت جو اسلام کے متعلق یورپ میں قرونِ وسطیٰ میں رائج تھے، ہم نہیں سمجھتے کہ مسلمان اُن کو سُن کر کیا کہیں گے؟ یہ تمام داستانیں اور نظمیں، مسلمانوں کے مذہب کی ناواقفیت کی وجہ سے بُغض و عداوت سے بھری ہُوئی ہیں۔ جو غلطیاں اور بدگمانیاں اسلام کے متعلق آج تک قائم ہیں، اُن کا باعث وہی قدیم معلومات ہیں۔ ہر مسیحی شاعر، مسلمانوں کو مشرک اور بُت پرست سمجھتا تھا اور حسبِ ترتیب درجات اُن کے تین خدا تسلیم کیے جاتے تھے، ماہوم یا ماہون، یا مافومیڈ (یعنی محامڈ) اور اپلین اور تیسرا ٹرگامان۔ اُن کا خیال تھا کہ محمدؐ نے اپنے مذہب کی بنیاد، دعوائے الوہیت پر قائم کی اور سب سے عجیب تر یہ ہے کہ محمدؐ (وہ محمدؐ جو بت شکن اور دشمنِ اصنام تھا) لوگوں کو اپنے طلائی بُت کی پرستش کی دعوت دیتا تھا۔

اسپین میں جب عیسائی، مسلمانوں پر غالب آئے، اور ان کو سرقوسطہ کی دیواروں تک ہٹا دیا، تو مسلمان لوٹ کر آئے اور اپنے بُتوں کو انھوں نے توڑ ڈالا۔ اس عہد کا ایک شاعر کہتا ہے۔" اپلین مسلمانوں کا دیوتا ایک غار میں تھا، اس پر وہ پل پڑے اور اس کو نہایت سخت سُست کہا اور اُس کو گالیاں دیں اور اس کے دونوں ہاتھ باندھ کر ایک ستون پر اس کو پاؤں سے

ؔ محمد اینڈ محمد نزم۔ از باسورتھ اسمتھ صاحب ایم۔ اے صفحہ ۶۳ (Bosworth Smith s. Mohammad & Mohammadanism P. 63)

روندا اور لاٹھیوں سے مار مار کر اس کے ٹکڑے کر ڈالے، اور ماہوم کو (جو اُن کا دوسرا دیوتا تھا) ایک گڑھے میں ڈال دیا۔ اُس کو سُوّر اور کتوں نے نوچ ڈالا۔ اس سے زیادہ اس سے پہلے کسی دیوتا کی تحقیر نہیں ہُوئی۔ اس کے بعد ہی مسلمانوں نے اپنے گناہوں سے توبہ کی اور اپنے دیوتاؤں سے معافی مانگی اور ازسرِ نو تلف شدہ بُتوں کو بنایا۔ اسی بنا پر جب شہنشاہ چارلس سرقوسطہ میں داخل ہُوا تو اس نے اپنے ہمراہیوں کو حکم دے دیا کہ تمام شہر کا چکر لگائیں۔ وہ مسجدوں میں گھس گئے اور لوہے کے ہتھوڑوں سے ماہومیڈ اور تمام بُتوں کو توڑ ڈالا۔[1]

ایک دوسرا شاعر ریچر خُدا سے دُعا کرتا ہے کہ "وہ ماہوم کے بُت کے پجاریوں کو شکست نصیب کرے۔" اس کے بعد وہ اُمرا کو جنگِ صلیبی کے لیے ان الفاظ میں آمادہ کرتا ہے: "اُٹھو اور ماہومیڈ اور ٹرماگان کے بُتوں کو ادندھا کر دو، اور ان کو آگ میں ڈال دو، اور ان کو اپنے خداوند کی نذر کر دو۔[1]"

اس قسم کے خیالات ایک مدت تک قائم رہے (کسی اور حصّہ میں ہم اس کو مفصّل لکھیں گے)۔

سترھویں اور اٹھارھویں صدی سترھویں صدی کے سنین وسطی یورپ کے عصرِ جدید کا مطلع ہے۔ یورپ کی جِدّ و جُہد، سعی و کوشش اور حریّت و آزادی کا دَور، اسی عہد سے شروع ہوتا ہے۔ ہمارے مقصد کی جو چیز اس دَور میں پیدا ہُوئی، وہ مستشرقینِ یورپ کا وجود ہے۔ جن کی کوششوں سے نادرالوجود عربی کتابیں ترجمہ اور شائع ہوئیں عربی زبان کے مدارس، علمی و سیاسی اغراض سے جابجا ملک میں قائم ہُوئے۔ اور

---

[1] ترجمہ کتاب ہنری دی کاستری بہ زبان عربی مطبوعہ مصر از صفحہ ۸ تا ۱۰۔

اس طرح وہ زمانہ قریب آتا گیا کہ یورپ اسلام کے متعلق خود اسلام کی زبان سے کچھ سُن سکا۔

اس دَور کی خصوصیتِ اوّل یہ ہے کہ سُنے سُنائے عامیانہ خیالات کے بجائے، کسی قدر تاریخ اسلام و سیرتِ پیغمبر (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی بنیاد عربی زبان کی تصانیف پر قائم کی گئی۔ گو موقع بہ موقع معلوماتِ سابقہ کے مصالح کے استعمال سے بھی احتراز نہیں کیا گیا۔

اس دَور سے چونکہ یورپ نے مذہبی اشخاص کے شکنجہ سے نجات پائی اور اس کے مذہبی اور سیاسی امور الگ الگ ہو گئے، اس بنا پر اسلام کے متعلق مصنفین کی دو جماعتیں الگ ہو گئیں۔ عوام اور مذہبی اشخاص اور محقق و غیر متعصب گروہ، اسلام کے متعلق ان دونوں جماعتوں نے جو کوششیں کیں، وہ آج ہمارے سامنے ہیں۔

اس عہد میں عربی زبان کی تاریخی تصنیفات کا ترجمہ ہو گیا تھا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے اربی نیوس (Arp) مارگولیوس (morgoli ou Th) ایڈورڈ پوکاک (Pococke) اور ہٹنجر (Hattinger) ذکر کے قابل ہیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اتفاقاً یا قصداً ان مستشرقین نے ابتداءً جن عربی تاریخوں کا ترجمہ کیا، وہ اکثر ان مسیحی مصنفین کی تصنیفات تھیں جو قرونِ ماضیہ میں اسلامی ممالک کے باشندے تھے۔ یعنی سعید بن بطریق اوٹیکوس المتوفی ۹۳۹ء جو اسکندریہ کا پیٹریارک تھا، اور ابن العمید المکین المتوفی ۱۲۷۳ء جو سلاطینِ مصر کا ایک درباری تھا، اور ابو الفرج ابن العبری الملطی المتوفی ۱۲۸۶ء مصنف تاریخ الدول۔

ابن العمید المکین کی تاریخ، طبری اور ذیلِ طبری کا خلاصہ ہے۔ اربی نیوس نے جو ہولینڈ کا ایک مستشرق تھا، لاطینی ترجمہ کے ساتھ، لیڈن سے اس کا ایک ٹکڑا شائع کیا، جو ابتدائے رسالت سے اتابکیہ تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔ المکین کے

نام سے اس کتاب کے حوالے، یورپ کی ابتدائی اصلاحی تصنیفات میں نہایت کثرت سے آتے ہیں۔

اٹھارھویں صدی یہ وہ زمانہ ہے جب یورپ کی قوت سیاسی، اسلامی ممالک میں پھیلنی شروع ہوگئی، جس نے "اورینٹلسٹ" کی ایک کثیر التعداد جماعت پیدا کردی، جنھوں نے حکومت کے اشارے سے السنۂ مشرقیہ کے مدارس کھولے۔ مشرقی کتب خانوں کی بنیادیں ڈالیں، ایشیاٹک سوسائٹیاں قائم کیں، مشرقی تصنیفات کی طبع و اشاعت کے سامان پیدا کیے، اور بہتسی تصنیفات کا ترجمہ شروع کیا۔

سب سے پہلے ہولینڈ نے اپنے مقبوضہ جزائر مشرقی میں ۱۷۷۸ء میں ایک ایشیاٹک سوسائٹی قائم کی۔ اس کی تقلید میں انگریزوں نے بمقام کلکتہ ۱۷۸۴ء میں جنرل ایشیاٹک سوسائٹی اور ۱۷۸۸ء میں بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ اس کے بعد ۱۷۹۵ء میں فرانس نے مشرقی زندہ زبانوں (عربی، فارسی، ترکی) کا دار العلوم قائم کیا۔ اور آخر کار ان مدارس اور سوسائٹیوں کی تقلید سے تمام ممالک یورپ میں اس قسم کی درسگاہیں اور انجمنیں جاری ہوگئیں۔ عام یونیورسٹیوں میں عربی زبان کے پروفیسروں اور کتب خانوں کا وجود لازمی سمجھا جانے لگا۔

مسلمانوں کے ہاں عربی زبان میں سیرت و مغازی کی جو کتابیں محفوظ تھیں، وہ ایک ایک کرکے باستثنائے چند، اٹھارھویں صدی کے اواخر سے لے کر انیسویں صدی کے اختتام تک یورپ میں چھپ گئیں، اور ان میں اکثر کا یورپین زبانوں میں ترجمہ ہوگیا۔ سب سے پہلے رسک (REISKE) المتوفی ۱۷۷۴ء نے تاریخ ابو الفداء مع ترجمۂ لاطینی و حواشی پانچ جلدوں میں شائع کی۔ ۱۸۰۹ء میں کپتان اے متھوس (A. N. MATTHEWS) نے کلکتہ سے مشکوٰۃ المصابیح کا انگریزی

میں ترجمہ شائع کیا۔ ۱۸۵۶ء میں وان کریمر (KREMER) نے کلکتہ میں محمد بن عمر واقدی کی کتاب المغازی طبع کرائی۔ ۱۸۶۰ء میں ابن ہشام کی مشہور تصنیف سیرۃ الرسول کی گوٹنگن (COTLINGEN) سے اشاعت کی۔ اس کے علاوہ اسی مستشرق نے سمہودی کی تاریخ مدینہ اور ابن قتیبہ کی تاریخ معارف طبع کرائی۔ ۱۸۶۴ء میں ڈاکٹر ویل (G. WEIL) نے ابن ہشام کا جرمنی میں ترجمہ کیا۔ ۱۸۷۷ء میں پیرس سے مسعودی کی تاریخ مروج الذہب مع ترجمہ فرانسیسی پروفیسر ڈی مانیارڈ نے شائع کی۔ والہوسن (WELLHAUSEN) نے ۱۸۸۲ء میں واقدی کا جرمن ترجمہ بعنوان "محمد بہ مدینہ" برلن سے شائع کیا۔ ۱۸۸۳ء میں لیڈن سے ہاوٹسما (HOUTASMA) کے اہتمام سے یعقوبی کی تاریخ دو جلدوں میں چھپی۔ ۱۸۸۹ء سے ۱۸۹۲ء تک چودہ برس کی محنت میں طبری کی مشہور اور نادر الوجود تاریخ بارتھ (J. BARTH) اور نولدیکی (NOLDEKE) وغیرہ نے شائع کی، اور سب سے آخر میں مشہور جرمن مستشرق پروفیسر سخاؤ (SACHOU) کی خاص کوشش اور دیگر سات مستشرقین کی اعانت سے ابن سعد کی عظیم الشان اور نادر الوجود طبقات، جس سے زیادہ مبسوط سیرت نبوی میں کوئی تصنیف نہیں تقریباً ۱۹۰۰ء سے گزشتہ سال تک ایک ایک جلد کر کے لیڈن سے شائع ہوتی رہی۔

ان اصل تاریخی تصنیفات اور ان کے تراجم کی اشاعت، ممالک اسلامیہ اور یورپ کے تعلقات، مذہبی منافرت کی کمی، اور آزادانہ تحقیقات کی خواہش، ان تمام چیزوں نے یورپ میں مصنفین تاریخ اسلام اور سوانح نگاران پیغمبر عرب (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ایک کثیر التعداد گروہ پیدا کر دیا۔

اوکسفورڈ کا ایک عالم اس غیر مختتم سلسلے کا ان الفاظ میں اعتراف کرتا ہے:

"محمد ﷺ کے سوانح نگاروں کا ایک وسیع سلسلہ ہے، جس کا ختم ہونا غیر ممکن ہے

لیکن اس میں جگہ پانا ناقابلِ فخر چیز ہے[۵]"+

ہم اس موقع پر صرف اُن تصنیفات کا مختصر سا نقشہ درج کرتے ہیں، جو بہ تخصیص آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حالات میں یا اسلام کے اصول عقائد پر لکھی گئیں، اور جن میں سے اکثر ہمارے دفتر تصنیف میں موجود ہیں، یا ہم ان سے متمتع ہو چکے ہیں:

نمبر	نام مصنف	وطن	نام تصنیف یا مضمون	زمانہ تصنیف
۱	ڈاکٹر جی، بی، (؟)	انگلستان	سیرت محمد خادع (نعوذ باللہ)	سنہ ۱۸۱۵ء
۲	ڈاکٹر وائٹ WHITE واعظ آکسفورڈ	"	بیمفلٹ سرمنز اسلام اور پیغمبر اسلام پر۔	اوائل سنہ ۱۸۰۰ء
۳	گاڈفری ہگنس ایم، آر، اے، ایس GODFREY HIGGINS	"	اپالوجی	سنہ ۱۸۲۹ء
۴	ڈاکٹر جے۔ اے مولر MOLLER	جرمن	اسلامزم	سنہ ۱۸۳۰ء
۵	گارسن ڈی ٹاسی GARCIN DE TASSY	فرانس	اسلام و قرآن	از سنہ ۱۸۳۱ء تا سنہ ۱۸۶۴ء
۶	اڈورڈ لین EDWARD LANE	انگلستان	انتخابات القرآن	سنہ ۱۸۴۳ء
۷	ڈاکٹر ویل WEIL	جرمن	ترجمہ و تحشیہ ابن ہشام و کتاب محمد پیغمبر صلعم	سنہ ۱۸۳۶ء تا سنہ ۱۸۴۵ء
۸	کارلایل CARLYLE	انگلستان	ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ	سنہ ۱۸۴۶ء

۱ مارگولیتھ، محمدؐ۔ دیباچہ، صفحہ ۱

زمانہ تصنیف	نام تصنیف یا مضمون	وطن	نام مصنف	نمبر
سنہ ۱۸۴۷ء	تاریخِ عرب	فرانس	کوسن ڈی برسیوال CAUSSIN DE PERGUAL	۹
سنہ ۱۸۴۹ء	سیرتِ محمدؐ	انگلستان	واشنگٹن اروِنگ ERWING	۱۰
سنہ ۱۸۵۱ء	سیرتِ محمدؐ	جرمن	ڈاکٹر اسپرنگر SPRINGER	۱۱
سنہ ۱۸۵۶ء	ترجمہ و تحشیۂ واقدی	"	وان کریمر VAN KREMER	۱۲
سنہ ۱۸۵۸ء	مضمون "محمدؐ"	انگلستان	مضمون نگار نیشنل ریویو	۱۳
سنہ ۱۸۶۱ء	تاریخ اسلام	ہولینڈ	ڈوزی DOZY	۱۴
"	بزرگ ترین عرب	انگلستان	مضمون نگار نیشنل ریویو	۱۵
"	سیرتِ محمدؐ	"	ڈی لین DELANE	۱۶
"	سیرتِ محمدؐ	"	میور MUIR	۱۷
سنہ ۱۸۶۵ء	محمدؐ و قرآن	فرانس	برتھالمی سینٹ ہلیر HILAIRE	۱۸
سنہ ۱۸۶۹	مضامین قرآن و اسلام	جرمن	نولڈیکی NOLDEKY	۱۹
"	اسلام	انگلستان	دوشیف مضمون نگار کوارٹرلی ریویو۔	۲۰
سنہ ۱۸۷۲ء	محمدؐ	"	مضمون نگار برٹش کوارٹرلی ریویو	۲۱
سنہ ۱۸۷۴ء	تاریخ بانیِ اسلام۔	فرانس	جولیس چارلس JULIUS CHALES	۲۲
سنہ ۱۸۷۵ء	محمدؐ اور اسلام	انگلستان	مضمون نگار کانٹمپریری ریویو	۲۳
"	"	"	باسورتھ اسمتھ Bosworth Smith	۲۴

نمبر	نام مصنف	وطن	نام تصنیف یا مضمون	زمانہ تصنیف
۲۵	سیدیو Sedillot	فرانس	تاریخِ عرب	۱۸۷۷ء
۲۶	ولہوسن Wellhausen	جرمن	تبصرہ بر واقدی	۱۸۸۲ء
۲۷	اہل کراہل Krehl	جرمنی	سیرتِ محمد	۱۸۸۴ء
۲۸	گولڈزیہر Goldziher	"	مطالعۂ اسلام	۱۸۹۰ء
۲۹	رینان Renan	فرانس	تاریخِ مذاہب	۱۸۹۲ء
۳۰	ایچ، گریم Grimme	ہولینڈ	سیرتِ محمدؐ	۱۸۹۴ء
۳۱	ہنری دی کاستری Hensi de Castri	فرانس	اسلام پر خیالات	۱۸۹۶ء
۳۲	الیف بوہل Buhl	ہولینڈ	سیرتِ محمدؐ	۱۹۰۳ء
۳۳	واسٹن Wallaston	انگلینڈ	آدھ گھنٹہ محمدؐ کے ساتھ	۱۹۰۵ء
۳۴	مارگولیتھ Margoliouth	"	محمدؐ	"
۳۵	کوئل Koelle	"	محمدؐ اور اسلام	۱۸۹۴ء
۳۶	پرنس کاتانی Caetani	اٹالیہ	تاریخِ کبیر محمد و اسلام و سلاطینِ اسلام	جاری
۳۷	میجر لیونارڈ Leonard	انگلینڈ	اسلام کا روحانی و اخلاقی پایہ	۱۹۰۹ء

مصنفینِ یورپ تین قسموں میں منقسم کیے جا سکتے ہیں:

۱- جو عربی زبان اور اصلی ماخذوں سے واقف نہیں۔ ان لوگوں کا سرمایۂ

معلومات اوروں کی تصنیفات اور تراجم ہیں۔ ان کا کام صرف یہ ہے کہ اس مشتبہ اور ناکامل مواد کو قیاس اور میلانِ طبع کے قالب میں ڈھال کر دکھائیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ ان میں بعض (مثلاً گبن صاحب) ایسے صائب الرائے اور انصاف پرست ہیں کہ راکھ کے ڈھیر میں سے بھی سونے کے ذرّے نکال سکتے ہیں۔ لیکن قلیلٌ ما ھم۔

۲۔ عربی زبان اور علم ادب و تاریخ و فلسفۂ اسلام کے بہت بڑے ماہر ہیں۔ لیکن مذہبی لٹریچر اور سیرت کے فن سے نا آشنا ہیں۔ ان لوگوں نے سیرت یا مذہب اسلام پر کوئی مستقل تصنیف نہیں لکھی۔ لیکن ضمنی موقعوں پر عربی دانی کے زعم میں میں اسلام یا شارعِ اسلام (صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم) کے متعلق نہایت دلیری سے جو کچھ چاہتے ہیں لکھ جاتے ہیں۔ مثلاً جرمن کا مشہور فاضل ساخو جس نے طبقات ابن سعد شائع کی ہے۔ اس کی وسعتِ معلومات اور عربی دانی سے کون انکار کر سکتا ہے، بیرونی کی کتاب الہند کا دیباچہ اُس نے جس تحقیق سے لکھا ہے، رشک کے قابل ہے۔ لیکن اسی دیباچہ میں اسلامی امور کے متعلق ایسی باتیں لکھ جاتا ہے، جس کو پڑھ کر بھول جانا پڑتا ہے کہ یہ وہی محترم شخص ہے جس کو ابھی ہم نے دیکھا تھا۔ نولدکی (جرمنی) نے قرآن مجید کا خاص مطالعہ کیا ہے لیکن انسائیکلو پیڈیا (جلد ۱۶ میں) قرآن پر اس کا جو آرٹیکل ہے جا بجا نہ صرف اس کے تعصّب، بلکہ اس کی جہالت کے رازِ پنہاں کی بھی پردہ دری کرتا ہے۔

۳۔ وہ مستشرقین جنھوں نے خاص اسلامی اور مذہبی لٹریچر کا کافی مطالعہ کیا ہے مثلاً پامر صاحب یا مارگولس صاحب، اُن سے ہم بہت کچھ اُمید کر سکتے تھے لیکن باوجود عربی دانی، کثرتِ مطالعہ، تفحصِ کتب کے ان کا یہ حال ہے کہ

ع دیکھتا سب کچھ ہوں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں

مارگولیوس نے مسند امام احمد بن حنبل کی ۶ ضخیم جلدوں کا ایک ایک حرف پڑھا ہے اور ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں کسی مسلمان کو بھی اس وصف میں اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں ہو سکتا۔ لیکن پروفیسر موصوف نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سوانح عمری پر جو کتاب لکھی ہے دنیا کی تاریخ اس سے زیادہ کوئی کتاب، کذب و افتراء اور تاویل و تعصب کی مثال کے لیے پیش نہیں کر سکتی۔ اس کا اگر کوئی کمال ہے تو یہ ہے کہ سادہ سے سادہ اور معمولی سے معمولی واقعہ کو جس میں برائی کا کوئی پہلو پیدا نہیں ہو سکتا، صرف اپنی طباعی کے زور سے بد منظر بنا دیتا ہے۔

ڈاکٹر اسپرنگر جرمنی کے مشہور عربی دان ہیں۔ کئی سال مدرسۂ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل رہے، لکھنؤ میں اکبر شاہی کتب خانہ کی رپورٹ لکھی جو ہماری نظر سے گزری ہے۔ حافظ ابن حجر کی کتاب الاصابۃ فی احوال الصحابہ، اول اول ان ہی نے تصحیح کر کے کلکتہ میں چھپوائی۔ لیکن جب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سوانح عمری پر ایک مستقل ضخیم کتاب ۳ جلدوں میں لکھی تو ہم حیرت زدہ ہو کر رہ گئے۔[1]

یورپین مصنفوں کی غلط کاریوں کی بڑی وجہ تو وہی ان کا مذہبی اور سیاسی تعصب ہے لیکن بعض وجوہ اور بھی ہیں جن کی بنا پر ہم ان کو معذور رکھ سکتے ہیں۔

۱۔ سب سے بڑی وجہ ہے کہ ان کا تمام تر سرمایہ استناد صرف سیرت و تاریخ کی کتابیں ہیں۔ مثلاً مغازی واقدی، سیرت ابن ہشام، سیرت محمد بن اسحاق، تاریخ طبری وغیرہ۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی غیر مسلم شخص اگر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی

---

[1] یہ کتاب جرمن زبان میں ہے۔ میں جرمن نہیں جانتا، لیکن اس کے اقوال اکثر مصنفین نے نقل کیے ہیں اور وہ ہماری نظر سے گزرے ہیں۔

سوانح عمری مرتب کرنا چاہے گا تو عام قیاس یہی رہبری کرے گا کہ اس کو تصنیفاتِ سیرت کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ سیرت کی تصنیفات میں سے ایک بھی نہیں جو استناد کے لحاظ سے بلند رتبہ ہو۔ چنانچہ اس کی بحث گزر چکی۔ مصنفین سیرت سے قطع نظر، سیرت کی روایتیں زیادہ تر جن لوگوں سے مروی ہیں، مثلاً سیف، سُدی، ابن سلمہ، ابن نجیح عموماً ضعیف الروایۃ ہیں، اس لیے عام اور معمولی واقعات میں ان کی شہادت کافی ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ واقعات جن پر مہتم بالشان مسائل کی بنیاد قائم ہے، ان کے لیے سرمایہ بے کار ہے۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سوانح عمری کے یقینی واقعات وہ ہیں، جو حدیث کی کتابوں میں یہ روایاتِ صحیحہ منقول ہیں، یورپین مصنفین اس سرمایہ سے بالکل بے خبر ہیں، اور ایک آدھ کوئی ہے، (مثلاً مارگولیس) تو اوّلاً وہ اس فن کا ماہر نہیں اور ہو بھی تو تعصّب کی ایک چنگاری سیکڑوں خرمنِ معلومات کو جلانے کے لیے کافی ہے۔

۲۔ دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ یورپ کے اصولِ تنقیحِ شہادت اور ہمارے اصولِ تنقیح میں سخت اختلاف ہے۔ یورپ اس بات کو بالکل نہیں دیکھتا کہ راوی صادق ہے یا کاذب، اس کے اخلاق و عادات کیا ہیں؟ حافظہ کیسا ہے؟ اُس کے نزدیک یہ تحقیق و تدقیق نہ ممکن ہے، نہ ضروری ہے۔ وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ راوی کا بیان بجائے خود، قرائن اور واقعات کے تناسب سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں؟ فرض کرو، ایک جھوٹے سے جھوٹا راوی ایک واقعہ بیان کرتا ہے جو قرائنِ موجودہ اور گرد و پیش کے واقعات کے لحاظ سے صحیح معلوم ہوتا ہے، بیان بالکل مسلسل ہے اور کہیں سے نہیں اُکھڑتا، تو یورپ کے مذاق کے موافق کی صحت تسلیم کر لی جائے گی۔

بخلاف اس کے مسلمان مورخ اور خصوصاً محدثین اس کی پروا نہیں کرتے

کہ خود روایت کی کیا حالت ہے۔ بلکہ سب سے پہلے وہ دیکھتے ہیں کہ "اسمائے رجال" کے دفترِ تحقیقات میں اُس شخص کا نام ثقہ لوگوں کی فہرست میں درج ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہے تو اُن کے نزدیک اس کا بیان بالکل ناقابلِ اعتنا ہے۔ بخلاف اس کے اگر ثقہ راوی نے کوئی واقعہ بیان کیا، تو گو قرائن اور قیاسات کے خلاف ہو، اور گو بظاہر عقل کے مطابق بھی نہ ہو، لیکن اس کی روایت قبول کر لی جائے گی۔

اس اختلافِ اصول نے یورپین تصنیفات پر بہت بڑا اثر پیدا کیا ہے۔ مثلاً اہلِ یورپ واقدی کے بیان پر سب سے زیادہ اعتماد کرتے ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ واقدی کا بیان نہایت مسلسل اور مربوط ہوتا ہے۔ جزئیات کی تمام کڑیاں باہم ملتی چلی جاتی ہیں۔ واقعات میں کہیں خلا نہیں ہوتا، جو چیزیں کسی واقعہ کو دلچسپ بنا سکتی ہیں، سب موجود ہوتی ہیں۔

لیکن سچ یہ ہے کہ یہی باتیں اصلی راز کی پردہ دری کرتی ہیں، جو روایتیں سو برس سے زیادہ زمانہ تک محض زبانوں پر رہیں۔ اُن میں اس قدر استقصائے جزئیات ممکن نہیں۔ یہ البتہ ہو سکتا ہے کہ جس طرح تاریخی افسانے لکھے جاتے ہیں، چند واقعات کا ذخیرہ سامنے رکھ کر قیاس و قرائن اور معلوماتِ عامہ کے ذریعے سے ایک سادہ خاکے کو نقش و نگار سے کامل کر دیا جائے۔ لیکن یہ جرأت صرف واقدی کر سکتا ہے۔ محدثین اس سے معذور ہیں۔

تاہم اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ ہر موقع پر محض راوی کا ثقہ ہونا کافی نہیں۔ ثقات بھی غلطی کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں، اس لیے ضرور ہے کہ درایت کے جو اصول محدثین نے قائم کیے ہیں، اور جن کو بعض جگہ وہ بھول جاتے ہیں، اُن کی نہایت سختی کے ساتھ پابندی کی جائے۔

یورپین تصنیفات کے اصول مشترکہ یورپین مصنفین آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے

اخلاق کے متعلق جو نکتہ چینیاں کرتے ہیں، یا اُن کی تصنیفات سے جو نکتہ چینیاں خود بخود ناظرین کے دل میں پیدا ہوتی ہیں، حسب ذیل ہیں:

(۱) آنحضرت (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَسَلَّم) کی زندگی مکہ معظمہ تک پیغمبرانہ زندگی ہے، لیکن مدینہ جاکر جب زور و قوت حاصل ہوتی ہے، تو دفعۃً پیغمبری بادشاہی سے بدل جاتی ہے، اور اس کے جو لوازم ہیں، یعنی لشکر کشی، قتل، انتقام، خون ریزی، خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔

(۲) کثرتِ ازدواج، اور میل الی النساء۔

(۳) مذہب کی اشاعت، جبر اور زور سے۔

(۴) لونڈی غلام بنانے کی اجازت اور اس پر عمل۔

(۵) دُنیا داروں کی سی حکمت عملی اور بہانہ جوئی۔

اس بنا پر، ہماری کتاب کے ناظرین کو، تمام واقعات میں اس نکتہ پر نظر رکھنی چاہیے، کہ یہ اعتراضات تاریخی تحقیقات کے معیار میں بھی ٹھیک اُتر سکتے ہیں، یا نہیں؟

اصولِ تصنیف اور ترتیب ہم نے اس کتاب میں جو اصول اختیار کیے ہیں، اب ان کے بتانے کا وقت آگیا ہے۔

(۱) سب سے پہلے یہ کہ سیرت کے واقعات کے متعلق جو کچھ قرآن مجید میں مذکور ہے، اُن کو سب پر مقدم رکھا ہے۔ یہ قطعاً ثابت ہے کہ بہت سے واقعات کے متعلق خود قرآن مجید میں ایسی تصریحات یا اشارے موجود ہیں جن سے اختلافی مباحث کا فیصلہ ہو جاتا ہے لیکن لوگوں نے آیاتِ قرآنی پر اچھی طرح نظر نہیں ڈالی، اس لیے وہ مباحث غیر منفصل رہ گئے۔

(۲) قرآن مجید کے بعد حدیث کا درجہ ہے۔ احادیثِ صحیحہ کے سامنے سیرت

کی روایتیں نظر انداز کردی ہیں، جو واقعات بخاری و مسلم وغیرہ میں مذکور ہیں۔ ان کے مقابلے میں سیرت یا تاریخ کی روایت کی کوئی ضرورت نہیں۔ ارباب سیر کو ایک بڑی غلطی یہ ہوئی کہ وہ واقعات کو کتب حدیث میں، ان موقعوں پر ڈھونڈھتے ہیں، جہاں عنوان اور مضمون کے لحاظ سے اُس کو درج ہونا چاہیے۔ اور جب ان کو ان موقعوں پر کوئی روایت نہیں ملتی تو وہ کم درجہ کی روایتوں کو لے لیتے ہیں۔ لیکن کتب حدیث میں ہر قسم کے نہایت تفصیلی واقعات ضمنی موقعوں پر روایت میں آجاتے ہیں۔ اس لیے اگر عام استقراء اور تفحص سے کام لیا جائے تو تمام اہم واقعات میں خود صحاح ستہ کی روایتیں مل جاتی ہیں، ہماری اِس کتاب کی بڑی خصوصیت یہی ہے کہ اکثر تفصیلی واقعات ہم نے حدیث ہی کتابوں سے ڈھونڈ کر مہیا کیے، جو اہلِ سیر کی نظر سے بالکل اوجھل رہ گئے تھے +

(۳) روزمرہ اور عام واقعات میں ابن سعد، ابن ہشام اور طبری کی عام روایتیں کافی خیال کی ہیں۔ لیکن جو واقعات کچھ بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے متعلق تنقید اور تحقیق سے کام لیا ہے اور تا امکان کدّ و کاوش کی ہے۔ اس خاص ضرورت کے لیے ہم نے پہلا کام یہ کیا کہ ابن ہشام، ابن سعد اور طبری کے تمام رُواۃ کے نام الگ انتخاب کر لیے، جن کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہے۔ پھر اسماء الرجال کی کتابوں سے اُن کی جرح و تعدیل کا نقشہ تیار کیا، تاکہ جس سلسلۂ روایت کی تحقیق مقصود ہو بہ آسانی ہوجائے +

(۴) جن فروگزاشتوں کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے، جہاں تک ممکن تھا اُن کی اصلاح اور تلافی کی ہے +

کتاب کے حصے اس کتاب کے پانچ حصے ہیں:

پہلے حصہ میں عرب کے مختصر حالات، کعبہ کی تاریخ، اور آنحضرت

(صلی اللہ علیہ وسلم) کی ولادت سے لے کر وفات تک عام حالات اور واقعات وغزوات ہیں۔ اسی حصہ کے دوسرے باب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی اخلاق و عادات کی تفصیل ہے۔ آل واولاد اور ازواجِ مطہرات کے حالات بھی اسی باب میں ہیں۔

دوسرا حصہ منصبِ نبوت سے متعلق ہے۔ نبوت کا فرض، تعلیم عقائد، اوامر ونواہی، اصلاحِ اعمال اور اخلاق ہے۔ اس بنا پر منصبِ نبوت کے کاموں کی تفصیل اس حصہ میں کی گئی ہے۔ اس حصہ میں فرائضِ خمسہ اور تمام اوامر و نواہی کی ابتداء اور تدریجی تغیرات کی مفصل تاریخ اور اُن کے مصالح اور حِکَم اور دیگر مذاہب سے ان کا مقابلہ وموازنہ ہے۔ اسی حصہ میں نہایت تفصیل سے بتایا گیا ہے، کہ عرب کے عقائد اور اخلاق وعادات پہلے کیا تھے، اور ان میں کیا کیا اصلاحیں عمل میں آئیں۔ نیز یہ کہ تمام عالم کی اصلاح کے لیے اسلام نے کیا قانون مرتب کیا، اور کیونکر وہ تمام عالم کے لیے اور ہر زمانہ کے لیے کافی ہوسکتا ہے۔

تیسرے حصہ میں قرآن مجید کی تاریخ، وجوہِ اعجاز، اور حقائق و اسرار سے بحث ہے۔

چوتھے حصہ میں معجزات کی تفصیل ہے۔ قدیم سیرت کی کتابوں میں معجزات کا الگ باب باندھتے ہیں لیکن آجکل تو اس کو بالکل مستقل حیثیت سے لکھنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ معجزات کے ساتھ اصل معجزہ کی حقیقت اور امکان سے بحث کرنے کی ضرورت بھی پیش آگئی ہے۔ البتہ جن معجزات کی تاریخ اور سنہ متعین ہے، مثلاً معراج، یا تکثیرِ طعام وغیرہ اُن کو اُس سنہ کے واقعات میں لکھ دیا ہے۔

پانچواں حصہ خاص یورپین تصنیفات کے متعلق ہے۔ یعنی یورپ نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اور مذہب اسلام کے متعلق کیا لکھا ہے؟ ان کا سرمایۂ معلومات کیا

ہے؟ تاریخی واقعات میں وہ کیونکر غلطیاں کرتے ہیں؟ مسائلِ اسلام کے سمجھنے میں اُن سے کیا کیا غلطیاں ہوئیں؟ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اخلاق و عادات یا مسائلِ اسلام پر جو نکتہ چینیاں کی ہیں اُن کے جوابات۔

یہ ضرور نہیں کہ یہ حصے اسی ترتیب سے شائع ہوں، بلکہ جس حصہ کی تیاری کے سامان فراہم ہو جائیں گے اور مرتب ہو جائے گا، وہ شائع کر دیا جائے گا۔

استناد اور حوالے تاریخ اور روایت میں حوالہ اور استناد سب سے مقدم چیز ہے، اس لیے اس کے متعلق چند ضروری امور بیان کر دینے ضرور ہیں:

(۱) صرف انہی کتابوں کا حوالہ دیا ہے جو خود میری نظر سے گزرتی ہیں۔

(۲) جو واقعات کسی قدر اہم ہیں، ان کے متعلق صرف صحیح حدیثوں یا مستند تاریخی روایتوں کا حوالہ دیا ہے لیکن عام واقعات یا غزوات کے متعلق جزئیات کی تفصیل میں محدثانہ کد و کاوش نہیں کی ہے۔

(۳) مطبوعہ کتابوں کے حوالہ میں مطبع کا نام بتا دیا گیا ہے قلمی کتابوں کے متعلق تصانیفِ سیرت کی فہرست جو اوپر گزر چکی ہے، اس میں بتا دیا ہے کہ ہمارے استعمال میں کونسا نسخہ تھا۔

وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ

عرب

وجہ تسمیہ عرب کی وجہ تسمیہ کے متعلق مختلف رائیں ہیں۔ اہل لغۃ کہتے ہیں کہ عرب اور اعراب کے معنی فصاحت اور زبان آوری کے ہیں، اور چونکہ اہلِ عرب اپنی زبان آوری کے سامنے تمام دُنیا کو ہیچ سمجھتے تھے، اس لیے انھوں نے اپنے آپ کو "عرب" اور دُنیا کی اور تمام قوموں کو عجم (ژولیدہ بیان) کہہ کر پکارا۔

بعض کی رائے ہے کہ عرب اصل میں عربۃ تھا۔ قدیم اشعار میں عرب کے بجائے عربۃ آیا ہے:

وَرَجّتْ، بَاحۃ العربات رجّاً ترقرق فی مناکبھا الدّماءُ

وعربۃ اُرضُ جدّ فی الشرّ اھلُھا کما جدّ فی شرب النّقاخ ظماءُ

وعربۃ ارضُ مایحل حرامُھا من النّاس الا اللّوزعیّ الحُلاحِل

عربۃ کے معنی سامی زبانوں میں دشت اور صحرا کے ہیں، اور چونکہ عرب کا بڑا حصہ دشت و صحرا ہے، اس لیے تمام ملک کو عرب کہنے لگے۔

جغرافیہ عرب کے حدودِ اربعہ یہ ہیں:

مغرب: بحیرۂ قلزم،

مشرق: خلیجِ فارس اور بحرِ عمان،

جنوب بحرِ ہند،

شمال کی حدود بہت مختلف فیہ ہیں۔ بعض مملکتِ حلب اور فرات تک اُس کی حدود کو وسعت دیتے ہیں۔

سینا کا جزیرہ نما، جس کا نام اَلتِیہَ ہے۔ اکثر مصنّفینِ عرب و یورپ اس کو مصر میں شمار کرتے ہیں، لیکن جیالوجی کی رُو سے وہ عرب سے متعلق ہے۔

عرب کی پیمائش باقاعدہ اب تک نہیں ہُوئی۔ تاہم اس قدر یقینی ہے کہ وہ جرمنی اور فرانس سے چوگنا زیادہ وسیع ہے۔ طول تقریباً پندرہ سو، عرض چھ سو میل اور مجموعی رقبہ بارہ لاکھ میل مربع ہے۔

ملک کا بڑا حصّہ ریگستان ہے۔ پہاڑوں کا جال تمام ملک میں پھیلا ہُوا ہے۔ سب سے بڑا طویل السلسلہ پہاڑ جبل السَّراۃ ہے، جو جنوب میں یمن سے شروع ہو کر شمال میں شام تک چلا گیا ہے۔ اس کی سب سے اُونچی چوٹی آٹھ ہزار فیٹ بلند ہے۔ بعض حصّے زرخیز اور شاداب بھی ہیں۔

چاندی اور سونے کی کانیں کثرت سے ہیں۔ علّامہ ہمدانی نے "صفۃ جزیرۃ العرب" میں ایک ایک کان کا نشان دیا ہے۔ قریش جو تجارت کیا کرتے تھے، مؤرخین نے لکھا ہے زیادہ تر اُن کا مالِ تجارت، چاندی ہوتی تھی۔ برٹن صاحب نے مدین کی طلائی معادن پر خاص ایک کتاب[1] لکھی ہے۔

قدیم تاریخ کے ماخذ اسلام سے قبل عرب کی تاریخ کے ماخذ حسب ذیل ہیں:

(۱) زمانہ جاہلیۃ کی بعض تصنیفات، جو سلاطینِ حیرہ کے کتب خانے میں محفوظ تھیں اور جو ابن ہشام کو ہاتھ آئی تھیں اور جن کا ذکر علّامہ موصوف نے

---

[1] GOLD MINES OF MEDIAN

کتاب الیتحان میں کیا ہے +

(۲) زبانی روایتیں جو قدیم سے چلی آتی تھیں، عرب کا حافظہ نہایت قوی تھا، یہاں تک کہ آج اشعارِ جاہلیت کا جو وسیع ذخیرہ موجود ہے، اسلام کے زمانے تک زبانی ہی روایت ہوتا چلا آتا تھا۔ اس بنا پر عرب کی قدیم تاریخ کا کافی سرمایہ محفوظ تھا۔ عرب کی جو قومیں معدوم ہو چکیں مثلاً طسم، جدیس، عاد، ثمود، ان کے متعلق بھی اس قدر تاریخی روایتیں محفوظ تھیں کہ ان کے ذریعے سے مورخینِ اسلام، عرب کی تاریخ قدیم پر معتدبہ تصنیفات مرتب کر سکے۔ مثلاً ہشام کلبی نے، طسم، جدیس، تبابعۂ یمن اور دیگر سلاطینِ عرب پر متعدد کتابیں لکھیں، جن کا ذکر ابن الندیم نے فہرست صفحہ ۹۶ میں کیا ہے +

(۳) اشعارِ جاہلیت، جن میں سے اکثر سلاطین اور اقوام، اور عماراتِ عرب کا ذکر ہے، یہ اشعار صفۃ جزیرۃ العرب اور معجم البلدان میں کثرت سے موجود ہیں، انہی قدیم ماخذوں سے علامۂ ہمدانی نے اپنی کتاب "اکلیل"[1] مرتب کی ہے، جس کا آٹھواں باب خاص سلاطینِ حمیر کے آثاراتِ قدیمہ اور حمیری کتبات پر مشتمل ہے۔

(۴) یورپ کی قدیم تصنیفات، مثلاً مصنفینِ یونان نے تھیوفراسٹس (جو حضرت عیسیٰؑ سے چار سو برس قبل تھا) سے لے کر بطلیموس تک بہت سے قبائلِ عرب کے نام لکھے ہیں، اور اُن کی آبادیوں کے نام بھی بتائے ہیں۔ رومن مورخ پلینی نے بھی عرب کے متعلق لکھا ہے، گو نہایت مختصر ہے +

(۵) عرب کی قدیم ویران شدہ عمارتوں کے کتبات، جو قدمائے اسلام نے دریافت کیے تھے، اور آجکل یورپ نے نہایت کثرت سے مہیا کیے ہیں +

---

[1] اس کتاب کا ذکر نہایت تفصیل کے ساتھ طبقات الامم (مطبوعۂ بیروت) میں ہے۔

عرب کے اقوام و قبائل : مورخینِ عرب نے اقوام و قبائل عرب کو تین حصوں پر منقسم کیا ہے :

عرب بائدہ یعنی عرب کے قدیم ترین قبائل جو اسلام سے بہت پہلے فنا ہو چکے تھے۔

عرب عاربہ بنو قحطان جو عرب بائدہ کے بعد عرب کے اصلی باشندے تھے اور جن کا اصل مسکن ملک یمن تھا۔

عرب مستعربہ بنو اسماعیل یعنی حضرت اسماعیل کی اولاد جو حجاز میں آباد تھی۔

ظہورِ اسلام کے وقت بنو قحطان اور بنو اسماعیل جن کو عدنانی قبائل بھی کہتے ہیں، ملک کے اصلی باشندے تھے۔ اور اُن کے علاوہ خال خال یہودیوں کی آبادی تھی۔ اس بنا پر درحقیقت ملکِ عرب اس وقت تین مختلف عناصر سے مرکب تھا۔ ہر عنصر کا قوام بے شمار قبائل و فروع سے تھا، جو یمن سے شام تک ہر قطعۂ زمین میں پھیلے ہوئے تھے، ان کی پھر مختلف چھوٹی چھوٹی شاخیں تھیں۔ چونکہ اس کتاب میں اکثر اُن کے نام آئیں گے، اس بنا پر ان کا ایک مختصر خاکہ درج ذیل ہے :-

بنو قحطان

اس خاندان کی تین بڑی شاخیں ہیں۔

ؔ یہاں سے "عرب کی قدیم حکومتیں" تک زیادت ہے، سؔ

(۱) قضاعہ (۲) کہلان (۳) ازد، حمیر بھی اسی کی شاخ ہے، جو یمن کے فرمانروا تھے، لیکن واقعات کو ان سے کوئی تعلق نہیں۔

(۱) قبائلِ قضاعۃ، عام علمائے انساب قضاعۃ کو بنو قحطان میں داخل کرتے ہیں، اور ہم بھی یہاں ان کی پیروی کرتے ہیں۔ ورنہ از روئے تحقیق وہ بنو اسماعیل ہیں۔ بہرحال ان کی حسب ذیل شاخیں ہیں:

بنو کلب، بنو تنوخ، بنو جرم، بنو جہنیہ، بنو نہد، بنو عذرہ، بنو اسلم، بلی، سلیح، ضجعم، تغلب، نمر، اسد، تیم اللات، کلب۔

(۲) کہلان،

بجیلہ، خثعم، ہمدان، کندہ، مذحج، طے، لخم، جذام، عاملہ،

(۳) ازد، انصار اسی کی شاخ تھے،

اوس، خزرج، خزاعۃ، غسان، دوس۔

مشہور عدنانی قبائل جن کا آخری مقسم مضر ہے، حسب ذیل ہیں۔ قبائل مضر اولاً بنی خندف اور بنو قیس دو خاندانوں پر منقسم ہیں۔

۱۔ خندف

ہذیل، کنانہ، اسد، ضبہ، مزینہ، رباب، تمیم، ہون۔

ان میں سے ہر ایک کے متعدد فروع ہیں،

اصول	فروع
کنانہ	قریش، دول،
ہون	قارہ
رباب	عدی، تیم، عکل، ثور،

تمیم | مقاعس، قریع، بہدلہ، یربوع، ریاح، ثعلبہ، کلیب۔

۲۔ قیس

عدوان، غطفان، اعصر، سلیم، ہوازن۔

ان میں سے بعض کے فروع یہ ہیں:

غطفان	عبس، ذبیان، فزارہ، مرہ۔
اعصر	غنی، باہلہ۔
ہوازن	سعد، نصر، جشم، ثقیف، سلول، بنو عامر (عامر کی شاخیں بنو ہلال، بنو نمیر، بنو کعب ہیں)۔

یہود

بنو قینقاع، بنو نضیر، بنو قریظہ۔

بنو قحطان و آلِ اسماعیل نے اسلام سے پہلے متعدد حکومتیں قائم کی تھیں، جن کے جستہ جستہ واقعات کہیں ملتے ہیں۔

عرب کی قدیم حکومتیں کتبوں اور دیگر مورخین کی تصریحوں سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے یہ ہے کہ اسلام سے پہلے عرب میں پانچ متمدن سلطنتیں گزریں:

(۱) معینی | معین یمن میں ایک مقام کا نام ہے جو کسی زمانہ میں سلطنت کا پایہ تخت تھا۔

(۲) سبائی	یعنی قوم سبا ۔
(۳) حضر موتی	حضر موت، یمن کا مشہور مقام ہے ۔
(۴) قتبانی	قتبان، عدن میں ایک مقام ہے جو آجکل گمنام ہے ۔
(۵) نابتی	حضرت اسمٰعیل کے ایک بیٹے کا نام نابت تھا، یہ سلسلہ انہی کی طرف منسوب ہے ۔

معینی سلطنت، جنوبی عربستان میں تھی۔ اس کے صدر مقامات قرن اور معین تھے۔ کتبوں سے تقریباً پچیس حکمرانوں کا پتہ چلتا ہے۔ محققین یورپ میں اختلاف ہے کہ معینی اور سبائی حکومتیں ہمزمان تھیں یا متقدم و متاخر، گلازر کا خیال ہے کہ معینی حکومت بہت متقدم ہے اور حضرت عیسیٰؑ سے پندرہ سو برس قبل موجود تھی۔ لیکن مولر کا بیان ہے کہ کوئی معینی کتبہ آٹھ سو برس قبل مسیحؑ سے پہلے کا نہیں ملتا، اس بنا پر سبائی اور معینی دونوں ہمعصر ہیں ۔

سبائی دَور، جیسا کہ کتبوں سے ثابت ہوتا ہے، حضرت عیسیٰؑ سے سات سو برس قبل ہے۔ اس سلطنت کا پایہ تخت مآرب تھا، اُس زمانہ کے سنگی کتبے بکثرت موجود ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ سے ایک سو پندرہ برس قبل تک اس حکومت کا پتہ چلتا ہے، اس دَور کے بعد حمیر کا زمانہ ہے۔ حمیر نے مآرب پر قبضہ کر کے اس کو پایۂ تخت بنا لیا ۔

قریباً ۱۱۵ سنہ قبل مسیح میں حمیر نے سبائی حکومت پر قبضہ کر لیا۔ کتبوں سے ثابت ہوتا ہے کہ حمیر میں چھبیس فرمانروا گزرے۔ حمیر کے بعض کتبوں میں سنہ و سال بھی کندہ ہے۔ ان کے عہد حکومت میں، رومی سلطنت نے عرب میں

مداخلت کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن یہ کوشش پہلی بھی تھی اور آخری بھی۔ ایے لیس گالس، جس نے حضرت عیسیٰؑ سے ۱۸ برس قبل، عرب پر چڑھائی کی تھی، بالکل ناکامیاب رہا۔ اُس کے رہبر دغابازی سے اس کو صحرا میں لے گئے اور ریگستان میں پہنچ کر اس کا سارا لشکر تباہ ہو گیا۔[۵]

حمیر نے یہودی مذہب قبول کر لیا تھا۔ اسی زمانہ کے قریب حبشیوں نے عرب کے جنوب میں حکومت قائم کرنی شروع کی۔ اور ایک زمانہ میں حمیریوں کو شکست دے کر اپنی مستقل حکومت قائم کرلی۔ اس عہد کا ایک کتبہ جو آجکل ہاتھ آیا ہے، اس پر یہ الفاظ ہیں:

"رحمان، مسیح، اور روح القدس کی قدرت و فضل و رحمت سے اس یادگاری پتھر پر ابرہہ نے کتبہ لکھا۔ جو کہ بادشاہ حبش ارا حمیس ذبی ان کا نائب الحکومۃ ہے۔"

سبا اور حمیر کی عظمت اور اقتدار اور وسعتِ فتوحات کی روایتیں، عرب میں اس قدر متواتر ہیں کہ ان کے قدر مشترک سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اشعار میں بھی کثرت سے واقعات مذکور ہیں۔ عربوں کے خیال کے موافق سلاطین حمیر نے ایران کے انتہائی مقامات فتح کر لیے تھے۔ ذوالقرنین جس کو عوام سکندر کہتے ہیں، اہل عرب کے نزدیک اسی حمیری خاندان کا فرماں روا تھا۔ شاہ نامہ میں مذکور ہے کہ کیکاؤس کو شاہ ہاماوران نے گرفتار کر لیا تھا۔ علامہ ثعلبی نے تاریخ ایران میں (جو اب یورپ میں چھپ کر شائع ہو گئی ہے) لکھا ہے کہ یہ ہاماوران، حمیر کا

۵؎ یہ تمام تفصیل انسائیکلو پیڈیا کے اس آرٹیکل سے ماخوذ ہے جو جی ڈبلو تھیاچر صاحب نے عرب پر لکھا ہے نیز لٹریری ہسٹری آف دی عربس مؤلفہ رینالڈ نکلسن پروفیسر کیمبرج صفحہ ۴ تا ۶۔

بادشاہ تھا، اور ہا ادران دراصل وہی عربی حمیر ہے۔ علامہ موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ سودابہ جو کیکاؤس کی زوجہ تھی، اور فردوسی کے بیان کے موافق، سیاوش پر عاشق ہوگئی تھی، اسی حمیری بادشاہ کی بیٹی تھی، اور اس کا اصلی نام سعدیٰ تھا، ایرانیوں نے اپنے تلفظ میں اس کو سودابہ کر لیا تھا۔

یورپ کی تحقیقات حال سے بھی سبا اور حمیر کے اعلیٰ درجہ کے تمدن کا ثبوت ملتا ہے۔ پروفیسر نولدکی جرمنی کا مشہور مستشرق لکھتا ہے:

"ولادت مسیح سے ہزار سال قبل، جنوبی و غربی عرب یعنی یمن جو حمیر اور سبا کا ملک تھا، اور بارش گرما کے باعث زراعت کے لیے نہایت موزوں تھا، تمدن کے اس رتبہ تک پہنچ چکا تھا کہ اس کے کثیر التعداد کتبات اور شاندار عمارات کے آثار سے آج بھی ہمارے جذبات مدح و ستایش کو تحریک ہوتی ہے، اور اہل یونان و روم نے اس کو "دولت مند عرب" کا جو لقب دیا تھا وہ بے جا نہ تھا...... توراۃ میں متعدد عبارتیں ہیں جو سبا کی عظمت و شوکت کی شہادت دیتی ہیں۔ چنانچہ ملکۂ سبا کا سلیمانؑ سے ملاقات کا قصہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ (۱۔ سلاطین ۱۰۔ آیت ۱ تا ۱۳) قوم ثمود۔ جن کی عمارات سے ڈاؤتی اور یوٹنگ کی محنتوں نے ہم کو روشناس کر دیا ہے، نیز قوم نابت نے جو ثمود سے بہت ملتی جلتی ہے۔ اپنے تمدن کی ابتدائی تعلیم غالباً انہی سے حاصل کی ہے۔"

"کتابت کا فن، جو سبائیوں نے بہت ابتدائی زمانہ میں شمال سے لیا تھا، اب اس کو خود انھوں نے عرب کے اکثر حصوں میں ہر طرح کے کاروبار میں جاری کر دیا۔ یہاں تک کہ ایک طرف دمشق اور دوسری جانب ابی سینیا تک اس کو پھیلا دیا۔"

ے مورخین کی تاریخ عالم جلد ۸ یعنی ہسٹورینس ہسٹری آف ورلڈ، تمہیدی آرٹیکل نوشتہ پروفیسر نولدکی صفحہ ۵

نابتی حکومت، جو شام کے حدود سے متصل تھی، اور جو قوم ثمود کی مرادف، یا اُن کی قائم مقام تھی۔ اس کی نسبت فارسٹر صاحب اپنے جغرافیہ میں لکھتے ہیں:

"ان مختصر بیانات سے معلوم ہوا ہوگا کہ زمانۂ قدیم میں نابت کا نام اور اثر نہ صرف ریگستانی اور صحرائی عرب پر مستولی تھا۔ بلکہ حجاز و نجد کے صوبہائے عظیمہ پر بھی حاوی تھا۔ نابتی جہاں ایک طرف منافع تجارت سے بہرہ اندوز ہونے میں کمال رکھتے تھے، وہاں دوسری طرف بطور سچے بنو اسمٰعیل کے خطراتِ جنگ کے لیے بالکل مستعد رہتے تھے۔ فلسطین و شام میں اُن کی غارت گریوں، اور خلیج عرب میں مصری جہازات پر اُن کی رہزنی نے بارہا تاجداران مقدونیہ کو اُن کی دشمنی پر آمادہ کر دیا۔ لیکن روما کی مجموعی قوت سے پیشتر کوئی شے اُنھیں روک نہ سکی، اور روما کی اطاعت بھی انھوں نے اسٹرابو کے زمانے میں بالکل مجبورانہ اور مشتبہ انداز سے قبول کی[۱]۔"

یہ قدیم سلطنتوں کا حال تھا۔ اسلام کے قبل یہ تمام سلطنتیں برباد ہو چکی تھیں۔ اُن کے بجائے یمن میں صرف بڑے بڑے سردار رہ گئے تھے، جن کو قیل، یا مقول کہتے تھے۔ عراق میں آلِ منذر کا خاندان قائم تھا، جو فارس کے زیرِ اثر تھا۔ خورنق اور سدیر عرب کی مشہور عمارتیں اسی سلسلہ کی یادگار ہیں۔ شام کے حدود میں غسانی خاندان فرمانروا تھا، جو قیصرانِ روم کا ماتحت تھا اور جس کا اخیر فرمانروا، جبلہ بن الایہم غسانی تھا۔

تہذیب و تمدن تہذیب و تمدن کے لحاظ سے عرب کے مختلف حصے بالکل مختلف حالت رکھتے تھے۔ مانسیو لیبان[۲] فرنساوی نے اصولِ عمران کی بنا پر یہ رائے ظاہر

---

[۱] تاریخی جغرافیہ عرب از ریورنڈ فارسٹر جلد اوّل از صفحہ ۲۲۰ تا ۲۲۸ [۲] تمدن عرب

کی ہے کہ اسلام سے پہلے عرب کا تمدن کسی زمانہ میں اوج کمال تک پہنچ چکا تھا۔ کیونکہ اصولِ ارتقا کے روئے کوئی قوم محض وحشت کی حالت سے دفعتہً اعلیٰ درجہ کی تہذیب و تمدن تک نہیں پہنچ سکتی۔

یہ ایک قیاسی استدلال ہے۔ تاریخ سے بھی اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ عرب کے بعض حصے مثلاً یمن کسی زمانہ میں انتہا درجہ کی ترقی تک پہنچ چکے تھے۔ یورپ کے محققینِ آثارِ قدیمہ جنھوں نے یمن کے آثارِ قدیمہ کی تحقیقات کی ہے، اور پرانے کتبوں کو پڑھا ہے، وہ یمن کی قدیم تہذیب و تمدن کا اعتراف کرتے ہیں۔

صنعاء اور **قلیس** کے ذکر میں، یاقوت حموی نے معجم میں قدیم آثاراتِ عجیبہ کا تذکرہ کیا ہے اور گو اس میں بہت کچھ مبالغہ بھی ہے۔ تاہم اصلیت کا حصہ بھی کچھ کم نہیں۔

اسی طرح عرب کے وہ مقامات جو ایران اور شام سے متصل تھے، مثلاً حیرہ جو آلِ نعمان کا پایہ تخت تھا۔ اور حوران جو خاندانِ غسان کا صدر مقام تھا، تہذیب و تمدن سے خالی نہ تھے۔

مورخینِ عرب کا دعویٰ ہے کہ یمن نے ایک زمانہ میں اس حد تک ترقی کی تھی کہ وہاں کے سلاطین نے تمام ایران فتح کر لیا تھا۔ چنانچہ سمرقند کی وجہ تسمیہ یہ بتاتے ہیں کہ یمن کا ایک بادشاہ جس کا نام شمر تھا، اس نے سمرقند کو کھدوا کر برباد کر دیا تھا۔ اس بنا پر ایرانی اس مقام کو شمر کند کہنے لگے، پھر معرب ہو کر سمرقند ہو گیا۔

عظیم الشان قلعوں اور عمارتوں کے آثار، جو اب بھی کچھ کچھ باقی ہیں، اس بات کی قطعی شہادت ہیں کہ اس ملک میں کبھی اعلیٰ درجے کا تمدن موجود تھا۔ علامہ ہمدانی نے اکلیل میں تمام آثارِ قدیمہ کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ صفۃ جزیرۃ العرب میں لکھتے ہیں[1]

---

[1] ج اول ص ۲۰۳ اس۔

المشهور من محافد الیمن و قصورها القدیمة التی ذکرتها العربُ فی الشعر والمثلِ...... کثیرةٌ الذی فیها من الشعر بابٌ واسع وقد جمع ذٰلک کلّہ الکتاب الثامن من الاکلیل	یمن کے مشہور قدیم قصر اور ایوان جن کا ذکر اہلِ عرب نے اشعار اور امثال میں کیا ہے..... کثرت سے ہیں، اور ان کے متعلق اشعار کا ایک دفتر ہے اکلیل کے آٹھویں باب نے ان سب کو جمع کر دیا ہے۔

اس کے بعد مصنف نے لکھا ہے کہ میں اس موقع پر صرف اُن کے نام گنا دیتا ہوں اور وہ یہ ہیں:

"غمدان، تُلغُم، ناعِط، صِرْواح، سَلحِین، ظفار، ھکر، ضَھر، شِبام، غیمان، بَیْنُون، رِیام، براقِش، مَعین، ردنان، اَرْیاب، ہِند، ھُنیدہ، عَمران، مُخَیّر۔"

ان میں سے غمدان اور ناعط کا حال معجم البلدان میں تفصیل سے مذکور ہے۔ اور اس کی عظمت و رفعت کے متعلق ایسی باتیں نقل کی ہیں جن پر ایشیائی مبالغہ کا دھوکہ ہوتا ہے۔ سلحین کی نسبت لکھا ہے کہ ستر برس میں تعمیر ہوا، شِبام کے حال میں لکھا ہے:

لهم فیه حصون عجیبةٌ هائلةٌ۔	ان میں اُن کے متعدد ہیبت انگیز قلعے ہیں۔

قلعہ ناعط وہب بن منبہ کے زمانے تک موجود تھا۔ اس کے ایک کتبہ کو محدث موصوف نے پڑھا تو معلوم ہوا کہ سولہ سو ۱۶۰۰ برس کی تعمیر ہے۔ آجکل یورپ کے محققین نے ان مقامات میں جا کر جو تحقیقات کی ہے، اس سے بھی حیرت انگیز تمدن کی تصدیق ہوتی ہے۔ تھیاچر صاحب اپنے آرٹکل میں لکھتے ہیں:[۵]

۵ دیکھو انسائیکلوپیڈیا، مضمون عرب۔

"جنوبی عربستان میں، جہاں حضرت عیسیٰؑ سے صدیوں پہلے، ایک ترقی یافتہ تمدن موجود تھا۔ قلعوں اور شہر پناہوں کے آثار اب تک موجود ہیں اور ان کا ذکر متعدد سیاحوں نے کیا ہے۔ ...... یمن اور حضرموت میں یہ آثار کثرت سے ہے، اور اکثروں پر اب تک کتبے موجود ہیں۔ ..... صنعا کے قریب ایک قلعہ تھا، جس کو قزوینی نے آثار البلاد میں دنیا کے عجائبِ ہفت گانہ میں سے ایک قرار دیا ہے۔ (دیگر قلعوں کے لیے دیکھو جرنل جرمن اورینٹل سوسائٹی جلد ۱۰ صفحہ ۲۰ سے آگے)

مآرب جو قدیم سبائی دارالسلطنت تھا، اس کے آثارِ قدیمہ کو ارنو، ہالیوے اور گلازر نے دیکھا ہے۔

مآرب کے مشہور آثار میں سے ایک بڑی خندق کے آثار باقی ہیں۔ ان کو دیکھ کر عدن کے دوبارہ تعمیر شدہ حوض یاد آتے ہیں، اُن کی اہمیت اس وقت ظاہر ہوئی جب گلازر نے وہ دو طویل الذیل کتبے شائع کیے، جن میں اُن کے عیسوی قرن پنجم و ششم میں دوبارہ تعمیر کا ذکر ہے۔ یمن میں بمقام حران ایک اور خندق ہے، جس کا طول تقریباً چار سو پچاس فیٹ ہے۔"

لیکن عرب کے اصلی اور اندرونی مقامات میں تہذیب و تمدن کی یہ حالت نہ تھی۔ عربی زبان نہایت وسیع ہے۔ باوجود اس کے جن چیزوں کو تمدن اور اسبابِ معاشرت سے تعلق ہے، اُن کے لیے خاص عربی زبان میں الفاظ نہیں ملتے، بلکہ ایران یا روم سے مستعار آتے ہیں۔ سکّہ کے لیے ایک لفظ بھی موجود نہیں، درہم اور دینار دونوں غیر زبان کے الفاظ ہیں۔ درہم یونانی لفظ درخم ہے، اور یہ وہی لفظ ہے جو انگریزی زبان میں ڈرام ہو گیا ہے۔ چراغ معمولی چیز ہے۔ تاہم اس کے لیے عربی میں کوئی لفظ نہ تھا۔ چراغ کو لے کر سراج کر لیا۔ پھر ایک

مصنوعی لفظ بنایا، مصباح، یعنی ایک آلہ جس سے صبح بنالی جاتی ہے۔ کوزہ کے لیے کوئی لفظ نہیں، کوزہ کو کوز کرلیا ہے۔ لوٹے کو ابریق کہتے ہیں، جو آب ریز کا معرب ہے۔ تشت فارسی لفظ تھا، اسی کو عربی میں طست کرلیا ہے۔ پیالہ کو کاس کہتے ہیں، وہی کاسہ فارسی لفظ ہے۔ کرتہ کو عربی میں قرطق کہتے ہیں، یہ بھی فارسی ہے۔ پائجامہ کو سروال کہتے ہیں، جو شلوار کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔

جب ایسی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے لفظ نہ تھے تو تمدن کے بڑے بڑے سامان کے لیے کہاں سے لفظ آتے؟ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب نے کسی زمانہ میں جو ترقی کی تھی آس پاس کے ممالک کی تہذیب و تمدن سے متاثر ہوکر کی تھی۔ اس لیے جو مقامات اُن ممالک سے دُور تھے اُسی اصلی حالت پر رہ گئے۔

احادیث صحیحہ سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک عیش و نعمت کے سامان بہت کم تھے۔ مسئلہ حجاب کے شانِ نزول میں بخاری وغیرہ میں مذکور ہے کہ اس زمانہ تک گھروں میں جائے ضرور نہ تھی۔ مستورات رفع حاجت کے لیے باہر جایا کرتی تھیں۔ ترمذی باب الفقر میں ہے کہ اس وقت چھلنیاں نہ تھیں۔ بھوسے کو پھونک کر اُڑاتے تھے، جو رہ جاتا تھا، وہی آٹا ہوتا تھا۔ بخاری کی ایک حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ راتوں کو گھروں میں چراغ نہیں جلتے تھے۔ ابوداؤد میں ایک صحابی کی روایت ہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں تھا، لیکن میں نے آپ سے حشرات الارض[1] کا حرام ہونا نہیں[2] سنا۔ اگرچہ اس حدیث کی شرح میں محدثین لکھتے ہیں، کہ ایک راوی کے نہ سننے سے یہ لازم

---

[1] حشرات الارض کیڑے مکوڑے کو کہتے ہیں۔

[2] ابوداؤد جلد دوم صفحہ ۱۷۶، باب فی اکل حشرات الارض،

[illegible] صلی اللہ علیہ وسلم نے حشرات الارض کی حرمت نہیں بیان کی، لیکن اس سے اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اسلام سے پہلے عرب حشرات الارض کھاتے تھے۔ تاریخ اور ادب میں یہ تصریح موجود ہے کہ عرب کھنکھجورا، کوے، گرگٹ، سہی اور جانوروں کا چمڑا کھاتے تھے۔

عرب کے مذاہب عرب میں اسلام سے پہلے مختلف مذاہب تھے۔ بعضوں کا خیال تھا کہ جو کچھ ہے زمانہ یا فطرت (قانونِ قدرت) ہے، خدا کوئی چیز نہیں۔ ان ہی لوگوں کی نسبت قرآن مجید میں ہے:

وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ (جاثیہ - ۳)

اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہے، یہی ہماری دُنیا کی زندگی ہے۔ ہم مرتے اور جیتے ہیں۔ اور ہم کو مارتا ہے تو زمانہ مارتا ہے۔

بعض خُدا کے قائل تھے لیکن قیامت اور جزا و سزا کے مُنکر تھے، اُن کے مقابلے میں قرآن مجید نے قیامت کے ثبوت پر اس طرح استدلال کیا ہے:

قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ (یٰسین - ۵)

کہ دو کہ (ہڈیوں کو) وہی دوبارہ زندہ کرے گا جس نے پہلی دفعہ پیدا کیا تھا۔

بعض خدا، اور جزا و سزا کے بھی قائل تھے، لیکن **نبوّت** کے مُنکر تھے۔ ان کا ذکر اس آیت میں ہے:

وَقَالُوا مَالِ هَٰذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ، قَالُوا أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا رَّسُولًا

(بنی اسرائیل ۱۱ - فرقان ۱)

اور کہتے ہیں کہ یہ کیسا رسول ہے کہ کھاتا پیتا ہے اور بازار میں چلتا پھرتا ہے، کہتے ہیں کہ خُدا نے آدمی پیغمبر بنا کر بھیجا ہے؟

اُن کا خیال تھا کہ اگر کوئی پیغمبر ہو سکتا ہے تو اس کو فرشتہ ہونا چاہیے، جو حاجات

انسانی سے منزہ ہو۔

لیکن عموماً لوگ بُت پرست تھے۔ وہ بتوں کو خدا نہیں سمجھتے تھے بلکہ کہتے تھے کہ خدا تک پہنچنے کے وسیلے ہیں[1]۔

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (زمر۔۱) ہم ان بتوں کو صرف اس لیے پوجتے ہیں کہ ہم کو خدا سے قریب کر دیں۔

قبیلۂ حمیر جو یمن میں رہتا تھا۔ آفتاب پرست تھا۔ کنانہ، چاند کو پوجتے تھے۔ قبیلہ بنی تمیم، دبران کی عبادت کرتا تھا۔ اسی طرح قیس، شعریٰ کی، قبیلۂ اسد، عُطارد کی، اور لخم و جذام، مشتری کی پرستش کرتے تھے[2]۔

مشہور بتوں اور ان کے پوجنے والوں کے نام حسب ذیل ہیں[3]:

نام بُت	مقام	قبیلہ جو اس بت کو پوجتا تھا
لات	طائف	ثقیف،
عُزّیٰ	مکۂ معظمہ	قریش و کنانہ،
منات	مدینۂ منورہ	اوس، خزرج اور غسان،
ودّ	دومۃ الجندل	کلب،
سُواع		ہذیل۔
یغوث		مذحج، اور بعض قبائل یمن،
یعوق		ہمدان،

[1] یہ تمام تفصیل "ملل و نحل" مذاہب عرب کے ذکر میں ہے۔ [2] طبقات الامم، لابن صاعد الاندلسی، مطبوعہ بیروت سنہ ۱۹۱۲ء صفحہ ۴۳۔ [3] بتوں کی تفصیل "ملل و نحل" میں ہے، ۱۲۔

سب سے بڑا بُت ہُبل تھا، جو کعبہ کی چھت پر منصوب تھا۔ قریش لڑائیوں میں اس کی جے پکارتے تھے۔

عرب میں بُت پرستی کا بانی ایک شخص عمرو بن لُحَی تھا، اُس کا اصلی نام ربیعہ بن حارثہ تھا۔ عرب کا مشہور قبیلہ خزاعہ اسی کی نسل سے ہے۔ عمرو سے پہلے جرہم کعبہ کے متولّی تھے۔ عمرو نے لڑکر جرہم کو مکہ سے نکال دیا، اور خود حرم کا متولّی ہوگیا۔ وہ ایک دفعہ شام کے کسی شہر میں گیا، وہاں کے لوگوں کو بُت پُوجتے دیکھا تو پُوچھا کہ ان کو کیوں پُوجتے ہو؟ انھوں نے کہا یہ حاجت روا ہیں، لڑائیوں میں فتح دلاتے ہیں، قحط پڑتا ہے تو پانی برساتے ہیں۔ عمرو نے چند بُت اُن سے لے لیے اور لاکر کعبہ کے آس پاس قائم کیے، کعبہ چونکہ عرب کا مرکز تھا، اس لیے تمام قبائل میں بُت پرستی کا رواج ہوگیا۔ ان میں سب سے قدیم بُت مناۃ تھا، یہ سمندر کے کنارے قدید کے قریب نصب تھا۔ اوس اور خزرج یعنی مدینہ کے لوگ اسی پر قربانی چڑھاتے تھے، اور جب کعبہ کا حج کرکے آتے تھے، تو احرام یہیں اُتارتے تھے۔ ہذیل اور خزاعہ بھی اس کی پرستش کرتے تھے۔[۱]

یاقوت حموی نے معجم البلدان (ذکر مکہ) میں لکھا ہے کہ عرب میں بُت پرستی کی عام اشاعت کی وجہ یہ ہُوئی کہ قبائلِ عرب جو تمام اطراف سے حج کو آتے تھے واپس جاتے ہُوئے حرم کے پتھروں کو اُٹھا لیتے تھے، اور ان کو اصنامِ کعبہ کی صورت پر تراش کر ان کی عبادت کرتے تھے۔

اللہ کا اعتقاد عرب، گو قریبًا سب کے سب بُت پرست تھے لیکن اس کے ساتھ یہ اعتقاد ان کے دل سے کبھی نہیں گیا کہ اصلی خدائے برتر اور چیز ہے، اور وہی

---

[۱] یہ تمام تفصیل معجم البلدان، ذکر مناۃ میں ہے۔

تمام عالم کا خالق ہے، اس خالقِ اکبر کو وہ "اللہ" کہتے تھے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝ (سورۂ عنکبوت - ۶)

اور اگر ان لوگوں (کافروں) سے پوچھو کہ آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا، اور چاند اور سورج کو کس نے تابعدار بنا رکھا ہے تو بول اٹھیں گے کہ اللہ، پھر کدھر بہکے جا رہے ہیں۔

فَاِذَا رَكِبُوْا فِى الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ۝ (سورۂ عنکبوت - ۷)

پھر جب کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو خدا ہی کو خلوص کے ساتھ پکارتے ہیں۔ پھر جب خدا اُن کو نجات دے کر خشکی کی طرف پہنچا دیتا ہے تو شرک کرنے لگتے ہیں۔

قرآن مجید نے تیرہ سو برس پہلے جس حقیقت کا اظہار کیا، آج تحقیقاتِ آثارِ قدیمہ بھی اس کی تصدیق کرتی ہے۔ مذاہب و اخلاق کی انسائیکلوپیڈیا[۱] میں مشہور مستشرق نولدیکی کا جو قول نقل کیا گیا ہے اُس کے اقتباسات حسبِ ذیل ہیں:

"اللہ" جو صفا کے کتبوں میں "ھلہ" لکھا ہوا ہے، نباتی اور دیگر قدیم باشندگانِ عرب شمالی کے نام کا ایک جزو تھا۔ مثلاً "زید اللّٰهی"...... نباتی کتبات میں اللہ کا نام بطور ایک علیحدہ معبود کے نہیں ملتا۔ لیکن صفا کے کتبات میں ملتا ہے۔ متاخرین مشرکین میں اللہ کا نام نہایت عام ہے۔ ولہاسن نے عربِ قدیم کے لٹریچر میں بہت سی عبارتیں نقل کی ہیں جن میں اللہ کا لفظ بطور ایک معبودِ اعظم کے مستعمل ہوا ہے۔ نباتی کتبات میں ہم بار بار کسی دیوتا کا نام پاتے ہیں جس کے ساتھ اللہ کا لقب شامل ہے۔ اس سے ولہاسن نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اللہ کا لقب جو پہلے مختلف معبودوں کے لیے استعمال

---

[۱] ج ۱ ص ۶۶۴ -

ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ زمانہ مابعد میں صرف ایک عظیم ترین معبود کے لیے بطور علَم کے مخصوص ہو گیا۔

نصرانیت اور یہودیت اور مجوسیت اگرچہ زمانہ اور مدت کا تعین مشکل ہے، لیکن یہ مذہب ایک مدّت دراز سے عرب میں رائج ہو چکے تھے۔ علامہ ابن قتیبہ نے معارف میں لکھا ہے کہ قبائلِ ربیعہ وغسان نصرانی تھے۔ قضاعۃ میں بھی اس مذہب کا اثر پایا جاتا تھا۔ نصرانیت کو اس قدر ترقی ہو چکی تھی کہ خود مکہ معظمہ میں ایسے لوگ موجود تھے (مثلاً ورقہ بن نوفل) جو عبرانی زبان میں انجیل کو پڑھ سکتے تھے۔ متعدد ایسے لوگ تھے جنھوں نے شام میں جاکر تعلیم پائی تھی۔

حمیر، بنو کنانہ، بنو حرث بن کعب، کندہ، یہ قبائل یہودی تھے۔ مدینہ منورہ میں یہود نے پورا غلبہ پا لیا تھا، اور توراۃ کی تعلیم کے لیے متعدد درسگاہیں قائم تھیں، جن کو بیت المدراس کہتے تھے، حدیث کی کتابوں میں اسی نام سے ان کا ذکر آتا ہے۔ قلعۂ خیبر کی تمام آبادی یہودی تھی۔ امراء القیس کا ہمعصر مشہور شاعر سموئیل بن عادیاء جس کی وفاداری آج تک عرب میں ضرب المثل ہے، یہودی تھا۔

اہلِ کتاب کی روایتیں مکہ معظمہ میں اس قدر رواج پا چکی تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب قرآن نازل ہوتا تھا اور اس میں بنی اسرائیل کے واقعات مذکور ہوتے تھے تو کفار بدگمانی کرتے تھے کہ کوئی یہودی یا عیسائی آپؐ کو سکھاتا ہے۔

خود قرآن مجید میں ہے:

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ	اور ہم جانتے ہیں کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ
اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ۔ (نحل - ۱۴)	محمدؐ کو کوئی آدمی سکھاتا ہے۔

قرآن مجید میں اس خیال کا ابطال بھی کر دیا ہے، جس کی تفصیل مناسب موقع پر آئے گی۔

قبیلہ تمیم مجوسی تھا، زراہ تمیمی نے، جو اس قبیلہ کا مشہور رئیس تھا، اسی بنا پر اپنی بیٹی سے شادی کر لی تھی، گو اس پر اس کو ندامت ہوئی۔ اقرع بن حابس بھی مجوسی تھا[۱]۔

مذہب حنیفی دینِ ابراہیمی کا اُم الاصول توحید خالص تھی۔ زمانہ کے امتداد اور جہالت کے شیوع سے یہ اصول اگرچہ شرک آلود ہو گیا تھا، یہاں تک کہ خود خانۂ خدا میں بتوں کی پرستش ہوتی تھی، تاہم بالکل فنا نہیں ہو سکتا تھا، عرب میں کہیں کہیں اس کا دھندلا سا نشان نظر آتا تھا۔ جو لوگ صاحبِ بصیرت تھے اُن کو یہ منظر نہایت نفرت انگیز معلوم ہوتا تھا، کہ انسانِ عاقل، جمادِ لایعقل کے سامنے سر جھکائے۔ اس بنا پر بت پرستی کی بُرائی کا خیال بہتوں کے دل میں آیا۔ لیکن اس کا تاریخی زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے کچھ ہی پہلے شروع ہوتا ہے۔ ابن اسحاق[۲] نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ کسی بُت کے سالانہ میلہ میں ورقہ بن نوفل، عبداللہ بن جحش، عثمان بن الحویرث، زید بن عمرو بن نفیل شریک تھے۔ ان لوگوں کے دل میں دفعتہً یہ خیال آیا کہ یہ کیا بیہودہ پن ہے کہ ہم ایک پتھر کے سامنے سر جھکاتے ہیں جو نہ سنتا ہے، نہ دیکھتا ہے، نہ کسی کا نقصان کر سکتا ہے، نہ کسی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ یہ چاروں قریش کے خاندان سے تھے۔ ورقہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے برادرِ عم زاد تھے۔ زید حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے چچا تھے۔ عبداللہ ابن جحش حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے بھانجے تھے۔ عثمان عبدالعزیٰ کے پوتے تھے۔

زید، دینِ ابراہیمی کی تلاش میں شام گئے۔ وہاں یہودی اور عیسائی پادریوں سے ملے، لیکن کسی سے تسلی نہ ہوئی۔ اس لیے اس اجمالی اعتقاد پر اکتفا کیا کہ "میں

---

[۱] معارف ابن قتیبہ۔ [۲] سیرت ابن ہشام مطبوعۂ مصر ص ۷۶، ۱۲

ابراہیمؑ کا مذہب قبول کرتا ہوں۔ صحیح بخاری میں (باب بنیان الکعبہ سے پہلے) حضرت اسماءؓ (دختر ابوبکر صدیقؓ) سے روایت ہے کہ "میں نے زید کو اس حالت میں دیکھا کہ کعبہ سے پیٹھ لگائے لوگوں سے کہتے تھے، اے اہل قریش! تم میں سے کوئی شخص بجز میرے، ابراہیمؑ کے دین پر نہیں ہے"!

عرب میں لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ زید ہی پہلے شخص ہیں جس نے اس رسم کی ممانعت کی، جب کوئی شخص ایسا ارادہ کرتا تو وہ جا کر اس لڑکی کو مانگ لیتے اور خود اس کی پرورش کرتے۔

صحیح بخاری میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے پہلے زید کو دیکھا تھا، اور ان سے صحبت رہی تھی۔ ورقہ اور عبداللہ بن جحش، اور عثمان بت پرستی چھوڑ کر عیسائی ہو گئے تھے۔

اسی زمانہ کے قریب امیہ بن ابی صلت نے جو طائف کا رئیس اور مشہور شاعر تھا۔ بت پرستی کی مخالفت کی۔ حافظ ابن حجر نے اصابہ میں زبیر بن بکار کی سند سے لکھا ہے کہ امیہ نے زمانۂ جاہلیت میں آسمانی کتابیں پڑھی تھیں، اور بت پرستی کو چھوڑ کر دین ابراہیمی اختیار کر لیا تھا۔

امیہ کا دیوان آج بھی موجود ہے۔ اگرچہ اس کا بڑا حصہ جعلی ہے۔ تاہم اصلی کلام بھی اس میں پایا جاتا ہے، وہ غزوۂ بدر تک زندہ رہا۔ عتبہ جو رئیس مکہ اور امیر معاویہؓ کا نانا تھا۔ امیہ کا ماموں زاد بھائی تھا۔ امیہ نے اس کے قتل ہونے کی خبر سنی تو اس کو سخت صدمہ ہوا، اور نہایت پُردرد مرثیہ لکھا۔ غالباً اسی کا اثر تھا کہ اسلام قبول نہ کر سکا۔

شمائل میں ہے کہ ایک دفعہ ایک صحابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم ردیف تھے۔ انھوں نے امیہ کا ایک شعر پڑھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

"اور" انھوں نے سو شعر پڑھے۔ ہر شعر کے ختم ہونے پر آپؐ فرماتے جاتے تھے کہ "اور"۔ اخیر میں آپؐ نے فرمایا کہ "امیہ مسلمان ہوتے ہوتے رہ گیا"۔

ابن ہشام نے بُت پرستی کی مخالفت کرنے والوں میں انہی چاروں کا نام لکھا ہے لیکن اور تاریخی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب میں اور متعدد اہل نظر پیدا ہو گئے تھے جنھوں نے بُت پرستی سے توبہ کی تھی۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور شخص، عرب کا نامور خطیب قس بن ساعدۃ الایادی ہے۔ اس کا ذکر آگے آتا ہے۔ ایک شخص قیس بن نُشبہ تھا، جس کی نسبت حافظ ابن حجر نے اصابہ میں لکھا ہے کہ جاہلیت کے زمانے میں خدا پرست ہو چکا تھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پر مشرف بہ اسلام ہُوا۔

یہ تحقیق نہیں کہ دین ابراہیمی کو حنیفی کیوں کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ لفظ موجود ہے، لیکن اس کے معنی میں اختلاف ہے۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ چونکہ اس دین میں بُت پرستی سے انحراف تھا، اس لیے اس کو حنیفی کہتے ہیں۔ کیونکہ حنف کے معنی انحراف کے ہیں۔ عبرانی اور سریانی زبان میں حنیف کے معنی منافق اور کافر کے ہیں۔ ممکن ہے کہ بت پرستوں نے یہ لقب دیا ہو، اور موحدین نے فخریہ قبول کر لیا ہو۔

یہ امر اکثر روایتوں سے ثابت ہے کہ عرب اور خصوصاً مکہ اور مدینہ میں متعدد اشخاص بُت پرستی کے منکر ہو گئے تھے اور ملت ابراہیمی کی جستجو میں تھے۔ یہ اس لیے کہ مجددِ ملتِ ابراہیمی کے ظہور کا وقت قریب آ گیا تھا۔

ان چند راہ طلب اور حقیقت جُو اشخاص کے وجود کی بنا پر مصنفینِ یورپ کہتے

۱؎ یہ مارگولیوس کا بیان ہے۔

ہیں کہ مذہبِ صحیح اور توحیدِ خالص کا رواج عام عرب میں اسلام سے پہلے بھی موجود تھا، لیکن اگر یہ صحیح ہے تو یہ حیرت انگیز بات ہے کہ اسلام کے ظہور پر اس قدر کیوں ہنگامہ برپا ہوا؟

کیا عرب میں ان مذاہب نے کچھ اصلاح کی؟

جیسا کہ اوپر بیان ہوا، عرب میں تمام مشہور مذاہب موجود تھے، یہودیت بھی، نصرانیت بھی، مجوسیت بھی، حنیفیت بھی، اور عقلی بلند پروازی کی معراج، الحاد بھی، لیکن ان سب کا نتیجہ کیا تھا؟ عقائد کے لحاظ سے یا تو خداؤں کی وہ کثرت جس کو نصرانیت نے بہت گھٹایا، تاہم تین کی تعداد سے کم نہ کرسکی۔ اس کے ساتھ یہ اعتقاد کہ حضرت عیسیٰؑ خود سُولی پر چڑھ کر تمام بنی آدم کے گناہوں کا کفّارہ بن گئے، یا توحید تھی، لیکن خدا اس قسم کا تھا، جو آدمیوں سے کُشتی لڑتا تھا۔[۱]

بُتوں پر آدمیوں کی قربانی چڑھائی جاتی تھی۔ باپ کی منکوحہ بیٹے کو وراثت میں ملتی تھی، حقیقی بہنوں سے ایک ساتھ شادی جائز تھی۔ ازدواج کی کوئی حد نہ تھی۔ قمار بازی، شراب خوری، زنا کاری کا عام رواج تھا۔ بے حیائی کی یہ حالت تھی کہ سب سے بڑا نامور شاعر امراء القیس جو شہزادہ بھی تھا، قصیدہ میں اپنی پھوپھی زاد بہن کے ساتھ اپنی بدکاری کا قصّہ مزے لے لے کر بیان کرتا ہے۔ اور یہ قصیدہ کعبہ پر آویزاں کیا جاتا ہے۔

لڑائیوں میں لوگوں کو زندہ جلا دینا، مستورات کے پیٹ چاک کر ڈالنا معصوم بچوں کو تہِ تیغ کرنا، عموماً جائز تھا۔ عیسائیوں کے بیان کے مطابق عربِ قبلِ اسلام تمام مذاہب میں سب سے زیادہ عیسائیت سے متاثر تھا۔ تاہم اس اثر کا کیا

---

[۱] توراۃ تکوین، آیت ۲۲ تا ۲۹ میں حضرت یعقوبؑ کے خدا سے کُشتی لڑنے کا واقعہ تفصیل سے مذکور ہے۔

نتیجہ تھا؟ اس کو خود عیسائی مورخین کی زبان سے سننا چاہیے! ایک عیسائی مورّخ لکھتا ہے:

"عیسائیوں نے عرب کو پانسو برس، تعلیم و تلقین کی، اس پر بھی خال خال عیسائی نظر آتے تھے۔ یعنی بنو حارث نجران میں، بنو حنیفہ یمامہ میں، اور کچھ بنی طے میں عیسائی تھے، باقی خیریت ...... بالآخر عرب کو من حیث المذہب دیکھیے تو اس کی سطح پر عیسائیوں کی ضعیف کوششوں کی کچھ خفیف سی موجیں لہراتی نظر آتی تھیں، اور یہود کی قوت بھی کبھی شدت سے طغیانی کرتی نظر آتی تھی۔ لیکن بت پرستی اور بنو اسمٰعیل کے بیہودہ اعتقادات کا دریا ہر سمت سے جوش مارتا ہوا کعبہ سے آکر ٹکراتا تھا[۵]"

یہ حالت صرف **عرب** کے ساتھ مخصوص نہ تھی، بلکہ تمام دنیا میں یہی تاریکی چھائی ہوئی تھی (اس کی تفصیل کتاب کے دوسرے حصے میں آئے گی) کیا اس عام ظلمت، اس عالمگیر تیرگی، اس وسیع اور ہمہ گیر تاریکی میں ایک **آفتاب عالمتاب** کی حاجت نہ تھی؟

---

۵ میور صاحب کی لائف آف محمدؐ جلد ۱، دیباچہ۔

سِلسلۂ اِسماعیلی

یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ مورخینِ عرب نے عرب کی تین قسمیں کی ہیں:
عرب کی وہ قدیم قومیں جو بالکل برباد ہو گئیں۔ مثلاً طسم و جدیس وغیرہ۔
خالص عرب جو قحطان کی اولاد ہیں، مثلاً اہلِ یمن اور انصار (اور تیسرا سلسلہ اسماعیلی)۔

حضرت اسمٰعیلؑ جب مکہ میں آباد ہوئے، تو حوالیِ مکہ میں بنو جرہم آباد تھے، حضرت اسماعیلؑ نے اس خاندان میں شادی کی۔ اس سے جو اولاد ہوئی، وہ عرب مستعربہ کہلاتی ہے۔ اب عرب کا بڑا حصہ اسی خاندان سے ہے۔

پیغمبرِ اسلامؐ اور خود اسلام کی تاریخ تمام تر اسی اخیر سلسلہ سے وابستہ ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) حضرت اسمٰعیلؑ ہی کے خاندان سے ہیں۔ اور جو شریعت آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو عنایت ہوئی، وہی ہے جو حضرت ابراہیمؑ کو عطا ہوئی تھی۔ قرآن مجید میں ہے:

مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ	تمہارے باپ ابراہیمؑ کا مذہب، اسی[1] نے اس سے پہلے تمہارا نام مسلم رکھا۔

(وفی ہذا)، (حج - ۷۸) (اور اس قرآن میں بھی)

[1] (اس کا مرجع بعض مفسرین نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بنایا ہے اور بعض نے اللہ تعالیٰ کو اور یہی صحیح ہے، جیسا کہ آیات سے صاف ظاہر ہے)۔ "س"

لیکن یورپ کے بہت سے متعصب مورخ سرے سے ان حقائق کے منکر ہیں۔ یعنی نہ حضرت ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ عرب میں آئے، نہ انھوں نے کعبہ کی بنیاد ڈالی۔ نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد ہیں۔

چونکہ ان مباحث نے مذہبی تعصب کی صورت اختیار کرلی ہے۔ اس لیے یہ توقع مشکل ہے کہ ہم اس بحث کو اس طرح طے کرسکیں گے کہ استدلال کی بنیاد، یورپ کے مسلمات پر رکھی جائے۔

جو واقعات مختلف فیہ ہیں بہت ہیں۔ لیکن اصولی امور صرف دو ہیں، جن میں دونوں فریق کا کوئی قدر مشترک نظر نہیں آتا۔ یہ اصول جس فریق کے موافق طے ہوں اس کے فرعی جزئیات بھی اسی کے موافق تسلیم کرلینے چاہییں۔ اصولِ مذکورہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ حضرت ہاجرہؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ عرب میں آکر آباد ہوئے یا نہیں؟

۲۔ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسحاقؑ کو قربانی کرنا چاہا تھا، یا حضرت اسمٰعیلؑ کو؟

حضرت اسماعیلؑ کہاں آباد ہوئے؟ یہود مدعی ہیں کہ حضرت اسحاقؑ ذبیح ہیں، اس بنا پر وہ قربانی گاہ کا موقع **شام** بتاتے ہیں۔ لیکن اگر یہ ثابت ہوجائے کہ حضرت اسحاقؑ نہیں، بلکہ حضرت اسمٰعیلؑ تھے، تو قربانی گاہ کے موقع کی نسبت عرب ہی کی روایتیں تسلیم کرنی پڑیں گی، اور اس حالت میں تاریخ کی تمام کڑیاں متصل ہوجائیں گی۔

توراۃ میں مذکور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پہلی اولاد حضرت ہاجرہؑ کے بطن سے ہوئی جس کا نام اسمٰعیل رکھا گیا۔ حضرت اسمٰعیلؑ کے بعد حضرت سارہؑ کے بطن سے حضرت اسحاقؑ پیدا ہوئے۔ حضرت اسمٰعیل جب بڑے

ہوئے، تو حضرت سارہؓ نے یہ دیکھ کر کہ وہ حضرت اسحاقؑ کے ساتھ گستاخی کرتے ہیں، حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ ہاجرہؑ اور اس کے بیٹے کو گھر سے نکال دو۔ ان واقعات کے بعد توراۃ کے خاص الفاظ یہ ہیں:

"تب ابراہیمؑ نے صبح سویرے اٹھ کر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی، اور ہاجرہ کو اس کے کاندھے پر دھر کر دی، اور اس لڑکے کو بھی رخصت کیا۔ وہ روانہ ہوئی، بیر سبع کے بیابان میں بھٹکتی پھرتی تھی، اور جب مشک کا پانی چک گیا تب اس نے اس لڑکے کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا، اور آپ اس کے سامنے ایک تیر کے ٹپے پر دور جا کر بیٹھی۔ کیونکہ اس نے کہا میں لڑکے کا مرنا نہ دیکھوں۔ سو وہ سامنے بیٹھی اور چلا چلا کر روئی۔ تب خدا نے اس لڑکے کی آواز سنی، اور خدا کے فرشتے نے آسمان سے ہاجرہ کو پکارا، اور اس سے کہا کہ اے ہاجرہ! تجھ کو کیا ہوا، مت ڈر کہ اس لڑکے کی آواز جہاں وہ پڑا ہے خدا نے سنی، اٹھ اور لڑکے کو اٹھا اور اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال کہ میں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا۔ پھر خدا نے اس کی آنکھیں کھولیں اور اس نے پانی کا ایک کنواں دیکھا اور جا کر اپنی مشک کو پانی سے بھر لیا، اور لڑکے کو پلایا، اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا، اور وہ بڑھا اور بیابان میں رہا کیا اور تیر انداز ہو گیا اور وہ فاران کے بیابان میں رہا، اور اس کی ماں نے ملک مصر سے ایک عورت بیاہنے کو لی۔"

(توراۃ سفر پیدائش باب ۲۱)

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ جب گھر سے نکالے گئے تو بالکل بچہ تھے۔ چنانچہ حضرت ہاجرہؑ نے مشک کو اور ان کو کاندھے پر اٹھایا۔ عربی توراۃ میں صاف یہ الفاظ ہیں:

واضعاً ایاھا علی کتفھا والولد۔ — حضرت ابراہیمؑ نے مشک اور بچہ دونوں کو ہاجرہ کے کندھے پر رکھا۔

لیکن توراۃ میں یہ بھی مذکور ہے کہ جب حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام پیدا ہوئے تو حضرت ابراہیمؑ کی عمر ۸۶ برس کی تھی[1] اور جب حضرت ابراہیم نے حضرت اسمٰعیلؑ کا ختنہ کیا تو حضرت اسمٰعیلؑ کی عمر ۱۳ برس کی، اور حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی ننانوے برس کی تھی[2]۔

یہ ظاہر ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کے گھر سے نکالے جانے کا واقعہ ختنہ کے بعد کا ہوگا، اس لیے اس وقت قطعاً اُن کی عمر ۱۳ برس سے زیادہ تھی، اور اس سن کا لڑکا اتنا چھوٹا نہیں ہوتا کہ ماں اُسے کندھے پر اُٹھائے پھرے۔ اس واقعہ سے غرض یہ ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی عمر اس وقت اتنی ہو چکی تھی کہ حضرت ابراہیمؑ، ان کو، اور ان کی والدہ کو اصلی مقام سکونت سے کسی دُور مقام پر لا کر آباد کر سکتے تھے۔

توراۃ کی عبارتِ مذکورہ میں تصریح ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ فاران میں رہے اور تیر اندازی کرتے رہے۔ عیسائی کہتے ہیں کہ فاران اُس صحرا کا نام ہے جو فلسطین کے جنوب میں واقع ہے، اس لیے حضرت اسمٰعیلؑ کا عرب میں آنا خلافِ واقعہ ہے۔ جغرافیہ دانانِ عرب عموماً متفق ہیں کہ فاران، حجاز کے پہاڑ کا نام ہے۔ چنانچہ معجم البلدان میں صاف تصریح ہے، لیکن عیسائی مصنّفین اس سے اتفاق نہیں کر سکتے۔ اس کا فیصلہ ایک بڑی طول طویل بحث پر مبنی ہے، جو مباحثہ اور مناظرہ کی حد تک پہنچ جاتی ہے، اس لیے ہم اس کو قلم انداز کرتے ہیں۔ البتہ

---

[1] پیدائش باب ۱۶

[2] پیدائش باب ۱۷، ۲۴ و ۲۵

اس قدر بتانا ضروری ہے کہ عرب کی حدِ شمالی کسی زمانہ میں کس حد تک وسیع تھی۔

موسیولیبان، تمدنِ عرب میں لکھتے ہیں:

"اس جزیرے کی حدِ شمالی اس قدر صاف اور آسان نہیں ہے۔ یعنی یہ حد اس طرح پر قائم ہوتی ہے کہ غزہ سے جو فلسطین کا ایک شہر اور بحرِ متوسط پر واقع ہے۔ ایک خط جنوب بحرِ لوط تک کھینچا جائے اور وہاں سے دمشق اور دمشق سے دریائے فرات تک، اور دریائے فرات کے کنارے کنارے لاکر خلیجِ فارس میں ملا دیا جائے، پس اس خط کو عربستان کی حدِ شمالی کہہ سکتے ہیں۔"

اس بنا پر عرب کے حجازی حصے کا فاران میں محسوب ہونا خلافِ قیاس نہیں۔ توراۃ[1] میں جہاں حضرت اسمٰعیلؑ کی جائے سکونت کا بیان ہے، وہاں یہ الفاظ ہیں:

"اور وہ حویلہ سے شور تک جو مصر کے سامنے اُس راہ میں ہے جس سے سور کو جاتے ہیں، بستے تھے۔"

اس تحدید میں، مصر کے سامنے جو زمین پڑتی ہے، وہ عرب ہی ہوسکتا ہے نصاریٰ کی مقدس کتابوں میں جس قدر اعتناء، بنو اسرائیل کے ساتھ ہے۔ بنی اسمٰعیل کا ذکر محض ضمنی طور پر آجاتا ہے، اور اس وجہ سے حضرت اسمٰعیلؑ کا عرب میں آباد ہونا بہ تصریح نہیں ملتا۔ لیکن مختلف تلمیحات سے مفہوم ہوتا ہے کہ حضرت ہاجرہؑ کا عرب میں آباد ہونا ایک مسلّمہ امر تھا۔ عہدِ جدید میں جس کو عیسائی وحیِ الٰہی سمجھتے ہیں، پولوس کا ایک خط گلتیون کے نام ہے، اس میں یہ

---

[1] سفرِ تکوین باب ۲۵، آیت ۱۸۔

عبارت ہے[۱]:

"ابراہیم کے دو بیٹے تھے، ایک لونڈی سے، دوسرا آزاد سے، پر وہ جو لونڈی سے تھا جسم کے طور پر پیدا ہوا، اور جو آزاد سے تھا، سو وعدے کے طور پر۔ یہ بات تمثیلی بھی مانی جاتی ہے، اس لیے کہ یہ عورتیں دو عہد ہیں، ایک تو سینا پہاڑ سے ہوا وہ نرے غلام جنتی ہے، یہ ہاجرہ ہے۔ کیونکہ ہاجرہ عرب کا کوہِ سینا ہے، اور اب کے یروشلم کا جواب ہے۔"

اگرچہ معلوم نہیں کہ اصلی عبارت کیا تھی، اُردو اور عربی دونوں ترجمے ناصاف ہیں۔ تاہم اس قدر واضح ہے کہ پولوس جو حضرت عیسیٰؑ کے سب سے بڑے جانشین ہیں، حضرت ہاجرہؓ کو عرب کا کوہِ سینا کہتے تھے۔ اگر حضرت ہاجرہؓ عرب میں آباد نہ ہوئی ہوتیں تو اُن کو عرب کا کوہِ سینا کہنا کیا معنی رکھتا ہے۔ آگے چل کر بکہ کے ذکر میں، یہ بحث زیادہ مؤیّد ہو جائے گی۔

ذبیح کون ہے؟ توراۃ اگرچہ یہودیوں کی عدمِ احتیاط، اغراضِ ذاتی اور زمانہ کے انقلابات سے سرتاپا مسخ ہو گئی ہے، اور خصوصاً پیغمبرِ خاتم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے متعلق اس میں جو تصریحات اور تلمیحات تھیں، یہود کے دستِ تصرف نے ان کو بالکل برباد کر دیا ہے۔ تاہم حقائق کے عناصر اب بھی ہر جگہ موجود ہیں۔ توراۃ میں گو تصریحاً حضرت اسحٰقؑ کا ذبیح ہونا لکھا ہے لیکن مطاویِ کلام میں اس بات کے قطعی دلائل موجود ہیں کہ وہ ہرگز ذبیح نہ تھے، اور نہ ہو سکتے تھے۔ امورِ ذیل کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے:

۱۔ شریعتِ سابقہ کی رو سے، قربانی صرف اُس جانور یا آدمی کی ہو سکتی تھی،

---

[۱] باب ۴، آیت ۲۴۔

جو پہلونٹا بچہ ہو۔ اسی بنا پر ہابیل نے جن مینڈھوں کی قربانی کی تھی وہ پہلونٹے بچے تھے۔

خُدا نے حضرت موسیٰؑ سے جہاں لادیوں کے متعلق احکام ارشاد فرمائے، وہاں فرمایا ہے:

لان لی کل بکرفی بنی اسرائیل من الناس والبھائم۔	کیونکہ بنو اسرائیل میں آدمی اور جانور کا ہر پہلونٹا بچہ میرے لیے ہے (عدد ۸-۱۷)

۲۔ پہلونٹے بچّہ کی افضلیت کسی حالت میں زائل نہیں ہوسکتی۔ توراۃ میں ہے کہ اگر کسی شخص کی دو بیویاں ہوں، ایک مجبوبہ ہو، اور دوسری غیر مرغوبہ، تو فضیلت اُسی اولاد کو ہوگی جو پہلونٹی ہو، گو وہ غیر مرغوبہ سے ہو۔

فانہ اوّل قدرتہ ولہٗ حقّ البکوریۃ۔	کیونکہ وہ اُس کی پہلی قدرت ہے، اور اُسی کو اولاد اوّلین ہونے کا حق ہے۔ (سفر تثنیۃ اصحاح ۲۱، آیت ۱۵ او ۱۷)

۳۔ جو اولاد خُدا کو نذر کردی جاتی تھی اُس کو باپ کا ترکہ نہیں ملتا تھا۔ توراۃ میں ہے:

فی ذٰلک الوقت افرز الرّب سبط لاوی لیحملوا تابوت عھد الرّب ولکی یقفوا امام الرّب لیخدموہ ویبارکوا باسمہ الیٰ ھذا الیوم لاجل ذٰلک لم یکن للاوی قسم ولا نصیب مع اخوتہ الرّب	تب خُدا نے لاوی کی اولاد کو اس لیے مخصوص کرلیا کہ خُدا کے عہد کا تابوت اُٹھائے، اور تاکہ خُدا کے آگے کھڑا ہو تاکہ وہ خدا کی خدمت کریں اور اس کے نام سے آج تک برکت لیں، یہی وجہ ہے کہ لادیوں کو اپنے بھائیوں کے ساتھ کوئی حصّہ اور ترکہ نہیں ملا۔

ہو نصیبہ۔ کیونکہ ان کا حصّہ خُدا ہے۔

(توراۃ، اصحاح ۱۰۔ آیت ۸ و ۹)

۴۔ جو شخص خُدا کی نذر کر دیا جاتا تھا، وہ سر کے بال چھوڑ دیتا تھا، اور معبد کے پاس جا کر منڈاتا تھا، جس طرح آج حج میں احرام کھولنے کے وقت بال منڈاتے ہیں۔ توراۃ میں ہے:

فھا انک تحملین وتلدین — اب تو حاملہ ہو گی اور بچہ جنے گی، اور
ابناً ولا یعلُ موسی راسہ — اس کے سر پر اُسترا نہ پھیرا جائے کیونکہ
لان الصبی یکون نذراً — یہ بچہ خُدا کے لیے نذر کیا جائے گا۔
للّٰہ۔ (توراۃ، قضاۃ اصحاح ۱۳۔۴)

۵۔ جو شخص خدا کا خادم بنایا جاتا تھا، اس کے لیے "خدا کے سامنے" کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ (توراۃ سفر عدد ۶۔۱۶ و ۲۰ و سفر تکوین ۱۷، تثنیہ ۱۰۔۸)

۶۔ حضرت ابراہیمؑ کو بیٹے کی قربانی کا جو حکم ہوا تھا، اس میں قید تھی کہ وہ بیٹا قربانی کیا جائے جو اکلوتا ہو، اور محبوب ہو۔ (توراۃ تکوین اصحاح ۲۲۔ آیت ۲)

اب اصل مسئلہ پر غور کرو، لیکن پہلے یہ بتا دینا ضرور ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی شریعت میں قربانی کرنا اور خدا پر نذر چڑھانا، ایک بات تھی، یعنی دونوں کے لیے ایک ہی لفظ استعمال کرتے تھے۔

اگر یہ کہا جائے کہ بچہ کو فلاں معبد میں قربانی چڑھا دو، تو اس کے یہ معنی تھے کہ وہ اس معبد کی خدمت اور مجاورت کے لیے گھر سے الگ کر دیا جائے۔ لیکن یہ لفظ جب جانوروں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا، تو حقیقی قربانی کے معنی مُراد ہوتے تھے۔ توراۃ[۱] میں خدا کی زبان سے مذکور ہے:

---

[۱] عدد۔ اصحاح ۸۔۷

لان لی کل بکو فی بنی اسرائیل | کیونکہ بنی اسرائیل میں آدمی اور جانور
من الناس والبھائم۔ | کا ہر پہلوٹا بچہ میرے لیے ہے۔

اسی اصحاح میں تصریح کے ساتھ مذکور ہے کہ "خدا نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ تم بنی اسرائیل میں سے لاویوں کو لو، اور اُن کو خُدا کے سامنے پیش کرو، کہ خُدا کے لیے خاص کر دیے جائیں اور یہ لوگ دو گایوں کے سر پر ہاتھ رکھ دیں جو قربانی کی جائیں۔" (اختصاراً)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب میں بیٹے کی قربانی کا جو حکم ہوا تھا، اُس سے بھی یہی مُراد تھی کہ بیٹے کو معبد کی خدمت کے لیے نذر چڑھا دیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے پہلے اس خواب کو عینی اور حقیقی سمجھا، اور اس لیے اس کی تعمیل کرنی چاہی۔ لیکن بعد میں ظاہر ہوا کہ وہ تمثیلی خواب تھا۔ اس بنا پر حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے کو خانۂ خدا کی خدمت کے لیے خاص کر دیا، اور جو شرطیں قربانی کی تھیں قائم رکھیں۔

بیانِ مذکورۂ بالا کے ذہن نشین کرنے کے بعد دلائل ذیل پیشِ نظر رکھنے چاہییں:

(۱) حضرت اسحاقؑ کی ولادت حضرت اسمٰعیلؑ کے بعد ہے۔ اس بنا پر حضرت اسحاقؑ اکلوتے بیٹے نہیں۔ اور چونکہ قربانی کے لیے اکلوتے بیٹے کی شرط ہے۔ اس لیے حضرت اسحاق کی قربانی کا حکم نہیں ہو سکتا تھا۔

(۲) حضرت اسحاقؑ کو حضرت ابراہیمؑ نے اپنا تمام ترکہ دیا۔ بخلاف اس کے حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی والدہ کو صرف پانی کی ایک مشک دے کر رُخصت کیا۔ یہ اس بات کا قطعی قرینہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسحاقؑ کو قربانی یعنی معبد پر نذر نہیں چڑھایا تھا۔

(۳) حضرت اسمٰعیلؑ کے خاندان میں مدت تک یہ رسم قائم رہی کہ لوگ سر کے بال نہیں منڈاتے تھے۔ حج میں احرام کے زمانے تک جو بال نہیں منڈاتے، یہ اسی سُنّت اسماعیلی کی یادگار ہے۔

(۴) جو الفاظ قربانی اور نذر چڑھانے کے لیے ملت ابراہیمی میں استعمال کیے جاتے تھے، وہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کے لیے استعمال کیے نہ کہ حضرت اسحاقؑ کے لیے۔ توراۃ میں ہے کہ جب خُدا نے حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسحاقؑ کی ولادت کی خوشخبری دی تو حضرت ابراہیمؑ نے کہا:

لیتَ اسمٰعیل یعیش امامك   کاش اسماعیل تیرے سامنے زندہ رہتا۔

توراۃ میں جہاں جہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے (سامنے زندہ رہنا) انہی معنوں میں ہوا ہے۔

(۵) حضرت اسمٰعیلؑ حضرت ابراہیمؑ کی محبوب ترین اولاد تھے۔ توراۃ جو تمام تر حضرت اسحاقؑ کی یک طرفہ داستان ہے، اس میں حضرت اسحاقؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کے جو امتیازی خصائص بیان کیے ہیں، یہ ہیں کہ حضرت اسحاقؑ خُدا کے وعدے اور عہد کا مظہر ہیں[۱]، اور حضرت اسمٰعیلؑ دعوتِ ابراہیم ہیں۔ یعنی حضرت ابراہیمؑ کی دُعا اور خواہش سے پیدا ہوئے[۲]۔ اسی بنا پر خدا نے ان کا نام اسمٰعیلؑ رکھا۔ کیونکہ اسمٰعیلؑ دو لفظوں سے مرکب ہے، سمع اور ایل، "سمع" کے معنی "سُننے" کے اور "ایل" کے معنی "خُدا" کے ہیں[۳]۔ یعنی خُدا نے حضرت ابراہیمؑ کی دُعا "سُن لی"۔ توراۃ میں ہے کہ خُدا نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ "اسمٰعیل کے بارے میں میں نے تیری سُن لی"۔ حضرت ابراہیمؑ کو جب خُدا نے حضرت اسحاقؑ کی خوشخبری

۱؎ توراۃ تکوین ۱۷-۱۸   ۲؎ تکوین اصحاح ۱۵   ۳؎ تکوین اصحاح ۱۷ و ۱۸۔

دی تو حضرت ابراہیمؑ نے اس موقع پر بھی حضرت اسمٰعیلؑ کو یاد کیا۔ غرض چونکہ حضرت ابراہیمؑ کو قربانی کا جو حکم ہوا تھا، اس میں قید تھی کہ محبوب ترین بیٹا ہو، اس لیے حضرت اسمٰعیلؑ ہی ذبیح ہو سکتے ہیں نہ کہ حضرت اسحاقؑ۔

(۶) حضرت اسحاقؑ کی جب خدا نے بشارت دی تو ساتھ ہی یہ بھی بشارت دی کہ میں اس کی نسل سے ابدی عہد باندھوں گا، توراۃ میں ہے:

"پھر خدا نے کہا بلکہ تیری بیوی سارہ تیرے لیے ایک بیٹا جنے گی اور اس کا نام اسحاق رکھے گا، اور میں ابدی عہد اس کی نسل سے قائم کروں گا۔"

(توراۃ تکوین اصحاح ۱۷۔ آیت ۱۸)

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ توراۃ میں مذکور ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے کو قربانی کرنا چاہا اور فرشتے نے ندا دی کہ ہاتھ کو روک لو، تو فرشتہ نے یہ الفاظ کہے:

"خدا کہتا ہے کہ چونکہ تو نے ایسا کام کیا اور اپنے اکلوتے بیٹے کو بچا نہیں رکھا، میں تجھ کو برکت دوں گا اور تیری نسل کو آسمان کے ستاروں اور ساحل بحر کی ریتی کی طرح پھیلا دوں گا۔"

(توراۃ تکوین، اصحاح ۲۲۔ آیت ۱۵)

اب غور کرو کہ خدا نے جب حضرت اسحاقؑ کی بشارت ہی کے وقت یہ کہہ دیا تھا کہ میں اس کی نسل قائم رکھوں گا، تو یہ کیونکر ممکن تھا کہ جس وقت تک حضرت اسحاقؑ کی اولاد نہیں پیدا ہوئی تھی، ان کی قربانی کا حکم ہوتا۔ لیکن حضرت اسمٰعیلؑ

لہ یہ مسلّم ہے کہ حضرت اسحاقؑ کی اولاد، حضرت ابراہیمؑ کی وفات کے بعد پیدا ہوئی۔ (تکوین، اصحاح ۲۵۔ آیت ۱۱)

کو ذبیح تسلیم کیا جائے تو تمام نصوص منطبق ہو جاتے ہیں۔ حضرت اسمٰعیلؑ اکبر اولاد تھے۔ محبوب تر تھے، قربانی کے وقت بالغ یا قریب البلوغ تھے۔ قربانی سے پہلے ان کی کثرتِ نسل کی بشارت نہیں دی گئی۔ توراۃ میں تصریح ہے کہ چونکہ ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے بیٹے کو قربان کرنا چاہا، اس لیے اس بیٹے کی کثرتِ نسل کا وعدہ کیا گیا، یعنی یہ کثرتِ نسل، اسی قربانی کے صلے میں تھی، اس لیے ذبیح حضرت اسمٰعیلؑ ہی ہو سکتے ہیں، کیونکہ حضرت اسحاقؑ کی تکثیرِ نسل کا وعدہ تو اُن کی ولادت ہی کے وقت ہو چکا تھا، جو کسی انعام و صلہ کے معاوضے میں نہ تھا۔

مقامِ قربانی (۷) توراۃ میں قربانی گاہ کا جو موقع بتایا ہے، وہ "موریا" ہے۔ یہودی کہتے ہیں کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں حضرت سلیمانؑ کا ہیکل تھا، عیسائی کہتے ہیں، یہ اس جگہ کا نام ہے جہاں حضرت عیسیٰؑ کو سُولی دی گئی۔

لیکن یورپ کے محققوں نے ان دونوں دعووں کی تغلیط کی ہے۔ سر اسٹانلی لکھتے ہیں:۔

> "حضرت ابراہیمؑ صبح کے وقت اپنے خیمہ سے نکل کر اس مقام پر گئے، جہاں اُن کو خدا نے حکم دیا تھا۔ لیکن یہ موریا کا پہاڑ نہیں ہے جیسا کہ یہود کا دعویٰ ہے۔ نہ عیسائیوں کے خیال کے موافق قبرِ مقدس کے گرجا کے پاس ہے۔ یہ قیاس تو یہودیوں کے قیاس سے بھی زیادہ بعید ہے۔ اور اس سے بھی بعید مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ وہ[۱] جبلِ عرفات ہے۔ غالباً یہ مقام جریزیم کے پہاڑ پر ہے۔ اور وہی قربانی گاہ سے مشابہ مقام ہے۔"

---

[۱] یہ غلط ہے مسلمان عرفات کو نہیں، بلکہ منیٰ کو قربانی گاہ سمجھتے ہیں۔

اس سے اتنا تو ثابت ہوا کہ موریا کے تعین میں یہودیوں اور عیسائیوں کے دعوے غلط ہیں۔ باقی یہ امر کہ مسلمانوں کا دعویٰ بھی غلط ہے، اس کی تحقیق آگے آتی ہے +

موریا کی تعیین میں جو اختلاف پیدا ہوا، اُس نے ایک اور اختلاف پیدا کر دیا۔ یعنی یہ کہ یہ لفظ کسی مقام کا نام ہے، یا وصفی معنی رکھتا ہے۔ بہت سے مترجموں نے اس کو ایک مشتق لفظ سمجھا، اور اس لیے اس کا ترجمہ تورات کے بعض نسخوں میں بلوطاتِ عالیہ اور بعض میں "زمین بلند" اور بعض میں مقام الرؤیا کیا۔ لیکن زیادہ صائب الرائے لوگوں نے اس کو مقام کا نام سمجھا، اور اس لیے لفظ کا ترجمہ نہیں کیا بلکہ بحال خود رہنے دیا۔ لیکن امتدادِ زمانہ اور بے پروائی سے لفظ کی ہیئت بدل گئی، یعنی مُریا کا مورہ ہو گیا خصوصاً اس وجہ سے کہ عبرانی زبان میں دونوں لفظوں کا املا قریب قریب ہے +

مورہ کی نسبت تورات میں تصریح ہے کہ عرب میں واقع ہے، تورات میں ہے:

وکان جیش المدیانیین	اور مدیانیوںؑ کی فوج، شمال کی جانب
شمالیھم عند تلّ مورة	مورہ کی پہاڑی پر وادی میں تھی۔
فی الوادی، (قضاۃ۔ اصحاح ۷، آیت ۱)	(مدیان عرب میں واقع ہے۔)

تمام واقعات اور قرائن کو پیش نظر رکھا جائے تو ثابت ہو جائے گا کہ یہ لفظ مورہ نہیں، بلکہ مروہ ہے جو مکہ معظمہ کی پہاڑی ہے، اور جہاں اب سعی کی رسم ادا کی جاتی ہے +

لہ مدین عرب کی زمین ہے اور عرب کو اکثر مدیانیون کہتے ہیں، اور مدین کی زمین شام کے جنوب سے یمن کے شمال تک ہے، اور یہ لوگ حضرت ابراہیم کی اولاد ہیں جو قطورا سے تھے (ضمیمہ بائبل صفحہ ۱۱۲)

عرب کی روایات، قرآن مجید کی تصریح، احادیث کی تعیین، تمام چیزیں اس قیاس سے اس قدر مطابق ہوتی جاتی ہیں کہ اس قسم کا تطابق بغیر صحت واقعہ کے ممکن نہیں۔ تفصیل اس کی یہ ہے:

حدیث میں ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مروہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا "قربانی گاہ یہ ہے اور مکہ کی تمام پہاڑیاں اور گھاٹیاں قربانی گاہ ہیں"۔[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مروہ میں قربانی نہیں ہوتی تھی، بلکہ منیٰ میں ہوتی تھی، جو مکہ سے تین میل پر ہے۔ تاہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مروہ ہی کو قربانی گاہ فرمایا، یہ اسی بنا پر تھا کہ حضرت ابراہیم نے یہیں حضرت اسمٰعیل کی قربانی کرنی چاہی تھی۔

قرآن مجید میں ہے:

ثُمَّ مَحِلُّهَا إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ۔ (حج - ۴) — پھر قربانی کے جانوروں کی جگہ کعبہ ہے۔

هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ (مائدہ ۱۳) — قربانی جو کہ کعبہ میں پہنچے۔

مروہ بالکل کعبہ کے مقابل، اور اس کے قریب ہے۔ ان آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ قربانی کی اصلی جگہ کعبہ ہے، منیٰ نہیں۔ لیکن جب حجاج کی کثرت ہوئی تو کعبہ کے حدود کو منیٰ تک وسعت دے دی گئی۔

قربانی کی یادگار یہودی حضرت اسحاقؑ کی اولاد ہیں، اس لیے اگر حضرت اسحاقؑ ذبیح ہوتے تو اس کی کوئی یادگار ان کے ہاں موجود ہوتی، بخلاف اس کے حضرت

---

[1] موطائے امام مالک رح

اسمٰعیلؑ کے خاندان، بلکہ تمام مسلمانوں میں، جو حضرت اسمٰعیلؑ کی روحانی اولاد ہیں، قربانی کی تمام رسمیں آج تک موجود ہیں +

اولادِ اسمٰعیلؑ میں قربانی کی تمام یادگاریں موجود ہیں، اور حج جو کہ ایک بڑا فریضۂ اسلام ہے، تمام تر اسی قربانی کی یادگار ہے۔ چنانچہ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ حضرت ابراہیمؑ کو جب خدا نے بیٹے کی قربانی کا حکم دینا چاہا، تو پکارا، اے ابراہیم! حضرت ابراہیمؑ نے کہا "میں حاضر ہوں"۔[۱]

حج کے وقت مسلمان جو ہر قدم پر لبیک کہتے چلتے ہیں۔ یہ وہی ابراہیمی الفاظ ہیں، جن کا لفظی ترجمہ وہی ہے، "میں حاضر ہوں"۔

۲۔ شریعت ابراہیمی میں دستور تھا کہ جس کو قربان گاہ پر چڑھاتے تھے، یا خدا کے لیے نذر دیتے تھے، وہ بار بار معبد یا قربانی گاہ کے پھیرے کرتا تھا +

حج میں صفا و مروہ کے درمیان جو سات بار سعی کرتے ہیں، یہ اسی کی یادگار ہے +

۳۔ نذر کے فرائض میں ایک یہ تھا کہ ایامِ نذر تک بال نہیں کترواتے تھے،[۲] حج میں بھی یہی دستور ہے۔ جب احرام اتارتے ہیں تب بال کترواتے یا منڈاتے ہیں۔ خود قرآن مجید میں شعار کا ذکر ہے:

مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ (فتح۔۴) سروں کو منڈاتے ہوئے۔

۴۔ حج کا ایک ضروری رُکن قربانی ہے، یہ وہی حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کی یادگار ہے، اسی بنا پر قرآن مجید میں فرمایا ہے:

---

[۱] توراۃ تکوین۔ اصحاح ۲۲۔ آیت ۱ [۲] توراۃ لاویین اصحاح ۸۔ آیت ۲۷

وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ۔	اور حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کے بدلے
(صافات۔ ۳)	ہم نے ایک بڑی قربانی قائم کی۔

یہ دلائل توراۃ کی تصریحات وکنایات کی بنا پر تھے۔ قرآن مجید کی رُو سے قطعاً حضرت اسمٰعیلؑ کا ذبیح ہونا ثابت ہے۔ اگرچہ بہت سے مفسرین نے غلطی سے یہودیوں ہی کی روایت کی تائید کی ہے۔ قرآن مجید میں قربانی کا واقعہ ان الفاظ میں مذکور ہے:

وَقَالَ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ	اور حضرت ابراہیم نے کہا میں اپنے
سَیَهْدِیْنِ رَبِّ هَبْ لِیْ	خدا کی طرف جاؤں گا وہ مجھ کو راستہ دکھائے
مِنَ الصّٰلِحِیْنَ فَبَشَّرْنٰهُ	گا۔ خدا مجھ کو وہ اولاد دے کہ جو نیک
بِغُلٰمٍ حَلِیْمٍ، فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ	چلن ہو، تو ہم نے اس کو ایک سمجھ دار
السَّعْیَ قَالَ یٰبُنَیَّ اِنِّیْٓ اَرٰی	لڑکے کی خوشخبری دی، پھر جب وہ لڑکا
فِی الْمَنَامِ اَنِّیْٓ اَذْبَحُكَ	اس کے ساتھ چلنے لگا تو ابراہیم نے کہا بیٹے!
فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی، الخ	میں نے خواب میں دیکھا کہ میں تجھ کو ذبح
(صافات۔ ۳)	کر رہا ہوں، تیری کیا رائے ہے، الخ

آیت بالا میں مذکور ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اولاد کے لیے دُعا مانگی، اور خُدا نے قبول کی، اور وہی لڑکا قربانی کے لیے پیش کیا گیا۔

توراۃ سے ثابت ہے کہ جو لڑکا حضرت ابراہیم کی دُعا سے پیدا ہُوا، وہ حضرت اسمٰعیلؑ ہیں، اور اسی لیے اُن کا نام اسمٰعیلؑ رکھا گیا، کہ خُدا نے اُن کے بارے میں حضرت ابراہیمؑ کی درخواست سُنی۔ اس بنا پر اس آیت میں جس کا ذکر ہے وہ حضرت اسمٰعیل ہیں، اسحاق نہیں۔

قربانی کے واقعہ کی تفصیل اور اختتام کے بعد حضرت اسحاق کی ولادت کا

ہے۔ اس سے قطعاً ثابت ہوتا ہے کہ جس کا ذکر اوپر ہوا، وہ حضرت اسحاق نہیں بلکہ حضرت اسمٰعیل ہیں۔

مسلمانوں کا نام جو مسلم رکھا گیا، یہ وہ نام ہے، جو حضرت ابراہیم نے ایجاد کیا تھا۔ قرآن مجید میں ہے:

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ،	تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب اُسی نے پہلے تمہارا نام مسلمان رکھا تھا۔

(حج - ۱۰)

اس تسمیہ کی تاریخ قربانی سے شروع ہوتی ہے۔ یعنی حضرت ابراہیم نے حضرت اسماعیل کو قربانی کرنا چاہا، اور اُن سے کہا کہ "مجھ کو خدا کا یہ حکم ہوا ہے، تمہاری کیا رائے ہے"؟ تو حضرت اسمٰعیل نے نہایت استقلال کے ساتھ گردن جھکا دی کہ یہ سر حاضر ہے۔ اس موقع پر خدا نے "اَسْلَمَا" کا لفظ استعمال کیا جو اسلام سے ماخوذ ہے اور جس کے معنی "تسلیم" اور "حوالہ کر دینے" کے ہیں۔

فَلَمَّآ اَسْلَمَا، (صافات - ۳) پھر جب دونوں نے اپنے آپ کو (ہمارے) حوالہ کر دیا۔

حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل کا سب سے بڑا عظیم الشان کارنامہ تسلیم و

۱؎ ابھی صفحہ ۱۳۸ کے حاشیے میں گزر چکا ہے کہ بعض مفسرین نے قرب لفظ کی وجہ سے سمّٰی کا فاعل حضرت ابراہیم کو قرار دیا ہے۔ تابعین میں حضرت ابن زید اور حضرت حسن بصری کا یہی مسلک ہے اور ابوحیان نے اسی کی تائید کی ہے لیکن صحابہ میں حضرت ابن عباس اور تابعین میں مجاہد، ضحاک، قتادہ اور سفیان نے اللہ کی طرف ضمیر پھیری ہے، اور یہ معنی لیے ہیں کہ تمہارا نام مسلم قرآن کے نزول سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ نے رکھا اور اس قرآن میں اس نے تمہارا یہ نام رکھا۔

"س"

رضا ہے۔ یعنی جب قربانی کا حکم ہوا تو باپ بیٹے دونوں نے بے عذر گردنیں جھکا دیں، یہ وصف مقبولِ بارگاہ ہوا، اور پھر حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیلؑ کا یہی شعارِ مذہبی قرار پایا، اسی بنا پر حضرت ابراہیمؑ نے اپنے پیروان ملت کا نام مُسلم رکھا۔

قربانی، ایثار، اور اسلام درحقیقت یہ سب مترادف الفاظ ہیں۔ یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ ہی نے اپنے آپ کو قربانی کے لیے پیش کیا تھا۔ اگر حضرت اسحاقؑ قربانی ہوتے تو یہ لقب ان کی اولاد یا ان کی اُمت کو ملتا۔

قربانی کی حقیقت اس مسئلہ کی حقیقت اس وقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے جب اس پر غور کیا جائے کہ حضرت ابراہیمؑ کو جو بیٹے کی قربانی کا حکم دیا گیا تھا، اس سے اصل مقصود کیا تھا؟ قدیم زمانے میں بُت پرست قومیں اپنے معبودوں پر اپنی اولاد کو بھینٹ چڑھا دیا کرتی تھیں۔ یہ رسم ہندوستان میں انگلش گورنمنٹ سے پہلے موجود تھی۔ مخالفین اسلام کا خیال ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی بھی اسی قسم کا حکم تھا، لیکن یہ سخت غلطی ہے۔

اکابرِ صوفیہ نے لکھا ہے کہ انبیاء علیہم السّلام کو جو خواب دکھائے جاتے ہیں،

لہ اس مقام پر مصنف کی یہ عبارت مزید تشریح کی محتاج ہے مصنف نے جیسا کہ لکھا ہے کہ رویا دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک عینی جس میں صورتِ واقعہ بعینہٖ دکھائی جاتی ہے اور دوسری تمثیلی جس میں صورتِ واقعہ کسی مثالی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس کو بہت سے علما نے تسلیم کیا ہے اور بیان کیا ہے۔ خواب کی اس دوسری قسم میں اصل مقصود رویا کی دوسری مثالی صورت ہوتی ہے، جیسے حضرت یوسف علیہ السّلام کا اپنے ماں باپ کو آفتاب و ماہتاب اور

دو قسم کے ہوتے ہیں، عینی اور تمثیلی، عینی میں بعینہٖ وہی چیز مقصود ہوتی ہے جو خواب میں نظر آتی ہے تمثیلی میں تشبیہ اور تمثیل کے پیرایہ میں کسی مطلب کو پورا ادا کرنا ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو خواب دکھایا گیا تھا، اُس سے یہ مُراد

(بقیہ حاشیہ ۱۴۵) اور بھائیوں کو ستاروں کی شکل میں دیکھنا، یا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ کی وبا کو بڑھیا کی شکل میں دیکھنا، اور اُحد میں مسلمان شہداء کو مذبوح گایوں کے رنگ میں دیکھنا۔

محدث خطابی معالم السنن میں لکھتے ہیں:

و بعض الرویا مثل یضرب	بعض خواب تمثیل ہوتے ہیں جس کو اس مثالی
لیتاول علی الوجه الذی یحب	صورت میں اس لیے بیان کیا جاتا ہے کہ
ان یصرف الیه معنی التعبیر	اس طریقہ پر اس کی تعبیر کی جائے جس
فی مثله و بعض الرّویا لا یحتاج	طریقہ پر ایسے خواب کی تعبیر کی جاتی ہے
الی ذالك بل یاتی کالمشاهدة	اور بعض خواب اس کے محتاج نہیں ہوتے
(فتح الباری جلد ۱۲ - صفحہ ۴۰۲)	بلکہ وہ مشاہدہ بن کر سامنے آتے ہیں۔

امام ابوبکر ابن العربی مالکی "احکام القرآن" میں اسی حقیقت کا ذکر حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس رویا کے ضمن میں یوں فرماتے ہیں کہ "بعض رویا نام کی طرح ہوتے ہیں یعنی عینی و تصریحی جو بالکل لفظاً واقعہ کے عین مطابق ہوتے ہیں، اور بعض مثل کنیتوں کے طرح ہوتے ہیں۔ یعنی کسی مناسبت معنوی کے سبب سے وہ کسی دوسرے ہم شکل واقعہ کی صورت میں دکھائے جاتے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ خواب اسی دوسری قسم کا تھا" (احکام القرآن جلد ۲ صفحہ ۱۹۶، مصر)

مصنفِ سیرۃ نے اس مقام پر ان ہی بعض علماء کی تقلید کر کے حضرت ابراہیمؑ کے

تھی کہ بیٹے کو کعبہ کی خدمت کے لیے نذر چڑھا دیں، یعنی وہ کسی اور شغل میں مصروف نہ ہوں، بلکہ کعبہ کی خدمت کے لیے وقف کر دیے جائیں، توراۃ میں جا بجا قربانی کا لفظ ان معنوں میں آیا ہے +

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۶) اس خواب کو تمثیلی کہا ہے اور اسی بنا پر ان کو یہ کہنے کی ضرورت ہوئی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے خواب کو جو تمثیلی تھا اپنے خطائے اجتہادی سے عینی و حقیقی سمجھے، اور اس کی بعینہٖ تعمیل پر آمادہ ہو گئے۔ لیکن عین وقت پر ان کو وحی الٰہی نے ان کی اس اجتہادی خطا پر متنبہ کر دیا، اور حضرت اسمٰعیلؑ کو بعینہٖ قربانی سے روک کر ان کی جگہ جانور کی قربانی پیش کی +

ہیچمدان جامع کا ذوق اس مقام پر اس واقعہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اجتہادی غلطی ماننے سے ابا کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو محبت الٰہی سے سرشار تھے، خطائے اجتہادی سے نہیں بلکہ غلبۂ شوقِ اطاعت و محبت میں اس حکم الٰہی کی تعمیل اپنی طرف سے بالکل بعینہٖ و بلفظہٖ کرنے پر آمادہ ہو گئے، تاکہ اس ابتلا میں وہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں پورے اتریں اور اپنی طرف سے بیٹے کی جان کی قربانی کی جگہ اسکی خدمت توحید و تولیت کعبہ کے لیے وقف کر دینے کی تاویل کا سہارا لے کر نفس کی متابعت کے شبہے اور دھوکے سے بھی پاک رہیں، تا آنکہ اللہ تعالیٰ خود اس حقیقت کو خود اپنے لفظوں میں واضح فرما دے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادا بہت پسند آئی، آواز آئی:

یَا اِبْرَاہِیْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْیَا، ابراہیم! تم نے خواب کو سچ کر دکھایا۔

اِنَّا کَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ (صافات ۳) ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں۔

وَفَدَیْنٰہُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ (صافات) اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اسکی عوض میں دیا۔

اور امت پر یہ قربانی اسی تمثیلی رنگ میں واجب ٹھہرائی گئی، یعنی جسمانی اطاعت و قربانی کی

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس خواب کو عینی خیال کیا، اور بعینہٖ اُس کی تعمیل کرنی چاہی، گو یہ خیال اجتہادی غلطی تھی جو انبیاء سے ہو سکتی ہے (گو یہ غلطی قائم نہیں رہتی، بلکہ خدا اس پر متنبہ کر دیتا ہے) اس بنا پر گو حضرت ابراہیم علیہ السلام اس فعل سے روک دیے گئے۔ لیکن خدا نے اُن کی حُسنِ نیت کی قدر کی اور فرمایا:

قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا — تو نے خواب کو سچا کیا، ہم اس طرح

كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ — نیکو کاروں کو جزا دیتے ہیں۔

(صافات - ۳)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۷) تمثیل جانور کی قربانی کی شکل میں۔

یہ تشریح ان بعض علما کی متابعت میں ہے جو بعض دینی و علمی اسباب کی بنا پر اس کو رویائے تمثیلی سمجھتے ہیں۔ ورنہ جمہور علماء اس رویا کو عینی ہی سمجھتے ہیں۔ لیکن اُس وقت جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اس پر عمل کر کے اپنی طرف سے فرزند کے ذبح کی پوری عزیمت کر کے اپنے کام کو پورا کر چکے تھے اور تعمیل حکم میں ایک لمحہ کی بھی دیر نہیں رہی تھی کہ وحیِ الٰہی نے آواز دی، "اے ابراہیم تم نے اپنا کام پورا کر دیا، اور اپنے خواب کو پورا کر دیا، اور اپنے خواب کو سچ کر دیا۔" اب اس کی ضرورت نہیں رہی، اب اس کی جگہ ملتِ ابراہیم کی یہ سنتِ عظیم جانور کی قربانی کی شکل میں ظاہر ہوگی۔

ظاہر ہے کہ بہر دو صورت یہ جانور کی قربانی جیسا کہ بعض ائمہ محققین نے لکھا ہے، نفس کی قربانی کی تمثیل ہے، اور اس قربانی کا گوشت اس روزِ عید میں قربانی کنندہ کے لیے برکت، احباب کے لیے تحفہ اور فقراء کے لیے سامانِ دعوت بنا۔

مزید تفصیل کے لیے معارف ذیحجہ ۱۳۵۵ھ مضمون "ذبحِ عظیم" اور معارف صفر ۱۳۵۶ھ کے شذرات ملاحظہ ہوں۔ "س"

بہرحال یہاں اس تفصیل سے مقصود یہ ہے کہ قربانی سے مقصود خدمتِ کعبہ کے لیے نذر نظر چڑھانا تھا، نذر چڑھانے کے لیے شریعتِ سابقہ میں جو لفظ مستعمل تھا وہ "خدا کے سامنے" تھا۔ توراۃ میں یہ محاورہ نہایت کثرت سے آیا ہے حضرت اسمٰعیلؑ کے حق میں خدا سے جو دعا کی وہ ان لفظوں میں تھی:

لیت اسمٰعیل یعیش امامك   کاش اسمٰعیل تیرے سامنے زندگی کرتا،

(توراۃ تکوین۔ اصحاح ۱۷۔ آیت ۱۸)

اسی خواہش کے مطابق ان کو خواب میں تمثیلی پیرایہ میں حکم دیا گیا کہ وہ بیٹے کی قربانی کریں، یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو خواب میں حضرت اسحاقؑ کی قربانی کا نہیں، بلکہ حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کا حکم دیا گیا تھا۔

مکّہ معظّمہ

حضرت اسمٰعیلؑ کی بحث مسکن میں گزرچکا کہ وہ عرب تھا۔ مقام ذبح کی تعیین میں یہ ثابت ہوچکا کہ وادی مکّہ تھا۔ اس بناء پر مکّہ کی نسبت ایک بحث قدیم زمانہ سے تعلق رکھتی ہے۔

متعصب عیسائی مورخ لکھتے ہیں کہ اس شہر کی قدامت کا دعویٰ مسلمانوں کا خاص دعویٰ ہے۔ قدیم تاریخوں میں اس کا نشان نہیں ملتا[1]، اس بناء پر اس بحث کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھتے ہیں۔

مکّہ کا قدیم اور اصلی نام بکّہ ہے۔ قرآن مجید میں یہی نام ہے:

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ	پہلا متبرک گھر جو آدمیوں کے لیے
لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا	بنایا گیا وہ "بکہ" میں تھا۔

(آلِ عمران ۱۰)

---

[1] مرگیولوس اپنی کتاب میں لکھتا ہے: "اگرچہ مذہبی خیال کی وجہ سے مسلمانوں نے اپنے مذہبی مرکز کو نہایت قدیم البنا قرار دیا ہے، لیکن صحیح روایات سے پتہ چلتا ہے کہ مکّہ کی سب سے قدیم عمارت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے صرف چند پشت قبل تعمیر ہوئی تھی۔" مرگیولوس نے اس کے ثبوت میں "اصابہ" کا حوالہ بھی دیا ہے، اور ہم کو بھی اس کی صحت سے انکار نہیں، لیکن اس کل بیان میں مغالطہ ہے جس کو ہم نے اصل کتاب میں ظاہر کر دیا ہے۔

کتاب زبور ۸۴-۶ میں ہے:

"بکہ کی وادی میں گزرتے ہوئے، اُسے ایک کنواں بناتے۔ برکتوں سے مورۃ کو ڈھانک لیتے، قوت سے قوت تک ترقی کرتے چلے جاتے ہیں۔"

اس عبارت میں بکہ کا جو لفظ ہے، یہ وہی مکہ معظمہ ہے، لیکن اگر اس لفظ کو اسم علَم کے بجائے مشتق قرار دیں تو اس کے معنی "رونے" کے ہوں گے، اور یہ وہی عربی لفظ بُکاء ہے۔ چونکہ یہود و نصاریٰ ہمیشہ مکہ کی وقعت مٹانے کے درپے رہتے آئے۔ اس لیے بہت سے مترجمین نے عبارت مذکور میں بکہ کا ترجمہ رونا کر دیا ہے۔ لیکن ہر شخص خود سمجھ سکتا ہے کہ اس حالت میں وادیٔ بکا کے کیا معنی ہوں گے؟ زبور کی عبارت مذکورہ کی اوپر کی آیتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس نشید میں حضرت داؤدؑ نے مکہ معظمہ اور مروہ اور قربان گاہِ اسمٰعیل کی نسبت اپنا شوق اور حسرت ظاہر کی ہے۔ اوپر کی عبارت یہ ہے، (حضرت داؤدؑ خدا سے کہتے ہیں) اے فوجوں کے خدا! تیرے مسکن کس قدر شیریں ہیں، میر النفس خدا کے گھر کا مشتاق بلکہ عاشق ہے...... اے خدا! تیرے قربان گاہ، میرے مالک اور میرے خدا ہیں، مبارکی ہو، ان لوگوں کی جو تیرے گھر میں ہمیشہ رہتے ہیں، اور تیری تسبیح پڑھتے ہیں۔" اس کے بعد بکہ والی آیتیں ہیں۔ اب غور کرو حضرت داؤدؑ جس مقام کے پہنچنے کا شوق ظاہر کرتے ہیں، وہ اس مقام پر صادق آسکتا ہے، جس میں حسب ذیل باتیں پائی جائیں:

(۱) قربانی گاہ ہو۔

(۲) حضرت داؤدؑ کے وطن سے دور ہو، کہ وہاں تک سفر کر کے جائیں۔

(۳) وہ وادیٔ بکہ کہلاتا ہو۔

(۴) وہاں مقام مورۃ بھی ہو، ان باتوں کو پیش نظر رکھو تو قطعاً یقین

ہو جائے گا کہ بکّہ وہی مکّہ معظمہ اور موروۃ وہی مروۃ ہے، اس کے ساتھ یہ بھی اندازہ ہوگا کہ یہودی کس طرح تعصب سے الفاظ کو اول بدل کر دیتے ہیں، یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِہٖ، ڈاکٹر ہسٹنگس نے "ڈکشنری آف دی بائبل" میں "وادی بکا" پر جو آرٹکل لکھا ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے:

"اس لفظ سے اگر کوئی وادی مُراد ہے تو وہ حسب ذیل ہوسکتی ہے:

(۱) ایک وادی ہے جس میں ہو کر زائرین بیت المقدس جاتے ہیں۔

(۲) وادی اخور ہے، جو یشوعا باب ۷۔ آیات ۲۴-۲۶ وغیرہ میں مذکور ہے۔

(۳) وادی رفایون ہے، جو سامویل دوم باب ۵ آیات ۱۸-۲۲ وغیرہ میں مذکور ہے۔

(۴) کوہِ سینا کی ایک وادی ہے۔

(۵) بیت المقدس تک جو کاروانی راستہ، شمال سے آتا ہے، اس راستہ کی آخری منزل ہے۔ (دیکھو رینان کی کتاب "حیاتِ عیسٰیؑ" باب ۴)

لیکن کیا عجیب بات ہے ڈاکٹر ہسٹنگس کو اتنے احتمالاتِ کثیرہ میں کہیں مکّہ معظمہ کا پتہ نہیں لگتا، مصرع

ہماں ورق کہ سیہ گشتہ مدعا اینجاست

حیرت پر حیرت یہ ہے کہ جن جن وادیوں کا نام لیا ہے، ان میں ایک کو بھی بکا کے لفظ سے کسی قسم کی مناسبت نہیں، یہاں تک کہ ایک حرف بھی مشترک نہیں۔ بخلاف اس کے بکا، اور بکّہ، بالکل ایک لفظ ہیں۔ فرق اسی قدر ہے جس قدر ایک ہی لفظ کے تلفظ میں فرق پیدا ہوجاتا ہے۔

جدید انسائیکلوپیڈیا[۵] میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے عنوان سے جو مضمون

۵ انسائیکلوپیڈیا طبع اخیر جلد ۱۷ صفحہ ۳۹۹۔ ارنداں اڈیشن۔

ہے وہ مرگیو یوس کا ہے، اس میں مکّہ معظمہ کی نسبت لکھا ہے :

" قدیم تاریخوں میں اس شہر کا نام نہیں ملتا، بجز اس کے کہ زبور (۸۴-۶) میں " وادی بکۃ " کا لفظ ہے "

لیکن مرگیو یوس صاحب اس تاریخی شہادت کو ضعیف سمجھتے ہیں۔
پروفیسر دوزی جو فرانس کا مشہور محقق اور عربی دان عالم ہے، وہ لکھتا ہے[۱] :

" بکہ " وہی مقام ہے جس کو یونانی جغرافیہ دان ماکروبہ لکھتے ہیں "

لیکن مارگیو یوس کو پروفیسر دوزی کے بیان پر بھی اعتماد نہیں۔
کارلائل صاحب نے اپنی کتاب " ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ میں لکھا ہے کہ

" رومن مؤرخ سیسلس نے کعبہ کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ " وہ دنیا کے تمام معبدوں سے قدیم اور اشرف ہے، اور یہ ولادتِ مسیح سے پچاس برس پہلے کا ذکر ہے "

اگر کعبہ حضرت عیسیٰؑ سے بہت پہلے موجود تھا، تو مکہ بھی قریباً اُسی زمانے کا شہر ہوگا۔ کیونکہ جہاں کہیں کوئی مشہور معبد ہوتا ہے اُس کے آس پاس ضرور کوئی نہ کوئی شہر یا گاؤں آباد ہو جاتا ہے۔

یاقوت حموی نے معجم البلدان میں لکھا ہے کہ مکہ معظمہ کا عرض اور طول بلد بطلیموس کے جغرافیے میں حسب ذیل ہے :

" طول ۷۸ درجہ   عرض ۲۳ ر درجہ "

---

[۱] بطلیموس کے جغرافیے کا ترجمہ عباسیوں کے زمانے میں ہوگیا تھا۔ مسعودی اور ابن الندیم نے اکثر اس کے حوالے دیے ہیں۔

بطلیموس نہایت قدیم زمانے کا مصنّف ہے۔ اگر اس نے اپنے جغرافیہ میں مکہ کا ذکر کیا ہے، تو اس سے زیادہ قدامت کی کیا سند درکار ہے؟

مارگیولوس نے جس بنا پر مکہ معظمہ کی قدامت سے انکار کیا ہے وہ یہ ہے کہ "اصابہ" میں تصریح ہے کہ "مکہ میں سب سے پہلی عمارت جو تعمیر ہوئی وہ سعید بن، یا سعد بن عمرو نے تعمیر کی۔" لیکن مارگیولیوس کو یہ معلوم نہیں کہ مورخین نے جا بجا یہ بھی تصریح کی ہے کہ چونکہ اہلِ عرب کعبہ کے مقابل یا آس پاس عمارات بنانے کو کعبہ کی بے ادبی سمجھتے تھے، اس لیے عمارتیں نہیں بنوائیں، بلکہ خیموں اور شامیانوں میں رہتے تھے، اور اس طرح مکہ ہمیشہ سے خیموں کا ایک وسیع شہر تھا۔

خانۂ کعبہ کی تعمیر دُنیا میں ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ایران، ہند، مصر، یورپ میں عالمگیر اندھیرا تھا، قبولِ حق ایک طرف، اس وسیع خطۂ خاک میں گز بھر زمین نہیں ملتی تھی جہاں کوئی شخص خالص خُدائے واحد کا نام لے سکتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے جب کلدان میں یہ صدا بلند کرنی چاہی تو آگ کے شعلوں سے کام پڑا۔ مصر آئے، ناموس کو خطرے کا سامنا ہوا۔ فلسطین پہنچے، کسی نے بات تک نہ پُوچھی۔ خدا کا نام لیتے تھے شرک اور بُت پرستی کے غلغلہ میں آواز دب کر رہ جاتی تھی۔ معمورۂ عالم کے صفحے، نقشہائے باطل سے ڈھک چکے تھے۔ اب ایک سادہ، بے رنگ، ہر قسم کے نقش و نگار سے معرّا ورق درکار تھا، جس پر طغرائے حق لکھا جائے، یہ صرف حجاز کا صحرائے ویران تھا، جو تمدّن اور عمران کے داغ سے کبھی داغدار نہیں ہوا تھا۔

حضرت ابراہیمؑ، حضرت ہاجرہؑ اور اسمٰعیل کو عرب میں لائے اور اُن کو یہیں آباد کیا۔ حضرت سارہؑ نے (جیسا کہ توراۃ میں ہے) کچھ عرصہ کے بعد انتقال کیا۔ حضرت ابراہیم مکہ میں چلے آئے۔ حضرت اسمٰعیل جوان ہو چکے تھے،

اعلانِ حق میں ایک ہم آواز ہاتھ آیا، دونوں نے مل کر ایک چھوٹے سے چوکھونٹے گھر کی بنیاد ڈالی[1]

وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ (بقرہ ۱۵)	اور جب کہ ابراہیم اور اسمٰعیل خانہ خدا کی دیواریں اٹھا رہے تھے۔

گھر بن چکا تو وحی الٰہی نے آواز دی:

وَطَهِّرْ بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْقَآئِمِیْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ، (سورہ حج ۴)	ہمارا گھر، طواف کرنے والوں (نماز میں) قیام کرنے والوں (رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک کر، اور تمام لوگوں کو پکار دے کہ حج کو آئیں پیدل بھی اور دبلی اونٹنیوں پر بھی، ہر دور دراز گوشہ

اس وقت اعلان و اشتہار کے وسائل نہیں تھے، ویران جگہ تھی، اور آدمی کا کوسوں تک پتہ نہ تھا، ابراہیمؑ کی آواز حدودِ حرم سے باہر نہیں جا سکتی تھی۔ لیکن وہی معمولی آواز کہاں کہاں پہنچی۔ مشرق سے مغرب تک، شمال سے جنوب تک، اور زمین سے آسمان تک۔

علامہ ازرقی نے تاریخِ مکہ میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جو تعمیر کی اس کا عرض و طول حسبِ ذیل تھا:

بلندی   زمین سے چھت تک،   ۹ گز

---

[1] محققین کے بیان کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانۂ کعبہ کی منہدم و بے نشان عمارت کی دوبارہ بنیاد اٹھا کر بلند کی۔ مزید توضیح کے لیے سیرۃ النبی جلد پنجم باب حج عنوانِ مکہ اور کعبہ میں دیکھیے۔ "س"

طول ، حجر اسود سے رُکنِ شامی تک ، ۳۲ گز ،

عرض ، رُکنِ شامی سے غربی تک ، ۲۲ گز ،

عمارت بن چکی تو حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ سے کہا کہ ایک پتھر لاؤ تاکہ ایسے مقام پر لگا دوں جہاں سے طواف شروع کیا جائے۔ تاریخ مکہ موسوم بہ اعلام ، باعلام بیت الحرام میں ہے :

فقال ابراهیم لاسمٰعیل	پھر حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیل
علیهما الصلوٰة والسلام	سے کہا کہ ایک پتھر لادو ، تاکہ میں
یا اسمٰعیل ایتنی بحجر اضعه	ایسی جگہ نصب کردوں ، جہاں سے
حتی یکون علما للناس	لوگ طواف شروع کریں ۔

یبتدون منه الطواف ،

خدا کا یہ گھر ایسا سادہ تعمیر ہوا تھا کہ نہ چھت تھی ، نہ کواڑ اور نہ چوکھٹ بازو تھے ۔ جب قصی بن کلاب کو کعبہ کی تولیت حاصل ہوئی تو اُنھوں نے قدیم عمارت گرا کر نئے سرے سے تعمیر کی اور کھجور کے تختوں کی چھت پاٹی۔[۱]

کعبہ کی برکت اور کشش سے لوگ آس پاس آباد ہونے لگے ۔ چنانچہ سب سے پہلے قبیلہ جرہم آکر آباد ہوا ، اس قبیلہ میں مضاض بن عمرو جرہمی ایک ممتاز شخص تھے ۔ حضرت اسمٰعیلؑ نے اُن کی لڑکی سے شادی کی ۔ اُن سے بارہ اولاد ہوئی ، جن کے نام توراۃ میں مذکور ہیں ۔ ان میں سے اکثر اہلِ عرب قیدار کی اولاد میں ہیں ۔ حضرت اسمٰعیلؑ کی وفات کے بعد ان کے بڑے بیٹے نابت کعبہ کے متولی ہوئے ۔ ان کے مرنے کے بعد اُن کے نانا مضاض نے یہ منصب

---

[۱] اعلام بحوالہ کتاب النسب از ابن بکار و ابن الماوردی ،

حاصل کیا، اور کعبہ کی تولیت خاندانِ اسمٰعیل سے نکل کر جرہم کے خاندان میں آگئی لیکن پھر ایک اور قبیلہ خزاعہ نے کعبہ پر قبضہ کر لیا، اور مدّت تک اسی خاندان میں یہ منصب رہا۔ حضرت اسمٰعیلؑ کا خاندان موجود تھا، لیکن اس نے کچھ مزاحمت نہیں کی۔ قصی بن کلاب کا زمانہ آیا تو انھوں نے اپنا آبائی حق حاصل کیا۔ چنانچہ اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

حرمِ کعبہ پر سب سے پہلے جس نے پردہ چڑھایا وہ یمن کا حمیری بادشاہ اسعد تبع تھا۔ یمن میں خاص قسم کی چادریں بُنی جاتی ہیں جن کو بُردِ یمانی کہتے ہیں۔ یہ پردہ انھی چادروں سے تیار کیا گیا تھا۔ قصی بن کلاب کے زمانے سے تمام قبائل پر ایک محصول لگا دیا گیا جس سے پردہ تیار کیا جاتا تھا۔ علّامہ ازرقی نے لکھا ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بھی یمنی پردہ چڑھایا تھا۔ لیکن اس روایت کے سلسلے کا ایک راوی واقدی ہے۔

---

۱ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں قُباطی کا پردہ چڑھایا تھا، جو مصر میں بُنا جاتا ہے۔ ان کے بعد معمول ہو گیا کہ ہر خلیفہ اپنے عہدِ خلافت میں پردہ چڑھاتا تھا۔ بنو امیہ نے دیبا کا پردہ چڑھایا تھا۔ مامون الرشید ہر سال تین پردے چڑھاتا تھا۔ حج کے زمانے میں دیبائے احمر کا، رجب میں قباطی کا، عید الفطر میں دیبائے سفید کا، مصر میں جب سلطان صالح بن قلاون بادشاہ ہوا تو مصر کے دو گاؤں پردہ کے مصارف کے لیے وقف کر دیے۔ جب ترکی خاندان قسطنطنیہ میں حکمران ہوا تو سلطان سلیمان نے چند گاؤں اور اضافہ کر دیے۔ (اعلام باعلام بیت اللہ الحرام) خانہ کعبہ پر پردہ چڑھانے کی تاریخ بہ تفصیل فتوح البلدان بلاذری اور تاریخ مکہ ازرقی اور معجم البلدان وغیرہ میں ہے۔ ہم نے اخیر تصنیف یعنی اعلام کو لیا ہے کہ وہ ان سب کے بعد کی تصنیف اور جامع ہے۔

خُدا کا گھر سیم و زر کی نقش آرائیوں کا محتاج نہ تھا، لیکن دولت اور ملک کی ترقّی کے یہ لوازم ہیں، اس لیے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جب خلیفہ ہُوئے تو انھوں نے کعبہ کے ستونوں پر سونے کے پتّر چڑھائے۔ عبدالملک بن مروان نے اپنے زمانے میں ۳۶ ہزار اشرفیاں اس کام کے لیے بھیجیں۔ امین الرشید نے ۱۸ ہزار اشرفیاں نذر کیں کہ دروازے کی چوکھٹ وغیرہ طلائی بنوادی جائے۔ اعلام (تاریخِ مکہ) میں عہد بہ عہد کی طلا کاریوں کی تفصیل لکھی ہے۔ لیکن یہ واقعات عہدِ نبوّت کے بعد کے ہیں، جو ہماری کتاب کا موضوع نہیں، اور سچ یہ ہے کہ آفتاب پر سونا چڑھانا ضرور بھی نہیں۔

حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی خدا کا گھر بن چکا تو ضرورت تھی کہ اُس کی تولیت اور خدمت کے لیے کوئی نفسِ قُدسی تمام مشاغل سے الگ ہو کر اپنی زندگی اس پر نذر چڑھا دے، اس قسم کی نذر کو ابراہیمی شریعت میں قربانی سے تعبیر کرتے تھے۔ توراۃ میں یہ محاورہ بہ کثرت آتا ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں، انبیاء علیہم السّلام پر جو وحی آتی ہے، اس کے مختلف انواع ہیں، جن میں سے ایک خواب بھی ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری باب بدء الوحی میں ہے کہ آنحضرت (صلّی اللہ علیہ وسلّم) پر وحی کی جو ابتدا ہُوئی خواب سے ہُوئی۔ یہ خواب کبھی تمثیلی ہوتا ہے، جس طرح حضرت یوسفؑ نے آفتاب و ماہتاب اور ستاروں کو سجدہ کرتے دیکھا تھا۔ بہرحال حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو خواب دکھلایا گیا کہ اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھ سے ذبح کر رہے ہیں، اُنھوں نے اس خواب کو عینی سمجھا اور بعینہٖ اس کی تعمیل پر آمادہ ہُوئے۔

حضرت ابراہیمؑ کو اپنے استقلال اور جاں نثاری پر اعتماد تھا لیکن یہ تحقیق طلب تھا کہ پانزدہ سالہ نوجوان بھی اپنی گردن پر چھُری چلتے دیکھ سکتا

ہے یا نہیں ؟ بیٹے سے مخاطب ہو کر کہا:

یٰبُنَیَّ اِنِّیْٓ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی، (صٰفّٰت)	بیٹا! مَیں خواب میں دیکھتا ہوں کہ مَیں تجھ کو ذبح کر رہا ہوں، تو بتا، تیری کیا رائے ہے۔

بیٹے نے نہایت استقلال سے جواب دیا:

یٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ (صٰفّٰت)	ابّا جان! آپ کو جو حکم ہوا ہے، وہ کر گزریے، خدا نے چاہا تو میں ثابت قدم رہوں گا۔

اب ایک طرف نوّے سالہ پیرِ ضعیف ہے جس کو دعاہائے سحر کے بعد، خاندانِ نبوّت کا چشم و چراغ عطا ہوا تھا، جس کو وہ تمام دُنیا سے زیادہ محبوب رکھتا تھا، اب اسی محبوب کے قتل کے لیے اس کی آستینیں چڑھ چکی ہیں، اور ہاتھ میں چھُری ہے۔

دوسری طرف نوجوان بیٹا ہے، جس نے بچپن سے آج تک، باپ کی محبت آمیز نگاہوں کی گود میں پرورش پائی ہے، اور اب باپ ہی کا مہر پرور ہاتھ اس کا قاتل نظر آتا ہے۔ ملائکہ قدسی، فضائے آسمانی، عالمِ کائنات، یہ حیرت انگیز تماشا دیکھ رہے ہیں، اور انگشت بدنداں ہیں کہ دفعۃً عالمِ قدس سے آواز آتی ہے:

یٰٓاِبْرٰهِیْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْیَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ۔ (صٰفّٰت-۳)	ابراہیم! تو نے خواب کو سچ کر دکھایا، ہم نیک بندوں کو اسی طرح اچھا بدلہ دیا کرتے ہیں۔

طغیانِ ناز بیں کہ جگر گوشۂ خلیل
در زیرِ تیغ رفت و شہیدش نمی کنند

بیٹے نے جس استقلال، جس عزم، اور جس حیرت خیز ایثار سے اپنے آپ کو قربانی کے لیے پیش کیا، اس کا صلہ یہی تھا کہ یہ رسم (قربانی) قیامت تک دنیا میں اس کی یادگار رہ جائے۔

——— :(؛): ———

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

سلسلۂ نسب

سلسلۂ نسب یہ ہے محمدؐ بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن قصی۔ بن کلاب ابن مرۃ بن کعب بن لوئے بن غالب بن فہر مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمۃ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر۔ بن نزار بن معد بن عدنان +

صحیح بخاری (باب مبعث النبیؐ) میں یہیں تک ہے لیکن امام بخاری نے اپنی تاریخ میں عدنان سے حضرت ابراہیمؑ تک نام گنائے ہیں یعنی عدنان بن عدد بن المقوم بن تارح بن یشجب بن یعرب بن نابت بن اسمٰعیلؑ بن ابراہیمؑ +

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے، جن کا ذکر توراۃ میں بھی ہے۔ ان میں سے قیدار کی اولاد حجاز میں آباد ہوئی اور بہت پھیلی، انہی کی اولاد میں عدنان ہیں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انہی کے خاندان سے ہیں۔ عرب کے نسب دان تمام پشتوں کو محفوظ نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ اکثر نسب ناموں میں عدنان سے حضرت اسمٰعیلؑ تک صرف آٹھ نو پشتیں بیان کی ہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ عدنان سے لے کر حضرت اسمٰعیل تک اگر صرف نو دس پشتیں ہوں تو یہ زمانہ مین سو برس سے زیادہ نہ ہوگا۔ اور یہ امر بالکل تاریخی شہادتوں کے خلاف ہے۔ علامہ سہیلی روض الانف (ص ۸) میں لکھتے ہیں:

ویستحیل فی العادة ان یکون بینھما اربعة آباً او سبعة کما ذکر ابن اسحاق او عشرۃ او عشرون فان المدۃ اطول من ذٰلک کلہ۔

اور یہ عادۃً محال ہے کہ دونوں میں ۴ یا ۷ پشتوں کا فاصلہ ہو جیسا کہ ابن اسحاق نے ذکر کیا یا ۱۰-۲۰ پشتیں ہوں، کیونکہ زمانہ اس سے بہت زیادہ ہے +

علامہ موصوف نے بہت سے تاریخی حوالوں اور شہادتوں سے ثابت کیا ہے کہ عدنان سے حضرت اسمٰعیل تک ۴۰ پشتوں کا فاصلہ ہے۔ اس غلطی نے بعض عیسائی مؤرخوں کو اس بات کا موقع دیا ہے کہ سرے سے اس بات کے منکر ہو گئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاندان ابراہیمؑ سے ہیں[۱]۔

اس غلطی کی زیادہ وجہ یہ ہوئی کہ اہل عرب زیادہ تر مشہور آدمیوں کے نام پر اکتفا کرتے تھے، اور بیچ کی پیڑھیوں کو چھوڑ دیتے تھے۔ اس کے علاوہ اہل عرب کے نزدیک چونکہ عدنان کا حضرت اسمٰعیل کے خاندان سے ہونا قطعی اور یقینی

---

[۱] سر ولیم صاحب نے صریحاً یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسمٰعیل کے خاندان سے نہ تھے! ان کے الفاظ یہ ہیں: "یہ خواہش کہ مذہب اسلام کے پیغمبرؐ کو اسمٰعیل کی اولاد سے خیال کیا جائے اور غالباً یہ کوشش کہ وہ اسمٰعیلؑ کی نسل میں سے ثابت کیے جائیں، ان کے حین حیات میں پیدا ہوئی تھی، اور اس طرح محمدؐ کے ابراہیمی نسب نامہ کے ابتدائی سلسلے گھڑے گئے تھے، اور اسمٰعیل اور بنی اسرائیل کے بے شمار قصے یہودی اور نصف عربی سانچہ میں ڈھالے گئے تھے!" لیکن ایک طرف سر ولیم میور صاحب کا تنہا شبہہ ہے دوسری طرف بیسیوں یورپین اور یہودی مؤرخین ہیں جو نہ صرف خاندان قریش کو بلکہ تمام شمالی عرب و حجاز کو ابراہیمی النسل تسلیم کرتے ہیں۔ (دیکھو فارسٹر صاحب کا جغرافیۂ تاریخی عرب)

تھا، اس لیے وہ صرف اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ عدنان تک سلسلۂ نسب صحیح طور پر نام بنام پہنچ جائے۔ اُوپر کے اشخاص کا نام لینا غیر ضروری سمجھتے تھے، اس لیے چند مشہور آدمیوں کا نام لے کر چھوڑ دیتے تھے۔ تاہم عرب میں ایسے محققین بھی تھے جو اس فرد گزاشت سے واقف تھے۔ علامہ طبری نے تاریخ میں لکھا ہے کہ "مجھ سے بعض نسب دانوں نے بیان کیا، کہ میں نے عرب میں ایسے علماء دیکھے جو معد سے لے کر حضرت اسمٰعیل تک ۴۰ پشتوں کے نام لیتے تھے، اور اس شہادت میں عرب کے اشعار پیش کرتے تھے۔ اس شخص کا یہ بھی بیان تھا کہ میں نے اس سلسلہ کو اہل کتاب کی تحقیقات سے ملایا تو پشتوں کی تعداد برابر تھی، البتہ ناموں میں فرق تھا[۱]۔ اسی مورخ نے ایک اور موقع پر لکھا ہے کہ "شہر تدمر میں ایک یہودی تھا جس کا نام ابو یعقوب تھا، وہ مسلمان ہو گیا تھا، اس کا بیان تھا کہ "ارمیا پیغمبر کے منشی نے عدنان کا جو نسب نامہ لکھا تھا وہ میرے پاس موجود ہے[۲]۔ اس شجرے میں بھی عدنان سے لے کر حضرت اسمٰعیل تک چالیس نام ہیں"۔ بہر حال یہ واقعہ یقینی ہے کہ عدنان حضرت اسمٰعیل کی اولاد ہے، اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم عدنان کے خاندان سے ہیں۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا خاندان اگرچہ اباً عن جدٍّ[۳] معزز	بنائے خاندانِ قریش

[۱] تاریخ طبری مطبوعہ یورپ ج ۳ صفحہ ۱۱۱۸، [۲] تاریخ طبری مطبوعہ یورپ ج ۳ صفحہ ۱۱۱۵

[۳] تاریخ عرب کا ایک ایک حرف اس کا شاہد ہے لیکن مارگولس نے نہایت کوشش کی ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے خاندان کو متبذل ثابت کیا جائے، ان کے الفاظ یہ ہیں "یہ بالکل ظاہر ہے کہ محمدؐ ایک غریب اور ادنیٰ خاندان سے تھے۔" اس کے بعد صاحب موصوف نے حسب ذیل استدلال پیش کیے: (قرآن مجید میں ہے کہ قریش کو حیرت تھی کہ ان میں ایسا پیغمبر کیوں نہ بھیجا گیا جو شریف خاندان سے ہوتا (۲) پیغمبر کے عروج کے زمانے

اور ممتاز چلا آتا تھا، لیکن جس شخص نے اس خاندان کو قریش کے لقب سے ممتاز کیا، وہ نضر بن کنانہ تھے۔ بعض محققین کے نزدیک قریش کا لقب سب سے پہلے فہر کو ملا، اور انہی کی اولاد قریشی ہے۔ حافظ عراقی سیرت منظوم میں لکھتے ہیں:

اما قریش فالاصح فہر ــ جماعها والاکثرون النضر[1]

قصیٰ

نضر کے بعد فہر اور فہر کے بعد قصیٰ بن کلاب نے نہایت عزت اور اقتدار

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۳) میں قریش نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس درخت سے تشبیہ دی جو گھوڑے پر جمتا ہے (۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ایک شخص نے مولیٰ کے لفظ سے خطاب کیا تو آپؐ نے اس لفظ سے انکار کیا (۴) فتح مکہ کے دن آپ نے فرمایا کہ "آج شرفائے کفار کا خاتمہ ہو گیا" قرآن شریف کے الفاظ یہ ہیں؛ وقالوا لولا نزل ھذا القراٰن علیٰ رجل من القریتین عظیم ۰ یعنی کفار کہتے ہیں کہ یہ قرآن دو شہروں (مکہ و طائف) کے کسی رئیس پر کیوں نہ اترا۔ عظیم اور شریف دو الگ لفظ ہیں۔ قرآن میں عظیم کا لفظ ہے، اہلِ عرب دولت اور اقتدار والے کو عظیم کہتے تھے۔ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شرافت سے نہیں بلکہ جاہ و دولت سے انکار تھا۔ دوسرا استدلال اگر صحیح ہو تو دشمن کی ہر بات کو صحیح ماننا چاہیے۔ کفار نے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیوانہ، جادو زدہ، شاعر، سب کچھ کہا، ان میں سے کونسی بات صحیح ہے؟ بےشبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مولیٰ اور سید کے لفظ سے انکار کیا لیکن متعدد حدیثوں میں صاف تصریح ہے کہ آپؐ نے فرمایا مجھ کو سید اور مولیٰ نہ کہو، مولیٰ اور سید خدا ہے۔ قرآن میں ہر جگہ خدا ہی کو مولیٰ کہا ہے۔ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاندانی شرافت کا ابطال کیونکر ہوتا ہے؟ خیر استدلال بھی حیرت انگیز ہے، اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کم نسبی کیونکر ثابت ہوتی ہے؟ کہ شرفائے مکہ سے یہاں مراد جبارین و متکبرین مکہ ہیں)۔ مارگولس صاحب نے یہ دلائل نولدیکی سے نقل کیے ہیں، جو مشہور جرمنی مستشرق ہے۔ ع این خانہ ہمہ آفتاب است۔

[1] زرقانی جلد اول صفحہ ۹۰۔

حاصل کیا۔ اس زمانہ میں حرم کے متولی حلیل خزاعی تھے۔ قصی نے حلیل کی صاحبزادی سے جن کا نام حبی تھا، شادی کی تھی۔ اس تعلق سے حلیل نے مرتے وقت وصیت کی کہ حرم کی خدمت قصی کو سپرد کی جائے۔ اس طرح یہ منصب بھی ان کو حاصل ہو گیا۔ قصی نے دار المشورہ قائم کیا، جس کا نام دار الندوہ رکھا۔ قریش جب کوئی جلسہ یا جنگ کی تیاری کرتے تو اسی عمارت میں کرتے۔ قافلے باہر جاتے تو یہیں سے تیار ہو کر جاتے، نکاح اور تقریبات کے مراسم بھی یہیں ادا ہوتے۔

قصی نے بڑے بڑے نمایاں کام کیے، جو ایک مدت تک یادگار رہے مثلاً سقایہ[۱] اور رفادہ جو خدامِ حرم کا سب سے بڑا منصب تھا، انہی نے قائم کیا۔ تمام قریش کو جمع کر کے تقریر کی کہ سیکڑوں ہزاروں کوس سے لوگ حرم کی زیارت کو آتے ہیں، ان کی میزبانی قریش کا فرض ہے۔ چنانچہ قریش نے ایک سالانہ رقم مقرر کی جس سے منیٰ اور مکہ معظمہ میں حجاج کو کھانا تقسیم کیا جاتا تھا۔ اس[۲] کے ساتھ چرمی حوض بنوائے، جن میں ایامِ حج میں پانی بھر دیا جاتا تھا، کہ حجاج کے کام آئے۔ مشعرِ حرام بھی انہی کی ایجاد ہے، جس پر ایامِ حج میں چراغ جلاتے تھے۔ چنانچہ عقد الفرید میں تصریح کی ہے۔ قصی نے اس قدر شہرت اور اعتبار حاصل کیا کہ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ قریش کا لقب اوّل انہی کو ملا[۳]۔ چنانچہ علامہ

---

[۱] سقایہ یعنی حاجیوں کو آبِ زمزم پلانا اور رفادہ حاجیوں کے کھانے پینے کا انتظام کرنا۔

[۲] قصی بن کلاب کا مفصل تذکرہ طبقات ابن سعد جزو اوّل مطبوعہ لیڈن ۱۳۲۲ھ صفحہ ۳۶ سے لے کر ۴۲ تک ہے۔ قریش کی وجہ تسمیہ میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ قریش کے معنی جمع کرنے کے ہیں، قصی نے لوگوں کو ایک رشتہ میں منسلک کیا، اس لیے قریش کہلائے۔ بعض کہتے ہیں کہ ایک مچھلی کا نام ہے، جو تمام مچھلیوں کو کھا جاتی ہے۔ چونکہ قصی بہت

ابن عبد ربہ نے عقد الفرید میں بھی لکھا ہے، اور یہ بھی تصریح کی ہے کہ قصیٰ نے چونکہ خاندان کو جمع کر کے آس پاس بسایا اس لیے ان کو قریش کہتے ہیں۔ کیوں کہ تقریش کے معنی جمع کرنے گے ہیں، اسی بنا پر اُن کو مجمع بھی کہتے تھے۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے:

قصیٌ ابوکم من یسمی مجمعاً ۔ بہ جمع اللّٰہ القبائل من فھر

قصیٰ کی چھ اولاد تھی، عبد الدار، عبد مناف، عبد العزیٰ، عبد بن قصی، تخمر، برہ؛ قصیٰ نے مرتے وقت حرم محترم کے تمام مناصب سب سے بڑے بیٹے عبد الدار کو دیے۔ اگرچہ وہ سب بھائیوں میں ناقابل تھے لیکن قصیٰ کے بعد قریش کی ریاست عبد مناف نے حاصل کی، اور انہی کا خاندان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص خاندان ہے۔ عبد مناف کے چھ بیٹے تھے، ان میں سے ہاشم نہایت صاحب صولت اور باا ثر تھے۔ اُنھوں نے بھائیوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ حرم کے مناصب جو عبد الدار کو دیے گئے، واپس لے لیے جائیں، وہ لوگ اس منصب عظیم کے قابل نہیں۔ عبد الدار کے خاندان نے انکار کیا، اور جنگ کی تیاریاں شروع کیں۔ بالآخر اس پر صلح ہو گئی کہ عبد الدار سے سقایہ اور رفادہ واپس لے کر ہاشم کو دے دیا۔

ہاشم ہاشم نے اپنے فرض کو نہایت خوبی سے انجام دیا۔ حجاج کو نہایت سیر چشمی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۵) بڑے سردار تھے اس لیے ان کو اس مچھلی سے تشبیہ دی۔ عام خیال یہ ہے کہ قریش قصیٰ یا کسی اور شخص کا نام ہے۔ لیکن امام سہیلی کی تحقیق یہ ہے کہ یہ قبیلے کا نام ہے، جس طرح قبائل عرب جانوروں کے نام پر رکھتے تھے مثلاً اسد، نمر وغیرہ۔ مؤرخین یورپ کا خیال ہے کہ قبائل جانوروں کی پرستش کرتے تھے، اور انہی جانوروں کے نام سے مشہور ہو جاتے تھے لیکن عربی تاریخوں میں اس کا پتہ نہیں چلتا۔ لہ طبقات ابن سعد جلد اصفحہ ۴۱، ۱۲

سے کھانا کھلاتے تھے۔ چرمی حوضوں میں پانی بھروا کر زمزم اور منیٰ کے پاس سبیل رکھتے تھے۔ تجارت کو نہایت ترقی دی۔ قیصر روم سے خط و کتابت کرکے فرمان لکھوایا کہ "قریش جب اس کے ملک میں اسبابِ تجارت لے کر جائیں تو اُن سے کوئی ٹیکس نہ لیا جائے"۔ حبش کے بادشاہ نجاشی سے بھی اسی قسم کا فرمان حاصل کیا۔ چنانچہ اہلِ عرب جاڑوں میں یمن اور گرمیوں میں شام اور ایشیائے کوچک تک تجارت کے لیے جایا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں انگوریہ (انقرہ) جو ایشیائے کوچک کا مشہور شہر ہے، قیصر کا پایہ تخت تھا، تجارِ قریش انگوریہ میں جاتے تو قیصر نہایت عزت اور حرمت سے خیر مقدم کرتا تھا۔

عرب میں راستے محفوظ نہ تھے، ہاشم نے مختلف قبائل میں دورہ کرکے قبائل سے یہ معاہدہ کیا کہ "قریش کے کاروانِ تجارت کو ضرر نہ پہنچائیں گے۔ جس کے صلے میں کاروانِ قریش ان قبائل میں اُن کی ضرورت کی چیزیں خود لے کر جائے گا، اور ان سے خرید و فروخت کرے گا"۔ یہ سبب تھا کہ عرب میں باوجود عام لوٹ مار کے قریش کا قافلہ ہمیشہ محفوظ رہتا تھا۔[۱]

ایک[۲] دفعہ مکہ میں قحط پڑا، ہاشم نے اس قحط میں شوربہ میں روٹیاں چورا کرکے لوگوں کو کھلائیں، اُس وقت سے ان کا نام ہاشم مشہور ہوگیا۔ عربی زبان میں چورہ کرنے کو ہشم کہتے ہیں، جس کا اسم فاعل ہاشم ہے۔

ایک بار تجارت کی غرض سے شام گئے۔ راستہ میں مدینہ میں ٹھہرے، وہاں سال کے سال بازار لگتا تھا۔ بازار میں گئے تو ایک عورت کو دیکھا، جس کے حرکات و سکنات سے شرافت اور فراست کا اظہار ہوتا تھا، اس کے ساتھ حسین اور جمیل

---

[۱] امالی ابو علی قالی [۲] طبری صفحہ ۱۰۸۸ و ۱۰۸۹ (ج ۳) "س"

یہی تھی، دریافت سے معلوم ہوا کہ خاندان بنی نجار سے ہے اور سلمیٰ نام ہے۔ ہاشم نے اس سے شادی کی درخواست کی، اور اس نے قبول کرلی۔ غرض نکاح ہوگیا۔ شادی کے بعد یہ شام کو چلے گئے، اور غزہ میں جاکر انتقال کیا۔ سلمیٰ کو حمل رہ گیا تھا، لڑکا پیدا ہوا، اس کا نام شیبہ رکھا گیا، اُس نے قریباً ۸ برس تک مدینہ میں پرورش پائی۔ ہاشم کے بھائی جن کا نام مطلب تھا، ان کو یہ حالات معلوم ہوئے تو فوراً مدینہ روانہ ہوئے، وہاں پہنچ کر بھتیجے کی جستجو کی۔ سلمیٰ نے اُن کے آنے کا حال سنا تو بلوا بھیجا۔ تین دن مہمان رہے، چوتھے دن شیبہ کو ساتھ لے کر مکہ معظمہ روانہ ہوئے۔ اُن کی عمر ۸ برس کی تھی۔ یہاں آکر ان کا نام عبدالمطلب پڑ گیا۔

عبدالمطلب کے لفظی معنی "مطلب کا غلام" ہیں۔ اس لیے ارباب سیر نے وجہ تسمیہ میں بہت سے اقوال نقل کیے ہیں، جن میں صحیح تر یہ ہے کہ چونکہ مطلب نے ان کی پرورش کی تھی اور یہ یتیم تھے، اس لیے عرب کے محاورہ کے مطابق "غلامِ مطلب" مشہور[۵] ہوگئے۔

عبدالمطلب کی زندگی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ چاہِ زمزم جو ایک مدت سے اَٹ کر گم ہوگیا تھا، انھوں نے اس کا پتہ لگایا اور کھدوا کر نئے سرے سے درست کرادیا۔

انھوں نے منت مانی کہ دس بیٹوں کو اپنے سامنے جوان دیکھ لیں گے تو ایک کو خدا کی راہ میں قربان کردیں گے۔ خدا نے یہ آرزو پوری کی، دسوں بیٹوں کو لے کر کعبہ میں آئے اور پجاری سے کہا کہ ان دسوں پر قرعہ ڈالو، دیکھو کس کے نام پر نکلتا ہے۔ اتفاق سے عبداللہ کا نام نکلا۔ یہ ان کو لے کر قربان گاہ کو چلے۔ عبداللہ

---

[۵] دیکھو زرقانی جلد اوّل ص ۸۵۔

کی بہنیں جو ساتھ تھیں رونے لگیں، اور کہا کہ ان کے بدلے دس اونٹ قربانی کیجیے۔ ان کو چھوڑ دیجیے۔ عبدالمطلب نے پجاری سے کہا کہ عبداللہ پر اور دس اونٹوں پر قرعہ ڈالو، اتفاق یہ کہ عبداللہ ہی کے نام پر قرعہ نکلا۔ عبدالمطلب نے اب دس کے بجائے بیس اونٹ کر دیے، یہاں تک کہ بڑھاتے بڑھاتے سو تک نوبت پہنچی تو اونٹوں پر قرعہ آیا۔ عبدالمطلب نے ۱۰۰ اونٹ قربانی کیے اور عبداللہ بچ گئے۔ یہ واقدی کی روایت ہے۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ اونٹوں کے معاوضے کی تدبیر رؤسائے قریش نے تجویز کی تھی۔

عبدالمطلب کے دس یا بارہ بیٹوں میں سے پانچ شخصوں نے اسلام یا کفر کی خصوصیت کی وجہ سے شہرت عام حاصل کی۔ یعنی ابولہب، ابوطالب، عبداللہ، حضرت حمزہ رضؓ، حضرت عباس رضؓ عام طور پر مشہور ہے کہ ابولہب کا اصلی نام اور ہے، خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یا صحابہ رضؓ نے دیا۔ لیکن یہ غلطی ہے۔ ابن سعد نے طبقات میں تصریح کی ہے کہ یہ لقب خود عبدالمطلب نے دیا تھا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ ابولہب نہایت حسین اور جمیل تھا، اور عرب میں گورے چہرے کو شعلہ آتش کہتے ہیں۔ فارسی میں بھی آتشیں رخسار ہے۔

عبداللہ قربانی سے بچ گئے تو عبدالمطلب کو ان کی شادی کی فکر ہوئی۔ قبیلہ زہرہ میں وہب بن عبد مناف کی صاحبزادی جن کا نام آمنہ تھا، قریش کے تمام خاندانوں میں ممتاز تھیں[۱]۔ وہ اس وقت اپنے چچا وہیب کے پاس رہتی تھیں، عبدالمطلب وہیب کے پاس گئے اور عبداللہ کی شادی کا پیغام دیا۔ انھوں نے منظور کیا، اور عقد ہو گیا۔ اسی موقع پر خود عبدالمطلب نے بھی وہیب کی

---

[۱] سیرت ابن ہشام در برحاشیہ زاد المعاد مصر، ج ۱ صفحہ ۸۵ ”س“

صاحبزادی سے جن کا نام ہالہ تھا، شادی کی۔ حضرت حمزہ رضؓ انہی ہالہ کے بطن سے ہیں۔ ہالہ رشتہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خالہ ہوتیں، اور اس بناء پر حضرت حمزہ رضؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خالہ زاد بھائی بھی ہیں +

دستور تھا کہ نوشاہ شادی کے بعد ۳ دن تک سسرال میں رہتا تھا۔ عبداللہ تین دن سسرال میں رہے، اور پھر گھر چلے آئے۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً سترہ برس[1] سے کچھ زیادہ تھی۔

عبداللہ تجارت کے لیے شام کو گئے، واپس آتے ہوئے مدینہ میں ٹھہرے اور بیمار ہوکر یہیں رہ گئے۔ عبدالمطلب کو یہ حال معلوم ہوا تو اپنے بڑے بیٹے حارث کو خبر لانے کے لیے بھیجا۔ وہ مدینہ میں پہنچے تو عبداللہ کا انتقال ہوچکا تھا۔ چونکہ یہ خاندان میں سب سے زیادہ محبوب تھے، تمام خاندان کو سخت صدمہ ہوا۔

عبداللہ نے ترکہ میں اونٹ، بکریاں اور ایک لونڈی چھوڑی تھی جس کا نام اُمّ ایمن تھا۔ یہ سب چیزیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ترکہ میں ملیں[2]۔ اُمّ ایمن کا اصلی نام برکۃ تھا۔

---

[1] زرقانی جلد اوّل صفحہ ۱۲۲ سطر ۷ [2] طبقات ابن سعد (جزء اوّل قسم اوّل ص ۶۲) "س"

ظہورِ قدسی

چمنستانِ دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آ چکی ہیں، چرخِ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزمِ عالم اس سروسامان سے سجائی کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں۔

ولادت لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیرِ کہن سالِ دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیے، سیارگانِ فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے، چرخِ کہن مدتہائے دراز سے اسی صبحِ جاں نواز کے لیے لیل و نہار کی کروٹیں بدل رہا تھا، کارکنانِ قضا و قدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر و باد کی تردستیاں، عالمِ قدس کے انفاسِ پاک، توحیدِ ابراہیمؑ، جمالِ یوسفؑ، معجز طرازیِ موسیٰؑ، جاں نوازیِ مسیحؑ، سب اسی لیے تھے کہ یہ متاع ہائے گراں ارز شاہنشاہِ کونین (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دربار میں کام آئیں گے۔

آج کی صبح وہی صبحِ جاں نواز، وہی ساعتِ ہمایوں، وہی دورِ فرخ فال ہے۔ اربابِ سیر اپنے محدود پیرایۂ بیان میں لکھتے ہیں کہ "آج کی رات ایوانِ کسریٰ کے ۱۴ کنگرے گر گئے، آتش کدۂ فارس بجھ گیا، دریائے سادہ خشک ہو گیا۔" لیکن سچ یہ ہے کہ ایوانِ کسریٰ نہیں، بلکہ شانِ عجم، شوکتِ روم، اوجِ چین کے قصر ہائے فلک بوس گر پڑے، آتشِ فارس نہیں بلکہ جحیمِ شر، آتش کدۂ کفر، آذر کدۂ گمرہی سرد ہو کر رہ گئے، صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی، بت کدے خاک

میں مل گئے، شیرازہ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراقِ خزاں دیدہ ایک ایک کر کے جھڑ گئے۔

توحید کا غلغلہ اٹھا، چمنستانِ سعادت میں بہار آگئی، آفتابِ ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں، اخلاقِ انسانی کا آئینہ پرتوِ قدس سے چمک اٹھا۔

یعنی یتیمِ عبداللہ، جگر گوشۂ آمنہ، شاہِ حرم، حکمرانِ عرب، فرمانروائے عالم، شہنشاہِ کونین ؎

شمسۂ نہ مسندِ ہفت اختراں	ختمِ رسل خاتمِ پیغمبراں
احمدِ مرسل کہ خرد خاکِ اوست	ہر دو جہاں بستۂ فتراکِ اوست
امّی و گویا بہ زبانِ فصیح	از الف آدم و میمِ مسیح
رسمِ ترنج است کہ در روزگار	پیش دہد میوہ، پس آرد بہار

عالمِ قدس سے عالمِ امکان میں تشریف فرمائے عزت و اجلال ہوا، اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلَیہِ وعلیٰ آلہ واصحابہ وَسَلِّم۔

تاریخ ولادت تاریخ ولادت کے متعلق مصر کے مشہور ہیئت دان عالم محمود پاشا فلکی نے ایک رسالہ لکھا ہے جس میں انھوں نے دلائلِ ریاضی سے ثابت کیا ہے کہ آپ کی ولادت ۹ ربیع الاوّل روز دوشنبہ مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء میں ہوئی تھی[۱]۔

---

[۱] محمود فلکی نے جو استدلال کیا ہے وہ کئی صفحوں میں آیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) صحیح بخاری میں ہے کہ ابراہیم (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صغیر السن صاحبزادے) کے انتقال کے وقت آفتاب میں گہن لگا تھا، اور سنہ ۱۰ھ تھا، (اور اس وقت آپ کی عمر کا تریسٹھواں سال تھا)۔

(باقی صفحہ ۱۶۳ پر)

آپؐ کا نام "محمدؐ" رکھا گیا، اور عام طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ عبدالمطلب نے یہ نام رکھا تھا۔

رضاعت سب سے پہلے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو آپؐ کی والدہ نے اور دو تین دن کے بعد ثوبیہ نے دودھ پلایا، (جو ابولہب کی لونڈی تھی)[۱] ثوبیہ کے بعد حضرت حلیمہ سعدیہ نے آپؐ کو دودھ پلایا۔ اس زمانہ میں دستور تھا کہ شہر کے رؤسا اور شرفاء شیر خوار بچوں کو اطراف کے قصبات اور دیہات میں بھیج دیتے تھے۔ یہ رواج اس غرض سے تھا کہ بدوؤں میں پل کر فصاحت کا جوہر پیدا کرتے تھے[۲] اور عرب کی خالص خصوصیات محفوظ رہتی تھیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۲) (۲) ریاضی کے قاعدے سے حساب لگانے سے معلوم ہوتا ہے کہ دسنہ ۱ھ کا گرہن ۷، جنوری ۶۳۲ء کو ۸ بجے کے ۳۱ منٹ پر لگا تھا۔

(۳) اس حساب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر قمری ۶۳ برس پیچھے ہٹیں تو آپ کی پیدائش کا سال ۵۷۱ء ہے جس میں (از روئے قواعد ہیئت) ربیع الاول کی پہلی تاریخ ۱۲ اپریل ۵۷۱ء کے مطابق تھی۔

(۴) تاریخ ولادت میں اختلاف ہے لیکن اس قدر متفق علیہ ہے کہ وہ ربیع الاول کا مہینہ اور دوشنبہ کا دن تھا اور تاریخ ۸ سے لے کر ۱۲ تک میں منحصر ہے۔

(۵) ربیع الاول مذکور کی ان تاریخوں میں دوشنبہ کا دن نویں تاریخ کو پڑتا ہے، ان وجوہ کی بنا پر تاریخ ولادت قطعاً ۲۰ اپریل ۵۷۱ء تھی۔

(۱) بخاری باب یحرم من الرضاعۃ ما یحرم من النسب ص ۷۶۴)

(۲) امام سہیلی نے بہ تفصیل یہ واقعات لکھے ہیں، اور یہ حدیث بھی نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ میں اس لیے فصیح ہوں کہ قبیلۂ بنی سعد میں پلا ہوں (الروض الانف

شرفائے عرب نے مدت تک اس رسم کو محفوظ رکھا، یہاں تک کہ بنو امیہ نے نے دمشق میں پایۂ تخت قائم کیا اور شاہانہ شان و شوکت میں کسریٰ و قیصر کی ہمسری کی۔ تاہم ان کے بچے صحراؤں میں بدوؤں کے گھر میں پلتے تھے۔ ولید بن عبدالملک خاص اسباب سے نہ جاسکا اور حرم شاہی میں پلا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خاندان بنی امیہ میں صرف ولید ہی ایک شخص تھا جو عربی صحیح نہیں بول سکتا تھا۔

غرض، دستور مذکور کی بنا پر سال میں دو مرتبہ دیہات سے شہر میں عورتیں آیا کرتی تھیں، اور شرفائے شہر اپنے شیر خوار بچوں کو ان کے حوالے کر دیا کرتے تھے، اس دستور کے موافق آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ولادت کے چند روز بعد قبیلۂ ہوازن کی چند عورتیں بچوں کی تلاش میں آئیں، اُن میں حضرت حلیمہ سعدیہ رضی بھی تھیں[۵]۔ اتفاق سے اُن کو کوئی بچہ ہات نہیں آیا۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی والدہ نے ان کو مقرر کرنا چاہا تو اُن کو خیال آیا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۳) ج اوّل ص ۱۰۹ "س ہ") سر ولیم میور صاحب لائف آف محمدؐ میں لکھتے ہیں کہ "محمد ص کی جسمانی حالت بہت اچھی تھی، ان کے اخلاق آزاد اور مستغنی عن الغیر تھے۔ جس کی وجہ ان کا پانچ سال تک بنی سعد میں بسر کرنا تھا، اور اسی وجہ سے ان کی تقریر جزیرہ نمائے عرب کے خالص نمونہ کے موافق تھی"۔ [۵] ابن اثیر ج ۵ صفحہ ۱ طبع لیڈن) "س" [۵] سہیلی نے لکھا ہے کہ عرب میں دودھ پلانا اور اس کی اُجرت لینا شریفانہ کام نہیں خیال کیا جاتا تھا۔ اسی بنا پر عرب مثل ہے الحرۃ لا تاکل بثدیہا، اس بنا پر سہیلی نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ اس سال قحط پڑا تھا اس لیے مجبوراً حضرت حلیمہ رض اور ان کے قبیلے نے یہ خدمت گوارا کی تھی۔ لیکن تمام تاریخوں میں ہے کہ مکہ میں ہر سال باہر سے عورتیں اس کام کے لیے آیا کرتی تھیں۔ ہمارا خیال ہے، کہ اس کام کو معیوب سمجھنا عرب کا عام خیال نہ تھا، یہ خیال اہل شہر اور اُمراء کے ساتھ مخصوص ہوگا۔

کہ یتیم بچے کو لے کر کیا کروں گی، لیکن خالی ہاتھ بھی نہ جا سکتی تھیں۔ اس لیے آمنہ کی درخواست قبول کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر گئیں۔ اُن کی ایک صاحبزادی تھیں جن کا نام شیماء تھا، ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت اُنس تھا۔ وہی آپؐ کو کھلایا کرتی تھیں دو برس کے بعد حلیمہ آپؐ کو مکہ میں لائیں اور آپ کی والدہ ماجدہ کے سپرد کیا۔ لیکن چونکہ اس زمانہ میں مکہ میں وبا پھیلی ہوئی تھی، آپؐ کی والدہ نے فرمایا کہ واپس لے جاؤ۔ چنانچہ دوبارہ گھر میں لائیں۔ اس میں اختلاف ہے کہ آپؐ حضرت حلیمہؓ کے یہاں کے برس تک رہے۔ ابن اسحاق نے وثوق کے ساتھ ۶ برس لکھا ہے۔

ہوازن کا قبیلہ فصاحت و بلاغت میں مشہور ہے۔ ابن سعد نے طبقات میں روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ "میں تم سب میں فصیح تر ہوں، کیونکہ میں قریش کے خاندان سے ہوں اور میری زبان بنی سعد کی زبان[۱] ہے"۔ بنی سعد ہوازن ہی کے قبیلے کو کہتے ہیں۔

حضرت حلیمہؓ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بے انتہا محبت تھی۔ عہد نبوت میں جب وہ آپؐ کے پاس آئیں تو آپ "میری ماں میری ماں" کہہ کر لپٹ گئے۔ یہ دلچسپ واقعات آگے آئیں گے۔

ابن کثیر نے لکھا ہے کہ حضرت حلیمہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے پہلے وفات پا گئیں، لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ ابن ابی خیثمہ نے "تاریخ" میں، ابن جوزی نے "حدار" میں، منذری نے "مختصر سنن ابی داؤد" میں، ابن حجر نے "اصابہ" میں ان کے اسلام لانے کی تصریح کی ہے۔ حافظ مغلطائی نے ان

---

[۱] طبقات ابن سعد جلد ۱ صفحہ ۷۱۔

کے اسلام پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے، جس کا نام "التحفۃ الجسیمہ فی اثبات اسلام حلیمہ[۱]" ہے۔

حارث حضرت حلیمہ کے شوہر یعنی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رضاعی باپ کا نام حارث ابن عبدالعزیٰ ہے۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد مکہ میں آئے اور اسلام[۲] لائے۔

حارث آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آئے اور کہا کہ یہ تم کیا کہتے ہو؟ آپؐ نے فرمایا، ہاں وہ دن آئے گا کہ میں آپ کو دکھا دوں گا کہ میں سچ کہتا تھا، حارث مسلمان ہو گئے۔

رضاعی بھائی بہن آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے چار رضاعی بھائی بہن تھے، جن کے نام یہ ہیں: عبداللہ، انیسہ، حذیفہ اور حذافہ جو شیماء کے لقب سے مشہور تھیں، ان میں سے عبداللہ اور شیماء کا اسلام لانا ثابت ہے۔ باقیوں کا حال معلوم نہیں۔

مدینہ کا سفر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عمر جب چھ برس کی ہوئی تو آپؐ کی والدہ آپؐ کو لے کر مدینہ گئیں۔ چونکہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دادا کی ننہال خاندانِ نجار میں تھی، وہیں ٹھہریں۔ اس سفر میں ام ایمن رضؓ بھی ساتھ تھیں، جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دایہ تھیں۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ آپؐ کی والدہ اس ننہالی رشتہ کی وجہ سے مدینہ گئیں۔ لیکن یہ رشتہ دُور کا رشتہ تھا۔ قیاس میں نہیں آتا کہ صرف اتنے سے تعلق سے اتنا بڑا سفر کیا جائے۔ میرے نزدیک بعض مؤرخین کا یہ بیان صحیح ہے کہ حضرت آمنہ اپنے شوہر کی قبر کی زیارت کے

---

[۱] زرقانی جلد ۱ صفحہ ۱۶۶ [۲] اصابہ فی احوال الصحابہ مطبوعہ مصر مطبع سعادت جلد ۱ صفحہ ۲۸۳

لیے گئی تھیں، جو مدینہ میں مدفون تھے۔ بہرحال ایک مہینہ تک مدینہ میں مقیم رہیں واپس آتے ہوئے جب مقام ابواء[۱] میں پہنچیں تو اُن کا انتقال ہوگیا اور یہیں مدفون ہوئیں۔ ام ایمن رضؓ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو لے کر مکہ میں آئیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قیام مدینہ کی بہت سی باتیں یاد رہ گئی تھیں، جب آپؐ قیام مدینہ کے زمانے میں ایک دفعہ بنو عدی کے منازل پر گزرے تو فرمایا کہ اسی مکان میں میری والدہ ٹھہری تھیں، یہی وہ تالاب ہے جس میں میں نے تیرنا سیکھا تھا۔ اسی میدان میں میں انیسہ ایک لڑکی کے ساتھ کھیلا کرتا تھا[۲]۔

عبدالمطلب کی کفالت والدہ ماجدہ کے انتقال کے بعد عبدالمطلب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دامن تربیت میں لیا، ہمیشہ آپؐ کو اپنے ساتھ رکھتے تھے[۳]۔

---

[۱] ایک گاؤں کا نام ہے جو جحفہ سے ۲۳ میل پر واقع ہے۔ [۲] طبقات ابن سعد جلد ۱ صفحہ ۷۳۔ [۳] عبدالمطلب کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عزیز رکھنا ایک مسلّم واقعہ ہے لیکن مارگولیس کو دادا کا پوتے پر مہربان ہونا بھی گوارا نہیں فرماتے ہیں کہ "یتیم لڑکے کی حالت کچھ اچھی نہ تھی، اور اخیر زندگی میں ان کے چچا حمزہ نے نشہ کی حالت میں محمدؐ کو طنزاً اپنے باپ کا غلام کہا تھا، (لائف آف محمدؐ از مارگولیس صفحہ ۴۵ تا ۴۹) حضرت حمزہؓ کے جس قول سے استدلال کیا ہے۔ مارگولیس خود تسلیم کرتے ہیں کہ وہ نشہ کی حالت تھی۔ اس کی تفصیل جیسا کہ بخاری (غزوۂ بدر و خمس) میں ہے کہ بدر کے مال غنیمت سے حضرت علیؓ کو دو اونٹ ملے تھے (اس وقت تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی حضرت حمزہ شراب میں مخمور ادھر سے گزرے اور اونٹ کا پیٹ پھاڑ کر دل اور جگر کا کباب بنایا۔ آنحضرت کو خبر ہوئی تو آپؐ حضرت حمزہ کے پاس گئے اور ان کو ملامت کی۔ حضرت حمزہؓ سخت مخمور تھے۔ اس حالت میں وہ الفاظ ان کی زبان سے نکلے تھے۔ کیا اس حالت کا کوئی بیان شہادت میں پیش کیا جاسکتا ہے؟

(عبدالمطلب نے بیاسی برس کی عمر میں وفات پائی اور حجون میں مدفون ہوئے۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر آٹھ برس کی تھی۔ عبدالمطلب کا جنازہ اُٹھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ساتھ تھے، اور فرطِ محبت سے روتے جاتے تھے) عبدالمطلب نے مرنے کے وقت اپنے بیٹے ابوطالب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت سپرد کی۔ ابوطالب نے اس فرض کو جس خوبی سے ادا کیا۔ اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔ یہ واقعہ خاص طور پر لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ عبدالمطلب کی موت نے بنو ہاشم کے رتبہ امتیاز کو دفعۃً گھٹا دیا، اور یہ پہلا دن تھا کہ دنیوی اقتدار کے لحاظ سے بنو امیہ کا خاندان بنو ہاشم پر غالب آگیا۔ عبدالمطلب کی مسندِ ریاست پر اب حرب متمکن ہوا، جو امیہ کا نامور فرزند تھا۔ مناصبِ ریاست میں سے صرف سقایہ یعنی حجاج کو پانی پلانا عباس کے ہاتھ میں رہا، جو عبدالمطلب کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔

ابوطالب کی کفالت (عبدالمطلب کے دس بیٹے مختلف ازواج سے تھے۔ ان میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والد عبداللہ اور ابوطالب ماں جائے بھائی تھے۔ اس لیے عبدالمطلب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ابوطالب ہی کے آغوشِ تربیت میں دیا۔ ابوطالب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قدر محبت رکھتے تھے کہ آپؐ کے مقابلے میں اپنے بچوں کی پروا نہیں کرتے تھے۔ سوتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ لے کر سوتے، اور باہر جاتے تو ساتھ لے کر جاتے)۔

غالباً جب آپؐ کی عمر دس بارہ برس کی ہوئی تو آپؐ نے بکریاں چرائیں۔ فرانس کے ایک نامور مورخ نے لکھا ہے کہ "ابوطالب چونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ذلیل رکھتے تھے، اس لیے اُن سے بکریاں چرانے کا کام لیتے تھے"! لیکن واقعہ یہ ہے کہ عرب میں بکریاں چرانا معیوب کام نہ تھا۔ بڑے بڑے شرفاء اور اُمراء کے بچے

بکریاں چراتے تھے۔ خود قرآن مجید میں ہے وَلَکُمۡ فِیۡهَا جَمَالٌ حِیۡنَ تُرِیۡحُوۡنَ وَحِیۡنَ تَسۡرَحُوۡنَ، اور حقیقت یہ ہے کہ یہ عالم کی گلہ بانی کا دیباچہ تھا۔ زمانہ رسالت میں آپؐ اس سادہ اور پُرلطف مشغلہ کا ذکر فرمایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ آپؐ صحابہؓ کے ساتھ جنگل میں تشریف لے گئے۔ صحابہؓ جھڑبیریاں توڑ توڑ کر کھانے لگے۔ آپؐ نے فرمایا جو خوب سیاہ ہو جاتے ہیں زیادہ مزے کے ہوتے ہیں یہ میرا اُس زمانہ کا تجربہ ہے، جب میں بچپن میں یہاں بکریاں چرایا کرتا تھا۔[۱]

شام کا سفر ابوطالب تجارت کا کاروبار کرتے تھے۔ قریش کا دستور تھا، سال میں ایک دفعہ تجارت کی غرض سے شام کو جایا کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر تقریباً بارہ برس کی ہوگی کہ ابوطالب نے حسب دستور شام کا ارادہ کیا۔ سفر کی تکلیف یا کسی وجہ سے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ نہیں لے جانا چاہتے تھے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ابوطالب سے اس قدر محبت تھی کہ جب ابوطالب

---

[۱] طبقات ابن سعد صفحہ ۸۰ جلد اوّل، بخاری نے کتاب الاجارۃ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نقل کیا ہے کہ "میں قراریط پر مکہ والوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا" قراریط کے معنی میں اختلاف ہے۔ ابن ماجہ کے شیخ یعنی سوید بن سعید کی رائے ہے کہ قراریط قیراط کی جمع ہے، اور قیراط درہم یا دینار کے ٹکڑے کا نام ہے۔ اس بناء پر اُن کے نزدیک حدیث کے یہ معنی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُجرت پر لوگوں کی بکریاں چراتے تھے۔ اسی بنا پر بخاری نے اس حدیث کو باب الاجارۃ میں نقل کیا ہے۔ لیکن ابراہیم حربی کا قول ہے کہ قراریط ایک مقام کا نام ہے جو اجیاد کے قریب ہے۔ ابن جوزی نے اس قول کو ترجیح دی ہے۔ علامہ عینی نے اس حدیث کی شرح میں یہ بحث تفصیل سے لکھی ہے اور قوی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ابن جوزی کی رائے صحیح ہے (عینی جلد ۲ صفحہ ۶۳۱) نور النبراس میں یہ بحث اور زیادہ تفصیل سے ہے اور اسی رائے کو ترجیح دی ہے۔

چلنے لگے تو آپ اُن سے لپٹ گئے۔ ابوطالب نے آپ کی دل شکنی گوارا نہ کی، اور ساتھ لے لیا۔ عام مورخین کے بیان کے موافق بحیرا کا مشہور واقعہ اسی سفر میں پیش آیا۔ اس واقعہ کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے کہ جب ابوطالب بصریٰ میں پہنچے تو ایک عیسائی راہب کی خانقاہ میں اُترے، جس کا نام بحیرا تھا۔ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر کہا کہ "یہ سید المرسلین ہیں۔" لوگوں نے پوچھا تم نے کیوں کر جانا؟ اس نے کہا جب تم لوگ پہاڑ سے اترے تو جس قدر درخت اور پتھر تھے، سب سجدے کے لیے جھک گئے۔

یہ روایت مختلف پیرایوں میں بیان کی گئی ہے۔ تعجب یہ ہے کہ اس روایت سے جس قدر عام مسلمانوں کو شغف ہے، اس سے زیادہ عیسائیوں کو ہے۔ سر ولیم میور، ڈریپر، مارگیولوس وغیرہ سب اس واقعہ کو عیسائیت کی فتح عظیم خیال کرتے ہیں اور اس بات کے مدعی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذہب کے حقائق و اسرار اسی راہب سے سیکھے، اور جو نکتے اس نے بتا دیے تھے، انہی پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عقاید اسلام کی بنیاد رکھی۔ اسلام کے تمام عمدہ اصول انہی نکتوں کے شروح اور حواشی ہیں۔[۵]

---

[۵] ڈریپر صاحب معرکۂ علم و مذہب میں لکھتے ہیں "بحیرا راہب نے بصریٰ کی خانقاہ میں محمد کو نسطوری عقاید کی تعلیم دی ..... آپ کے ناتربیت یافتہ لیکن اخاذ دماغ نے نہ صرف اپنے اتالیق کے مذہبی بلکہ فلسفیانہ خیالات کا گہرا اثر قبول کیا..... بعد میں آپ کے طرزِ عمل سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ نسطوریوں (عیسائیوں کے ایک مذہبی فرقے کا نام ہے) کے مذہبی عقائد نے آپ پر کہاں تک قابو پا لیا تھا۔" سر ولیم میور صاحب نے بھی نہایت آب و رنگ سے ثابت کرنا چاہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بُت پرستی سے جو نفرت

عیسائی مصنفین اگر روایت کو صحیح مانتے ہیں تو اس طرح ماننا چاہیے، جس طرح روایت میں مذکور ہے، اس میں بحیرا کی تعلیم کا کہیں ذکر نہیں۔ قیاس میں بھی نہیں آسکتا کہ دس بارہ برس کے بچے کو مذہب کے تمام دقائق سکھا دیے جائیں، اور اگر یہ کوئی خرقِ عادت تھا، تو بحیرا کے تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

لیکن حقیقت یہ ہے کہ روایت ناقابلِ اعتبار ہے۔ اس روایت کے جس قدر طریقے ہیں سب مرسل ہیں۔ یعنی راوی اوّل واقعہ کے تحت خود موجود نہ تھا۔ اور اس راوی کا نام نہیں بیان کرتا جو شریکِ واقعہ تھا۔

اس روایت کا سب سے زیادہ مستند طریقہ یہ ہے جو ترمذی میں مذکور ہے، اس کے متعلق تین باتیں قابلِ لحاظ ہیں:

(۱) ترمذی نے اس روایت کے متعلق لکھا ہے کہ "حسن اور غریب ہے، اور ہم اس حدیث کو اس طریقہ کے سوا کسی اور طریقہ سے نہیں جانتے"۔ حسن کا مرتبہ صحیح حدیث سے کم ہوتا ہے، اور جب غریب ہو تو اس کا رتبہ اس سے بھی گھٹ جاتا ہے۔

(۲) اس حدیث کا ایک راوی عبدالرحمان بن غزوان ہے۔ اس کو بہت سے لوگوں نے اگرچہ ثقہ بھی کہا ہے، لیکن اکثر اہلِ فن نے اس کی نسبت بے اعتباری

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۰) پیدا ہوئی اور ایک مذہب جدید کا جو خاکہ آپ نے قائم کیا، وہ سب اسی سفر اور اس کے مختلف تجاربِ اور مشاہدات کے نتائج تھے، (لیکن ظاہر ہے کہ اگر شارعِ اسلام بالفرض ان عیسائی اساتذہ کا تعلیم یافتہ ہوتا تو ناممکن تھا کہ توحید خالص کا وہ ولولہ اور تثلیث سے نفرت کا وہ جوش اس کے سینے میں پیدا ہو سکتا جو قرآن کے ہر صفحہ میں نظر آتا ہے)۔

ظاہر کی ہے۔ علامہ ذہبی، میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں کہ " عبدالرحمن منکر حدیثیں بیان کرتا ہے۔ جن میں سب سے بڑھ کر منکر وہ روایت ہے، جس میں بحیرا کا واقعہ مذکور ہے "۔

(۳) حاکم نے مستدرک میں اس روایت کی نسبت لکھا ہے کہ "یہ حدیث بخاری و مسلم کی شرائط کے مطابق ہے۔ علامہ ذہبی نے تلخیص المستدرک میں حاکم کا یہ قول نقل کر کے لکھا ہے کہ "میں اس حدیث کے بعض واقعات کو موضوع، جھوٹا اور بنایا ہوا خیال کرتا ہوں"۔

(۴) اس روایت میں مذکور ہے کہ حضرت بلال رضؓ اور ابوبکر رضؓ اس سفر میں شریک تھے، حالانکہ اس وقت بلال رضؓ کا وجود بھی نہ تھا اور حضرت ابوبکر رضؓ بچے تھے۔

(۵) اس حدیث کے اخیر راوی ابوموسیٰ اشعری رضؓ ہیں۔ وہ شریک واقعہ نہ تھے، اور اوپر کے راوی کا نام نہیں بتاتے۔ ترمذی کے علاوہ، طبقات ابن سعد میں جو سلسلہ سند مذکور ہے، وہ مرسل یا معضل ہے یعنی جو روایت مرسل ہے اس میں تابعی جو ظاہر ہے کہ شریک واقعہ نہیں ہے، کسی صحابی کا نام نہیں لیتا ہے۔ اور جو روایت معضل ہے اس میں راوی اپنے اوپر کے دو راوی جو تابعی اور صحابی ہیں دونوں کا نام نہیں لیتا ہے)۔

۱؎ نبراس فی شرح عیون السیر لابن سید الناس اور زرقانی اور میزان الاعتدال اور اصابہ (تذکرہ عبدالرحمان ابن غزوان) (مستدرک حاکم مع تلخیص ج ۲ ص ۶۱۵) "س"

۲؎ (جزء اول قسم اول ص ۵) "س"

(۴) حافظ ابن حجر رواۃ پرستی کی بنا پر اس حدیث کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ حضرت ابوبکرؓ اور بلالؓ کی شرکت بداہۃً غلط ہے، اس لیے مجبوراً اقرار کرتے ہیں کہ اس قدر حصہ غلطی سے روایت میں شامل ہو گیا ہے لیکن ابن حجر کا یہ ادعا بھی صحیح نہیں کہ اس روایت کے تمام رواۃ قابل سند ہیں۔ عبدالرحمان بن غزوان کی نسبت خود انہی حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ "وہ خطا کرتا تھا اس کی طرف سے اس وجہ سے شبہہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نے ممالیک کی روایت نقل کی ہے۔" ممالیک کی ایک روایت ہے جس کو محدثین جھوٹ اور موضوع خیال کرتے ہیں[1]۔

حرب فجار کی شرکت عرب میں اسلام کے آغاز تک لڑائیوں کا جو متواتر سلسلہ چلا آتا ہے، ان میں یہ جنگ سب سے زیادہ مشہور اور خطرناک تھی۔

یہ لڑائی قریش اور قیس کے قبیلے میں ہوئی تھی۔ قریش کے تمام خاندانوں نے اس معرکہ میں اپنی اپنی الگ فوجیں قائم کی تھیں۔ آل ہاشم کے علم بردار زبیر بن عبدالمطلب تھے، اور اسی صف میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک تھے۔ بڑے زور کا معرکہ ہوا۔ اول قیس، پھر قریش غالب آئے اور بالآخر صلح پر خاتمہ ہو گیا۔ اس لڑائی میں قریش کا رئیس اور سپہ سالار اعظم حرب بن امیہ تھا جو ابوسفیان کا باپ اور امیر معاویہ کا دادا تھا۔

چونکہ قریش اس جنگ میں برسر حق تھے، اور خاندان کے ننگ و نام کا معاملہ تھا، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی شرکت فرمائی۔ لیکن جیسا کہ ابن

---

[1] (جامع نے بحیرا راہب کے قصے کی مکمل تنقید سیرۃ النبیؐ جلد سوم باب "مشہور علامات و دلائل و معجزات کی روایتی حیثیت" میں کی ہے، اس کو ملاحظہ فرمایا جائے)۔ "س"

ہشام نے لکھا ہے آپ نے کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ امام سہیلی نے صاف تصریح کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود جنگ نہیں کی، ان کے الفاظ یہ ہیں:

وانما لم یقاتل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مع اعمامہ فی الفجار وقد بلغ سن القتال لانھا کانت حرب فجار و کانوا ایضا کلھم کفارا و لم یاذن اللہ لمومن ان یقاتل الا لیکون کلمۃ اللہ ھی العلیا۔	اور آپ نے اس لڑائی میں جنگ نہیں کی، حالانکہ آپ لڑائی کی عمر کو پہنچ چلے تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ لڑائی ایام الحرام میں پیش آئی تھی نیز یہ وجہ تھی کہ فریقین کافر تھے اور مسلمانوں کو لڑائی کا حکم صرف اس لیے خدا نے دیا ہے کہ خدا کا بول بالا ہو۔

اس لڑائی کو فجار اس لیے کہتے ہیں کہ ایام الحرام میں یعنی ان مہینوں میں پیش آئی تھی جن میں لڑنا ناجائز تھا۔

حلف الفضول لڑائیوں کے متواتر سلسلہ نے سیکڑوں گھرانے برباد کر دیے تھے اور قتل و سفاکی موروثی اخلاق بن گئے تھے۔ یہ دیکھ کر بعض طبیعتوں میں اصلاح کی تحریک پیدا ہوئی۔ جنگِ فجار سے لوگ واپس پھرے تو زبیر بن عبدالمطلب نے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا اور خاندان کے سرگروہ تھے، یہ تجویز پیش کی، چنانچہ خاندانِ ہاشم، زہرہ اور تیم، عبداللہ بن جدعان کے گھر میں جمع ہوئے اور معاہدہ ہوا کہ ہم میں سے ہر شخص مظلوم کی حمایت کرے گا، اور کوئی ظالم مکہ میں نہ رہنے پائے گا۔[۱]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس معاہدہ میں شریک تھے، اور عہدِ نبوت میں

[۱] طبقات ج ۱ ص ۸۲۔

فرمایا کرتے تھے، کہ "معاہدہ کے مقابلے میں اگر مجھ کو سُرخ رنگ کے اونٹ بھی دِیے جاتے تو مَیں نہ بدلتا۔[۱] اور آج بھی ایسے معاہدے کے لیے کوئی بُلائے تو مَیں حاضر ہوں"۔

اس معاہدہ کو حلف الفضول اس لیے کہتے ہیں کہ اوّل اوّل اس معاہدے کا خیال جن لوگوں کو آیا ان کے نام میں لفظ "فضیلت" کا مادّہ داخل تھا[۲] یعنی فضیل بن حرث، فضیل ابن وداعة اور مفضل۔ یہ لوگ جرہم اور قطورا کے قبیلے کے تھے۔ اگرچہ یہ معاہدہ بے کار گیا، اور کسی کو یاد بھی نہ رہا۔ چنانچہ قریش نے نئے سرے سے بنیاد ڈالی۔ تاہم بانیِ اوّل کو نیک نیّتی کا یہ ثمرہ ملا کہ ان کے نام کی یادگار اب تک باقی ہے۔

تعمیر کعبہ کعبہ کی عمارت صرف قدِ آدم اونچی تھی اور دیواروں پر چھت نہ تھی جس طرح ہمارے ملک میں عیدگاہیں ہوتی ہیں۔ چونکہ عمارت نشیب میں تھی، بارش کے زمانے میں شہر کا پانی حرم میں آتا تھا، اس کی روک تھام کے لیے بالائی حصہ پر بند بنوادیا گیا، لیکن وہ ٹوٹ جاتا تھا، اور عمارات کو بار بار نقصان پہنچتا تھا۔ بالآخر یہ رائے قرار پائی کہ موجودہ عمارت ڈھاکر نئے سر سے زیادہ مستحکم بنائی جائے حسنِ اتفاق یہ کہ جدّہ کے بندرگاہ پر ایک تجارتی جہاز کنارہ سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا، قریش کو خبر لگی تو ولید بن مغیرہ نے جدّہ پہنچ کر جہاز کے تختے مول لے لیے۔ جہاز میں ایک رومی معمار تھا جس کا نام باقوم تھا، ولید اس کو ساتھ لایا، اور تمام قریش نے مل کر تعمیر شروع کی۔ مختلف قبائل نے عمارت کے مختلف حصّے آپس

---

[۱] مستدرک ج ۲ ص ۲۲۰ س [۲] لیکن امام سہیلی نے مسند حارث بن اسامہ سے ایک حدیث نقل کی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ نام اس لیے پڑا کہ اس معاہدہ میں الفاظ تھے تردّ الفضول علی اھلہا

تقسیم کر لیے تھے کہ کوئی اس شرف سے محروم نہ رہ جائے۔ لیکن جب حجرِ اسود کے نصب کرنے کا موقع آیا تو سخت جھگڑا[1] پیدا ہوا۔ ہر شخص چاہتا تھا کہ یہ خدمت اسی کے ہات سے انجام پائے، نوبت یہاں تک پہنچی کہ تلواریں کھنچ گئیں۔

عرب میں دستور تھا کہ جب کوئی شخص جان دینے کی قسم کھاتا تھا تو پیالہ میں خون بھر کر اس میں انگلیاں ڈبو لیتا تھا۔ اس موقع پر بھی بعض دعویداروں نے یہ رسم ادا کی۔ چار دن تک یہ جھگڑا برپا رہا۔ پانچویں دن ابو امیہ بن مغیرہ نے جو قریش میں سب سے زیادہ معمر تھا، رائے دی کہ کل صبح کو سب سے پہلے جو شخص آئے وہی ثالث قرار دے دیا جائے۔ سب نے یہ رائے تسلیم کی۔ دوسرے دن تمام قبائل کے معزز آدمی موقع پر پہنچے۔ کرشمۂ ربانی دیکھو کہ صبح کو سب سے پہلے لوگوں کی نظریں جس پر پڑیں، وہ جمالِ جہاں تاب چہرۂ محمدیؐ تھا۔ لیکن رحمتِ عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قبول نہ کیا کہ اس شرف سے تنہا بہرہ ور ہو، آپؐ نے فرمایا جو قبائل دعویدار ہیں، سب کا ایک ایک سردار انتخاب کر لیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چادر بچھا کر حجرِ اسود کو اس میں رکھ دیا اور سرداروں سے کہا کہ چادر کے چاروں کونے تھام لیں اور اُوپر کو اُٹھائیں۔ جب چادر موقع کے برابر آگئی تو آپؐ نے حجرِ اسود کو اُٹھا کر نصب فرما دیا (یہ گویا اشارہ تھا کہ دینِ الٰہی کی عمارت کا آخری تکمیلی پتھر بھی ان ہی ہاتھوں سے نصب[2] ہوگا)۔

اس طرح ایک سخت لڑائی آپؐ کے حُسنِ تدبیر سے رُک گئی۔ کعبہ کی عمارت

---

[1] مسند طیالسی جلد اوّل ص۱۸ و مستدرک حاکم جلد اوّل ص۴۵۸ "س"

[2] یہ ایک حدیث کی طرف تلمیح ہے، جس میں آپؐ نے فرمایا ہے کہ "میں نبوت کی عمارت کا آخری پتھر ہوں" یعنی مکمل مذہب اور خاتم الرسل ہوں)۔ "س"

اب مسقف کر دی گئی۔ لیکن چونکہ سامانِ تعمیر کافی نہ تھا، ایک طرف زمین کا کچھ حصہ چھوڑ کر بنیادیں قائم کی گئیں اور اس حصہ کے گرد چار دیواری کھینچ دی گئی۔ کہ پھر موقع ہوگا تو کعبہ کے اندر لے لیں گے۔ یہی حصہ ہے جس کو آج حطیم کہتے ہیں، اور جس کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد نبوت ارادہ فرمایا تھا کہ دیوار ڈھا کر نئے سر سے عمارت بنائی جائے۔ لیکن پھر خیال ہوا کہ نئے نئے مسلمان ہیں، دیوارِ کعبہ کے ڈھلنے سے بدگمان ہو جائیں گے۔[1]

شغلِ تجارت[2] | عرب اور خصوصاً قریش یعنی بنی اسمٰعیل، ظہورِ اسلام کے ہزاروں برس پہلے سے تجارت پیشہ[3] تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جد اعلیٰ نے قبائلِ عرب سے تجارتی معاہدے کر کے اس خاندانی طریقۂ اکتساب کو اور زیادہ مستحکم اور باقاعدہ کر دیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب بھی تاجر تھے، اس بنا پر سنِ رُشد کو پہنچنے کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب فکرِ معاش کی طرف توجہ ہوئی تو تجارت سے بہتر کوئی پیشہ نظر نہ آیا۔

ابو طالب کے ساتھ آپ بچپن میں بھی بعض تجارتی سفر کر چکے تھے، جس سے ہر قسم کا تجربہ حاصل ہو چکا تھا، اور آپؐ کے حُسنِ معاملہ کی شہرت ہر طرف پھیل چکی تھی۔ لوگ عموماً اپنا سرمایہ کسی تجربہ کار اور امین شخص کے ہاتھ میں دے کر اس کے

---

[1] یہ واقعات ابن ہشام، طبقات، طبری میں منفرد اور زرقانی جلد اول صفحہ ۲۳۶ تا ۲۰۲ میں مجتمعاً مذکور ہیں، اخیر کا واقعہ صحیح بخاری میں بھی ہے۔ بخاری میں یہ بھی ہے کہ قریش جب کعبہ کی تعمیر کر رہے تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک تھے اور دوشِ مبارک پر پتھر ڈھو کر لاتے تھے، یہاں تک کہ شانے چھل گئے تھے۔

[2] اضافہ وزیادہ [3] توراۃ تکوین قصۂ یوسف۔

منافع میں شرکت کر لیتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی خوشی کے ساتھ اس شرکت کو گوارا فرماتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شرکائے تجارت کی شہادتوں سے جو احادیث او تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہیں، ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ کس دیانت اور راستبازی کے ساتھ اس کام کو انجام دیتے تھے۔

تاجر کے محاسن اخلاق میں سب سے زیادہ نادر مثال ایفائے عہد اور اتمامِ وعدہ کی ہوسکتی ہے لیکن منصبِ نبوت سے پہلے مکہ کا تاجر امینؐ اس اخلاقی نظیر کا بہترین نمونہ تھا۔ حضرت عبداللہ ابن ابی الحمساء ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ بعثت سے پہلے میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خرید و فروخت کا کوئی معاملہ کیا تھا، کچھ معاملہ ہو چکا تھا، کچھ باقی تھا۔ میں نے وعدہ کیا کہ پھر آؤں گا۔ اتفاق سے تین دن تک مجھ کو اپنا وعدہ یاد نہ آیا۔ تیسرے دن جب وعدہ گاہ پر پہنچا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی جگہ منتظر پایا۔ لیکن اس خلافِ وعدہ سے آپؐ کی پیشانی پر بل تک نہ آیا، صرف اس قدر فرمایا کہ "تم نے مجھے زحمت دی۔ میں اسی مقام پر تین دن سے موجود ہوں"[1]۔

کاروبارِ تجارت میں ہمیشہ آپؐ اپنا معاملہ صاف رکھتے تھے۔ نبوت سے پہلے بھی جن لوگوں سے تجارت میں آپؐ کا سابقہ تھا، وہ بھی اس کی شہادت دیتے تھے۔ سائب رضؓ نام ایک صحابی جب مسلمان ہو کر خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے تو لوگوں نے اُن کی تعریف کی، آپؐ نے فرمایا "میں ان کو تم سے زیادہ جانتا ہوں"۔ سائب رضؓ نے کہا، آپؐ پر میرے ماں باپ قربان، آپؐ میرے شریکِ تجارت تھے۔ لیکن

---

[1] سنن ابی داؤد جلد ۲ ص ۲۲۶ (مطبع محمدی) کتاب الادب باب فی الوعد)

ہمیشہ معاملہ صاف رکھا۔ فکنت لا تداری ولا تماری۔ قیس بن سائب مخزومیؓ ایک اور صحابیؓ بھی آپ کے شریک تجارت تھے، وہ بھی انہی الفاظ کے ساتھ آپؐ کے حسنِ معاملہ کی شہادت دیتے ہیں[۲]۔

تجارت کی غرض سے شام و بصریٰ اور یمن کے متعدد سفر آپؐ نے کیے تھے۔

تزویج خدیجہؓ حضرت خدیجہؓ ایک معزز خاتون تھیں۔ ان کا سلسلہ نسب پانچویں پشت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے ملتا ہے۔ اور اس رشتہ کے لحاظ سے وہ آپؐ کی چچیری بہن تھیں، اُن کی دو شادیاں پہلے ہو چکی تھیں، اب وہ بیوہ تھیں۔ چونکہ نہایت شریف النفس اور پاکیزہ اخلاق تھیں، جاہلیت میں لوگ ان کو طاہرہ کے نام سے پکارتے تھے۔ نہایت دولتمند تھیں۔ طبقاتِ ابن سعد میں لکھا ہے کہ جب اہلِ مکہ کا قافلہ تجارت کو روانہ ہوتا تھا تو اکیلا اُن کا سامان تمام قریش کے برابر ہوتا تھا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر اب پچیس برس کی ہو چکی تھی۔ متعدد قومی کاموں میں آپؐ شریک ہو چکے تھے۔ تجارت کے کاروبار کے ذریعے سے لوگوں کے ساتھ معاملات پیش آتے تھے۔ اس بنا پر آپؐ کے حسنِ معاملہ، راستبازی، صدق و دیانت اور پاکیزہ اخلاقی کی عام شہرت ہو چکی تھی۔ یہاں تک کہ زبانِ خلق نے آپؐ کو امین کا لقب دے دیا تھا۔ حضرت خدیجہؓ نے ان اسباب کے لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پیغام بھیجا کہ "آپ میرا مالِ تجارت لے کر شام کو جائیں، جو معاوضہ میں اوروں کو دیتی ہوں آپ کو اس کا مضاعف دوں گی۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمایا، اور مالِ تجارت لے کر بصریٰ تشریف

---

[۱] ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۳۱۷۔ [۲] اصابہ ج ۵ ص ۲۵۳ ترجمہ حضرت قیسؓ بن سائب۔

لے گئے۔

واپس آنے کے تقریباً تین مہینے کے بعد حضرت خدیجہ رضؓ نے آپؐ کے پاس شادی کا پیغام بھیجا۔ اُن کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ لیکن ان کے چچا عمرو بن اسد زندہ تھے۔ عرب میں عورتوں کو یہ آزادی حاصل تھی کہ شادی بیاہ کے متعلق خود گفتگو کر سکتی تھیں، اور اس میں بالغہ نابالغہ کی قید نہ تھی۔ حضرت خدیجہ رضؓ نے چچا کے ہوتے خود براہ راست تمام مراتب طے کیے (تاریخ معین پر ابوطالب اور تمام رؤسائے خاندان جن میں حضرت حمزہ رضؓ بھی تھے، حضرت خدیجہ رضؓ کے مکان پر آئے۔ ابوطالب رضؓ نے خطبۂ نکاح پڑھا اور پانسو طلائی درہم مہر قرار پایا)۔

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت خدیجہ رضؓ کے والد زندہ تھے اور ان کی موجودگی میں نکاح ہوا، لیکن شراب میں مخمور تھے۔ جب ہوش میں آئے تو نکاح کا حال سن کے برہم ہوئے کہ یہ برابر کا جوڑ نہیں۔

لیکن یہ روایت صحیح نہیں، امام سہیلی نے بہ تصریح اور بہ دلیل ثابت کیا ہے کہ حضرت خدیجہ رضؓ کے والد جنگ فجار کے قبل انتقال کر چکے تھے۔

حضرت خدیجہ رضؓ جس مکان میں رہتی تھیں، وہ آج بھی (بحسب بیان مؤرخ طبری) انہی کے نام سے مشہور ہے، امیر معاویہ رضؓ نے اس مکان کو خرید کر مسجد بنا دیا۔

شادی کے وقت حضرت خدیجہ رضؓ کی عمر چالیس برس کی تھی، اور پہلے دو شوہروں سے دوؔ صاحبزادے اور ایک صاحبزادی تھیں، ان کے نام اور مفصل حالات آگے آئیں گے۔

لہ حضرت خدیجہ رضؓ کے نکاح کے واقعات ابن ہشام، ابن سعد و طبری میں باختلاف اجمال و تفصیل و اثبات و نفی مذکور ہیں۔ میں نے قرائن سے جو روایت زیادہ قابل اعتبار پائی،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جس قدر اولاد ہوئی، بجز حضرت ابراہیم کے حضرت خدیجہ رضؓ ہی کے بطن سے ہوئی۔ ان کے حالات آگے تفصیل سے آئیں گے۔

جستہ جستہ واقعات

یہ واقعات تھے جن میں تاریخی ترتیب معلوم ہے، اس لیے مسلسل لکھے گئے۔ ان امور کے سوا جستہ جستہ واقعات کا بھی پتہ لگتا ہے۔ چونکہ ان کے سنین اور تاریخیں غیر معلوم ہیں، اس لیے ان کو عام سلسلہ سے الگ یکجا لکھنا زیادہ موزوں ہوگا۔

حدود سفر

اہل مکہ عموماً تجارت کی غرض سے سفر کرنے کے عادی تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس تقریب سے متعدد سفر کیے۔ شام اور بصریٰ کے سفر کا حال پہلے گزر چکا ہے۔ اس کے علاوہ اور مقامات تجارت میں بھی آپ کا تشریف لے جانا ثابت ہے۔ عرب میں مختلف مقامات میں جو بازار قائم تھے ان میں سے جباشہ کا ذکر ابن سید الناس نے کیا ہے۔ حضرت خدیجہ رضؓ نے جہاں جہاں آپ کو تجارت کی غرض سے بھیجا تھا، ان میں جرش بھی ہے، جو یمن میں ہے۔ حاکم نے مستدرک میں لکھا ہے، اور علامہ ذہبی نے بھی تصدیق کی ہے۔ کہ جرش میں آپؐ دو دفعہ تشریف لے گئے اور ہر دفعہ حضرت خدیجہ رضؓ نے معاوضہ میں ایک اونٹ دیا۔

نبوت کے بعد جس سال آپؐ کی خدمت میں عرب کے تمام دور دراز مقامات سے وفود آئے۔ ان میں جب بحرین سے عبدالقیس کا وفد آیا، تو آپؐ نے بحرین کے ایک ایک مقام کا نام لے کر وہاں کا حال پوچھا، لوگوں نے تعجب سے پوچھا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۰) نقل کی ہے، یکجا تمام حالات دیکھنے ہوں تو زرقانی جلد اول صفحہ ۲۳۲ سے ۲۳۶ تک دیکھنا چاہیے۔ حضرت خدیجہ رضؓ کے مکان کا ذکر صرف طبری نے کیا ہے۔ ابن حنبل (مسند ابن عباس میں بھی واقعات مذکور ہیں۔ ۱۲

لہ نور النبراس فی شرح ابن سید الناس۔

کہ آپؐ ہمارے ملک ... کا حال ہم سے زیادہ جانتے ہیں! آپؐ نے فرمایا "میں نے تمہارے ملک کی خوب سیر کی ہے۔"[1] مورخین یورپ نے جو علوم غیبی کے منکر ہیں اور جو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) آپؐ کے تمام معارف و معلومات سیر و سفر سے ماخوذ ہیں۔ قیاسات کے ذریعے سے اس دائرہ کو اور وسعت دی ہے۔ ایک مورخ نے لکھا ہے کہ "آپ نے بحری سفر بھی کیا تھا، جس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں جہازوں کی رفتار اور طوفان کی کیفیت کی ایسی صحیح تصویر ہے جس سے (نعوذ باللہ) ذاتی تجربہ کی بو آتی ہے"[2] مورخ مذکور کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ آپؐ مصر بھی تشریف لے گئے تھے، اور ڈیڈسی (بحر میت) کا بھی معائنہ کیا تھا، لیکن تاریخی دفتر ان واقعات سے خالی ہے[3]۔

مراسم شرک سے اجتناب یہ قطعاً ثابت ہے کہ آپؐ بچپن اور شباب میں بھی جب کہ منصب پیغمبری سے ممتاز نہیں ہوئے تھے، مراسم شرک سے ہمیشہ مجتنب رہے۔ ایک دفعہ قریش نے آپؐ کے سامنے کھانا لا کر رکھا، یہ کھانا بتوں کے چڑھاوے کا تھا۔ جانور جو ذبح کیا گیا تھا، آپؐ نے کھانے سے انکار

---

[1] مسند امام احمد بن حنبل (جلد ۴) صفحہ ۲۰۶، س۔ [2] مارگولیوس صفحہ ۵۷۔

[3] (یورپین مورخین جن کی بنیاد صرف قیاس و رائے پر ہوتی ہے۔ اگر اس قسم کے واقعات بیان کریں تو کوئی تعجب نہیں ہے، لیکن اگر بحرین تشریف لے جانے کی روایت صحیح ہے تو خلیج فارس آپؐ نے دیکھا ہوگا۔ بحر میت کا مشاہدہ بھی ممکن ہے کیونکہ اس کا موقع عرب و شام کے درمیان میں ہے۔ جہاں سے آپؐ کئی بار تجارت کے ساتھ گزرے ہوں گے) "س"

کیا ہے[1]

نصاریٰ نے دعویٰ کیا ہے کہ آپؐ کے اعتقادات میں جو تغیر ہُوا ہے وہ عہدِ نبوّت سے ہُوا ہے، ورنہ اس سے پہلے آپؐ کا طرزِ عمل وہی تھا جو آپؐ کے خاندان اور اہلِ شہر کا تھا۔ چنانچہ آپؐ نے اپنے پہلے صاحبزادہ کا نام عبدالعزیٰ[2] رکھا تھا، اور یہ روایت خود امام بخاری کی تاریخ صغیر میں موجود ہے لیکن یہ روایت اگر صحیح بھی ہو تو اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کیونکر استدلال ہو سکتا ہے؟

حضرت خدیجہ رضؓ اسلام سے بہت پہلے بُت پرست تھیں، انھوں نے یہ نام رکھا ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابھی تک منصبِ ارشاد پر مامور نہیں ہوئے تھے اس لیے آپؐ نے تعرض نہ فرمایا ہوگا اور اصل واقعہ یہ ہے کہ یہ روایت فی نفسہٖ بھی ثابت نہیں، اس روایت کا سب سے زیادہ تر صحیح سلسلہ وہ ہے جو امام بخاری نے تاریخ صغیر میں روایت کیا ہے، اس کا پہلا راوی اسمٰعیل ہے، جس کا پورا نام اسمٰعیل بن ابی اویس ہے۔ اگرچہ بعض محدثین نے اس کی توثیق کی ہے۔ لیکن گروہِ کثیر کی رائے حسب ذیل ہے:

---

[1] صحیح بخاری باب المناقب ذکر زید بن عمرو بن نفیل، یہ حدیث امام بخاری نے اور ابواب میں بھی نقل کی ہے، اس کے الفاظ میں اجمال رہ گیا ہے جو اس روایت میں صاف ہو گیا ہے۔ مسند ابن امام حنبل جلد اوّل (ص ۱۸۹) میں ایک روایت ہے جس میں بیان کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید کو اس کھلنے پر بُلایا اور زید نے انکار کیا اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تاریخ سے کبھی بتوں پر ذبح کیا ہُوا کھانا نہیں کھایا۔ لیکن اس روایت کے راویوں کا حال نہیں ملتا اور یوں بھی بخاری کے سامنے اس روایت کی کیا وقعت ہے۔ [2] عزّیٰ ایک بُت کا نام تھا۔

معاویہ بن صالح	اسمٰعیل اور اس کا باپ دونوں ضعیف ہیں۔
یحییٰ بن مخلط	وہ جھوٹ بولتا ہے اور محض ہیچ ہے۔
امام نسائی	ضعیف اور غیر ثقہ ہے۔
نصر بن سلمہ مروزی	وہ کذاب ہے۔
دار قطنی	مَیں اس کو صحیح روایت کے لیے پسند نہیں کرتا۔
سیف بن محمد	وہ جھوٹ حدیثیں بناتا ہے۔
سلمہ بن شبیب	مجھ سے اس نے خود اقرار کیا کہ جب کبھی کسی بات میں اختلاف ہوتا تھا تو مَیں ایک حدیث بنا لیتا۔

یہ امر واقعی طور پر ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے پہلے بُت پرستی کی بُرائی شروع کر دی تھی، اور جن لوگوں پر آپؐ کو اعتماد تھا، اُن کو اس بات سے منع فرماتے تھے[1] (مستدرک حاکم جلد سوم ذکر زید بن حارثہ "س")

---

[1] مسٹر مارگولیس نے اس کے برخلاف ایک حیرت انگیز دعویٰ کیا ہے اور اس دعویٰ سے زیادہ تر حیرت انگیز فریب کاری کی ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہؓ دونوں سونے سے پہلے ایک بُت کی پرستش کر لیا کرتے تھے جس کا نام عزیٰ تھا" مصنف موصوف نے اس کی سند میں امام حنبل کی روایت (جلد ۴ صفحہ ۲۲۲) پیش کی ہے، روایت کے الفاظ یہ ہیں:

حدثنی جار لخدیجة بنت خویلد	مجھ سے خدیجہ (بنت خویلد) کے ایک ہمسایہ نے
انہ سمع نبی صلی اللہ علیہ وسلم	بیان کیا کہ مَیں نے پیغمبر صاحبؐ کو حضرت
وھو یقول لخدیجة ای خدیجة	خدیجہ رضؓ سے یہ کہتے سُنا کہ اے خدیجہ بخدا
واللہ لا اعبد اللات والعزیٰ	مَیں کبھی لات اور عزیٰ کی پرستش نہ کرونگا

موحدین کی ملاقات اس میں شبہہ نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے فیضِ الٰہی کی خفیف شعاعیں عرب میں پھیلنی شروع ہو گئی تھیں۔ چنانچہ قس بن ساعدہ، ورقہ بن نوفل، عبیداللہ بن جحش، عثمان بن الحویرث، زید بن عمرو بن نفیل نے بُت پرستی سے انکار کر دیا تھا[1] ان میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید سے مُلاقات کی تھی، جس کا ذکر صحیح بخاری میں بھی ہے۔ ورقہ عیسائی ہو گئے تھے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۴) واللہ لا اعبد ابداً قال فتقول خدیجۃ خل اللات خل العزیٰ قال کانت صنمهم التی کانوا یعبدون ثم یضطجون۔ | خدیجہ کہتی تھیں کہ لات کو جانے دیجیے، لات کو جانے دیجیے (یعنی ان کا ذکر بھی نہ کیجیے) اس نے کہا کہ لات و عزّیٰ وہ بُت تھے جس کی پرستش اہلِ عرب سونے سے پیشتر کیا کرتے تھے

ایک معمولی عربی دان بھی سمجھ سکتا ہے کہ عبارت مذکور میں کانوا کا لفظ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اہلِ عرب لات و عزّیٰ کی پرستش کیا کرتے تھے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ ہوتا تو تثنیہ کا صیغہ ہوتا نہ کہ جمع کا۔ اس کے علاوہ خود اسی روایت میں لات و عزّیٰ کی پرستش سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سخت انکار کرنا مذکور ہے +

مارگولیس صاحب نے یہ روایت بھی بیان کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عزّیٰ کے نام پر ایک خاکی رنگ کی بھیڑ ذبح کی تھی لیکن صاحب موصوف نے اسکی سند میں کوئی عربی ماخذ پیش نہیں کیا۔ واقہوسن کا حوالہ دیا ہے (دیکھو مارگولس کی کتاب صفحہ ۶۸ تا ۷۰) معجم البلدان (ایک جغرافیہ کی کتاب) میں ایک روایت اس مضمون کی موجود ہے لیکن (اولاً) تو اس موضوع خاص میں یہ کتاب خود بے سند ہے، ثانیاً یہ روایت ابن کلبی سے ہے جو مشہور دروغگو ہے۔

[1] ابن ہشام صفحہ ۷۶ میں قس بن ساعدۃ کے سوا باقی سب لوگوں کے نام اور حالات مذکور ہیں۔ زید کا ذکر بخاری میں بھی ہے۔ قس کا ذکر نہایت کثرت سے تمام تاریخوں اور ادب کی تاریخوں میں پایا جاتا ہے +

اور چونکہ حضرت خدیجہ رضؓ کے برادرِ عمِ زاد تھے اور مکہ ہی میں رہتے تھے، اس لیے قیاس ہوتا ہے کہ آپؐ اُن سے بھی ملے ہوں گے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ اُن سے آپؐ کی دوستی تھی +

ادب و محاضرات کی کتابوں میں عموماً اور بعض تاریخوں میں بھی مذکور ہے کہ قس بن ساعدۃ نے عکاظ میں جو مشہور خطبہ دیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس خطبہ میں شریک تھے۔ اس خطبے کا بڑا حصہ اکثر اہلِ ادب نے نقل کیا ہے اور چونکہ اس کے فقرے بظاہر قرآن مجید کی ابتدائی سورتوں کی طرح چھوٹے چھوٹے اور مقفیٰ ہیں، اس لیے عیسائی مؤرخین نے دعویٰ کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ طرز اُنہی سے لیا ہے۔ چنانچہ بعض فقرے یہ ہیں:

ایّھا الناس اسمعوا وعوا، واذا وعیتم فانتفعوا، انہ من عاش مات، ومن مات فات وکل ما ھو آت آت، مطر و نبات، و ارزاق و اقوات، و اٰباء و امّھات، و احیاء و اموات، وجمیع و اشتات، انّ فی السماء لخبرا، و ان فی الارض لعبرا، لیل داج، و سماء ذات ابراج، و بحار ذات امواج، مالی اری الناس یذھبون فلا یرجعون، ارضوا بالمقام فاقاموا، ام ترکوا ھناک فناموا، این من بنیٰ و شید، و زخرف و نجد، و عدّ المال و الولد، این من بغیٰ و طغیٰ +

قس بن ساعدۃ کی روایت اور اس کا خطبہ مختصر و مطول بہ عباراتِ مختلفہ، بغوی، ازدی، بیہقی، جاحظ وغیرہ نے نقل کیا ہے۔ لیکن وہ سرتاپا مصنوعی اور موضوع ہے۔ اس کے رواۃ عموماً ناقابلِ سند بلکہ کذاب ہیں۔ چنانچہ سیوطی نے موضوعات میں اس روایت کے تمام طریقوں کو نقل کرکے اُن کے رواۃ سے بحث

کی ہے، اور علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر وغیرہ کے اقوال تفصیل سے نقل کیے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ روایت مختلف طریقوں سے مروی ہے لیکن ہر طریقہ میں کوئی نہ کوئی راوی ایسا ہے جو موضوع حدیثیں بنایا کرتا تھا۔ اس کا ایک مشترک راوی محمد بن حجاج ہے، اس کی نسبت ابن معین کا قول ہے کہ "کذاب اور خبیث ہے۔" ابن عدی نے لکھا ہے کہ "ہریسہ کی حدیث اسی نے وضع کی ہے۔" ایک طریقہ کا راوی سعید بن ہبیرۃ ہے۔ اس کی نسبت ابن حبان نے لکھا ہے کہ "ثقہ لوگوں کی زبانی جھوٹی حدیثیں روایت کرتا تھا۔ یا تو خود وہ یہ حدیثیں تصنیف کرتا تھا، یا اور لوگ اس کے لیے بنادیا کرتے۔" ایک طریقہ کے راوی قاسم بن عبداللہ اور احمد بن سعید ہیں، اور یہ دونوں حدیث بنانے میں بدنام ہیں۔ بیہقی نے اس روایت کے متعلق ایک بڑا قصہ نقل کیا ہے، جس میں حضرت ابوبکر رضہ نے قس بن ساعدہ کا پورا خطبہ اپنی یاد سے بیان کیا ہے۔ یہ روایت پوری کی پوری موضوع ہے[1]۔ حافظ ابن حجر نے اس روایت کے اور طریقے بھی نقل کیے ہیں اور ان کی تضعیف کی ہے[2]۔

---

[1] یہ پوری تفصیل لآلی المصنوعۃ مطبوعۂ مصر صفحہ ۹۵ تا صفحہ ۱۰۰ میں ہے۔ [2] یہ ایک نکتہ یہاں خاص طور پر لحاظ رکھنے کے قابل ہے۔ بنوامیہ اور عباسیہ کے زمانہ میں یہ مذاق پیدا ہوگیا تھا کہ اپنے زمانہ کے شعرا اور فصحا سے اشعار اور خطبے تصنیف کراتے تھے، اور جاہلیت یا ابتدائے اسلام کے شعرا اور خطبا کے نام سے مشہور کرتے تھے۔ محمد بن اسحاق رتبہ کے شخص ہیں کہ امام بخاری نے جزء القرءۃ میں ان سے روایت کی ہے تاہم ان کا یہ عام طریقہ تھا، علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال (مطبوعہ مصر صفحہ ۹۲) میں خطیب بغدادی سے روایت کی ہے کہ محمد بن اسحاق شعرائے وقت کو مغازی کے واقعات دیا کرتے تھے کہ ان کے بارے میں اشعار کہہ دو، ان اشعار کو وہ اپنی کتاب میں شامل کر دیتے تھے۔ ابن ہشام میں حضرت خدیجہ رضہ، ابوبکر، امیہ بن ابی الصلت، ابوطالب کے سیکڑوں اشعار نقل کیے ہیں جن کی زبان اور انداز بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کی زبان نہیں ہے۔ ایک لطیف بات یہ ہے کہ ابن ہشام ان اشعار کو نقل کرکے اکثر موقعوں پر لکھ دیتے ہیں کہ فن شعر کے ماہر ان اشعار کی نسبت انکار کرتے ہیں مثلاً سریہ عبیدۃ بن الحرث میں (ابن ہشام جلد دوم صفحہ ۳

احباب خاص

نبوت سے پہلے جو لوگ آپؐ کے احباب خاص تھے، سب نہایت پاکیزہ اخلاق، بلند رتبہ اور عالی منزلت تھے۔ ان میں سب سے مقدم حضرت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۷) کر دیتے تھے' ابن ہشام میں حضرت خدیجہؓ، ابوبکرؓ، امیہ بن ابی الصلت، ابوطالب کے سیکڑوں اشعار نقل کیے ہیں، جن کی زبان اور انداز بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کی زبان نہیں ہے۔ ایک لطیف بات یہ ہے کہ ابن ہشام ان اشعار کو نقل کرکے اکثر موقعوں پر لکھ دیتے ہیں کہ فن شعر کے ماہران اشعار کی نسبت انکار کرتے ہیں۔ مثلاً سریۂ عبیدہ بن الحرث میں (ابن ہشام جلد دوم صفحہ ۳ مطبوعہ مصر) حضرت ابوبکرؓ کا ایک قصیدہ نقل کیا ہے اور لکھا ہے:

واکثر اھل العلم والشعر ینکرہ ھذہ القصیدۃ لابی بکر،	اور اکثر اہل علم اور فن شعر والے اس بات کے منکر ہیں کہ یہ قصیدہ حضرت ابوبکرؓ کا ہے۔

یہ وضاعی مختلف غرض سے کی جاتی تھی۔ زیادہ اس وجہ سے کہ ان خطبوں یا شعروں میں آنحضرتؐ کے مبعوث ہونے کی پیش گوئی یا اور کوئی بات اسلام کی تصدیق کی شامل کر دیتے تھے۔ مثلاً یہی قس بن ساعدہ کا خطبہ اس میں یہ فقرے بھی ہیں:

نبیًا قد حان حینہ واظلکم اوانہ فطوبی لمن امن بہ فھداہ وویل لمن خالفہ وعصاہ۔ (اللآلی المصنوعہ ص۲۸)	ایک پیغمبر کا زمانہ قریب آ گیا ہے سو اس کو مبارک ہے جو اس پر ایمان لائے گا اور وہ اس کو ہدایت کرے گا، اور تباہی ہے اس کے لیے جو اس کی مخالفت اور نافرمانی کرے گا۔

ابوطالب کے نام سے جو لامیہ قصیدہ ابن ہشام وغیرہ نے نقل کیا ہے (ابن ہشام صفحہ ۹۳ و ۹۴) سرتاپا موضوع ہے، اس کے خاتمہ کے اشعار یہ ہیں:

فاصبح فینا احمد فی ارومۃ — تقصر عنہ سورۃ المتطاول

فایدہ رب العباد بنصرہ — واظہر دینًا حقہ غیر باطل

(اس قصیدہ کو سرتاپا موضوع کہنے کے بجائے جیسا کہ مصنفؒ نے کہا ہے، اکثر کہنا صحیح ہے، کیونکہ اس کے دو شعر صحاح میں بھی مذکور ہیں۔ مثلاً صحیح بخاری و صحیح مسلم باب الاستسقاء
خود ابن اسحاق نے اس قصیدہ کو نقل کر کے لکھا ہے: ولبعض اھل العلم بالشعر

ابوبکرؓ تھے جو برسوں آپؐ کے شریکِ صحبت رہے[۵]۔ حضرت خدیجہؓ کے چچیرے بھائی حکیم بن حزام جو قریش کے نہایت معزز رئیس تھے، وہ بھی احباب خاص میں تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۸) ینکرا اکثرھا، یعنی بعض ماہرین شعراس کے اکثر اشعار کی صحت سے انکار کرتے ہیں، "س") اکثر لوگ یہ کرتے تھے کہ قرآن مجید میں توحید اور معاد کے متعلق جو باتیں ہیں، ان کے مطابق اشعار تصنیف کراتے تھے، اور سمجھتے تھے کہ اس سے اسلام کی تائید ہوگی۔ امیہ بن ابی الصلت کے نام سے جو اشعار منقول ہیں ان کو دیکھ کر صاف یقین ہوجاتا ہے کہ کسی نے قرآن مجید کو سامنے رکھ کر یہ اشعار کہے ہیں۔ مثلاً

فقلت لہٗ اذھب بھرون فادعوا   الی اللّٰہ فرعون الذی کان طاغیا

وقولا لہٗ انت رفعت ھٰذہٖ   بلا عمد ارفق اذا بک بانیا

وقولا لہٗ انت سوّیت وسطھا   منیرًا اذا ما جنہ اللیل ھادیا

ایک عجیب بات یہ ہے کہ مسٹر مارگولیس نے بھی ایک موقع پر اس کی تصدیق کی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں "قدیم شاعری کا اکثر حصہ قرآن کے اسلوب پر موزوں کیا گیا ہے"۔ (صفحہ ۲۰ تا صفحہ ۶۳) ان لوگوں نے اپنی دانست میں اسلام کی خیر خواہی کی غرض سے یہ کام کیا تھا۔ آج یورپ والے اسی سے یہ کام لیتے ہیں کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) پیغمبر نہ تھے بلکہ جاہلیت کے خطباء اور شعراء سے معتقدات اور خیالات بلکہ طرز ادا تک اخذ کرتے تھے لیکن ادب کا نکتہ شناس یا فن روایت کا ماہر بے تکلف سمجھ سکتا ہے کہ تمام شعار اور خطبے مصنوعی ہیں۔ یورپ کو فن ادب اور روایت میں مہارت کے لیے ابھی ایک زمانہ درکار ہے۔ اور جب وہ زمانہ آئے گا تو یورپ کو اپنی بدمذاقی پر خود شرم آئے گی۔

[۵] اصابہ ذکر حضرت ابوبکرؓ (حضرت ابوبکرؓ کا نام عبداللہ تھا۔ اصابہ میں اسی نام کے ذیل میں حضرت ابوبکرؓ کا حال لکھا ہے)۔

(جلد ۲ صفحہ ۳۴۱ "س")

حرم کا منصب رفادۃ انہی کے ہاتھ میں تھا۔ دار الندوہ کے بھی یہی مالک تھے۔ چنانچہ اسلام کے بعد امیر معاویہ رضؓ کے ہاتھ ایک لاکھ درہم پر بیچ ڈالا۔ لیکن یہ کل رقم خیرات کر دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عمر میں پانچ برس بڑے تھے[1]۔

اگرچہ یہ مدت تک یعنی ہجرت کے آٹھویں سال تک ایمان نہیں لائے، لیکن اس حالت میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہایت محبت رکھتے تھے۔ ایک دفعہ کعبہ میں ذو یزن کا اسباب نیلام ہوا تھا، اس میں ایک عمدہ حلّہ تھا، انھوں نے پچاس اشرفیوں میں اس کو خریدا اور مدینہ لے کر آئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نذر کریں۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں مشرکوں کا ہدیہ قبول نہیں کرتا، البتہ قیمت تو تو لے سکتا ہوں۔ مجبور ہو کر انھوں نے قیمت لینی گوارا کی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو لے لیا[2]۔

حضرت ضماد بن ثعلبہ، جو ازد کے قبیلے سے تھے، جاہلیت میں طبابت اور جرّاحی کا پیشہ کرتے تھے۔ یہ بھی احباب خاص میں تھے۔ نبوّت کے زمانے میں یہ مکہ آئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حالت میں دیکھا کہ راستہ میں جا رہے ہیں اور پیچھے لونڈوں کا غول ہے۔ مکہ کے کفّار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مجنون کہتے تھے۔ لونڈوں کا غول دیکھ کر ضماد نے یہی قیاس کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا، محمدؐ! میں جنون کا علاج کر سکتا ہوں۔ آپؐ نے حمد و ثنا کے بعد چند مؤثر جملے ادا کیے، ضماد مسلمان ہو گئے۔ اس واقعہ کو مختصراً مسلم و نسائی نے بھی لکھا ہے لیکن زیادہ تفصیل مسند امام احمد حنبل (جلد ا صفحہ ۳۰۲) میں ہے۔

---

[1] اصابہ ذکر حکیم بن حزام (جلد ا صفحہ ۳۴۹) "س"

[2] مسند امام حنبل جلد ۳ صفحہ ۴۰۳۔

جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تجارت کے کاروبار میں شریک تھے، ان میں سے ایک صاحب قیس بن سائب مخزومی تھے۔ مجاہد بن جبیر جو مشہور مفسر گزرے ہیں، انہی کے غلام تھے۔ ان کا بیان ہے کہ شرکار کے ساتھ آپؐ کا معاملہ نہایت صاف رہتا تھا، اور کبھی کوئی جھگڑا یا مناقشہ پیش نہیں آتا تھا۔[1]

---

[1] استیعاب (جلد ۲ صفحہ ۵۳۷) "س" و اصابہ۔

آفتابِ رسالت کا طلوع

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس زمانے میں پیدا ہوئے مکہ بت پرستی کا مرکزِ اعظم تھا۔ خود کعبہ میں تین سو ساٹھ بُت تھے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خاندان کا تمغاے امتیاز صرف اس قدر تھا کہ اس صنم کدہ کے متولی اور کلید بردار تھے۔ بااینہمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بُتوں کے آگے سر نہیں جھکایا۔ دیگر رسومِ جاہلیت میں بھی کبھی شرکت نہیں کی۔ قریش نے بھی اس بنا پر کہ ان کو عام لوگوں سے ہر بات میں ممتاز رہنا چاہیے، یہ قاعدہ قرار دیا تھا کہ ایامِ حج میں قریش کے لیے عرفات جانا ضرور نہیں، اور یہ کہ جو لوگ باہر سے آئیں، وہ قریش کا لباس اختیار کریں، ورنہ ان کو عریاں ہو کر کعبہ کا طواف کرنا ہوگا[1] چنانچہ اسی بنا پر طوافِ عریاں کا عام رواج ہوگیا تھا۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان باتوں میں کبھی اپنے خاندان کا ساتھ نہ دیا[2]۔

عرب میں افسانہ گوئی کا عام رواج تھا۔ راتوں کو لوگ تمام اشغال سے فارغ ہو کر کسی مقام میں جمع ہوتے تھے، ایک شخص جس کو اس فن میں کمال ہوتا تھا داستان شروع کرتا تھا۔ لوگ بڑے ذوق و شوق سے رات رات بھر سُنتے تھے۔ بچپن میں ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس جلسہ میں شریک ہونا چاہا تھا، لیکن

---

[1] ابن ہشام مطبوعۂ مصر ۱۲۹۵ھ جلد اول صفحہ ۶۷ [2] ابن ہشام صفحہ ۶۹۔

اتفاق سے راہ میں شادی کا کوئی جلسہ تھا، دیکھنے کے لیے کھڑے ہو گئے، وہیں نیند آ گئی، اُٹھے تو صبح ہو چکی تھی[۱]

ایک دفعہ اور ایسا ہی اتفاق ہوا، اُس دن بھی یہی اتفاق پیش آیا۔ چالیس برس کی مدت میں صرف دو دفعہ اس قسم کا ارادہ کیا، لیکن دونوں دفعہ توفیقِ الٰہی نے بچالیا۔ کہ "تیری شان ان مشاغل سے بالاتر ہے[۲]"

یہ فطرتِ سلیم اور نیک سرشتی کا اقتضا تھا، لیکن ایک شریعتِ کبرا ے کی تاسیس، ایک مذہب کامل کی تشیید اور رہنمائی کونین کے منصبِ عظیم کے لیے کچھ اور درکار تھا۔ اسی زمانہ کے قریب میں اور حق پرستوں (ورقہ، زید، عثمان بن حویرث) کے دل میں خیال آیا کہ جمادِ لایعقل کے آگے سر جھکانا حماقت ہے۔ چنانچہ سب مذہب حق کی تلاش کے لیے نکلے، لیکن ناکامی کی دیوار سے سر ٹکرا ٹکرا کر رہ گئے۔ ورقہ اور عثمان عیسائی ہو گئے، اور زید یہ کہتے کہتے مر گئے "اے خدا! اگر مجھ کو یہ معلوم ہوتا کہ تجھ کو کس طریقہ سے پوجنا چاہیے تو میں اُسی طریقہ سے تجھ کو پوجتا"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت سے دنیاوی تعلقات تھے۔ تجارت کا کاروبار تھا، متعدد اولادیں تھیں، تجارت کی ضرورت سے اکثر سفر کرنا پڑتا تھا، لیکن دستِ قدرت کو جو کام لینا تھا وہ ان مشاغل سے بالاتر تھا۔ دنیا اور دنیا کے تمام کام آپؐ کو ہیچ نظر آتے تھے، تاہم مطلوبِ حقیقی کا اب تک پتہ نہ تھا۔

---

[۱] بزار و مستدرک بحوالہ نسیم الریاض ج اوّل صفحہ ۶۰۹ و خصائص کبریٰ ج اوّل صفحہ ۸۸ "س"

[۲] سر ولیم میور صاحب "لائف آف محمد صلی اللہ علیہ وسلم" میں لکھتے ہیں "ہماری تمام تصنیفات محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارہ میں ان کے چال چلن کی عصمت اور ان کی پاکیزگی پر جو اہل مکہ میں کمیاب تھی، متفق ہیں"

مکہ معظمہ سے تین میل پر ایک غار تھا جس کو حرا کہتے ہیں، آپؐ مہینوں وہاں جا کر قیام فرماتے اور مراقبہ کرتے، کھانے پینے کا سامان ساتھ لے جاتے، وہ ہو چکتا تو پھر گھر پر تشریف لاتے، اور پھر واپس جا کر مراقبہ میں مصروف ہوتے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ غارِ حرا میں آپؐ تحنث یعنی عبادت کیا کرتے تھے۔ یہ عبادت کیا تھی؟ عینی شرح بخاری میں ہے:

قیل ما کان صفۃ تعبدہ	یہ سوال کیا گیا کہ آپؐ کی عبادت کیا
اجیب بان ذلک بالتفکر	تھی؟ جواب یہ ہے کہ غور و فکر
الاعتبار۔	اور عبرت پذیری۔

یہ وہی عبادت تھی جو آپ کے دادا ابراہیم علیہ السلام نے نبوت سے پہلے کی تھی۔ ستاروں کو دیکھا تو چونکہ تجلی کی جھلک تھی، دھوکا ہوا۔ چاند نکلا تو اور بھی شبہہ ہوا، آفتاب پر اس سے زیادہ، لیکن جب سب نظروں سے غائب ہو گئے تو بے ساختہ پکار اٹھے:

لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ......	میں فانی چیزوں کو نہیں چاہتا۔
اِنِّىْ وَجَّهْتُ وَجْهِىَ لِلَّذِىْ	میں اپنا منہ اس کی طرف کرتا ہوں
فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (انعام)	جس نے زمین و آسمان پیدا کیا۔

ایک مغربی مؤرخ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس عبادت کی کیفیت اس طرح ادا کی ہے:

"سفر و حضر میں ہر جگہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دل میں ہزاروں سوال پیدا ہوتے تھے، میں کیا ہوں؟ یہ غیر متناہی عالم کیا ہے؟ نبوت کیا شے ہے؟ میں کن چیزوں کا اعتقاد کروں؟ کیا کوہِ حرا کی چٹانیں، کوہ طور کی سر بفلک چوٹیاں، کھنڈر اور میدان، کسی نے ان سوالوں کا جواب دیا؟ نہیں

ہرگز نہیں، بلکہ گنبد گرداں، گردش لیل و نہار، چمکتے ہوئے ستارے، برستے ہوئے بادل، کوئی ان سوالوں کا جواب نہ دے سکا۔"[1]

نبوت کا یہ دیباچہ تھا کہ خواب میں آپؐ پر اسرار منکشف ہونے شروع ہوئے، جو کچھ آپؐ خواب میں دیکھتے تھے، بعینہٖ وہی پیش آتا تھا۔[2] ایک دن جب کہ آپؐ حسب معمول غارِ حرا میں مراقبہ میں مصروف تھے، فرشتۂ غیب نظر آیا کہ آپؐ سے کہہ رہا ہے:

اِقْرَءْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَءْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۝ (اقرء)	پڑھ اُس خدا کا نام جس نے کائنات کو پیدا کیا، جس نے آدمی کو گوشت کے لوتھڑے سے پیدا کیا، پڑھ تیرا خدا اکریم ہے جس نے انسان کو قلم کے ذریعے سے علم سکھایا، وہ جس نے انسان کو وہ باتیں سکھائیں جو اُسے معلوم نہ تھیں۔

آپ گھر واپس تشریف لائے تو جلالِ الٰہی سے لبریز تھے۔[3]

---

[1] کارلائل ہیروز۔ تذکرۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم [2] وحی کے انواع میں سے ایک خواب بھی ہے۔ صحیح بخاری کے شروع میں ہے اوّل ما بدء بہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من الوحی الرؤیا الصالحۃ فی النوم۔ بخاری کتاب التعبیر میں زیادہ صاف طریقہ پر یہ مسئلہ ادا کیا گیا ہے۔ [3] صحیح بخاری باب بدء الوحی و کتاب التعبیر، یہ روایت حضرت عائشہؓ سے مروی ہے، لیکن حضرت عائشہؓ اس وقت تک پیدا نہیں ہوئی تھیں۔ محدثین کی اصطلاح میں ایسی روایت کو مُرسل کہتے ہیں۔ لیکن صحابہ کا مرسل محدثین کے نزدیک قابلِ حجت ہے، کیونکہ متروک راوی بھی صحابہؓ ہی ہوں گے۔

آپؐ نے حضرت خدیجہؓ سے تمام واقعہ بیان کیا۔ وہ آپؐ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لواگئیں، جو عبری زبان جانتے تھے، اور توریت و انجیل کے ماہر تھے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے واقعہ کی کیفیت سُنی تو کہا کہ یہ وہی ناموس ہے جو موسیٰؑ پر اُترا تھا۔

روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ڈر پیدا ہُوا! حضرت خدیجہؓ نے کہا کہ "آپ متردّد نہ ہوں، خُدا آپؐ کا ساتھ نہ چھوڑے گا۔" پھر وہ آپؐ کو ورقہ کے پاس لواگئیں، اُنھوں نے آپؐ کی نبوّت کی تصدیق کی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بے شبہ یہ الفاظ نکلے "مجھ کو ڈر ہے" لیکن یہ تردّد، یہ ہیبت، یہ اضطراب، جلالِ الٰہی کا تاثر، اور نبوّت کے بارگراں کی عظمت کا تخیل تھا۔ آپؐ نے کیا دیکھا؟ ناموسِ اعظم نے کیا کہا؟ کیا کیا مشاہدات ہُوئے؟ یہ وہ نازک باتیں ہیں جو الفاظ کا تحمل نہیں کرسکتیں۔

صحیح بخاری باب التعبیر میں ہے کہ چند روز تک جب وحی رُک گئی، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جاتے تھے کہ اپنے آپؐ کو گرادیں۔ دفعۃً حضرت جبرئیل نظر آتے تھے، اور کہتے تھے، "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم واقعی خدا کے پیغمبر ہو۔" اس سے آپؐ کو اُس وقت تسکین ہوجاتی تھی، لیکن پھر وحی کچھ دنوں کے لیے رُک جاتی تھی تو پھر آپ کسی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر اپنے آپ کو گرادینا چاہتے تھے اور پھر حضرت جبرئیل نمایاں ہوکر تسکین دیتے کہ آپؐ واقعی خُدا کے پیغمبر ہیں۔

حافظ ابنِ حجر نے اسی حدیث کے حصّہ اوّل کی شرح میں معترضین کا یہ اعتراض نقل کیا ہے کہ "ایک پیغمبر کو نبوّت میں کیونکر شک ہوسکتا ہے، اور ہو تو کسی عیسائی کے تسکین دینے سے کیا تسکین ہوسکتی ہے۔" پھر ایک مشہور

محدث کا یہ جواب نقل کیا ہے کہ "نبوت ایک امرِ عظیم ہے، اس کا تحمل دفعۃً نہیں ہو سکتا۔ اس لیے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب کے ذریعے سے مانوس کیا گیا، پھر دفعۃً فرشتہ نظر آیا تو آپ اقتضائے بشریت سے خوفزدہ ہو گئے۔ حضرت خدیجہ رضؓ نے آپ کو تسکین دی، پھر جب ورقہ نے تصدیق کی تو آپؐ کو یقین ہو گیا۔ محدث مذکور کے الفاظ یہ ہیں:

فَلَمَّا سَمِعَ کَلَامَہٗ ایقن بالحق واعترف بہ۔ — جب آپؐ نے ورقہ کا کلام سُنا تو آپؐ کو حق کا یقین آگیا اور آپ نے اس کا اعتراف کیا۔

محدث مذکور اس کے بعد لکھتے ہیں کہ "وحی بار بار اس لیے رُک جاتی تھی کہ آپؐ رفتہ رفتہ اس کے برداشت کرنے کے قابل ہو جائیں۔"[۵]

لیکن جب کہ ترمذی میں یہ حدیث موجود ہے کہ نبوت سے پہلے سفرِ شام میں (بمقام بصریٰ) جس درخت کے نیچے آپ بیٹھے تھے، اس کی تمام شاخیں آپؐ پر جھک آئیں جس سے بحیرا نے آپؐ کے نبی ہونے کا یقین کیا۔ جب کہ صحیح مسلم میں یہ حدیث ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں اس پتھر کو پہچانتا ہوں جو نبوت سے پہلے مجھ کو سلام کیا کرتا تھا۔" جب کہ صحاح میں موجود ہے کہ "نبوت سے پہلے فرشتوں نے آپؐ کا سینہ چاک کیا اور جسمانی آلائش نکال کر پھینک دی۔" تو خود ان روایتوں کے روایت کرنے والے کیونکر یہ کہہ سکتے ہیں کہ فرشتے کا نظر آنا ایسا واقعہ تھا جس سے آپؐ اس قدر خوفزدہ ہو جاتے تھے کہ ایک دفعہ تسکین ہو کر بھی بار بار اضطراب ہوتا تھا، اور آپؐ اپنے آپ کو پہاڑ پر سے گرا دینے کا ارادہ کرتے تھے اور بار بار حضرت جبرئیل کو اطمینان دلانے کی ضرورت

---

[۵] فتح الباری شرح صحیح بخاری کتاب التعبیر جلد ۱۲ صفحہ ۳۱۰، مطبوعۂ مصر۔

ہوتی تھی، کیا اور کسی پیغمبر کو بھی ابتدائے وحی میں کبھی شک ہوا تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے درخت سے آواز سُنی "کہ میں خدا ہوں" تو کیا اُن کو کوئی شبہہ پیدا ہوا؟

حافظ ابنِ حجر وغیرہ کی پیروی کرنے کی ہم کو ضرورت نہیں، ہم کو پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ خود اصل روایت بہ سند مرفوع متصل ہے یا نہیں، یہ روایت امام زہری کے بلاغات میں سے ہے، یعنی سند کا سلسلہ زہری تک ختم ہو جاتا ہے اور آگے نہیں بڑھتا۔ چنانچہ خود شارحینِ بخاری نے تصریح کر دی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایسے عظیم الشان واقعہ کے لیے سند مقطوع کافی نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب فرضِ نبوت ادا کرنا چاہا تو سخت مشکلیں پیشِ نظر تھیں۔ اگر آپؐ کا فرض اسی قدر ہوتا کہ مسیح علیہ السلام کی طرح صرف تبلیغ دعوت پر اکتفا فرمائیں یا حضرت کلیمؑ کی طرح اپنی قوم کو لے کر مصر سے نکل جائیں، تو مشکل نہ تھی لیکن خاتمِ انبیا صلی اللہ علیہ وسلم کا کام خود سلامت رہ کر عرب اور نہ صرف عرب بلکہ تمام عالم کو فروغِ اسلام سے منور کر دینا تھا۔ اس لیے نہایت تدبیر اور تدریج سے کام لینا پڑا۔ سب سے پہلا مرحلہ یہ تھا کہ یہ پُر خطر راز پہلے اُن کے سامنے پیش کیا جائے۔ اس کے لیے صرف وہ لوگ انتخاب کیے جا سکتے تھے، جو فیضیابِ صحبت رہ چکے تھے، جن کو آپؐ کے اخلاق و عادات کی ایک ایک حرکات و سکنات کا تجربہ ہو چکا ہو چکا تھا، جو پچھلے تجربوں کی بنا پر آپؐ کے صدقِ دعویٰ کا قطعی فیصلہ کر سکتے تھے۔ یہ لوگ حضرت خدیجہؓ آپؐ کی حرمِ محترم تھیں۔ حضرت علیؓ تھے جو آپؐ کی آغوشِ تربیت میں پلے تھے۔ زیدؓ تھے جو آپ کے آزاد کردہ غلام اور بندۂ خاص تھے۔ حضرت ابو بکرؓ تھے جو برسوں[1] سے فیضیابِ خدمت تھے۔ سب سے پہلے

---

[1] اصابہ فی احوال الصحابہ میں بزرگانِ موصوف کا تذکرہ ملاحظہ کرنا چاہیے۔

پہلے آپؐ نے حضرت خدیجہ رضؓ کو یہ پیغام سُنایا۔ وہ سُننے سے پہلے مومن تھیں، پھر اور بزرگوں کی باری آئی، اور سب ہمہ تن اعتقاد تھے۔

حضرت ابو بکر رضؓ دولتمند، ماہرِ انساب، صاحب الرائے اور فیاض تھے ابنِ سعد نے لکھا ہے کہ جب وہ ایمان لائے تو ان کے پاس چالیس ہزار درہم تھے۔ غرض ان اوصاف کی وجہ سے مکہ میں ان کا عام اثر تھا، اور معززین شہر ان سے ہر بات میں مشورہ لیتے تھے۔ اربابِ روایت کا بیان ہے کہ کبارِ صحابہ رضؓ میں سے حضرت عثمان رضؓ، حضرت زبیر رضؓ، حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف، حضرت سعد بن ابی وقاص فاتح ایران، حضرت طلحہ رضؓ سب انہی کی ترغیب اور ہدایت سے اسلام لائے۔[1] ان کی وجہ سے یہ چرچا چپکے چپکے اور لوگوں میں بھی پھیلا، اور مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان سابقینِ اوّلین میں عمار رضؓ، خبابؓ بن الارت، حضرت عثمان رضؓ، عبدالرحمنؓ ابن عوف، حضرت سعد رضؓ بن ابی وقاص، طلحہ رضؓ، ارقم رضؓ، سعیدؓ بن زید، عبداللہؓ بن مسعود، عثمان رضؓ بن مظعون، عبیدہ رضؓ صہیب رضؓ رومی زیادہ ممتاز ہیں۔

لیکن جو کچھ ہُوا پوشیدہ طور پر ہُوا۔ نہایت احتیاط کی جاتی تھی کہ محرمانِ خاص کے سوا کسی کو خبر نہ ہونے پائے۔ نماز کا جب وقت آتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی پہاڑ کی گھاٹی میں چلے جاتے اور وہاں نماز ادا کرتے۔ ابن الاثیر کا بیان ہے کہ چاشت کی نماز آپؐ حرم ہی میں ادا کرتے تھے، کیونکہ یہ نماز قریش کے مذہب میں بھی جائز تھی۔[2] ایک دفعہ آپؐ حضرت علیؓ کے ساتھ کسی درہ میں نماز پڑھ رہے تھے،

---

[1] دیکھو ریاض النضرۃ لمحب الطبری مطبوعہ مصر صفحہ ۵۷۔

[2] (کامل ابن اثیر ج ۲ صفحہ ۲۱ ذکر الاختلاف فی اوّل من اسلم) "س"

اتفاق سے آپؐ کے چچا ابوطالب آنکلے، اُن کو اس جدید طریقۂ عبادت پر تعجب ہوا کھڑے ہو گئے اور بغور دیکھتے رہے۔ نماز کے بعد پوچھا کہ یہ کون دین ہے؟ آپؐ نے فرمایا ہمارے دادا ابراہیمؑ کا یہی دین تھا۔ ابوطالب نے کہا میں اس دین کو اختیار تو نہیں کر سکتا لیکن تم کو اجازت ہے اور کوئی شخص تمہارا مزاحم نہ ہو سکے گا۔

یہ تاریخ اسلام کا ایک بڑا اہم مسئلہ ہے کہ اسلام کیونکر پھیلا؟ مخالفین نے اس کا ذریعہ تلوار بتایا ہے۔ اس مسئلے پر مفصل بحث کتاب کے دوسرے حصوں میں آئے گی، لیکن ایک خاص پہلو پر یہیں نگاہ ڈال لینی چاہیے۔ یعنی یہ کہ اوائل اسلام میں جب کہ اسلام لانا جان و مال سے ہاتھ دھونا تھا، کون لوگ اور کس قسم کے لوگ ایمان لائے؟

اس زمانہ میں جو لوگ اسلام لائے ان میں چند خصائص مشترک تھے، اسی قسم کے لیکن بالعکس مشترک خصائص اُن لوگوں میں بھی پائے جاتے تھے، جنھوں نے شدت سے مخالفت کی، چنانچہ تفصیل آگے آتی ہے۔

(۱) اکثر وہ لوگ اسلام لائے جو پہلے سے تلاش حق میں سرگرداں اور فطرۃً نیک طبع اور پاکیزہ اخلاق تھے۔ مثلاً حضرت ابوبکرؓ جاہلیت میں بھی عفیف، پارسا، اور صدق و دیانت میں مشہور تھے۔ عثمانؓ بن مظعون صوفی مزاج تھے اور اسلام سے پہلے شراب چھوڑ چکے تھے۔ اسلام کے بعد چاہتے تھے کہ راہب بن جائیں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا۔ صہیبؓ عبداللہ بن جدعان کے تربیت یافتہ تھے جو اسلام سے پہلے تارک شراب ہو کر وفات پا چکے تھے۔ حضرت ابوذرؓ غفاری کا اسلام لانے والوں میں چھٹا یا ساتواں نمبر تھا، ان کے اسلام لانے کا واقعہ یہ ہے کہ وہ پہلے سے بت پرستی چھوڑ چکے تھے اور غیر متعین طریقہ سے جس طرح ان کے ذہن میں آتا خدا کا نام لیتے تھے اور نماز پڑھتے تھے۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حال سنا تو اپنے بھائی کو بھیجا کہ صحیح خبر لائیں، وہ مکہ میں آئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر قرآن مجید کی سورتیں سنیں، واپس جا کر ابوذر سے کہا کہ "میں نے ایک شخص کو دیکھا جس کو لوگ مرتد کہتے ہیں، وہ مکارم اخلاق سکھاتا ہے، اور جو کلام سناتا ہے وہ شعر نہیں کوئی اور چیز ہے، تمہارا طریقہ اس سے بہت ملتا جلتا ہے۔" ابوذر رض کو تسکین نہیں ہوئی۔ خود مکہ میں آئے، زبان مبارک سے آپ کا ارشاد سنا اور اسلام قبول کر لیا۔ وہ تمام عمر دنیاوی تعلقات سے الگ رہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ مسلمان کے لیے زر و مال کا جمع کرنا جائز نہیں، چنانچہ اسی بنا پر حضرت عثمان رض نے اپنے زمانہ میں ان کو مدینہ سے دور بھیج دیا تھا۔[1]

(۲) بعض صحابہ رض ایسے تھے جو احناف کے تربیت یافتہ تھے۔ یعنی وہ لوگ جو زمانۂ اسلام سے پہلے بت پرستی ترک کر چکے تھے اور اپنے آپ کو حضرت ابراہیم کا پیرو کہتے تھے، لیکن اس اجمالی اعتقاد کے سوا اور کچھ نہیں جانتے تھے، اور اسی لیے تلاش حق میں سرگرداں تھے۔ انہی میں زید بھی تھے، جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ انھوں نے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پانچ برس پہلے وفات پائی۔ لیکن ان کے صاحبزادے سعید موجود تھے۔ وہ باپ کے ارشادات سن چکے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے تو ان کو وہ رہنما ہاتھ آ گیا جس کی جستجو میں ان کے باپ دنیا سے چلے گئے، اور ابتک سرگشتہ تھے۔

(۳) یہ امر سب میں مشترک تھا کہ یہ لوگ قریش کے مناصب اعظم میں سے

۱؎ حضرت ابوذر رض کے اسلام لانے کا واقعہ بخاری و مسلم دونوں میں مذکور ہے لیکن باہم اختلاف ہے۔ میں نے دونوں سے کچھ کچھ لیا ہے۔ لیکن اختصار کے لحاظ سے بہت سی باتیں چھوڑ دیں۔

کوئی منصب نہیں رکھتے تھے، بلکہ اکثر ایسے تھے، مثلاً عمار رض، خباب رض، ابو فکیہہ رض، صہیب رض وغیرہ جن کو دولت وجاہ کے دربار میں جگہ بھی نہیں مل سکتی تھی۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کو لے کر حرم میں جاتے تو رؤسائے قریش ہنس کر کہتے:

اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا۔ (انعام-۱)	یہی وہ لوگ ہیں جن پر خدا نے ہم لوگوں کو چھوڑ کر احسان کیا ہے۔

کفار کے نزدیک اُن کا افلاس اُن کی تحقیر کا سبب تھا۔ لیکن یہی چیز تھی جس کی وجہ سے ایمان کی دولت سب سے پہلے ان ہی کے ہاتھ آسکتی تھی، دولت و مال، ان کے دلوں کو سیاہ نہیں کر چکا تھا، فخر و غرور ان کو انقیادِ حق سے روک نہیں سکتا تھا۔ ان کو یہ ڈر نہ تھا کہ اگر بُت پرستی چھوڑ دیں گے تو کعبہ کا کوئی منصب عظیم ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ غرض اُن کے دل ہر قسم کے رنگ سے پاک تھے اور حق کی شعاعیں اُن پر دفعتہً پرتو افگن ہوسکتی تھیں یہی سبب ہے کہ انبیاءؑ کے ابتدائی پیرو ہمیشہ مفلس اور نادار لوگ ہوتے ہیں۔ عیسائیت کے ارکانِ اوّلین ماہی گیر تھے۔ حضرت نوحؑ کے مقربین خاص کی نسبت کفار کو علانیہ کہنا پڑا:

وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۢ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ۔ (ہود)	اور ہم تو بظاہر یہ دیکھتے ہیں کہ تیری پیروی انہی لوگوں نے کی جو رذیل ہیں اور ہم تو تم میں کوئی برتری نہیں پاتے بلکہ ہمارا تو یہ خیال ہے کہ تم سب جھوٹے ہو۔

یہ سابقینِ اسلام جس قسم کا راسخ ایمان لائے تھے اس کی تفصیل آگے آتی ہے، جس سے ظاہر ہوگا کہ قریش کی سخت خونخواریاں، جور و ظلم کے شدائد، دولت و مال کی

انتہائی ترغیبیں، کوئی چیزان کو متزلزل نہ کر سکی۔ اور آخر انہی کمزور ہاتھوں نے قیصر و کسریٰ کا تخت اُلٹ دیا۔

تین برس تک آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نہایت رازداری کے ساتھ فرض تبلیغ ادا کیا، لیکن آفتاب رسالت بلند ہو چکا تھا، صاف حکم آیا:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (حجر) اور تجھ کو جو حکم دیا گیا ہے واشگاف کہ دے،

اور نیز حکم آیا:

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ اور اپنے نزدیک کے خاندان والوں کو خدا سے ڈرا (شعراء - ۱۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہِ صفا پر چڑھ کر پکارا یا معشر قریش! لوگ جمع ہوئے تو آپؐ نے فرمایا کہ "اگر میں تم سے یہ کہوں کہ پہاڑ کے عقب سے ایک لشکر آ رہا ہے، تو تم کو یقین آئے گا؟" سب نے کہا "ہاں، کیونکہ تم کو ہمیشہ سے سچ بولتے دیکھا ہے"! آپؐ نے فرمایا "تو مَیں یہ کہتا ہوں کہ اگر تم ایمان نہ لاؤ گے تو تم پر عذاب شدید نازل ہوگا"! یہ سُن کر سب لوگ جن میں ابولہب آپؐ کا چچا بھی تھا، سخت برہم ہو کر چلے گئے۔ (صحیح بخاری ج ۲، صفحہ ۷۰۲)

چند روز کے بعد آپ نے حضرت علی رضؓ سے کہا کہ دعوت کا سامان کرو۔ یہ درحقیقت تبلیغ اسلام کا پہلا موقع تھا، تمام خاندانِ عبدالمطلب مدعو کیا گیا، حمزہؓ، ابوطالبؓ، عباسؓ سب شریک تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے کے بعد کھڑے ہو کر فرمایا کہ "مَیں وہ چیز لے کر آیا ہوں جو دین اور دُنیا دونوں کو کفیل ہے۔ اس بارگراں کے اُٹھانے میں کون میرا ساتھ دے گا"؟ تمام مجلس میں سناٹا تھا، دفعۃً حضرت علی رضؓ نے اُٹھ کر کہا "گو مجھ کو آشوب چشم ہے، گو میری ٹانگیں پتلی ہیں، اور گو مَیں سب سے کم عمر ہوں، تاہم مَیں آپؐ کا

ساتھ دوں گا۔[1]

قریش کے لیے یہ ایک حیرت انگیز منظر تھا کہ وہ شخص (جن میں ایک سیزدہ سالہ نوجوان ہے) دنیا کی قسمت کا فیصلہ کر رہے ہیں۔ حاضرین کو بے ساختہ ہنسی آگئی لیکن آگے چل کر زمانہ نے بتا دیا کہ سراپا سچ تھا۔

اب مسلمانوں کی ایک معتدبہ جماعت تیار ہوگئی تھی جن کی تعداد چالیس سے زیادہ تھی، آپؐ نے حرم کعبہ میں جا کر توحید کا اعلان کیا۔ کفار کے نزدیک یہ حرم کی سب سے بڑی توہین تھی، اس لیے دفعۃً ایک ہنگامہ برپا ہوگیا، اور ہر طرف سے لوگ آپؐ پر ٹوٹ پڑے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ربیب حضرت حارث رضی اللہ عنہ بن ابی ہالہ گھر میں تھے، ان کو خبر ہوئی، دوڑے ہوئے آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بچانا چاہا، لیکن ہر طرف سے ان پر تلواریں پڑیں اور وہ شہید ہوگئے۔ اسلام کی راہ میں یہ پہلا خون تھا جس سے زمین رنگین ہوئی۔[2]

قریش کی مخالفت اور اس کے اسباب

مکہ کی جو عزت تھی کعبہ کی وجہ سے تھی۔ قریش کا خاندان جو تمام عرب پر مذہبی حکومت رکھتا تھا، اور جس کی وجہ سے وہ ہمسایگان خدا بلکہ آل اللہ یعنی خاندان الٰہی کہلاتے تھے۔ اس کی صرف یہ وجہ تھی کہ وہ کعبہ کے مجاور اور کلید بردار تھے۔ اس تعلق سے قریش کا کاروبار زیادہ پھیلتا گیا، یہاں تک کہ متعدد محکمے اور بڑے بڑے مناصب

---

[1] طبری نے تاریخ ج ۳ صفحہ ۱۱۷۱ اور تفسیر ج ۱۹ صفحہ ۶۸ میں عبدالغفار بن قاسم اور منہال بن عمرو کے واسطہ سے اس کو روایت کیا ہے۔ پہلا شیعی اور متروک ہے اور دوسرا بد مذہب اس روایت میں اور بھی وجوہ ضعف بلکہ وجوہ وضع ہیں۔ "س"

[2] اصابہ فی احوال الصحابہ ذکر حارث رضی اللہ عنہ ابن ابی ہالہ۔

قائم کیے گئے تھے جن کی تفصیل یہ ہے:-

منصب	منصب کی تفصیل	کس خاندان کو کون کون منصب حاصل تھا	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کون لوگ ان مناصب پر ممتاز تھے
حجابۃ	کعبہ کی کلید برداری اور تولیت		عثمان بن طلحہ
رفادہ	غریب حجاج کی خبر گیری	خاندان نوفل	حرث بن عامر
سقایۃ	حجاج کے پانی پلانے کا انتظام	خاندان ہاشم	حضرت عباس
مشورہ		خاندان اسد	یزید بن ربیعۃ الاسود
دیات و مغارم	خون بہا کا فیصلہ کرنا	خاندان تیم	حضرت ابوبکرؓ
عقاب	عَلَم برداری	خاندان امیہ	ابوسفیان
قبہ	خیمہ و خرگاہ کا انتظام اور سواروں کی افسری۔	خاندان مخزوم	ولید بن مغیرہ
سفارت	سفیر ہو کر جانا اور جن قبیلوں میں		
منافرت	یہ نزاع پیش آئے کہ شریف ترکون ہے، اس کا فیصلہ کرنا۔	خاندان عدی	حضرت عمرؓ
ازلام و ایسار	محکمہ فال کا انتظام	خاندان جمح	صفوان بن اُمیہ
اموال	مہتمم خزانہ	خاندان سہم	حرث بن قیس

لہ یہ تمام تفصیل عقد الفرید جلد دوم صفحہ ۱۱۳ میں ہے۔

آغازِ اسلام میں جو لوگ قریش کے رؤسائے اعظم تھے اور جن کی عظمت و اقتدار کا اثر تمام مکہ پر تھا، ان کے نام یہ ہیں:

ابوسفیان بن حرب (حضرت معاویہؓ کے باپ	حرب فجار میں انہی کا باپ قریش کا سپہ سالار
ابولہب (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا)	
ابوجہل	ولید بن مغیرہ کا بھتیجا اور اپنے قبیلہ کا سردار،
ولید بن مغیرہ (حضرت خالدؓ کا باپ)	قریش کا رئیسِ اعظم تھا۔
عاص بن وائل سہمی (حضرت عمروؓ بن العاص کا باپ۔	نہایت دولتمند، کثیر الاولاد اور صاحبِ اثر تھا۔
عتبہ بن ربیعہ (امیر معاویہ کا نانا)	نہایت شریف الطبع اور صاحبِ ریاست تھا۔

اِن کے سوا، اسود بن مطلب، اسود بن عبدیغوث، نضر بن الحرث بن کلدہ، اخنس بن شریق ثقفی، ابی بن خلف، عقبہ بن ابی معیط صاحبِ اثر تسلیم کیے جاتے تھے۔

اس موقع پر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ خاندانِ ہاشم اور بنو امیہ برابر کے حریف تھے، اور دونوں میں مُدت سے رشک و رقابت چلی آتی تھی۔

پہلا سبب ناتربیت یافتہ اور تُندخُو قوموں کا خاصہ ہے کہ کوئی تحریک جو اُن کے آبائی رسم و عقائد کے خلاف ہو، اُن کو سخت برہم کر دیتی ہے۔ اس کے ساتھ اُن کی مخالفت محض زبانی مخالفت نہیں ہوتی، اور اُن کی تشنگیٔ انتقام کو

خون کے سوا کوئی چیز بجھا نہیں سکتی۔ آج ہندوستان اس قدر مہذب ہو گیا ہے، لیکن اب بھی کسی عام مسئلہ مذہبی کی مخالفت کی جائے تو ایک حشر برپا ہو جاتا ہے، اور حکومتِ موجودہ اگر منتظم اور صاحبِ جبروت نہ ہوتی تو اس زمین پر بارہا خون کا بادل برس چکا تھا۔

عرب ایک مدّت سے بُت پرستی میں مبتلا تھا۔ خلیلِ بُت شکن کی یادگار (کعبہ) تین سو ساٹھ (۳۶۰) معبودوں سے مزیّن تھی، جن میں ہُبل سب سے بڑا دیوتا تھا، یہی بت ہر قسم کے خیر و شر کے مالک سمجھے جاتے تھے۔ پانی برساتے تھے، اولادیں دیتے تھے، معرکہ ہائے جنگ میں فتحیں دلاتے تھے۔ خدا، یا تو سرے سے نہ تھا، یا تھا تو وجود معطل تھا۔

دوسرا سبب اسلام کا اصل فرض اس طلسم کو دفعۃً برباد کر دینا تھا، لیکن اس کے ساتھ قریش کی عظمت و اقتدار اور عالمگیر اثر کا بھی خاتمہ تھا۔ اس لیے قریش کی عظمت و اقتدار اور عالمگیر اثر کا بھی خاتمہ تھا، اس لیے قریش نے شدت سے مخالفت کی، اور ان میں جن لوگوں کو جس قدر زیادہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا، اُسی قدر مخالفت میں زیادہ سرگرم تھے۔

قریش کا رئیس اعظم حرب بن اُمیّہ تھا۔ چنانچہ حربِ فجار میں وہی سپہ سالارِ اعظم تھا۔ لیکن حرب کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا ابوسفیان اس منصبِ عظیم کے حاصل کرنے کی قابلیت نہیں رکھتا تھا۔ اس لیے ولید بن المغیرہ نے اپنی لیاقت اور اثر سے ریاست حاصل کی، ابوجہل اس کا بھتیجا تھا اور وہ بھی قریش میں امتیاز رکھتا تھا۔

ابوسفیان گو اپنے باپ کا منصب نہ حاصل کر سکا لیکن بنو اُمیّہ کے خاندان کا سردار وہی تھا۔ خاندانِ ہاشم میں سب سے زیادہ کبیر السن ابولہب

تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی چچا تھا۔

قبیلہ سہم میں سب سے زیادہ با اثر عاص بن وائل تھا جو نہایت دولتمند اور کثیر الاولاد تھا۔

قریش کی عنانِ حکومت انہی روٗسا کے ہاتھ میں تھی، اور یہی لوگ تھے جنہوں نے اسلام کی سخت مخالفت کی۔ قریش کے دیگر اکابر مثلاً اسود بن مطلب، اسود بن عبد یغوث، نضر بن الحرث، امیہ بن خلف، عقبہ بن ابی معیط انہی لوگوں کے زیرِ اثر تھے، اور اس وجہ سے حالاتِ اسلام میں ان کے نام ہر جگہ نمایاں نظر آتے ہیں۔

قریش کا یہ خیال تھا کہ نبوت کا منصب اعظم اگر کسی کو ملتا تو مکہ یا طائف کے کسی رئیس کو ملتا۔

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هَٰذَا الْقُرْآنُ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ (زخرف۔۳) اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کو اترنا تھا تو ان دو شہروں (مکہ و طائف) میں سے کسی رئیسِ اعظم پر اترتا (یعنی ولید بن ربیعہ یا ابو مسعود ثقفی)

عرب میں ریاست کے لیے دولت اور اولاد سب سے پہلی اور سب سے ضروری شرط تھی۔ اولاد کی نسبت اکثر وحشی قوموں میں (ہندوستان میں بھی) یہ خیال ہے کہ جو شخص صاحبِ اولاد نہ ہو، وہ عالمِ آخرت کی برکات سے محروم رہتا ہے ہندوؤں میں بھی یہ خیال ہے کہ اولاد کے بغیر انسان کو پوری نجات نہیں مل سکتی۔

قریش میں اوصافِ مذکورہ کے لحاظ سے جو لوگ ریاست کا استحقاق رکھتے تھے وہ ولید بن المغیرہ، امیہ بن خلف، عاص بن وائل سہمی، اور ابو مسعود

تقفی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اوصاف سے بالکل خالی تھے۔ دولت کے غبار سے آپ کا دامن پاک تھا اور اولادِ ذکور سال دو سال سے زیادہ زندہ نہیں رہی۔

تیسرا سبب | قریش کو عیسائیوں سے بالطبع نفرت تھی، جس کی وجہ یہ تھی ابرہۃ الاشرم (بادشاہِ حبش) جو کعبہ کو ڈھانے آیا تھا، عیسائی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ قریش عیسائیوں کے مقابلے میں پارسیوں کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ ایران اور روم کی جنگ میں ایرانیوں کو فتح ہوئی تو قریش نے نہایت خوشی کا اظہار کیا اور مسلمان شکستہ ہوئے چنانچہ یہ آیت اتری:

غُلِبَتِ الرُّومُ فِي أَدْنَى الْأَرْضِ — قریب کے ملک میں رومی مغلوب ہو گئے

وَهُمْ مِنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ — لیکن یہ لوگ مغلوب ہونے کے بعد

سَيَغْلِبُونَ فِي بِضْعِ سِنِينَ — چند سال میں پھر غالب آجائیں گے

لِلَّهِ الْأَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ — خدا ہی کو اختیار ہے پہلے بھی اور پیچھے

وَيَوْمَئِذٍ يَفْرَحُ الْمُؤْمِنُونَ — بھی، اور تب مسلمان اللہ کی مدد سے خوشی

بِنَصْرِ اللَّهِ (روم) — منائیں گے۔

اسلام اور نصرانیت میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس زمانہ میں اسلام کا قبلہ بیت المقدس تھا اور مدینہ منورہ میں بھی ایک مدت تک یہی قبلہ رہا۔ ان اسباب سے قریش کو خیال ہوا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) عیسائیت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

چوتھا سبب | ایک بڑا سبب قبائل کی خاندانی رقابت تھی۔ قریش میں دو قبیلے نہایت ممتاز اور حریف یکدگر تھے۔ بنو ہاشم و بنو امیہ، عبدالمطلب نے اپنے زور اور اثر سے بنو ہاشم کا پلہ بھاری کر دیا تھا، لیکن ان کے بعد اس خاندان میں کوئی

صاحب اثر نہیں پیدا ہوا۔ ابوطالب دولتمند نہ تھے۔ عباس دولتمند تھے لیکن فیاض نہ تھے۔ ابولہب بدچلن تھا۔ اس پر بنو امیہ کا اقتدار بڑھتا جاتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو خاندانِ بنو امیہ اپنے رقیب (ہاشم) کی فتح خیال کرتا تھا، اس لیے سب سے زیادہ اسی قبیلہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی۔ بدر کے سوا باقی تمام لڑائیاں ابوسفیان ہی نے برپا کیں، اور وہی ان لڑائیوں میں رئیس لشکر رہا۔

عقبہ بن ابی معیط جو سب سے زیادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن تھا، اور جس نے نماز پڑھنے کی حالت میں آپؐ کے دوشِ مبارک پر اونٹ کی اوجھ لاکر ڈالی تھی، اُموی تھا۔ بنو امیہ کے بعد جس قبیلے کو بنو ہاشم کی برابری کا دعویٰ تھا، وہ بنی مخزوم تھے۔ ولید بن المغیرہ اسی خاندان کا رئیس تھا، اس لیے اس قبیلہ نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سخت مخالفت کی۔ ابوجہل کی ایک تقریر سے اس بیان کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔ ایک دفعہ اخنس ابن شریق ابوجہل کے پاس گیا اور کہا کہ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق تمھاری کیا رائے ہے"؟ ابوجہل نے کہا کہ ہم اور بنو عبد مناف (یعنی آلِ ہاشم) ہمیشہ حریفِ مقابل رہے۔ انھوں نے مہمانداریاں کیں تو ہم نے بھی کیں۔ اُنھوں نے خون بہا دِیے تو ہم نے بھی دِیے، اُنھوں نے فیاضیاں کیں تو ہم نے اُن سے بڑھ کر کیں، یہاں تک کہ جب ہم نے ان کے کاندھے سے کاندھا ملا دیا، تو اب بنو ہاشم پیغمبری کے دعویدار ہیں، خدا کی قسم ہم اس پیغمبر پر کبھی ایمان نہیں لا سکتے[۱]۔

پانچواں سبب ایک بڑا سبب یہ تھا کہ قریش میں سخت بد اخلاقیاں پھیلی ہوئی

---

[۱] ابن ہشام صفحہ ۱۰۸ مطبوعہ مصر۔

تھیں۔ بڑے بڑے ارباب اقتدار نہایت ذلیل بداخلاقیوں کے مرتکب تھے۔ ابولہب جو خاندانِ ہاشم میں سب سے زیادہ ممتاز تھا، اس نے حرمِ محترم کے خزانے سے غزالِ زریں چرا کر بیچ ڈالا تھا۔ اخنس ابن شریق جو بنو زہرہ کا حلیف اور رؤسائے عرب میں شمار کیا جاتا تھا، نمام اور کذاب تھا۔ نضر بن حارث کو جھوٹ بولنے کی سخت عادت تھی۔ اسی طرح اکثر اربابِ جاہ مختلف قسم کے افعالِ شنیعہ میں گرفتار تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف بت پرستی کی برائیاں بیان فرماتے تھے، دوسری طرف ان بداخلاقیوں پر سخت دار و گیر کرتے تھے۔ جس سے ان کی عظمت و اقتدار کی شاہنشاہی متزلزل ہوتی جاتی تھی۔ قرآن مجید میں بہیم علانیہ ان بدکاروں کی شان میں آیتیں نازل ہوتی تھیں، اور گو طریقۂ بیان عام ہوتا تھا لیکن لوگ جانتے تھے کہ روئے سخن کس کی طرف ہے۔

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ هَمَّازٍ مَّشَّاءٍ بِنَمِيمٍ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ عُتُلٍّ بَعْدَ ذَٰلِكَ زَنِيمٍ أَن كَانَ ذَا مَالٍ وَبَنِينَ (سورۂ قلم-۱)	اور اس شخص کے کہنے میں نہ آنا جو بات بات میں قسم کھاتا ہے۔ آبرو باختہ ہے طاعن ہے، چغلیاں لگاتا ہے، لوگوں کو اچھے کاموں سے روکتا ہے، حد سے بڑھ گیا ہے، بد ہے، تندخو ہے اور ان سب باتوں کے ساتھ مجھول النسب بنتا ہے۔ اس لیے کہ وہ مالدار اور لڑکوں والا ہے۔
كَلَّا لَئِن لَّمْ يَنتَهِ لَنَسْفَعًا	ہاں سن رکھے کہ اگر وہ باز نہ آیا تو ہم اس کی

---

[1] حرم میں ایک سونے کا ہرن مدت سے خزانہ میں محفوظ تھا، ابولہب نے چرا کر فروخت کر دیا۔ یہ واقعہ عموماً تاریخوں میں مذکور ہے۔ ابن قتیبہ نے بھی معارف ص۵ مطبوعہ مصر میں اس کا ذکر کیا ہے۔

بِالنَّاصِيَةِ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ — پیشانی کے بال پکڑ کر گھسیٹیں گے جو کہ

(سورہ علق) جھوٹی اور خطاکار ہے۔

ممکن تھا کہ دعوت و تبلیغ کا یہ نرم طریقہ اختیار کیا جاتا۔ لیکن جن کی عربی نخوت ہو، اقتدار کا غرور، ریاست کا زعم، ان تحقیروں کے ہوتے ہوئے ملتے تو عیب تک ضرب نہایت سخت نہ ہوتی تو وہ متاثر نہ ہوتے۔ یہی سبب ہے کہ بڑے بڑے جبار اس طرح مخاطب کیے جاتے تھے۔

ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا — ہم کو اور اُس کو تنہا چھوڑ دو جس نے

وَجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَّمْدُودًا — ہم نے اس کو تنہا پیدا کیا پھر بہت سا مال دیا،

وَبَنِينَ شُهُودًا وَمَهَّدتُّ — بیٹے دیئے، سامان دیا، پھر چاہتا ہے کہ

لَهُ تَمْهِيدًا ثُمَّ يَطْمَعُ — ہم اس کو اور دیں، ہرگز نہیں، وہ

أَنْ أَزِيدَ كَلَّا إِنَّهُ كَانَ لِآيَاتِنَا — ہماری آیتوں کا دشمن ہے۔

عَنِيدًا (مدثر ۱۱)

یہ خطاب ولید بن مغیرہ کے ساتھ ہے جو قریش کا سرتاج تھا، اور یہ الفاظ اُس شخص کی زبان سے ادا ہوتے تھے جس کو ظاہری جاہ و اقتدار حاصل نہ تھا۔

لیکن مخالفت کی جو سب سے بڑی وجہ تھی اور جس کا اثر تمام قریش بلکہ تمام عرب پر یکساں تھا، یہ تھا کہ جو معبود سیکڑوں برس سے عرب کے حاجت روا عام سمجھے جاتے تھے اور جن کے آگے وہ ہر روز پیشانی رگڑتے تھے، اسلام ان کا نام و نشان مٹاتا تھا، اور ان کی شان میں کہتا تھا:

إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ — بلاشبہ تم اور جن چیزوں کو تم خدا کو

اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ — چھوڑ کر پوجتے ہو، سب دوزخ کے

(سورہ انبیاء ۷) ایندھن ہوں گے۔

قریش کے تحمل کے اسباب

ان اسباب کے ساتھ جن میں سے ہر ایک قریش کو سخت مشتعل کر دینے کے لیے کافی تھا، توقع یہ تھی کہ اعلان دعوت کے ساتھ سخت خونریزیاں شروع ہو جاتیں، لیکن قریش نے تحمل سے کام لیا، اور اس کے متعدد اسباب تھے، قریش لڑائی جھگڑوں میں تباہ ہو چکے تھے، اور حرب فجار کے بعد ایسے عاجز آگئے تھے کہ لڑائی کے نام سے ڈرتے تھے، قبیلہ پرستی کی وجہ سے لڑائی صرف اتنی سی بات پر شروع ہو جاتی تھی کہ کسی قبیلے کا کوئی آدمی قتل کر دیا جائے، مقتول کا قبیلہ بغیر کسی تحقیق کے انتقام کے لیے تیار ہو جاتا تھا، اور جب تک بدلہ نہ لیا جائے یہ آگ بجھ نہیں سکتی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل پر آمادہ ہونا قریش کے لیے نہایت آسان تھا، لیکن وہ جانتے تھے کہ بنو ہاشم خون کا انتقام نہ چھوڑیں گے، اس لیے پھر سلسلہ تمام مکہ جنگ میں مبتلا ہو جائے گا، بہت سے لوگ اسلام لا چکے تھے، اور قریش کا کوئی قبیلہ ایسا باقی نہ تھا جس میں دو ایک شخص اسلام لا چکے ہوں، اس لحاظ سے اسلام اگر جرم تھا تو صرف ایک شخص اس کا مجرم نہ تھا بلکہ سینکڑوں تھے اور سب کا قبیلہ الگ الگ تھا، سب سے بڑھ کر یہ کہ قریش میں متعدد ایسے تھے جو شریف النفس تھے، وہ بد نفسی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے خیال میں نیک نیتی کی بنا پر مخالفت کرتے تھے، اس بنا پر وہ چاہتے تھے کہ معاملہ صلح و آشتی سے طے ہو جائے۔[1]

غرض جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان دعوت کیا اور قریش

---

[1] یہ آیت غالباً انہی لوگوں کی شان میں ہے، وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْأَوْنَ عَنْهُ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی سے تو لوگوں کو منع کرتے تھے لیکن آپ کے دعوے سے خود بھی الگ رہتے تھے۔ اصابہ بذکر ابی طالب بحوالہ عبدالرزاق، ص ۲

کی علانیہ مذمت شروع کی تو قریش کے چند معززوں نے ابوطالب سے آکر شکایت کی۔ ابوطالب نے نرمی سے سمجھا کر رخصت کر دیا۔ لیکن چونکہ بنائے نزاع قائم تھی، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ادائے فرض سے باز نہ آسکتے تھے، اِس لیے یہ سفارت دوبارہ ابوطالب کے پاس آئی، اس میں تمام رؤسائے قریش، یعنی عتبہ بن ربیعہ، شیبہ، ابوسفیان، عاص بن ہشام، ابوجہل، ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل وغیرہ شریک تھے، ان لوگوں نے ابوطالب سے کہا کہ تمہارا بھتیجا ہمارے معبودوں کی توہین کرتا ہے، ہمارے آباواجداد کو گمراہ کہتا ہے، ہم کو احمق ٹھہراتا ہے، اس لیے یا تو تم بیچ میں سے ہٹ جاؤ، یا تم بھی میدان میں آؤ کہ ہم دونوں میں سے ایک کا فیصلہ ہو جائے۔ ابوطالب نے دیکھا کہ اب حالت نازک ہو گئی ہے، قریش اب تحمل نہیں کر سکتے اور میں تنہا قریش کا مقابلہ نہیں کر سکتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مختصر لفظوں میں کہا کہ "جانِ عم! میرے اوپر اتنا بار نہ ڈال کہ میں اٹھا نہ سکوں"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری پشت و پناہ جو کچھ تھے ابوطالب تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ اب اُن کے پائے ثبات میں بھی لغزش ہے، آپؐ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا "خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند لا کر دے دیں تب بھی میں اپنے فرض سے باز نہ آؤں گا، خدا یا اس کام کو پورا کرے گا، یا میں خود اس پر نثار ہو جاؤں گا"۔ آپؐ کی پُراثر آواز نے ابوطالب کو سخت متاثر کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا "جا! کوئی شخص تیرا بال بیکا نہیں کر سکتا"[۱]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدستور دعوتِ اسلام میں مصروف ہوئے۔ قریش اگرچہ

---

[۱] ابن ہشام صفحہ ۸۹۔ امام بخاری نے بھی تاریخ میں یہ واقعہ اختصار کے ساتھ نقل کیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ نہ کر سکے، لیکن طرح طرح کی اذیتیں دیتے تھے، راہ میں کانٹے بچھاتے تھے، نماز پڑھنے میں جسمِ مبارک پر نجاست ڈال دیتے تھے، بدزبانیاں کرتے تھے، ایک دفعہ آپؐ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے، عقبہ بن ابی معیط نے آپؐ کے گلے میں چادر لپیٹ کر اس زور سے کھینچی کہ آپؐ گھٹنوں کے بل گر پڑے۔ قریش متحیر تھے کہ آپؐ یہ سب سختیاں کیوں جھیلتے ہیں؟ انسانی دماغ ایسی سخت نفس کشی اور جانبازی کا مقصد جاہ و دولت اور نام و نمود کی خواہش کے سوا اور کیا خیال کر سکتا ہے۔ قریش نے بھی یہی خیال کیا۔ اس بنا پر عتبہ بن ربیعہ قریش کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا "محمدؐ! کیا چاہتے ہو؟ کیا مکہ کی ریاست؟ کیا کسی بڑے گھرانے میں شادی؟ کیا دولت کا ذخیرہ؟ ہم یہ سب کچھ مہیا کر سکتے ہیں، اور اس پر بھی راضی ہیں کہ مکہ تمھارا زیر فرمان ہو جائے، لیکن ان باتوں سے باز آ جاؤ" عتبہ کو اس درخواست کی کامیابی کا پورا یقین تھا، لیکن ان سب ترغیبات کے جواب میں آپ نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں:

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ۔ (حٰمٓ۔ السجدہ ۱)	اے محمد! کہہ دے کہ میں تمھیں جیسا آدمی ہوں مجھ پر وحی آئی ہے کہ تمھارا خدا بس ایک خدا ہے، بس سیدھے اس کی طرف جاؤ اور اسی سے معافی مانگو۔
قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (حٰمٓ۔ السجدہ۔ ۲)	کہہ دے کہ کیا تم لوگ خدا کا انکار کرتے ہو جس نے دو دن میں یہ زمین پیدا کی، اور تم خدا کے شریک قرار دیتے ہو، یہی سارے جہان کا پروردگار ہے۔

عتبہ واپس گیا تو وہ عتبہ نہ تھا، اُس نے قریش سے جا کر کہہ دیا کہ "محمدؐ جو کلام

پیش کرتے ہیں، وہ شاعری نہیں کوئی اور چیز ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ تم ان کو اُن کے حال پر چھوڑ دو، اگر وہ کامیاب ہو کر عرب پر غالب آجائیں گے تو یہ تمہاری ہی عزت ہے' ورنہ عرب ان کو خود فنا کر دے گا۔" لیکن قریش نے یہ رائے نامنظور کی۔

حضرت حمزہ رضؓ اور عمر رضؓ کا اسلام سنہ ۶ نبوی ؐ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمام میں سے حضرت حمزہ رضؓ کو آپؐ سے خاص محبت تھی، وہ آپؐ سے دو تین برس بڑے تھے، اور ساتھ کے کھیلے تھے، دونوں نے ثویبہ کا دودھ پیا تھا، اور اس رشتہ سے بھائی بھائی تھے۔ وہ ابھی تک اسلام نہیں لائے تھے، لیکن آپؐ کی ہر ادا کو محبت کی نظر سے دیکھتے تھے، ان کا مذاق طبیعت سپہگری اور شیر افگنی تھا، معمول تھا کہ منہ اندھیرے تیر کمان لے کر نکل جاتے، دن دن بھر شکار میں مصروف رہتے، شام کو واپس آتے تو پہلے حرم میں جاتے، طواف کرتے، قریش کے رؤسا صحن حرم میں الگ الگ دربار جما کر بیٹھا کرتے تھے۔ حضرت حمزہ رضؓ ان لوگوں سے صاحب سلامت کرتے، کبھی کبھی کسی کے پاس بیٹھ جاتے، اس طریقہ سے سب سے یارانہ تھا اور سب لوگ اُن کی قدر و منزلت کرتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخالفین جس بے رحمی سے پیش آتے تھے، بیگانوں سے بھی دیکھا نہ جا سکتا تھا۔ ایک دن ابو جہل نے رُو در رُو آپؐ کے ساتھ نہایت گستاخیاں کیں۔ ایک کنیز دیکھ رہی تھی۔ حضرت حمزہ رضؓ شکار سے آئے تو اُس نے تمام ماجرا کہا۔ حضرت حمزہ رضؓ غصہ سے بیتاب ہو گئے۔ تیر و کمان ہاتھ میں لیے حرم میں آئے اور ابو جہل سے کہا "میں مسلمان ہو گیا ہوں"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جوش حمایت میں اُنھوں نے اسلام کا اظہار تو کر دیا، لیکن گھر پر آئے تو متردد تھے کہ آبائی دین کو دفعۃً کیونکر چھوڑ دوں، تمام

دن سوچتے رہے، بالآخر غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ دینِ حق یہی ہے دو ہی چار روز کے بعد حضرت عمرؓ بھی اسلام لائے۔[1]

حضرت عمرؓ کا ستائیسواں[2] سال تھا کہ آفتابِ رسالت طلوع ہوا۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے، حضرت عمرؓ کے گھرانے میں زید کی وجہ سے توحید کی آواز نا مانوس نہیں رہی تھی۔ چنانچہ سب سے پہلے زید کے بیٹے سعیدؓ اسلام لائے۔ حضرت سعیدؓ کا نکاح حضرت عمرؓ کی بہن فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ہوا تھا۔ اس تعلق سے فاطمہؓ بھی مسلمان ہو گئیں۔ اسی خاندان میں ایک اور شخص نعیم بن عبداللہ نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا، لیکن حضرت عمرؓ ابھی تک اسلام سے بیگانہ تھے۔ اُن کے کانوں میں یہ صدا پہنچی تو سخت برہم ہوئے، یہاں تک کہ قبیلہ میں جو لوگ اسلام لا چکے تھے اُن کے دشمن بن گئے۔ لُبینہؓ ان کے خاندان کی کنیز تھی جس نے اسلام قبول کر لیا تھا، اُس کو بے تحاشا مارتے اور مارتے مارتے تھک جاتے تو کہتے کہ "دم لے لوں تو پھر ماروں گا۔" لُبینہؓ کے سوا اور جس جس پر قابو چلتا تھا زدوکوب سے دریغ نہیں کرتے تھے لیکن اسلام کا نشہ ایسا تھا کہ جس کو چڑھ جاتا تھا اُترتا نہ تھا۔ ان تمام سختیوں پر ایک شخص کو بھی وہ اسلام سے بددل نہ کر سکے۔ آخر مجبور ہو کر (نعوذ باللہ) خود (ذاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم) کے قتل کا ارادہ کیا۔ تلوار کمر سے لگا سیدھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

---

[1] حضرت عمرؓ کے اسلام کا واقعہ عموماً سب نے لکھا ہے، لیکن یہ اخیر واقعہ میں نے صرف روضۃ الانف میں دیکھا ہے۔ [2] حضرت عمرؓ کا قبول اسلام میں الفاروق میں مفصل لکھ چکا تھا، اسی کو بعینہ یہاں نقل کر دیا ہے، کہیں کہیں بعض الفاظ یا جملے بدل دیے ہیں، (جامع نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام کے واقعہ کی دوسری روایتیں سیرۃ النبیؐ جلد سوم باب استجابت دعا میں مفصل درج کر دی ہیں، وہاں دیکھی جائیں۔ "س ن")

طرف چلے، کارکنانِ قضا نے کہا ع

آمد آں یارے کہ ما می خواستیم

راہ میں اتفاقاً نعیم رضؓ بن عبد اللہ مل گئے، ان کے تیور دیکھ کر پوچھا خیر ہے؟ بولے کہ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا فیصلہ کرنے جاتا ہوں۔ انھوں نے کہا "پہلے اپنے گھر کی خبر لو، خود تمھارے بہن اور بہنوئی اسلام لا چکے ہیں۔" فوراً پلٹے اور بہن کے ہاں پہنچے۔ وہ قرآن پڑھ رہی تھیں، اُن کی آہٹ پا کر چپ ہو گئیں۔ اور قرآن کے اجزا چھپا لیے لیکن آواز اُن کے کانوں میں پڑ چکی تھی۔ بہن سے پوچھا یہ کیا آواز تھی؟ بولیں کچھ نہیں۔ اُنھوں نے کہا میں سُن چکا ہوں تم دونوں مرتد ہو گئے ہو، یہ کہہ کر بہنوئی سے دست و گریبان ہوئے، اور جب اُن کی بہن بچانے کو آئیں تو اُن کی بھی خبر لی، یہاں تک کہ اُن کا جسم لہولہان ہو گیا، لیکن اسلام کی محبت اس سے بالاتر تھی، بولیں کہ "عمر! جو بن آئے کرو، لیکن اب اسلام دل سے نہیں نکل سکتا۔" اِن الفاظ نے حضرت عمر رضؓ کے دل پر خاص اثر کیا۔ بہن کی طرف محبت کی نگاہ سے دیکھا۔ ان کے جسم سے خون جاری تھا، دیکھ کر اور بھی رقت ہوئی۔ فرمایا، تم لوگ جو پڑھ رہے تھے مجھ کو بھی سُناؤ۔ فاطمہ رضؓ نے قرآن کے اجزا لا کر سامنے رکھ دیے، اُٹھا کر دیکھا تو یہ سورہ تھی:

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (حدید - ۱)	زمین و آسمان میں جو کچھ ہے خُدا کی تسبیح پڑھتا ہے اور خدا ہی غالب اور حکمت والا ہے۔

ایک ایک لفظ پر ان کا دل مرعوب ہوتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ جب اس آیت پر پہنچے:

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (حدید-۱) خدا پر اور اُس کے رسول پر ایمان لاؤ۔

تو بے اختیار پکار اُٹھے کہ :

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ   مَیں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود
اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ   نہیں، اور یہ کہ محمدؐ خدا کے پیغمبر ہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ علیہ وَسلّم حضرت ارقم رضؓ کے مکان میں جو کوہ صفا کی تلی میں واقع تھا، پناہ گزین تھے، حضرت عمر رضؓ نے آستانہ مبارک پر پہنچ کر دستک دی، چونکہ شمشیر بکف گئے تھے صحابہ کو تردّد ہوا۔ لیکن حضرت امیر حمزہ رضؓ نے کہا "آنے دو، مخلصانہ آیا ہے تو بہتر ہے، ورنہ اسی کی تلوار سے اس کا سر قلم کر دوں گا۔" حضرت عمر رضؓ نے اندر قدم رکھا تو رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ علیہ وَسلّم خود آگے بڑھے، اور اُن کا دامن پکڑ کے فرمایا "کیوں عمر کس ارادہ سے آیا ہے"؟ نبوت کی پُر جلال آواز نے اُن کو کپکپا دیا، نہایت خضوع کے ساتھ عرض کیا کہ "ایمان لانے کے لیے" آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ علیہ وَسلّم بے ساختہ اَللّٰہُ اَکْبَر پکار اُٹھے، اور ساتھ ہی تمام صحابہ رضؓ نے مل کر اس زور سے اَللّٰہُ اَکْبَر کا نعرہ مارا کہ مکہ کی تمام پہاڑیاں گونج اُٹھیں[۵]۔

حضرت عمر رضؓ کے اسلام لانے نے اسلام کی تاریخ میں نیا دَور پیدا کر دیا۔ اُس وقت تک اگرچہ چالیس پچاس آدمی اسلام لا چکے تھے۔ عرب کے مشہور بہادر حضرت حمزہ رضؓ سید الشہداء نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا۔ تاہم مسلمان اپنے فرائض مذہبی علانیہ نہیں ادا کر سکتے تھے۔ اور کعبہ میں نماز پڑھنا تو بالکل ناممکن تھا۔ حضرت عمر رضؓ کے اسلام کے ساتھ دفعتًہ یہ حالت بدل گئی۔ اُنھوں نے علانیہ اسلام ظاہر کیا۔ کافروں نے اوّل اوّل بڑی شدّت کی، لیکن وہ ثابت قدمی سے مقابلہ کرتے رہے، یہاں تک کہ مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ کعبہ میں جا کر نماز ادا کی۔ ابن ہشام نے

---

۵ انساب الاشراف بلاذری و طبقات ابن سعد و اسد الغابہ و ابن عساکر و کامل ابن الاثیر۔

اس واقعہ کو حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی زبانی ان الفاظ میں روایت کیا ہے:

فَلَمَّا اَسْلَمَ عُمَرُ قَاتَلَ قُرَيْشًا — جب عمرؓ اسلام لائے تو قریش سے لڑے

حَتّٰی صَلّٰی عِنْدَ الْكَعْبَةِ وَصَلَّيْنَا مَعَهٗ — یہاں تک کہ کعبہ میں نماز پڑھی اور اُن کے ساتھ ہم لوگوں نے بھی پڑھی۔

صحیح بخاری میں ہے کہ جب حضرت عمرؓ اسلام لائے تو ایک ہنگامہ برپا ہوگیا اتفاق سے عاص بن وائل آنکلا، اُس نے پوچھا کیا ہنگامہ ہے؟ لوگوں نے کہا عمرؓ مرتد ہوگئے۔ عاص ابن وائل نے کہا اچھا تو کیا ہوا میں نے عمر کو پناہ دی۔

تہذیب مسلمین — رسوخ عزم، قوت ارادہ، شدت عمل، انسان کے اصلی جوہر ہیں، اور داد کے قابل ہیں۔ لیکن انہی اوصاف کا رُخ جب بدل جاتا ہے تو وہ سخت دلی، بے رحمی، درندہ طبعی اور سفاکی کا مہیب قالب اختیار کر لیتے ہیں۔

اسلام جب آہستہ آہستہ پھیلنا شروع ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اکابر صحابہؓ کو اُن کے قبیلوں نے اپنے حصار حفاظت میں لے لیا، تو قریش کا طیش و غضب ہر طرف سے سمٹ کر اُن غریبوں پر ٹوٹا جن کا کوئی یار و مددگار نہ تھا۔ اُن میں کچھ غلام اور کنیزیں تھیں، کچھ غریب الوطن تھے، جو ایک دو پشت سے مکہ میں آ رہے تھے، اور کچھ کمزور قبیلوں کے آدمی تھے جو کسی قسم کی عظمت و اقتدار نہیں رکھتے تھے، قریش نے ان کو اس طرح ستانا شروع کیا کہ جور و ستم کی تاریخ میں اس کی مثال پیدا کرنا، قریش کی یکتائی کی تحقیر ہے۔

یہ آسان تھا کہ مسلمانوں کے خس و خاشاک سے سرزمین عرب دفعۃً پاک کر دی جاتی۔ لیکن قریش کا نشۂ انتقام اس سے اُتر نہیں سکتا تھا مسلمان اگر اپنے مذہب پر ثابت قدم رہ کر پیوند خاک کر دیے تو اس میں جس قدر قریش کی تعریف نکلتی، اس سے زیادہ اُن بیکسوں کا صبر و استقلال داد طلب ہوتا۔ قریش کی شان اس

وقت قائم رہ سکتی تھی، سبب یہ لوگ جادۂ اسلام سے پھر کر، پھر قریش کے مذہب میں آجائیں، یا شاید ان کو مسلمانوں کی سخت جانی کا امتحان لینا، اور اس کی داد دینا منظور تھا۔

قریش میں ایسے لوگ بھی تھے جن کا دل واقعی اس حالت پر جلتا تھا کہ ان کا مدتوں کا بنابنایا کارخانہ درہم برہم ہوا جاتا ہے۔ اُن کے آباؤ اجداد کی تحقیر کی جاتی ہے، قابلِ احترام معبودوں کی عظمت مٹی جاتی ہے۔ یہ لوگ صرف حسرت و افسوس کر کے رہ جاتے تھے، اور کہتے تھے کہ چند خام طبعوں کے دماغ میں خلل آگیا ہے۔ عتبہ، عاص بن وائل وغیرہ اسی قسم کے لوگ تھے۔ لیکن ابوجہل، اُمیّہ بن خلف وغیرہ کا معیار اس سے زیادہ بلند تھا۔

مسلمانوں پر ظلم کے طریقے

بہرحال قریش نے جور و ظلم کے عبرت ناک کارنامے شروع کیے، جب ٹھیک دوپہر ہوجاتی تو وہ غریب مسلمانوں کو پکڑتے، عرب کی تیز دھوپ، ریتلی زمین کو دوپہر کے وقت جلتا توا بنا دیتی ہے، وہ ان غریبوں کو اسی توے پر لٹاتے، چھاتی پر بھاری پتھر رکھ دیتے کہ کروٹ نہ بدلنے پائیں، بدن پر گرم بالو بچھاتے، لوہے کو آگ پر گرم کر کے اس سے داغتے، پانی میں ڈبکیاں دیتے۔[۱]

یہ مصیبتیں اگرچہ تمام بیکس مسلمانوں پر عام تھیں، لیکن ان میں جن لوگوں پر قریش زیادہ مہربان تھے، اُن کے نام یہ ہیں:

حضرت خبابؓ بن الارت تمیم کے قبیلے سے تھے، جاہلیت میں غلام بنا کر

---

[۱] یہ واقعات ابن سعد نے حضرت بلالؓ و صہیبؓ کے حال میں بہ تفصیل لکھے ہیں۔ دیکھو کتاب مذکور، جلد ثالث تذکرہ صحابۂ بدر۔

فروخت کردیئے گئے۔ ام نمارا نے خرید لیا تھا، یہ اُس زمانہ میں اسلام لائے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ارقمؓ کے گھر میں مقیم تھے، اور صرف چھ سات شخص اسلام لاچکے تھے، قریش نے ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دیں۔ ایک دن کوئلے جلاکر زمین پر بچھائے، اس پر چت لٹایا، ایک شخص چھاتی پر پاؤں رکھے رہا کہ کروٹ بدلنے نہ پائیں۔ یہاں تک کہ کوئلے پیٹھ کے نیچے پڑے پڑے ٹھنڈے ہو گئے۔ خبابؓ نے مدتوں کے بعد جب یہ واقعہ حضرت عمرؓ کے سامنے بیان کیا تو پیٹھ کھول کر دکھائی کہ برص کے داغ کی طرح بالکل سپید تھی[۱]۔ حضرت خبابؓ جاہلیت میں لوہاری کا کام کرتے تھے، اسلام لائے تو بعض لوگوں کے ذمے اُن کی بقایا تھی۔ مانگتے تو جواب ملتا جب تک محمدؐ کا انکار نہ کروگے، ایک کوڑی نہ ملیگی۔ یہ کہتے کہ نہیں، جب تک تم مرکر پھر جیو نہیں[۲]") +

حضرت بلالؓ، یہ وہی حضرت بلالؓ ہیں جو مؤذن کے لقب سے مشہور ہیں۔ حبشی النسل اور اُمیہ بن خلف کے غلام تھے۔ جب ٹھیک دوپہر ہوجاتی تو امیہ ان کو جلتی بالو پر لٹاتا، اور پتھر کی چٹان سینے پر رکھ دیتا کہ جنبش نہ کرنے پائیں، اُن سے کہتا کہ اسلام سے باز آ، ورنہ یوں ہی گھٹ گھٹ کر مرجائے گا۔ لیکن اس وقت بھی اُن کی زبان سے "اَحَدٌ" کا لفظ نکلتا جب یہ کسی طرح متزلزل نہ ہوئے تو گلے میں رسّی باندھی اور لونڈوں کے حوالے کیا، وہ ان کو شہر کے اس سرے سے اُس سرے تک گھسیٹتے پھرتے تھے۔ لیکن اب بھی وہی رٹ تھی، اَحَدٌ اَحَدٌ +

حضرت عمارؓ یمن کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد "یاسر" مکہ میں آئے،

۱؎ طبقات ابن سعد جلد سوم، تذکرہ خبابؓ ۲؎ صحیح بخاری صفحہ ۶۹۲ (ج ۲) س"

ابو حذیفہ مخزومی نے اپنی کنیز سے جس کا نام سُمیّہ تھا، شادی کردی، عمار اسی کے پیٹ سے پیدا ہوئے۔ یہ جب اسلام لائے تو ان سے پہلے صرف تین شخص اسلام لا چکے تھے۔ قریش اُن کو جلتی ہوئی زمین پر لٹاتے اور اس قدر مارتے کہ بیہوش ہو جاتے۔ ان کے والد، اور والدہ کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جاتا۔

حضرت سُمیّہؓ، حضرت عمارؓ کی والدہ تھیں، اُن کو ابوجہل نے اسلام لانے کے جُرم میں برچھی ماری اور ہلاک ہو گئیں۔

حضرت یاسرؓ، حضرت عمارؓ کے والد تھے، یہ بھی کافروں کے ہاتھ سے اذیت اُٹھاتے اُٹھاتے ہلاک ہو گئے۔

حضرت صہیبؓ: یہ رومی مشہور ہیں، لیکن درحقیقت رومی نہ تھے۔ اُن کے والد سنان کسریٰ کی طرف سے اُبلہ کے حاکم تھے۔ ان کا خاندان موصل میں آباد تھا۔ ایک دفعہ رومیوں نے اس نواح پر حملہ کیا، اور جن لوگوں کو قید کر کے لے گئے ان میں حضرت صہیبؓ بھی تھے۔ یہ روم میں پلے، اس لیے عربی زبان اچھی طرح بول نہ سکتے تھے۔ ایک عرب نے اُن کو خریدا، اور مکہ میں لایا، یہاں عبداللہ بن جدعان نے اُن کو خرید کر آزاد کر دیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دعوتِ اسلام شروع کی، تو یہ اور عمارؓ بن یاسر ایک ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ آپؐ نے اسلام کی ترغیب دی، اور یہ مسلمان ہو گئے۔ قریش ان کو اس قدر اذیت دیتے تھے کہ اُن کے حواس مختل ہو جاتے تھے۔ جب اُنھوں نے مدینہ کو ہجرت کرنی چاہی تو قریش نے کہا کہ اپنا سارا مال و متاع چھوڑ جاؤ تو جا سکتے ہو، اُنھوں نے نہایت خوشی

لہ ابن الاثیر ذکر تعذیب المستضعفین، ابن الاثیر نے لکھا ہے کہ عمار اس وقت ایمان لائے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارقم کے مکان میں چلے آئے تھے، اور جب کہ تیس شخص سے زیادہ اسلام لا چکے تھے۔

سے منظور کیا۔

حضرت **ابوفکیہہ** رضؓ صفوان بن امیہ کے غلام تھے اور حضرت بلال رضؓ کے ساتھ اسلام لائے۔ اُمیہ کو جب یہ معلوم ہوا تو اُن کے پاؤں میں رسّی باندھی اور آدمیوں سے کہا کہ گھسیٹتے ہوئے لے جائیں اور تپتی ہوئی زمین پر لٹائیں۔ ایک "گبریلا" راہ میں جا رہا تھا، اُمیہ نے ان سے کہا "تیرا خدا یہی تو نہیں ہے" اُنھوں نے کہا "میرا اور تیرا دونوں کا خُدا اللہ تعالیٰ ہے" اس پر اُمیہ نے اس زور سے اُن کا گلا گھونٹا کہ لوگ سمجھے دم نکل گیا۔ ایک دفعہ اُن کے سینے پر اتنا بھاری پتھر رکھ دیا کہ ان کی زبان نکل پڑی۔

حضرت **لُبینیہ** رضؓ یہ بیچاری ایک کنیز تھیں۔ حضرت عمر رضؓ اس[1] بیکس کو مارتے مارتے تھک جاتے تھے تو کہتے تھے کہ "میں نے تجھ کو رحم کی بنا پر نہیں بلکہ اس وجہ سے چھوڑ دیا ہے کہ تھک گیا ہوں" وہ نہایت استقلال سے جواب دیتیں کہ "اگر تم اسلام نہ لاؤ گے تو خدا اس کا انتقام لے گا"۔

حضرت **زنیرہ** رضؓ، حضرت عمر رضؓ کے گھرانے کی کنیز تھیں، اور اس وجہ سے حضرت عمر رضؓ (اسلام سے پہلے) اُن کو جی کھول کر ستاتے، ابوجہل نے اُن کو اس قدر مارا کہ ان کی آنکھیں جاتی رہیں۔

حضرت **نہدیہ** رضؓ اور **اُم عبیس** رضؓ، یہ دونوں بھی کنیزیں تھیں اور اسلام لانے کے جُرم میں سخت سے سخت مصیبتیں جھیلتی تھیں۔

حضرت ابوبکر رضؓ کے دفترِ فضائل کا یہ پہلا باب ہے کہ انھوں نے ان مظلوموں میں سے اکثروں کی جان بچائی۔ حضرت بلال رضؓ، عامر رضؓ بن فہیرہ، لبینہ رضؓ زنیرہ رضؓ،

---

[1] حضرت عمر رضؓ اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے۔

نہدیہ رض، ام عبیس رض سب کو بھاری بھاری داموں پر خریدا اور آزاد کر دیا تھا۔ یہ لوگ وہ تھے جن کو قریش نے نہایت سخت جسمانی اذیتیں پہنچائیں، ان سے کم درجہ پر وہ لوگ تھے جن کو طرح طرح سے ستاتے تھے۔

(حضرت عثمان رض جو کبیر السن اور صاحب جاہ و اعزاز تھے، جب اسلام لائے تو دوسروں نے نہیں بلکہ ان کے چچا نے رسّی باندھ کر مارا[۱] حضرت ابوذر رض جو سنہ تویں مسلمان ہیں جب مسلمان ہوئے، اور کعبہ میں اپنے اسلام کا اعلان کیا، تو قریشیوں نے مارتے مارتے ان کو لٹا دیا[۲]۔ حضرت زبیر بن العوام جن کا مسلمان ہونے والوں میں پانچواں نمبر تھا، جب اسلام لائے تو اُن کے چچا اُن کو چٹائی میں لپیٹ کر اُن کی ناک میں دُھواں دیتے تھے[۳] (جب حضرت عمر رض کے چچازاد بھائی سعید بن زید جب اسلام لائے تو حضرت عمر رض نے ان کو رسّیوں سے باندھ دیا[۴]۔

لیکن یہ تمام مظالم، یہ جلّادانہ بیرحمیاں، یہ عبرت خیز سفاکیاں، ایک مسلمان کو بھی راہِ حق متزلزل نہ کر سکیں۔ ایک نصرانی مورّخ نے نہایت سچ لکھا:

"عیسائی اس کو یاد رکھیں تو اچھا ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مسائل نے وہ درجہ نشۂ دینی کا آپ کے پیروؤں میں پیدا کیا جس کو عیسیٰ کے ابتدائی پیروؤں میں تلاش کرنا بے فائدہ ہے..... جب عیسیٰ ؑ کو سُولی پر لے گئے تو اُن کے پیرو بھاگ گئے، ان کا نشۂ دینی جاتا رہا، اور اپنے مقتدا کو موت کے پنجے میں گرفتار چھوڑ کر چل دیے........ برعکس اس کے محمد

---

(۱) طبقات ترجمہ عثمان رض بن عفان (۲) بخاری ج ۱ ص ۵۴۴-۵۴۵ باب اسلام ابی ذر رض (۳) ریاض النضرۃ للمحب الطبری (۴) بخاری صفحہ ۱۰۲۷ (اس وقت تک حضرت عمر رض اسلام نہیں لائے تھے) "س"

(صلی اللہ علیہ وسلم) کے پیرو، اپنے مظلوم پیغمبر کے گرد آئے اور آپ کے بچاؤ میں اپنی جانیں خطرہ میں ڈال کر کل دشمنوں پر آپ کو غالب کیا ؟

ہجرتِ حبش ۵ نبوی قریش کے ظلم و تعدی کا بادل جب پیہم برس کر نہ کھلا تو رحمتِ عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جاں نثارانِ اسلام کو ہدایت کی کہ حبش کو ہجرت کر جائیں۔ حبش قریش کا قدیم تجارت گاہ تھا، وہاں کے حالات پہلے سے معلوم تھے۔ اہلِ عرب حبش کے فرماں روا کو نجاشی[۲] کہتے تھے، اور اس کے عدل و انصاف کی عام شہرت تھی۔

جاں نثارانِ اسلام ہر قسم کی تکلیف جھیل سکتے تھے اور ان کا پیمانۂ صبر لبریز نہیں ہو سکتا تھا، لیکن مکہ میں رہ کر فرائضِ اسلام کا آزادی سے بجالانا ممکن نہ تھا۔ اس وقت تک حرمِ کعبہ میں کوئی شخص بلند آواز سے قرآن نہیں پڑھ سکتا تھا۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود جب اسلام لائے تو انھوں نے کہا میں اس فرض کو ضرور ادا کروں گا۔ لوگوں نے منع کیا، لیکن وہ باز نہ آئے۔ حرم میں گئے اور مقامِ ابراہیم کے پاس کھڑے ہو کر سورۂ الرحمٰن پڑھنا شروع کیا۔ کفار ہر طرف سے ٹوٹ پڑے، اور اُن کے مُنہ پر طمانچے مارنے شروع کیے۔ اگرچہ انھوں نے جہاں تک پڑھنا تھا پڑھ کر دم لیا۔ لیکن واپس گئے تو چہرے[۳] پر زخم کے نشان لے کر گئے۔ (حضرت ابو بکر جاہ و اقتدار میں دیگر رؤسائے قریش سے کم نہ تھے، لیکن آواز سے قرآن نہیں پڑھ سکتے تھے، اور اسی بنا پر ایک بار ہجرت کے لیے آمادہ ہو گئے[۴]) ۔

---

[۱] اپالوجی گاڈفری ہیگنس، ترجمہ اُردو صفحہ ۶۶، ۶۷ مطبوعہ بریلی ۱۸۷۳ء [۲] نجاشی حبشی لفظ نجوس کی تعریب ہے، جس کے معنی حبشی میں بادشاہ کے ہیں۔ نجاشی کا نام "اصحمہ" تھا۔ بخاری باب موت النجاشی) "س" [۳] طبری صفحہ ۱۱۸۸ ج ۳) "س"

[۴] بخاری باب ہجرت مدینہ) "س"

اس کے علاوہ ہجرت سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی تھا کہ جو شخص اسلام لے کر جہاں جاتا وہاں اسلام کی شعاعیں خود بخود پھیلتی تھیں +

غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایما سے اول اول گیارہ مرد اور چار عورتوں نے ہجرت کی، جن کے نام حسب ذیل ہیں:

۱- حضرت عثمان رضؓ (بن عفان)	مع اپنی زوجہ محترمہ (حضرت) رقیہ رضؓ کے جو رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صاحبزادی تھیں +
۲- (حضرت) ابوحذیفہ رضؓ بن عتبہ مع اپنی زوجہ کے جن کا نام (حضرت) سہلہ رضؓ (بنت سہیل) تھا،	ان کا باپ عتبہ قریش کا مشہور سردار تھا، لیکن چونکہ سخت کافر تھا، اس لیے ان کو گھر چھوڑنا پڑا +
۳- (حضرت) زبیر رضؓ بن العوام	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھیرے بھائی اور مشہور صحابی تھے +
۴- (حضرت) مصعب رضؓ بن عمیر۔	ہاشم کے پوتے تھے +
۵- (حضرت) عبدالرحمن رضؓ بن عوف۔	مشہور صحابی اور عشرہ مبشرہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ قبیلہ زہرہ سے تھے اور اس بنا پر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ننہالی رشتہ دار تھے +
۶- (حضرت) ابوسلمہ رضؓ (بن عبدالاسد) مخزومی مع اپنی زوجہ حضرت ام سلمہ رضؓ (بنت ابی امیہ) کے	یہ ام سلمہ وہی ہیں جو ابوسلمہ کے مرنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں آئیں +
۷- (حضرت) عثمان رضؓ بن مظعون جمحی	مشہور صحابی ہیں +

۸- (حضرت) عامرؓ بن ربیعہ مع اپنی زوجہ کے جن کا نام (حضرت) لیلیٰؓ بنت ابی حثمہ تھا۔

سابقین اولین میں ہیں۔ بدر میں بھی شریک تھے، حضرت عثمانؓ نے سفرِ حج میں اُن کو مدینہ کا حاکم مقرر کیا تھا۔ (اصابہ)

۹- (حضرت) ابو سبرۃؓ بن ابی رہم

ل
(یا)

اُن کی ماں برۃ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پھوپھی تھیں۔ یہ سابقین فی الاسلام میں ہیں۔ حافظ ابن حجر نے اصابہ میں لکھا ہے کہ یہ ہجرت ثانیہ میں گئے تھے۔

۱۰- (حضرت ابو) حاطبؓ بن عمرو

بدر میں شریک تھے۔ امام زہری کا بیان ہے کہ سب سے پہلے ان ہی نے ہجرت کی۔ (اصابہ)

ل حبشہ کے مہاجرین اول کی تعداد اور ان کے تعین میں کسی قدر اختلاف ہے:
ابن اسحاق نے مردوں میں ان ہی دس آدمیوں کا نام لیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کے متعلق وہ یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہ ہجرت اولیٰ میں نہیں بلکہ ہجرت ثانیہ میں تھے۔ (فتح الباری ج ۷ ص ۱۴۳) واقدی نے مردوں میں گیارہ صاحبوں کی ہجرت کا ذکر کیا ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے حضرت ابو سبرہؓ اور حضرت ابو حاتمؓ دونوں کو مہاجرین میں شمار کیا ہے اور ابن اسحاق ان میں سے ایک کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں واقدی سے ایک بڑی فروگذاشت یہ ہوئی کہ انھوں نے گیارہ مردوں کو مہاجرین حبش بتلایا لیکن جب مہاجرین کی فہرست گنائی، تو اس میں بارہ آدمیوں کا نام لیا، یعنی حضرت عبداللہؓ بن مسعود کا بھی اضافہ کیا۔ (زرقانی علی المواہب ج اول ص ۳۱۴) حافظ ابن حجر نے واقدی کی اس فروگذاشت

۱۰- حضرت سہیل رضؓ بن بیضاء
۱۱- حضرت عبداللہ رضؓ بن مسعود | مشہور صحابی اور مجتہدین صحابہ میں داخل ہیں۔

ان لوگوں نے ۵ نبوی ماہِ رجب میں سفر کیا۔ حُسنِ اتفاق یہ کہ جب یہ بندرگاہ پر پہنچے تو دو تجارتی جہاز حبش کو جا رہے تھے۔ جہاز والوں نے سستے کرایہ پر اُن کو بٹھا لیا۔ ہر شخص کو صرف ۵ درہم دینے پڑے۔ قریش کو خبر ہوئی تو بندرگاہ تک تعاقب میں آئے، لیکن موقع نکل چکا تھا۔[1]

عام مورخین کا خیال ہے کہ ہجرت اُنہی لوگوں نے کی جن کا کوئی حامی اور مددگار نہ تھا، لیکن فہرستِ مہاجرین میں ہر درجہ کے لوگ نظر آتے ہیں۔ حضرت عثمان رضؓ بنو امیہ سے تھے، جو سب سے زیادہ صاحبِ اقتدار خاندان تھا۔ متعدد بزرگ مثلاً زبیر رضؓ اور مصعب رضؓ خود آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خاندان سے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳۸) پر گرفت کی ہے' (فتح الباری ج ۷، ص ۱۴۳) ابن سعد نے انہی تمام مہاجرین کا نام لیا ہے، جن کا ذکر واقدی نے کیا ہے' (ابن سعد اول ص ۱۳۶) ابن سید الناس نے بھی بروایت زہری بارہ آدمیوں کا ذکر کیا ہے۔ مگر انھوں نے حضرت زبیر رضؓ کے بجائے حضرت سلیط رضؓ بن عمرو کا نام لیا ہے (عیون الاثر اول ص ۱۱۵)۔ بعض دوسرے سیرت نگار جو بارہ مرد مہاجرین کو تسلیم کرتے ہیں، وہ حضرت حاطب بن عمرو اور حضرت سہیل رضؓ بن بیضاء کے بجائے حضرت حاطب رضؓ بن حارث اور حضرت ہاشم رضؓ بن عمرو کا نام لیتے ہیں (زرقانی اول ص ۳۲۱) اسی طرح، ہجرت کرنے والی خواتین میں بعض لوگ حضرت ابوہریرہ رضؓ کی بیوی حضرت ام کلثوم رضؓ بنت سہیل رضؓ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دایہ حضرت ام ایمن رضؓ کا اضافہ کرتے ہیں۔) "س"

[1] یہ تمام تفصیل طبری میں ہے۔ ۱۲

عبدالرحمٰن رضؓ بن عوف اور ابو سبرہ رضؓ معمولی لوگ نہ تھے، اس بنا پر زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ قریش کا ظلم و ستم بیکسوں پر محدود نہ تھا بلکہ بڑے بڑے خاندان والے بھی اُن کے ظلم و ستم سے محفوظ نہ تھے۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ جو لوگ سب سے زیادہ مظلوم تھے اور جن کو انگاروں کے بستر پر سونا پڑا تھا، یعنی حضرت بلال رضؓ، عمار رضؓ، یاسر رضؓ وغیرہ، ان لوگوں کا نام مہاجرین حبش کی فہرست میں نظر نہیں آتا، اس لیے یا تو اُن کی بے سروسامانی اس حد تک پہنچی تھی کہ سفر کرنا بھی ممکن تھا یا یہ کہ درد کے لذت آشنا تھے، اور اس لطف کو چھوڑ نہ سکتے تھے ؎

دلم زجورِ تو آسودہ است ومی نالم ۔۔۔ کہ غیر پے نہ برد لذتِ خدنگِ ترا

نجاشی کے بدولت مسلمان حبش میں امن و امان سے زندگی بسر کرنے لگے۔ لیکن قریش یہ خبریں سُن سُن کر پیچ و تاب کھاتے تھے، آخر یہ رائے ٹھہری کہ نجاشی کے پاس سفارت بھیجی جائے کہ ہمارے مجرموں کو اپنے مُلک سے نکال دو، عبداللہ بن ربیعہ اور عمرو بن العاص (فاتحِ مصر) اس کام کے لیے منتخب ہوئے[۱]۔ نجاشی اور اس کے درباریوں میں سے ایک ایک کے لیے گراں بہا تحفے مہیا کیے گئے اور نہایت سروسامان سے یہ سفارت حبش کو روانہ ہوئی[۲]۔ یہ سفرا ر نجاشی سے پہلے درباریوں سے ملے اور ان کی خدمت میں نذریں پیش کیں اور کہا کہ ہمارے شہر کے چند نادانوں نے ایک نیا مذہب ایجاد کیا ہے، ہم نے ان کو نکال دیا

---

(۱) مسند احمد ج ۱ ص ۲۰۲، س (۲) ابن ہشام نے لکھا ہے کہ مکہ کا بڑا تحفہ چمڑا تھا، اور کتابوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اہلِ مکہ شام وغیرہ کو جو مال تجارت لے جاتے تھے، وہ بھی چمڑا ہوتا تھا۔ (مسند امام ابن حنبل میں تصریح ہے کہ یہ تحفہ چمڑا ہی تھا، مسند اہل البیت)

تو آپ کے مُلک میں بھاگ آئے، کل ہم بادشاہ کے دربار میں اُن کے متعلق جو درخواست پیش کریں، آپ بھی ہماری تائید فرمائیں۔ دوسرے دن سفراء دربار میں گئے اور نجاشی سے درخواست کی کہ ہمارے مجرم ہم کو حوالہ کر دیے جائیں، درباریوں نے بھی تائید کی۔ نجاشی نے مسلمانوں کو بُلا بھیجا اور کہا "تم نے یہ کون سا دین ایجاد کیا ہے جو نصرانیت اور بُت پرستی دونوں کے مخالف ہے"؟

مسلمانوں نے اپنی طرف سے گفتگو کرنے کے لیے حضرت جعفر رضؓ (حضرت علیؓ کے بھائی) کو انتخاب کیا، اُنھوں نے اس طرح تقریر شروع کی:

"اَیُّھَا الْمَلِکُ! ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے، بُت پوجتے تھے، مُردار کھاتے تھے، بدکاریاں کرتے تھے، ہمسایوں کو ستاتے تھے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا، قوی لوگ کمزوروں کو کھا جاتے تھے، اس اثنا میں ہم میں ایک شخص پیدا ہُوا جس کی شرافت اور صدق و دیانت سے ہم لوگ پہلے سے واقف تھے، اُس نے ہم کو اسلام کی دعوت دی اور یہ سکھایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں، سچ بولیں، خونریزی سے باز آئیں، یتیموں کا مال نہ کھائیں، ہمسایوں کو آرام دیں، عفیف عورتوں پر بدنامی کا داغ نہ لگائیں، نماز پڑھیں، روزے رکھیں، زکوٰۃ دیں، ہم اس پر ایمان لائے، شرک اور بت پرستی چھوڑ دی اور تمام اعمالِ بد سے باز آئے۔ اس جُرم پر ہماری قوم ہماری جان کی دُشمن ہوگئی اور ہم کو مجبور کرتی ہے کہ اُسی گمراہی میں واپس آجائیں"۔

نجاشی نے کہا "جو کلامِ الٰہی تمھارے پیغمبر پر اُترا ہے کہیں سے پڑھو"۔ حضرت جعفر رضؓ نے سورہ مریم کی چند آیتیں پڑھیں، نجاشی پر رقت طاری ہُوئی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ پھر کہا "خدا کی قسم یہ کلام اور انجیل دونوں ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں"! یہ کہہ کر سفرائے قریش سے کہا، تم واپس

جاؤ میں ان مظلوموں کو ہرگز واپس نہ دوں گا۔[۱]

دوسرے دن عمرو بن العاص نے پھر دربار میں رسائی حاصل کی اور نجاشی سے کہا۔ حضور! آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ لوگ حضرت عیسٰیؑ کی نسبت کیا اعتقاد رکھتے ہیں؟ نجاشی نے مسلمانوں کو بُلا بھیجا کہ اس سوال کا جواب دیں، ان لوگوں کو تردّد ہُوا کہ اگر حضرت عیسٰیؑ کے ابن اللہ ہونے سے انکار کرتے ہیں تو نجاشی عیسائی ہے ناراض ہو جائے گا۔ حضرت جعفرؓ نے کہا کچھ ہو ہم کو سچ بولنا چاہیے۔

غرض یہ لوگ دربار میں حاضر ہُوئے۔ نجاشی نے کہا تم لوگ عیسٰیؑ بن مریم کے متعلق کیا اعتقاد رکھتے ہو؟ حضرت جعفرؓ نے کہا "ہمارے پیغمبر نے بتایا ہے کہ "عیسٰی خدا کا بندہ اور پیغمبر اور کلمۃ اللہ ہے"۔ نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اُٹھا لیا اور کہا "واللہ جو تم نے کہا عیسٰی اس تنکے کے برابر بھی اس سے زیادہ نہیں ہیں"۔[۱] بطریق جو دربار میں موجود تھے نہایت برہم ہُوئے۔ نتھنوں سے خرخراہٹ کی آواز آنے لگی۔ نجاشی نے ان کے غصے کی کچھ پروا نہ کی اور قریش کے سفیر بالکل ناکامیاب آئے۔[۲]

---

(۱) مستدرک حاکم ج ۱ ص ۱۰۳ کتاب التفسیر) "س" (۲) مارگوس صاحب نے ہجرت حبش کی بھی بڑی نازک اور دُور از نظر وجہ تلاش کر کے پیدا کی ہے، فرماتے ہیں کہ جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دیکھا کہ قریش سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے اور یہ پہلے سُنا تھا . . . . کہ کعبہ کے گرانے کے لیے ابرہۃ الاشرم جو آیا تھا وہ حبش ہی کا تھا، اس لیے انھوں نے چاہا کہ بادشاہ حبش سے سازش کر کے اس کو مکہ پر حملہ کرنے کی ترغیب دیں تاکہ قریش کا زور ٹوٹ جائے۔ اسی غرض سے ہجرت کا بہانہ کر کے اپنے اصحاب کو حبش

اسی اثنا میں کسی دشمن نے نجاشی کے ملک پر حملہ کیا، نجاشی اس کے مقابلے کے لیے خود گیا۔ صحابہؓ نے مشورہ کیا کہ ہم میں سے ایک شخص جائے اور خبر بھیجتا رہے کہ اگر ضرورت ہو تو ہم بھی نجاشی کی مدد کے لیے آئیں۔ حضرت زبیرؓ اگرچہ سب سے زیادہ کمسن تھے، لیکن انھوں نے اس خدمت کے لیے اپنے کو پیش کیا۔ مشک کے سہارے دریائے نیل تیر کر رزمگاہ میں پہنچے۔ ادھر صحابہؓ نجاشی کی فتح کے لیے خدا سے دعا مانگتے تھے۔ چند روز کے بعد حضرت زبیرؓ واپس آئے اور خوشخبری سنائی کہ نجاشی کو خدا نے فتح دی ۵ +

حبش میں کم و بیش ۸۳ مسلمان ہجرت کر کے گئے۔ چند روز آرام سے گزرنے پائے تھے کہ یہ خبر مشہور ہوئی کہ کفار نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ یہ سن کر اکثر صحابہؓ نے مکہ معظمہ کا رخ کیا، لیکن شہر کے قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط ہے۔ اس لیے بعض لوگ واپس چلے گئے اور اکثر چھپ چھپ کر مکہ میں آگئے +

یہ روایت طبری اور اکثر تاریخوں میں مذکور ہے، اور ممکن ہے کہ صحیح ہو، لیکن ان کتابوں میں اس خبر کے مشہور ہونے کی وجہ یہ لکھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۲) بھیجا، لیکن پھر سمجھے کہ نجاشی اگر مکہ میں آیا تو خود مکہ پر قابض ہو جائے گا، مجھ کو کیا ہاتھ آئے گا؟ اس بنا پر اس ارادے سے باز رہے"۔ یہ بالکل بے ثبوت بات ہے۔

صاحب موصوف کو حضرت جعفرؓ کی تقریر و مکالمت میں اس بنا پر شک ہے کہ نجاشی عربی زبان سے ناواقف تھا، حالانکہ اس زمانہ میں (اولاً تو) عربی زبان عام طور سے حبش میں بے تکلف لوگ سمجھ سکتے تھے، کہ یہ دونوں زبانیں باہم قریب ہیں۔ ثانیاً درباروں میں ترجمان ہوتے تھے۔ جیسا کہ ابوسفیان اور قیصر روم کے باہمی مکالمہ میں مذکور ہے، بخاری باب بدء الوحی ۵ "س ۱"

علیہ وسلم نے حرم میں ایک دفعہ نماز ادا کی۔ کفار بھی موجود تھے۔ جب آپؐ نے یہ آیت پڑھی وَمَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الْاُخْرٰی تو شیطان نے آپؐ کی زبان سے یہ الفاظ نکلوا دیے:

تِلْكَ الْغَرَانِيقُ الْعُلٰی وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰی، یعنی (یہ بت اعظم و محترم ہیں، اور ان کی شفاعت مقبول ہے)

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کیا اور تمام کفار نے آپ کی متابعت کی۔ (اس روایت کا یہ آخری حصہ کہ چند کافروں کے سوا تمام جن و انس نے حضورؐ کے ساتھ ایک دفعہ سجدہ کیا صحیح ہے، جیسا کہ صحیح بخاری باب[1] (قوله فاسجدوا لله واعبدوا) میں مذکور ہے، مگر باقی) قصہ بیہودہ اور ناقابلِ ذکر ہے اور اکثر کبار محدثین مثلاً بیہقی، قاضی عیاض، علامہ عینی، حافظ منذری، علامہ نوویؒ نے اس کو باطل اور موضوع لکھا ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ بہت سے محدثین نے اس روایت کو بہ سند نقل کیا ہے۔ ان میں طبری، ابن ابی حاتم، ابن المنذر، ابن مردویہ، ابن اسحاق، موسیٰ بن عقبہ، ابو معشر[2] شہرت عام رکھتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر تعجب یہ ہے کہ حافظ ابن حجر کو جن کے کمالِ فن حدیث پر زمانے کا اتفاق ہے، اس روایت کی صحت پر اصرار ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں[3]:

---

(۱) کتاب التفسیر سورۂ نجم ص ۱ ۲ دیکھو زرقانی بر مواہب لدنیہ و شفائے قاضی عیاض و عینی شرح بخاری، تفسیر سورۂ نجم و نور النبراس، علامہ نووی کے یہ الفاظ ہیں، لا یصح فیہ شیء لا من جھۃ النقل ولا من جھۃ العقل، اور علامہ عینی لکھتے ہیں فلا صحۃ لہ نقلا ولا عقلا ۳ دیکھو مواہب لدنیہ اور زرقانی واقعہ ہجرت حبشہ

۴ زرقانی بر مواہب جلد اوّل صفحہ ۳۳۰۔

وَقد ذکرنا ان ثلاثۃ اسانید	ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ اس روایت
منھا علیٰ شرط الصحیح و	کی تین سندیں صحیح کی شرط کے موافق ہیں
ھی مراسیل یحتج بمثلھا	اور یہ روایتیں مُرسل ہیں اور اُن سے وہ لوگ
من یحتج بالمراسیل ۔	استدلال کر سکتے ہیں جو مرسل روایتوں کے قائل
	ہیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ کفار کی عادت تھی کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید کی تلاوت کرتے تو شور مچاتے اور اپنی طرف سے فقرے ملا دیتے۔ قرآن مجید کی آیت ذیل میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے :

لَا تَسْمَعُوْا لِھٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا	اس قرآن کو نہ سُنو، اور اس میں گڑبڑ
فِیْہِ لَعَلَّکُمْ تَغْلِبُوْنَ ۝ (حٰمٓ السجدۃ)	کر دو شاید تم غالب آؤ ۔

قریش کا معمول تھا کہ جب کعبہ کا طواف کرتے تو یہ فقرے کہتے جاتے[1] :

واللات والعزی ومناۃ	لات اور عزیٰ اور تیسرے بُت مناۃ کی
الثالثۃ الاُخریٰ فانھن الغرانیق	قسم یہ بلند و بزرگ ہیں، اور ان کی
العلیٰ وان شفاعتھن لترتجی ،	شفاعت کی اُمید ہے ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سورۂ النجم کی وہ آیتیں پڑھیں تو کسی شیطان (کافر) نے یہی فقرے آپؐ کی آواز میں ملا کر پڑھ دیے ہوں گے۔ دُور کے لوگوں کو (کفار میں سے) شبہہ ہُوا ہو گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے وہ الفاظ ادا کیے' اس واقعہ کا چرچا جب مسلمانوں میں ہُوا ہو گا، تو لوگوں نے کہا ہو گا کہ کسی شیطان نے آپؐ کی طرف سے وہ فقرے کہہ دیے ہوں گے۔ اس واقعہ نے روایتوں میں

---

[1] معجم البلدان لفظ عزیٰ ۔

بدل بدل کر یہ صورت اختیار کر لی کہ شیطان نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ الفاظ نکلوا دیے، اور چونکہ عام مسلمان اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ شیطان دوسرے شخص کی زبان سے بول سکتا ہے، اس لیے راویوں نے اس روایت کو تسلیم کر لیا۔

یہ صرف قیاس نہیں بلکہ اگلے محققین نے بھی تصریح کی ہے۔ مواہب میں ہے:

قیل انه لما وصل الی قوله ومنوة الثالثة الاخریٰ خشی المشرکون ان یاتی بعدها بشیٔ یذم الھتھم فبادروا الیٰ ذلک الکلام فخلطوہ فی تلاوة النبی صلی اللہ علیہ وسلم علیٰ عادتھم فی قولھم لا تسمعوا لھٰذا القراٰن و الغوا فیہ او المراد بالشیطان شیطان الانس۔	بعض لوگوں نے کہا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت پر پہنچے ومناة الثالثة الاخریٰ تو مشرکوں کو یہ ڈر پیدا ہوا کہ اب آگے معبودوں کی کچھ برائی کا بیان ہوگا، اس بنا پر انھوں نے جھٹ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت میں یہ فقرے خلط کر کے پڑھ دیے، جیسا کہ اُن کی عادت تھی کہ کہتے کہ قرآن پر کان نہ لگاؤ اور اس میں گڑبڑ مچا دو، یا شیطان سے شیطان آدمی مراد ہے۔

جو لوگ حبش سے واپس آگئے تھے، اہل مکہ نے اب اُن کو اور زیادہ ستانا شروع کیا، اور اس قدر اذیت دی کہ دوبارہ ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے لیکن اب کی ہجرت کچھ آسان نہ تھی، کفار نے سخت مزاحمت کی، تاہم جس طرح ہو سکا بہت سے صحابہ جن کی تعداد قریباً سو تک پہنچتی ہے، مکہ سے نکل گئے، اور حبش میں اقامت اختیار کی، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کو ہجرت کی تو

کچھ لوگ فوراً واپس چلے آئے اور جو لوگ رہ گئے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۶ھ میں اُن کو بُلا لیا[2]۔

کفار کی ایذا و تعدی اب کمزوروں اور بیکسوں پر محدود نہ تھی۔ حضرت ابوبکرؓ کا قبیلہ معزز اور طاقتور قبیلہ تھا، اُن کے یار اور انصار بھی کم نہ تھے۔ تاہم وہ بھی کفار کے ظلم سے تنگ آ گئے اور بالآخر حبش کی ہجرت کا ارادہ کیا، برک الغماد جو مکہ معظمہ سے یمن کی سمت پانچ دن کی راہ ہے، وہاں تک پہنچے تھے، کہ ابن الدغنہ سے ملاقات ہو گئی جو قبیلہ قارہ کا رئیس تھا، اُس نے پوچھا کہاں؟ حضرت ابوبکرؓ نے کہا "میری قوم مجھ کو رہنے نہیں دیتی، چاہتا ہوں کہ کہیں الگ جا کر خدا کی عبادت کروں"۔ ابن الدغنہ نے کہا "یہ نہیں ہو سکتا کہ تم جیسا شخص مکہ سے نکل جائے، میں تم کو اپنی پناہ میں لیتا ہوں"۔ تو حضرت ابوبکرؓ اس کے ساتھ واپس آئے۔ ابن الدغنہ مکہ پہنچ کر تمام سرداران قریش سے ملا اور کہا کہ "ایسے شخص کو نکالتے جو مہمان نواز ہے، مفلسوں کا مددگار ہے، رشتہ داروں کو پالتا ہے، مصیبتوں میں کام آتا ہے"۔ قریش نے کہا لیکن شرط یہ ہے کہ ابوبکر نمازوں میں چپکے جو چاہیں پڑھیں، آواز سے قرآن پڑھتے ہیں تو ہماری عورتوں اور بچوں پر اثر پڑتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے چند روز یہ پابندی اختیار کی، لیکن آخر انھوں نے گھر کے پاس ایک مسجد بنالی، اور اس میں خضوع و خشوع

---

[1] یہ تمام تفصیل طبقات ابن سعد میں ہے بعض مؤرخوں نے اس ہجرت ثانیہ کا ذکر نہیں کیا اور بعض نے نہایت اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

[2] زرقانی بر مواہب جلد اول صفحہ ۳۳۴ ذکر ہجرت ثانیہ حبش۔

کے ساتھ بہ آواز قرآن پڑھتے تھے۔ وہ نہایت رقیق القلب تھے۔ قرآن پڑھتے تو بے اختیار روتے۔ عورتیں اور بچے ان کو دیکھتے اور متاثر ہوتے۔ قریش نے ابن الدّغنہ سے شکایت کی۔ اس نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ اب میں تمہاری حفاظت کا ذمّہ دار نہیں ہو سکتا۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا "مجھ کو خدا کی حفاظت بس ہے میں تمہارے جوار سے استعفا دیتا ہوں"[۱]۔

محرم ۷ نبویؐ
شعبِ ابوطالب میں محصور ہونا

قریش دیکھتے تھے کہ اس روک ٹوک پر بھی اسلام کا دائرہ پھیلتا جاتا ہے۔ عمرؓ اور حمزہؓ جیسے لوگ ایمان لا چکے۔ نجاشی نے مسلمانوں کو پناہ دی۔ سفرا بے نیل مرام واپس آئے۔ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اس لیے اب یہ تدبیر سوچی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے خاندان کو محصور کر کے تباہ کر دیا جائے۔ چنانچہ تمام قبائل نے ایک معاہدہ مرتب کیا کہ "کوئی شخص نہ خاندانِ بنی ہاشم سے قرابت کرے گا نہ اُن کے ہاتھ خرید و فروخت کرے گا، نہ اُن کے پاس کھانے پینے کا سامان جانے دے گا، جب تک وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کے لیے حوالہ نہ کر دیں[۲]"۔ یہ معاہدہ منصور بن عکرمہ نے لکھا، اور درِ کعبہ پر آویزاں کیا گیا۔

ابوطالب مجبور ہو کر تمام خاندانِ ہاشم کے ساتھ شعبِ ابوطالب[۳] میں پناہ گزین

---

[۱] یہ پوری تفصیل صحیح بخاری باب ہجرت مدینہ میں ہے۔ [۲] اس معاہدہ کا ذکر طبری نے اور ابن سعد وغیرہ نے تفصیل سے کیا ہے۔ لیکن یہ الفاظ کہ "وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کے لیے حوالہ کر دیں" صرف مواہب لدنیہ میں مذکور ہیں۔ [۳] یہ پہاڑ ایک درہ تھا، جو خاندان بنو ہاشم کا موروثی تھا۔

ہوئے۔ تین سال تک بنو ہاشم نے اس حصار میں بسر کی، یہ زمانہ ایسا سخت گزرا کہ طلح کے پتے کھا کھا کر رہتے تھے۔ حدیثوں میں جو صحابہ رضؓ کی زبان سے مذکور ہے کہ ہم طلح کی پتیاں کھا کھا کر بسر کرتے تھے۔ یہ اسی زمانہ کا واقعہ ہے۔ چنانچہ سہیلی نے روض الانف میں تصریح کی ہے۔ حضرت سعد وقاص کا بیان ہے کہ ایک دفعہ رات کو سوکھا ہوا چمڑا ہاتھ آ گیا، میں نے اس کو پانی سے دھویا، پھر آگ پر بھونا اور پانی میں ملا کر کھایا۔[1]

ابن سعد نے روایت کی ہے کہ بچے، جب بھوک سے روتے تھے تو باہر آواز آتی تھی، قریش سن سن کر خوش ہوتے تھے۔ لیکن بعض رحم دلوں کو ترس بھی آتا تھا۔ ایک دن حکیم بن حزام نے جو حضرت خدیجہ رضؓ کا بھتیجا تھا، تھوڑے سے گیہوں اپنے غلام کے ہاتھ حضرت خدیجہ رضؓ کے پاس بھیجے، راہ میں ابوجہل نے دیکھ لیا اور چھین لینا چاہا، اتفاق سے ابو البختری کہیں سے آ گیا۔ وہ اگرچہ کافر تھا، لیکن اس کو رحم آیا اور کہا کہ ایک شخص اپنی پھوپھی کو کچھ کھانے کے لیے بھیجتا ہے تو کیوں روکتا ہے!!

متصل تین برس تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام آلِ ہاشم نے یہ مصیبتیں جھیلیں، بالآخر دشمنوں ہی کو رحم آیا اور خود انہی کی طرف سے اس معاہدہ کے توڑنے کی تحریک ہوئی۔ ہشام عامری خاندانِ بنی ہاشم کا قریبی رشتہ دار اور اپنے قبیلہ میں ممتاز تھا، وہ چوری چھپے بنو ہاشم کو غلہ وغیرہ بھیجتا رہتا تھا۔ ایک دفعہ وہ زہیر کے پاس جو ابو المطلب کے نواسے تھے، گیا اور کہا "کیوں زہیر! تم کو یہ پسند ہے کہ تم کھاؤ پیو، ہر قسم کا لطف اٹھاؤ اور تمہارے ماموں کو ایک دانہ تک نصیب نہ ہو"؟ زہیر نے کہا "کیا کروں تنہا ہوں، ایک شخص بھی

---

[1] روض الانف،

میرا ساتھ دے تو مَیں اس ظالمانہ معاہدہ کو پھاڑ کر پھینک دوں"۔ ہشام نے کہا مَیں موجود ہوں۔ دونوں مل کر مطعم بن عدی کے پاس گئے۔ ابوالبختری ابن ہشام، زمعہ بن الاسود نے بھی ساتھ دیا۔ دوسرے دن سب مل کر حرم میں گئے۔ زہیر نے سب لوگوں کو مخاطب کر کے کہا، "اے اہلِ مکہ! یہ کیا انصاف ہے! ہم لوگ آرام سے بسر کریں اور بنو ہاشم کو آب و دانہ نصیب نہ ہو۔ خدا کی قسم جب تک یہ ظالمانہ معاہدہ چاک نہ کر دیا جائے گا مَیں باز نہ آؤں گا"۔ ابوجہل برابر سے بولا "ہرگز اس معاہدہ کو کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا"۔ زمعہ نے کہا تو جھوٹ کہتا ہے، جب یہ لکھا گیا تھا، اُس وقت بھی ہم راضی نہ تھے۔ غرض مطعم نے ہاتھ بڑھا کر دستاویز چاک کر دی مطعم بن عدی، عدی بن قیس، زمعہ بن الاسود، ابوالبختری، زہیر سب ہتھیار باندھ باندھ کر بنو ہاشم کے پاس گئے اور اُن کو درہ سے نکال لائے۔[1] بقول ابن سنہ نبوی کا واقعہ ہے۔ اسی زمانہ میں **معراج** واقع ہوئی، جس کی تفصیل تیسرے حصّہ میں آئے گی۔ اسی زمانہ میں نماز پنجگانہ فرض ہوئی +

سنہ نبوی، حضرت خدیجہؓ اور ابو طالب کی وفات

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اب شعب ابی طالب سے نکلے تھے اور چند روز قریش کے جور و ظلم سے امان ملی تھی کہ ابو طالب اور حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہو گیا +

ابو طالب کی وفات کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے پاس تشریف لے گئے۔ ابوجہل اور عبداللہ بن ابی امیہ پہلے سے موجود تھے۔ آپؐ نے

---

[1] یہ تفصیل ابن ہشام، طبری وغیرہ میں مذکور ہے۔ اخیر واقعہ صرف ابن سعد نے بیان کیا ہے۔

فرمایا "مرتے مرتے لا الٰہ الا اللہ کہ دیجیے کہ میں خدا کے ہاں آپ کے ایمان کی شہادت دوں۔" ابو جہل اور ابن ابی امیہ نے کہا "ابو طالب! کیا تم عبد المطلب کے دین سے پھر جاؤ گے؟" بالآخر ابو طالب نے کہا "میں عبد المطلب کے دین پر مرتا ہوں۔" پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف خطاب کر کے کہا "میں وہ کلمہ کہ دیتا، لیکن قریش کہیں گے کہ موت سے ڈر گیا۔" آپ نے فرمایا، "میں آپ کے لیے دعائے مغفرت کروں گا، جب تک کہ خدا مجھ کو اس سے منع نہ کر دے[1]۔"

یہ بخاری اور مسلم کی روایت ہے۔ ابن اسحاق کی روایت ہے کہ مرتے وقت ابو طالب کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ حضرت عباسؓ (جو اس وقت تک کافر تھے) کان لگا کر سنا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا "کہ تم نے جس کلمہ کے لیے کہا تھا، ابو طالب وہی کہ رہے ہیں[2]۔"

اس بنا پر ابو طالب کے اسلام کے متعلق اختلاف ہے۔ لیکن چونکہ بخاری کی روایت عموماً صحیح تر مانی جاتی ہے، اس لیے محدثین زیادہ تر ان کے کفر ہی کے قائل ہیں۔

لیکن محدثانہ حیثیت سے بخاری کی یہ روایت چنداں قابل حجت نہیں کہ اخیر راوی مسیّب ہیں، جو فتح مکہ میں اسلام لائے اور ابو طالب کی وفات کے وقت موجود نہ تھے۔ اسی بنا پر علامہ عینی نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ "روایت مرسل[3] ہے۔" ابن اسحاق کے سلسلہ روایت میں عباس

---

[1] صحیح بخاری باب الجنائز اور مسلم، ابو طالب کا اخیر فقرہ مسلم میں ہے، بخاری میں نہیں۔

[2] ابن ہشام مطبوعہ مصر صفحہ ۱۴۶ [3] عینی کتاب الجنائز (ج ۴ صفحہ ۲) س۔

بن عبداللہ بن معید، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ ہیں، یہ دونوں ثقہ ہیں، لیکن بیچ کا ایک راوی یہاں بھی رہ گیا ہے۔ اس بنا پر دونوں روایتوں کے درجہ استناد میں چنداں فرق نہیں (۱)۔

ابو طالب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جو جاں نثاریاں کیں، اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ وہ اپنے جگر گوشوں کو آپؐ پر نثار کرتے تھے، آپؐ کی محبت میں تمام عرب کو اپنا دشمن بنا لیا، آپؐ کی خاطر محصور ہوئے، فاقے

---

(۱) مصنف کے اس نظریہ سے مجھے اتفاق نہیں ہے، اس لیے کہ بخاری کی روایت کے آخری راوی حضرت مسیبؓ ہیں، جو صحابی ہیں، ظاہر ہے کہ صحابی کی روایت کسی صحابی ہی سے ہوگی، اسی لیے مراسیلِ صحابہ حجت ہیں اور ابن اسحاق کی روایت منقطع ہے اور چھوٹا ہوا راوی صحابی نہیں ہے۔ خود ابن اسحاق بھی استناد کا اعلیٰ درجہ نہیں رکھتے، اس لیے دونوں روایتوں کو یکساں نہیں قرار دیا جا سکتا۔

علاوہ بریں حضرت مسیبؓ کی اس روایت کی تائید میں خود حضرت عباسؓ کی وہ روایت ہے جو اسی مسیب والی روایت سے اوپر صحیح بخاری میں موجود ہے، جس میں ذکر ہے کہ حضرت عباسؓ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہؐ آپ کے چچا (ابو طالب) کو آپ سے کیا فائدہ پہنچا کہ وہ آپؐ کی حفاظت کرتے تھے، اور آپ کے لیے آپ کے دشمنوں سے برسرِ پرخاش رہتے تھے۔ فرمایا، وہ دوزخ کی آگ میں صرف ٹخنے تک ہیں، مگر اس کا اثر بھی دماغ تک پہنچ جاتا ہے۔ اگر میں نہ ہوتا تو وہ دوزخ کے سب سے نیچے طبقہ میں ہوتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خود حضرت عباسؓ کے علم میں تھا کہ ان کا خاتمہ توحید کے اقرار پر نہیں ہوا۔ اسی مضمون کی روایت حضرت ابو سعید خدریؓ سے بھی ہے جو صحیح بخاری باب قصہ ابی طالب میں اسی موقع پر موجود ہے۔ "س" ۱۲

اٹھائے، شہر سے نکالے گئے، تین تین برس تک آب و دانہ بند رہا۔ کیا یہ محبت، یہ جوش، یہ جان نثاریاں سب ضائع جائیں گی؟

ابوطالب، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ۳۵ برس عمر میں بڑے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن سے نہایت محبت تھی۔ ایک دفعہ وہ بیمار پڑے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن کی عیادت کے لیے گئے تو انھوں نے کہا "بھتیجے! جس خدا نے تجھ کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے اس سے دعا نہیں مانگتا، کہ مجھ کو اچھا کر دے!" آپؐ نے دعا کی اور وہ اچھے ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا خدا تیرا کہنا مانتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ "آپ بھی اگر خدا کا کہنا مانیں تو وہ بھی آپ کا کہنا مانے"[1]۔

ابوطالب کی وفات کے چند ہی روز بعد حضرت خدیجہ رضؓ نے بھی وفات کی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ انھوں نے ابوطالب سے پہلے انتقال کیا۔ اب آپؐ کے مددگار اور غمگسار دونوں اُٹھ گئے۔ صحابہ خود اپنی حالت میں مبتلا تھے، یہی زمانہ ہے جو اسلام کا سخت ترین زمانہ ہے، اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سال کو عام الحزن (سالِ غم) فرمایا کرتے تھے[2]۔

حضرت خدیجہ رضؓ نے رمضان سنہ ۱۰ نبوی میں وفات کی۔ اُن کی عمر ۶۵ برس کی تھی، مقام حجون میں دفن کی گئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود اُن کی قبر میں اُترے، اس وقت تک نمازِ جنازہ مشروع نہیں ہوئی تھی[3]۔

ابوطالب اور حضرت خدیجہ رضؓ کے اُٹھ جانے کے بعد قریش کو کس کا پاس تھا؟ اب وہ نہایت بے رحمی و بے باکی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ستاتے

---

[1] اصابہ فی احوال الصحابہ ذکر ابوطالب [2] مواہب لدنیہ [3] یہ تفصیل ابن سعد میں ہے۔

تھے۔ ایک دفعہ آپؐ راہ میں جا رہے تھے، ایک شقی نے آکر فرقِ مبارک پر خاک ڈال دی۔ اسی حالت میں آپؐ گھر میں تشریف لائے، آپؐ کی صاحبزادی نے دیکھا تو پانی لے کر آئیں، آپؐ کا سر دھوتی تھیں اور جوشِ محبت سے رو تی جاتی تھیں۔ آپؐ نے فرمایا: جانِ پدر! روؤ نہیں، خدا تیرے باپ کو بچا لے گا۔[۱]

اہلِ مکہ سے تو قطعی نا اُمیدی تھی، اس لیے آپؐ نے ارادہ فرمایا کہ طائف تشریف لے جائیں اور وہاں دعوتِ اسلام فرمائیں۔ طائف میں بڑے بڑے اُمرا اور اربابِ اثر رہتے تھے۔ ان میں عمیر کا خاندان رئیس القبائل تھا، یہ تین بھائی تھے۔ عبد یالیل، مسعود، حبیب، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے پاس گئے اور اسلام کی دعوت دی۔ ان تینوں نے جو جواب دیے، وہ نہایت عبرت انگیز تھے۔ ایک نے کہا "اگر تجھ کو خدا نے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے تو کعبہ کا پردہ چاک کر رہا ہے!" دوسرے نے کہا "کیا خدا کو تیرے سوا اور کوئی نہیں ملتا تھا"، تیسرے نے کہا "میں بہر حال تجھ سے بات نہیں کر سکتا تو اگر سچا ہے تو تجھ سے گفتگو کرنا خلافِ ادب ہے اور جھوٹا ہے تو گفتگو کے قابل نہیں!"

ان بدبختوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، طائف کے بازاریوں کو اُبھار دیا کہ آپؐ کی ہنسی اُڑائیں۔ شہر کے اوباش ہر طرف سے ٹوٹ پڑے۔ یہ مجمع دو رُویہ صف باندھ کر کھڑا ہوا۔ جب آپ اُدھر سے گزرے تو آپؐ کے پاؤں پر پتھر مارنے شروع کیے، یہاں تک کہ آپؐ کی جوتیاں خون سے بھر گئیں۔ جب آپؐ

---

[۱] طبری اور ابن ہشام ذکرِ وفات حضرت خدیجہ رضؓ۔

زخموں سے چور ہو کر بیٹھ جاتے تو بازو تھام کر کھڑا کر دیتے۔ جب آپؐ پھر چلنے لگتے تو پتھر برساتے، ساتھ ساتھ گالیاں دیتے، اور تالیاں بجاتے جاتے[1] آخر آپؐ نے ایک باغ میں انگور کی ٹٹیوں میں پناہ لی۔ یہ باغ عتبہ بن ربیعہ کا تھا جو باوجود کفر کے شریف الطبع اور نیک نفس تھا۔ اس نے آپؐ کو اس حالت میں دیکھا تو اپنے غلام کے ہاتھ جس کا نام عداس تھا، انگور کا خوشہ ایک کشتی میں رکھ کر بھیجا۔

اس سفر میں حضرت زیدؓ بن حارثہ بھی ساتھ تھے[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف سے پھر کر چند روز نخلہ میں قیام کیا، پھر حرا میں تشریف لائے اور مطعم بن عدی کے پاس پیغام بھیجا کہ مجھ کو اپنی حمایت میں لے سکتے ہو۔ عرب کا شعار تھا کہ جب کوئی اُن سے طالب حمایت ہوتا تو گو دشمن ہوتا انکار نہیں کر سکتے تھے۔ مطعم نے درخواست منظور کی، بیٹوں کو بلا کر

---

[1] یہ پوری تفصیل مواہب لدنیہ بحوالہ موسیٰ بن عقبہ اور طبری و ابن ہشام میں ہے [2] کیا عجیب بات ہے کہ ایک ہی واقعہ دو مختلف نگاہوں کو کس طرح مختلف نظر آتا ہے مارگولیوس نے (نعوذ باللہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سفر کو سوء تدبیر میں داخل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ طائف مکہ سے بالکل قریب اور ان کے زیر اثر تھا اور وہاں رؤسائے مکہ کے باغ تھے، جس کی وجہ سے اُن کی آمد و رفت رہتی تھی۔ اس سبب مکہ کے تمام رؤسا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تھے، تو طائف کے لوگوں سے کیا امید ہو سکتی تھی؟ سر ولیم میور صاحب لکھتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا زور اعتقاد اور اعتماد علی النفس تھا کہ باوجود تمام ناکامیوں کے وہ تنہا ایک مخالف شہر میں گئے اور تبلیغ کا فرض ادا کیا۔ ع

والفضل ما شہدت بہ الاعداء

کہا کہ "ہتھیار لگا کر حرم میں جاؤ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تشریف لائے مطعم اونٹ پر سوار تھا، حرم کے پاس آیا تو پکارا کہ میں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پناہ دی ہے" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حرم میں آئے، نماز ادا کی اور دولت خانہ کو واپس گئے۔ مطعم اور اس کے بیٹے آپ کو تلواروں کے سایہ میں لائے[1]۔

مطعم نے کفر کی حالت میں غزوۂ بدر سے پہلے وفات کی۔ حضرت حسان رض جو دربارِ رسالت کے شاعر تھے، انھوں نے مرثیہ لکھا، زرقانی نے یہ مرثیہ بدر میں نقل کیا ہے[2] اور لکھا ہے کہ اس میں کچھ مضائقہ نہیں، مطعم کا یہ کام بے شبہ مدح کا مستحق تھا۔ لیکن آجکل کے مسلمان حضرت حسان رض اور زرقانی سے زیادہ شیفتہ اسلام ہیں، اس لیے معلوم نہیں حضرت حسان رض کا یہ فعل آج بھی پسند کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

قبائل کا دورہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا، جب حج کا زمانہ آتا اور عرب کے قبائل ہر طرف سے آ کر مکہ کے آس پاس اترتے تو آپ ایک ایک قبیلہ کے پاس جاتے اور تبلیغ اسلام فرماتے۔ عرب میں مختلف مقامات پر میلے لگتے تھے، جن میں دُور دُور کے قبائل آتے تھے۔ آپ ان میلوں میں جاتے اور اسلام کی تبلیغ فرماتے۔

ان میلوں میں سے **عکاظ** جو اہلِ عرب کا قومی اور علمی دنگل تھا، اور مجنّہ اور ذوالمجاز کا نام مورخین نے خاص طور پر لیا ہے۔ قبائل عرب میں سے بنو عامر، محارب، فزارہ، غسّان، مرّہ، حنیفہ، سلیم، عبس، بنو نصر، کندۃ، کلب، حارث بن کعب، عذرہ، حضارمہ، مشہور قبائل ہیں[3]۔ ان سب قبائل کے پاس

---

[1] ابن سعد صفحہ ۱۴۲ کسی قدر تفصیل مواہب لدنیہ سے اضافہ کی گئی جو ابن اسحاق کی روایت ہے۔ تعجب ہے کہ ابن ہشام نے یہ واقعات قلم انداز کیے ہیں۔ [2] زرقانی جلد اوّل صفحہ ۵۱۶ [3] ابن سعد نے ان تمام قبائل کا ذکر کیا ہے۔

آپؐ تشریف لے گئے، لیکن **ابولہب** ہر جگہ ساتھ ساتھ جاتا، اور جب آپؐ کسی مجمع میں تقریر کرتے تو برابر سے کہتا کہ "دین سے پھر گیا ہے اور جھوٹ کہتا ہے۔"[1]

بنی حنیفہ یمامہ میں آباد تھے، ان لوگوں نے نہایت تلخی کے ساتھ جواب[2] دیا، مسیلمہ کذاب جس نے آگے چل کر نبوت کا دعویٰ کیا، اسی قبیلے کا رئیس تھا۔ قبیلہ بنوذہل بن شیبان کے پاس جب آپؐ گئے تو حضرت ابوبکرؓ بھی ساتھ تھے، حضرت ابوبکرؓ نے مفروق سے کہا "تم نے کسی پیغمبر کا تذکرہ سنا ہے؟ وہ یہی ہیں۔" مفروق نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رخ کر کے کہا "برادر قریش، تم کیا تلقین کرتے ہو"؟ آپؐ نے فرمایا "خدا ایک ہے، اور میں اس کا پیغمبر ہوں۔" اور یہ آیتیں پڑھیں:

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَنْ لَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ (انعام-۱۹)	کہ دو کہ آؤ میں تمہیں سناؤں کہ خدا نے کیا چیزیں حرام کی ہیں، یہ کہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، اور والدین کا حق خدمت بجالاؤ، اور اپنے بچوں کو افلاس کے خیال سے قتل نہ کرو۔ ہم تم کو اور ان کو دونوں کو روزی دیں گے۔ مخش باتوں کے پاس نہ جاؤ، وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ اور آدمی کی جان جس کو خدا نے حرام کیا ہے، ناحق ہلاک نہ کرو۔

---

[1] مستدرک حاکم جلد اول ص۱۵ حیدر آباد "س" [2] ابن ہشام

اس قبیلہ کے رؤسا، مفروق، مثنیٰ، اور ہانی بن قبیصہ تھے، اور وہ سب اس موقع پر موجود تھے، ان لوگوں نے کلام کی تحسین کی، لیکن کہا کہ "مدتوں کا خاندانی دین دفعۃً چھوڑ دینا زود اعتقادی ہے۔" اس کے علاوہ ہم کسریٰ کے زیر اثر ہیں اور معاہدہ ہو چکا ہے کہ ہم اَور کسی کے اثر میں نہ آئیں گے۔" آپؐ نے اُن کی راست گوئی کی تحسین کی، اور فرمایا کہ "خدا اپنے دین کی آپ مدد کریگا۔"[۱]

قبیلۂ بنو عامر کے پاس گئے تو ایک شخص نے جس کا نام (بحیرہ بن) فراس تھا، آپؐ کی تقریر سُن کر کہا "یہ شخص مجھ کو ہاتھ آجائے تو میں تمام عرب کو مسخر کر لوں۔" پھر آپؐ سے پوچھا کہ "اگر ہم تمھارا ساتھ دیں اور تم اپنے مخالفوں پر غالب آجاؤ تو تمھارے بعد ریاست ہم کو ملے گی؟" آپؐ نے فرمایا "یہ خدا کے ہاتھ ہے۔" اس نے کہا "ہم اپنا سینہ عرب کا آماج گاہ بنائیں، اور حکومت غیروں کے ہاتھ آئے، ہم کو یہ غرض نہیں۔"[۲]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی

اسباب مذکورۂ بالا کی بنا پر قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سخت مخالفت کی، اور چاہا کہ آپؐ کو اس قدر ستائیں کہ آپؐ مجبور ہو کر تبلیغ اسلام سے دستبردار ہو جائیں۔ سُوئے اتفاق یہ کہ جو کفار آپؐ کے ہمسایہ تھے یعنی ابو جہل، ابولہب، اسود بن عبد یغوث، ولید بن مغیرہ، اُمیّہ بن خلف، نضر بن حارث، منبّہ بن حجاج، عقبہ بن ابی معیط، حکم بن ابی العاص سب قریش کے سر برآوردہ رؤسا تھے، اور یہی سب سے بڑھ کر آپؐ کے دشمن[۳] تھے۔ یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[۱] روض الانف بحوالہ قاسم بن ثابت۔ [۲] طبری ج ۳، ص ۱۲۰۵) "س"

[۳] ابن سعد جلد اوّل صفحہ ۱۳۴۔

کی راہ میں کانٹے بچھاتے، نماز پڑھتے وقت ہنسی اُڑاتے، سجدہ میں آپؐ کی گردن پر اوجھڑی لا کر ڈال دیتے، گلے میں چادر لپیٹ کر اس زور سے کھینچتے کہ گردنِ مبارک میں بدھیاں پڑ جاتیں، (آپؐ کی رُوحانی قوت اثر کو دیکھ کر لوگ جادوگر کہتے، دعوائے نبوت کو سُن کر مجنوں کہتے، باہر نکلتے تو شریر لڑکے پیچھے پیچھے غول باندھ کر چلتے، نماز جماعت میں قرآن زور سے پڑھتے تو قرآن، قرآن کے لانے والے (رسول صلی اللہ علیہ وسلم) اور قرآن کے اُتارنے والے (خدا) کو گالیاں دیتے[¹])۔

ایک دفعہ آپ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے۔ رؤسائے قریش بھی موجود تھے۔ ابوجہل نے کہا" کاش اس وقت کوئی جاتا اور اونٹ کی اوجھ نجاست سمیت اُٹھا لاتا کہ جب محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) سجدہ میں جاتے تو اُن کی گردن پر ڈال دیتا"۔ عقبہ نے کہا "یہ خدمت مَیں انجام دیتا ہوں"۔ چنانچہ اوجھ لاکر آپؐ کی گردن پر ڈال دی۔ قریش مارے خوشی کے ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے۔ کسی نے جاکر حضرت فاطمہ رضؓ کو خبر کی۔ وہ اگرچہ اُس وقت پانچ چھ برس کی تھیں، لیکن جوشِ محبت سے دوڑی آئیں، اور اوجھ ہٹا کر عقبہ کو بُرا بھلا کہا، اور بددعائیں دیں[²]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کہیں کسی مجمعِ عام میں دعوتِ اسلام کا وعظ فرماتے تو ابولہب جو آپؐ کے ساتھ ساتھ برابر سے کہتا جاتا کہ" یہ جھوٹ کہتا ہے"۔ ایک صحابی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ جب کہ میں اسلام نہیں

---

(۱) مسند امام حنبل جلد صفحہ ۳۰۲ (۲) صحیح بخاری (۶۸۶) (۳) صحیح بخاری باب الطہارۃ والصلوٰۃ والجزیہ والجہاد و صحیح مسلم و زرقانی جلد اوّل صفحہ ۲۹۴۔

لاچکا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بازار ذوالمجاز میں گئے اور مجمع میں گھس کر لوگوں سے کہا کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کہو، ابوجہل آپؐ پر خاک پھینکتا جاتا تھا، اور کہتا کہ "اس کے فریب میں نہ آنا، یہ چاہتا ہے کہ تم لات و عزیٰ کی پرستش چھوڑ دو۔[۱]

طائف میں کفار نے آپؐ کو جو اذیتیں پہنچائیں، اُن کا بیان پیچھے گزر چکا۔

ایک دفعہ آپؐ حرم کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے، عقبہ نے آپ کی گردن میں چادر لپیٹ کر نہایت زور سے کھینچی، اتفاقاً حضرت ابوبکرؓ آگئے، اور آپؐ کا شانہ پکڑ کر عقبہ کے ہاتھ سے چھڑایا، اور کہا کہ "اُس شخص کو قتل کرتے ہو جو حضرت یہ کہتا ہے کہ خدا ایک ہے"[۲]

جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی میں نہایت سرگرم تھے، اور رات دن اسی شغل میں رہتے تھے اُن کے نام جیسا کہ ابن سعد نے طبقات میں لکھے ہیں حسب ذیل ہیں:

"ابوجہل، ابولہب، اسود بن عبد یغوث، حارث بن قیس بن عدی، ولید بن المغیرہ، اُمیہ، ابی بن خلف، ابوقیس بن فاکہہ بن المغیرہ، عاص بن وائل، نضر بن حارث، منبہ بن الحجاج، زہیر بن ابی امیہ، سائب بن صیفی، اسود بن عبدالاسد، عاص بن سعید ابن العاص، عاص بن ہاشم، عقبہ بن ابی معیط، ابن الاصدی، ہذلی، حکم بن ابی العاص، عدی بن حمراء"

یہ سب کے سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمسایہ اور ان میں سے اکثر صاحب جاہ و اقتدار تھے۔

---

[۱] مسند امام حنبل جلد ۴ صفحہ ۶۳ [۲] صحیح بخاری باب مالقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ بمکۃ الخ

جو کچھ ہُوا، گو نہایت دردانگیز اور حسرت خیز تھا، لیکن تعجب انگیز نہ تھا۔ دُنیا کی تاریخ میں کوئی ایسی مثال نہیں ہے کہ نامانوس اور اجنبی صدائیں بہ رغبت سُن لی گئی ہوں حضرت نوح علیہ السلام کو سیکڑوں برس تک قوم کی نفرت اور وحشت کا سامنا رہا۔ یونان دُنیا کی شائستگی کا معلّم اوّل ہے۔ تاہم اسی حکمت کدہ میں سقراط کو زہر کا پیالہ پینا پڑا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دار و رسن کا منظر پیش آیا۔ اس بنا پر عرب اور قریش نے جو کچھ کیا وہ سلسلۂ واقعات کی غیر معمولی کڑی نہ تھی۔ لیکن غور طلب یہ ہے کہ اس کے مقابلے میں **سرورِ عالم** (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کیا کیا؟

سقراط (زہر کا) پیالہ پی کر فنا ہو گیا، حضرت نوح علیہ السلام نے مخالفت سے تنگ آ کر ایک قیامت خیز طوفان کی استدعا کی اور دُنیا کا ایک بڑا حصّہ برباد ہو گیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام تیس چالیس[۴] شخصوں کی مختصر جماعت پیدا کر کے بروایتِ نصاریٰ سُولی پر چڑھ گئے۔ لیکن سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا فرض ان سب سے بالاتر تھا۔ حضرت خبابؓ بن الارت نے جب قریش کی کی ایذارسانی سے تنگ آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ آپ ان کے حق میں بد دعا کیوں نہیں فرماتے؟ تو آپؐ کا چہرہ سُرخ ہو گیا، اور فرمایا کہ "تم سے پہلے وہ لوگ گزرے ہیں جن کے سر پر آرے چلائے جاتے اور چیر ڈالے جاتے تھے۔ تاہم وہ اپنے فرض سے باز نہ آئے، خُدا اس کام کو پُورا کرے گا، یہاں تک کہ شُتر سوار صنعا سے حضر موت تک سفر کرے گا اور اُس کو خدا کے سوا کسی کا ڈر نہ ہو گا[۵]"

کیا یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری نہیں ہُوئی؟

۵؎ صحیح بخاری، باب مالقی النبی و اصحابہ من المشرکین، ذکر ایام جاہلیۃ۔

مدینۂ منوّرہ اور انصار

آفتاب کی روشنی دُور پہنچ کر تیز ہوتی ہے۔ شمیم گل باغ سے نکل کر عطر فشاں بنتی ہے۔ آفتاب اسلام طلوع مکہ میں ہُوا، لیکن کرنیں مدینہ کے اُفق پر چمکیں +

مدینہ کا اصلی نام یثرب ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہاں آکر قیام کیا تو اس کا نام مدینۃ النبی، یعنی "پیغمبر کا شہر" پڑگیا، اور پھر مختصر ہوکر مدینہ مشہور ہو گیا +

یہ شہر مدتوں سے آباد ہے۔ بہت قدیم زمانہ میں یہودی یہاں آکر آباد ہوئے ان کی نسلیں کثرت سے پھیلیں اور مدینہ کے اطراف اُن کے قبضہ میں آگئے۔ انھوں نے مدینہ اور اس کے حوالی میں چھوٹے چھوٹے قلعے بنالیے تھے اور اُن میں سکونت رکھتے تھے۔ (یہود کے متعلق زائد تحقیق آگے آئے گی۔

انصار اصل میں یمن کے رہنے والے اور قحطان کے خاندان سے تھے۔ یمن میں جب مشہور سیلاب آیا جس کو "سیلِ عرم" کہتے ہیں۔ یہ لوگ یمن سے نکل کر مدینہ میں آباد ہُوے۔ یہ دو بھائی تھے، **اوس** اور **خزرج**، تمام انصار ان ہی دو کے خاندان سے ہیں[۱]۔ یہ خاندان جب یثرب میں آیا تو

---

[۱] انصار کے نسب، اور مدینہ میں آباد ہونے کی پوری تفصیل وفاء الوفا جلد اوّل صفحہ ۱۱۶ تا ۱۵۲ میں مذکور ہے +

یہود نہایت اقتدار اور اثر رکھتے تھے۔ آس پاس کے مقامات اُن کے قبضے میں تھے اور دولت و مال سے مالا مال تھے۔ چونکہ آل و اولاد کی کثرت سے بیس "بیس" قبیلے بن گئے تھے۔ اس لیے دُور دُور تک بستیاں بسالی تھیں۔ انصار کچھ زمانہ تک اُن سے الگ رہے لیکن اُن کا زور اور اثر یکہ کر بالآخر اُن کے حلیف[ف] بن گئے۔ ایک مُدت یہ حالت قائم رہی۔ لیکن اب انصار کا خاندان پھیلتا جاتا تھا اور اقتدار حاصل کرتا جاتا تھا۔ یہود نے پیش بینی کے لحاظ سے اُن سے معاہدہ توڑ دیا۔

یہودیوں میں ایک رئیس فطیون پیدا ہوا جو نہایت عیاش اور بدکار تھا۔ اس نے یہ حکم دیا کہ جو دوشیزہ لڑکی بیاہی جائے، پہلے اس کے شبستانِ عیش میں آئے۔ یہودیوں نے اس کو گوارا کر لیا تھا، لیکن جب انصار کی نوبت آئی تو انھوں نے سرتابی کی، اس زمانہ میں انصار کا سردار ایک شخص مالک بن عجلان تھا، اس کی بہن کی شادی ہوئی تو وہ عین شادی کے دن گھر سے نکلی اور اپنے بھائی مالک بن عجلان کے سامنے سے بے پردہ گزری، مالک کو غیرت آئی، اُٹھ کر گھر میں آیا اور بہن کو سخت ملامت کی۔ اُس نے کہا "ہاں! لیکن کل جو کچھ ہوگا اس سے بھی بڑھ کر ہے"۔ دوسرے دن حسب دستور جب مالک کی بہن دُلہن بن کر فطیون کی خلوت گاہ میں گئی تو مالک بھی زنانے کپڑے پہن کر سہیلیوں کے ساتھ گیا، اور فطیون کو قتل کر کے شام کو بھاگ گیا۔ یہاں غسانیوں کی حکومت تھی اور ابوجبلہ حکمران تھا۔ اس نے یہ حالات سُنے تو ایک فوجِ گراں لے کر آیا، اور

[ف] جو قبیلے آپس میں ایک دوسرے کی اعانت و شرکت کا (بحلف) معاہدہ کرتے تھے، وہ باہم حلیف کہلاتے تھے۔

اوس اور خزرج کے رؤسا کو بلا کر ان کو خلعت اور صلے دیے۔ پھر رؤسائے یہود کی دعوت کی اور ایک ایک کو دھوکے سے قتل کرا دیا۔ یہود کا زور اب ٹوٹ گیا، اور انصار نے نئے سرے سے قوت حاصل[۱] کی۔

انصار نے مدینہ اور حوالیِ مدینہ میں کثرت سے چھوٹے چھوٹے قلعے بنالیے، اوس اور خزرج ایک مدت تک باہم متحد رہے، لیکن پھر عرب کی فطرت کے موافق خانہ جنگیاں شروع ہوگئیں اور سخت خونریز لڑائیاں ہوئیں سب سے اخیر لڑائی میں جس کو بعاث کہتے ہیں اس زور کا معرکہ ہوا کہ دونوں خاندانوں کے تمام نامور لڑلڑ کر مر گئے۔ انصار اب اس قدر ضعیف ہو گئے کہ انھوں نے قریش کے پاس سفارت بھیجی کہ ہم کو حلیف بنا لیجیے، لیکن ابوجہل نے معاملہ درہم برہم کر دیا۔

انصار گو بت پرست تھے۔ تاہم چونکہ یہود سے میل جول تھا، اس لیے نبوت اور کتب آسمانی سے گوش آشنا تھے۔ یہود سے گو انصار سے اک گونہ رقابت رکھتے تھے لیکن اُن کے علمی فضل و کمال کے معترف تھے۔ یہود نے مدینہ میں جو علمی مدارس قائم کیے تھے اور جن کو بیت المدارس کہتے تھے (بخاری وغیرہ میں نام مذکور[۲] ہے) ان میں توراۃ کی تعلیم ہوتی تھی۔ انصار جاہل تھے، اس لیے ان پر یہود کے علمی تفوق کا خواہ مخواہ اثر پڑتا تھا۔ یہاں تک کہ انصار میں سے جس کے اولاد زندہ نہیں رہتی تھی، وہ منت مانتا تھا کہ بچہ زندہ رہے گا تو یہودی بنا دیا جائے[۳] گا۔

---

[۱] وفاء الوفاء، یہ واقعہ مختلف صورتوں میں بیان کیا گیا ہے۔ اور وفاء الوفاء میں یہ تمام روایتیں مذکور ہیں۔ (۲) بخاری ج ۲ ص ۱۰۲۷ کتاب الاکراہ باب فی بیع المکرہ ونحوہ فی الحق وغیرہ) "س"۔ [۳] کتب تفسیر میں لَآ اِکۡرَاهَ فِی الدِّیۡنِ کی تفسیر دیکھو)۔

یہودی عموماً یہ یقین رکھتے تھے کہ ایک پیغمبر ابھی اور آنے والا ہے۔ اس بنا پر انصار بھی ایک پیغمبرِ موعود کے نام سے آشنا تھے۔

انصار میں ایک شخص، سوید بن صامت جو شاعری اور جنگ آوری میں ممتاز تھا، اس کو امثالِ لقمان کا نسخہ ہاتھ آگیا تھا، جس کو وہ کتاب آسمانی سمجھتا تھا، وہ ایک دفعہ حج کو گیا۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کے حالات سُنے تو خود اس کے پاس تشریف لے گئے۔ اُس نے امثالِ لقمان پڑھ کر سُنایا، آپؐ نے فرمایا "میرے پاس اس سے بھی بہتر چیز ہے۔" یہ کہہ کر قرآنِ مجید کی چند آیتیں پڑھیں، سوید نے تحسین کی[۱] اگرچہ وہ مدینہ واپس آکر جنگِ بعاث میں مارا گیا، لیکن وہ اسلام کا معتقد ہو چکا تھا۔

سوید شجاعت اور شاعری دونوں میں کمال رکھتا تھا۔ ایسے شخص کو اہلِ عرب "کامل" کہتے تھے، اور اسی بنا پر سوید اسی لقب سے پکارا جاتا تھا[۲]۔ سوید کے میلانِ اسلام کا اثر انصار پر پڑ چکا تھا۔

اوس اور خزرج کے معرکوں میں اوس کو جب شکست ہوئی تو اوس کے عمائد قریش کے پاس گئے کہ خزرج کے مقابلے میں اُن کو حلیف بنائیں۔ اس سفارت میں ایاس بن مُعاذ بھی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان لوگوں کا آنا معلوم ہوا تو آپؐ اُن کے پاس تشریف لے گئے اور قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھ کر سنائیں

---

(۱) البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۳ ص ۱۴۷ "س"۔ (۲) سوید کا ذکر ابن ہشام میں ہے، لیکن روض الانف میں زیادہ تفصیل ہے۔ اصابہ میں بھی اس کا حال ہے۔ لیکن نسب میں اختلاف ہے، اور امثالِ لقمان کا ذکر نہیں ہے۔ طبری میں بھی سوید کا پورا واقعہ مع اس کے اشعار کے مذکور ہے۔ دیکھو صفحہ ۱۲۰۷۔

ایاس نے ساتھیوں سے کہا کہ "خدا کی قسم تم جس غرض کے لیے آئے ہو یہ کام اس سے بھی بہتر ہے"۔ لیکن قافلہ سالار یعنی ابوالحیس نے کنکریاں اٹھا کر ان کے منہ پر ماریں اور کہا کہ "ہم اس کام کے لیے نہیں آئے"۔ اس کے بعد بعاث کا معرکہ پیش آگیا، اور ایاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے انتقال کر گئے۔ لوگوں کا بیان ہے کہ مرتے وقت ایاس کی زبان پر تکبیر جاری تھی[۱]

انصار کے اسلام کی ابتدا سنہ نبوی

جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ حج کے زمانے میں رؤسائے قبائل کے پاس جا کر تبلیغ اسلام فرمایا کرتے تھے۔ اس سال (رجب سنہ نبوی) میں بھی آپ متعدد قبائل کے پاس تشریف لے گئے۔ عقبہ کے پاس، جہاں اب مسجد العقبہ ہے، خزرج کے چند اشخاص آپ کو نظر آئے۔ آپ نے ان سے نام و نسب پوچھا، انھوں نے کہا "خزرج" آپ نے دعوتِ اسلام دی، اور قرآن مجید کی آیتیں سنائیں۔ ان لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کہا "دیکھو، یہود ہم سے اولیت میں بازی نہ لے جائیں"۔ یہ کہہ کر سب نے ایک ساتھ اسلام قبول کیا۔ یہ چھ شخص[۲] تھے

---

۱ طبری اور اصابہ میں یہ واقعہ تفصیل سے مذکور ہے۔ اصابہ میں لکھا ہے کہ ایاس کا حال امام بخاری نے تاریخ کبیر میں لکھا ہے۔ (البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۳ ص ۱۴۸) س

۲ مدینہ منورہ کے یہ حضرات جو پہلے پہل اسلام لائے، بعض مصنفین سیرت نے ان کے اس قبولِ اسلام کے واقعے کا تذکرہ بیعت عقبہ اولیٰ کے عنوان سے یہ کیا ہے، یہ عنوانِ کتب سیرت کے ناظرین کے لیے اس وقت پریشانی کا موجب بن جاتا ہے، جب وہ دوسری (مثلاً مستدرک حاکم ج ۲ ص ۶۲۴ ابن کثیر علی حاشیۂ فتح البیان ج ۹ ص ۴۴۳) میں دیکھتے ہیں کہ بیعت عقبہ اولیٰ میں بارہ آدمی تھے۔

جن کے نام حسب ذیل ہیں :

۱- ابوالہیثم بن تیہان

۲- ابو امامہ اسعدؓ بن زرارہ (صحابہ میں سب سے پہلے ان ہی نے سنہ میں وفات پائی۔

۳- عوف بن حارث، (بدر میں شہادت پائی)

۴- رافع بن مالک بن عجلان، اس وقت تک جس قدر قرآن اتر چکا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو عنایت فرمایا۔ جنگ اُحد میں شہید ہوئے

۵- قطبہ بن عامر بن حدیدہ، (تینوں عقبات میں شریک رہے)۔

۶- جابر بن عبداللہ (بن ریاب) (یہ مشہور صحابی حضرت جابرؓ بن عبداللہ بن عمرو کے علاوہ تھے، بدر وغیرہ میں شریک تھے)۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۶) اسی اختلافِ روایت کے سبب سے بعض مصنفینِ سیرت بیعت عقبۂ ثانیہ میں بارہ آدمی اور بعض ۷، ۳ آدمی بتلاتے ہیں۔

حالانکہ اصل صورت یہ ہے کہ چھ یا آٹھ آدمی جو شروع شروع میں اسلام لائے، ان کے واقعہ قبولِ اسلام کا عنوان بیعت عقبۂ اولیٰ نہیں بلکہ ابتدائے اسلام انصار ہونا چاہیے اور دوسرے سال جب کہ گیارہ بارہ آدمی حاضر ہوئے ہیں یہ بیعت عقبۂ اولیٰ ہے (سیرت حلبیہ ج ۲ صفحہ ۸)۔ حضرت عُبادہؓ بن الصامت نے بصراحت فرمایا ہے کنا احد عشر فی العقبۃ الاولیٰ من العام المقبل (مستدرک ج ۲ ص۶۲۴ حیدرآباد دکن) اس روایت میں حضرت عُبادہؓ "العام المقبل" میں بیعت عقبۂ اولیٰ کا ہونا فرماتے ہیں اور اس میں گیارہ

بیعت عقبۂ اولیٰ
سلہ نبوی

دوسرے سال بارہ شخص مدینۂ منورہ سے آئے اور بیعت کی۔ اس کے ساتھ اس بات کی بھی خواہش کی کہ احکامِ اسلام کے سکھلانے کے لیے کوئی معلم ان کے ساتھ کر دیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۷) آدمیوں کے ہونے کی صراحت فرماتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس سے پہلے جو لوگ آکر اسلام قبول کر چکے تھے، اس کا تعلق بیعت عقبۂ اولیٰ سے نہیں ہے۔

جن لوگوں نے انصار کے ابتدائے اسلام کے واقعہ کا نام بیعتِ عقبۂ اولیٰ رکھا ہے وہ تین بیعت عقبہ کا عنوان دیتے ہیں۔ یعنی ایک یہ بیعت عقبہ اولیٰ ہے، دوسری وہ بیعت عقبۂ جس میں گیارہ یا بارہ آدمی اسلام لائے اور تیسری وہ بیعت عقبہ جس میں ۷۳ افراد مشرف بہ اسلام ہوئے، اور یہ تینوں واقعے ایک ایک سال کے فصل سے حج کے موسم میں پیش آئے، اور جن لوگوں نے انصار ... کے ابتدائے اسلام کے واقعہ کو صرف ابتدائے اسلامِ انصار کے عنوان سے ذکر کیا ہے، انھوں نے گیارہ آدمیوں والی بیعت کو بیعت عقبۂ اولیٰ اور ۷۳ آدمیوں والی بیعت کو بیعت عقبۂ ثانیہ کے عنوان سے ذکر کیا ہے، (ملاحظہ ہو تاریخ خمیس اوّل ص۳۰۶، ص۳۱۶، ص۳۱۷ وزرقانی علی المواہب ج اوّل ص۳۶۲ و ص۳۶۷) اس سلہ یہ واقعات تمام تاریخوں میں مذکور ہیں، ہم نے زرقانی کو پیش نظر رکھا ہے۔ کیونکہ اس نے تمام مختلف روایتیں جمع کر دی ہیں۔ ان لوگوں کی تعداد بعضوں نے آٹھ بیان کی ہے۔ اسعدؓ بن زرارہ اور ابو الہیثم کا پہلے سے موجود ہونا ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے، دیکھو کتاب مذکور جزء ثالث انصار بدریین، صفحہ ۲۲' واقدی کا بیان ہے کہ اسعدؓ بن زرارہ اس واقعہ سے پہلے مکہ میں جا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا چکے تھے، (بعضوں نے ابو الہیثم بن یتہان کی جگہ عقبہ بن عامر بن نابی کا نام لیا ہے، اور بعض نے جابر بن ریاب کے بجائے عبادہ بن صامت کو جگہ دی ہے) "س"

مصعبؓ بن عمیر کو اس خدمت پر مامور فرمایا، مصعبؓ ہاشم بن عبدمناف کے پوتے اور سابقینِ اسلام میں سے تھے۔ غزوۂ بدر میں لشکر کی علم برداری کا منصب انہی کو ملا تھا، وہ مدینہ میں آکر اسعدؓ بن زرارہ کے مکان پر ٹھہرے جو مدینہ کے نہایت معزز رئیس تھے۔ روزانہ معمول تھا کہ انصار کے ایک ایک گھر کا دورہ کرتے، لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے اور قرآن مجید پڑھ کر سناتے، روزانہ ایک دو نئے آدمی اسلام قبول کرتے۔ رفتہ رفتہ مدینہ سے قبا تک گھر گھر اسلام پھیل گیا۔ صرف خطمتہ، وائل، واقف کے چند گھرانے باقی رہ گئے۔ ابن سعد نے طبقات میں یہ واقعات تفصیل سے لکھے ہیں۔

قبیلۂ اوس کے سردار حضرت سعدؓ بن معاذ تھے، قبیلہ پر ان کا یہ اثر تھا کہ ہر کام میں ان کے اشاروں پر چلتے تھے، مصعبؓ نے جب ان کے پاس جاکر اسلام کی دعوت دی تو انھوں نے پہلے نفرت ظاہر کی، لیکن جب مصعبؓ نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں تو پتھر موم تھا، ان کا اسلام لانا تمام قبیلۂ اوس کا اسلام قبول کرلینا تھا۔

بیعت عقبۂ ثانیہ سنہ ۱۲ نبوی

اگلے سال بہتر شخص حج کے زمانے میں آئے، اور اپنے ساتھیوں سے (جو بت پرست تھے) چھپ کر بہ مقام منیٰ (عقبہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس موقع پر حضرت عباسؓ بھی جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، انھوں نے انصار سے خطاب کرکے کہا "گروہ خزرج! محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خاندان میں معزز اور محترم ہیں۔ دشمنوں کے مقابلے میں ہم ہمیشہ ان کے سینہ سپر رہے، اب وہ تمہارے پاس جانا چاہتے ہیں، اگر مرتے دم تک ان کا ساتھ دے سکو تو بہتر، ورنہ ابھی سے جواب دے دو۔"

حضرت براءؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف خطاب کر کے کہا "ہم لوگ تلواروں کی گود میں پلے ہیں!" وہ اسی قدر کہنے پائے تھے کہ ابو الہیثم رضؓ نے بات کاٹ کر "یا رسول اللہ! ہم سے اور یہود سے تعلقات ہیں، بیعت کے بعد یہ تعلقات ٹوٹ جائیں گے، ایسا تو نہ ہو کہ جب آپؐ کو قوت و اقتدار حاصل ہو جائے تو آپؐ ہم کو چھوڑ کر اپنے وطن چلے جائیں!" آپؐ نے مسکرا کر فرمایا "نہیں تمہارا خون میرا خون ہے، تم میرے اور میں تمہارا ہوں!"

آپؐ نے اس گروہ میں سے بارہ شخص نقیب انتخاب کیے، جن کے نام خود انصار نے پیش کیے تھے، اُن میں نو خزرج کے اور تین اوس کے تھے۔ ان کے نام حسب روایت ابن سعد حسب ذیل ہیں:

۱۔ اُسید رضؓ بن حضیر	جنگ بعاث میں انہی کے باپ اوس کے سردار تھے۔
۲۔ ابو الہیثم رضؓ بن تیہان	
۳۔ سعد رضؓ بن خیثمہ	جنگِ بدر میں شہید ہوئے۔
۴۔ اسعد رضؓ بن زرارہ	ان کا ذکر اوپر گزر چکا، یہ امام نماز تھے۔
۵۔ سعد رضؓ بن الربیع	جنگِ اُحد میں شہید ہوئے۔
۶۔ عبداللہ رضؓ بن رواحہ	مشہور شاعر ہیں، جنگِ موتہ میں شہید ہوئے۔
۷۔ سعد رضؓ بن عبادہ	معزز اور مشہور صحابی ہیں سقیفہ بنی ساعدۃ میں ان ہی نے پہلے خلافت کا دعویٰ کیا تھا۔
۸۔ منذر بن عمرو	بیر معونہ میں شہید ہوئے۔

۹- براء بن معرورؓ	بیعتِ عقبہ میں انہی نے انصار کی طرف سے تقریر کی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے انتقال کر گئے
۱۰- عبداللہ بن عمرو	جنگِ اُحد میں شہید ہوئے ÷
۱۱- عُبادۃؓ بن الصامت	مشہور صحابی ہیں، اُن سے اکثر حدیثیں مروی ہیں ÷
۱۲- رافع بن مالک	جنگِ اُحد میں شہید ہوئے ÷

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن باتوں پر انصار سے بیعت لی یہ تھیں "شرک، چوری، زنا، قتلِ اولاد، اور افترا کے مرتکب نہ ہوں گے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن سے جو اچھی بات کہیں گے، اس سے سرتابی نہ کریں گے"۔

جب انصار بیعت کر رہے تھے تو سعد بن زرارہ نے کھڑے ہو کر کہا "بھائیو! یہ بھی خبر ہے، کس چیز پر بیعت کر رہے ہو؟ یہ عرب و عجم اور جن و انس سے اعلانِ جنگ ہے"۔ سب نے کہا ہاں ہم اسی پر بیعت کر رہے ہیں ÷

بارہ شخص جو نقیب انتخاب کیے گئے رئیس القبائل تھے، اُن کا اسلام قبول کرنا تمام انصار کا اسلام قبول کرنا تھا۔ صبح کو اس بیعت کی اُڑتی سی خبر پھیلی، قریش انصار کے پاس آئے، اور شکایت کی، انصار کے ساتھ جو بُت پرست تھے۔ اُن کو اس بیعت کی خبر نہ تھی۔ انھوں نے تکذیب کی کہ "ایسا ہوتا تو ہم

لہ یہ صحیح بخاری کی روایت ہے، سیرت کی کتابوں میں مذکور ہے کہ عقبۂ اولیٰ کی شرائط ہیں۔ اخیر بیعت اس بات پر لی گئی تھی کہ انصار آپؐ کی جان کی حفاظت کریں گے ÷

سے کیونکر چھپ سکتا تھا؟"

مدینہ میں اسلام کو پناہ حاصل ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو اجازت دی کہ مکہ سے ہجرت کر جائیں۔ قریش کو معلوم ہوا تو انھوں نے روک ٹوک شروع کی، لیکن چوری چھپے لوگوں نے ہجرت شروع کر دی۔ رفتہ رفتہ اکثر صحابہ چلے گئے۔ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ رہ گئے، جو لوگ مفلسی سے مجبور تھے، وہ مدت تک نہ جا سکے، یہ آیت انہی کی شان میں ہے:

وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا	کمزور مرد، عورتیں اور بچے، جو یہ کہتے ہیں کہ اے خدا! ہم کو اس شہر سے نکال کہ یہاں کے لوگ ظالم ہیں۔

(نسآء - ۱۰)

سنہ ۱ھ

ہجرت

اس وقت جب کہ دعوتِ حق کے جواب میں ہر طرف سے تلوار کی جھنکاریں سنائی دے رہی تھیں، حافظِ عالم نے مسلمانوں کو دار الامان مدینہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا۔ لیکن خود وجودِ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) جو ان ستمگاروں کا حقیقی ہدف تھا، اپنے لیے حکمِ خدا کا منتظر تھا۔ مکہ کے باہر اطراف میں جو صاحبِ اثر مسلمان ہو چلے تھے وہ جان نثارانہ اپنی حفاظت کی خدمت پیش کرتے تھے۔ قبیلہ دوس ایک محفوظ قلعہ کا مالک تھا، اس کے رئیس طفیل بن عمرو نے اپنا قلعہ پیش کیا کہ آپؐ یہاں ہجرت کر آئیں۔ لیکن آپؐ نے انکار فرمایا۔[1] اسی طرح بنی ہمدان کے ایک شخص نے بھی یہی خواہش کی تھی، بعد کو اس نے کہا کہ وہ اپنے اہلِ قبیلہ کو مطلع کر کے آئندہ سال آئے گا[2] لیکن کارسازِ قضا و قدر نے یہ شرف صرف انصار کے لیے مخصوص کیا تھا، چنانچہ قبلِ ہجرت آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خواب دیکھا کہ دار الہجرۃ ایک پُر باغ و بہار مقام ہے۔ خیال تھا کہ وہ یمامہ یا ہجر کا شہر ہوگا، لیکن وہ شہر مدینہ نکلا۔[3]

---

(۱) صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۵۸ باب الدلیل علی ان قاتل نفسہ لا یکفر (۲) مستدرک ج ۲ صفحہ ۶۱۳ و زرقانی علی المواہب ج اوّل صفحہ ۳۵۹ (۳) صحیح بخاری باب ہجرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم "س"

نبوت کا تیرھواں سال شروع ہوا، اور اکثر صحابہ مدینہ پہنچ چکے تو وحیِ الٰہی کے مطابق آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بھی مدینہ کا عزم فرمایا۔ یہ داستان نہایت پُر اثر ہے، اور اسی وجہ سے امام بخاری نے باوجود اختصار پسندی کے اس کو خوب پھیلا کر لکھا ہے اور حضرت عائشہ رضؓ کی زبانی لکھا ہے۔ حضرت عائشہ رضؓ گو اُس وقت سات آٹھ برس کی تھیں، لیکن ان کا بیان درحقیقت خود رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور حضرت ابوبکر رضؓ کا بیان ہے کہ اُنہی سے سُن کر کہا ہوگا، اور ابتدائے واقعہ میں وہ خود بھی موجود تھیں۔

قریش نے دیکھا کہ اب مسلمان مدینہ میں جا کر طاقت پکڑتے جاتے ہیں، اور وہاں اسلام پھیلتا جاتا ہے۔ اس بنا پر اُنھوں نے دارالندوہ میں، جو دارالشوریٰ تھا، اجلاس عام کیا۔ ہر قبیلہ کے رؤسا یعنی عتبہ، ابوسفیان، جبیر بن مطعم، نضر بن حارث بن کلدہ، ابوالبختری، ابن ہشام، زمعہ بن اسود بن مطلب، حکیم بن حزام، ابوجہل، نبیہ و منبہ، امیہ بن خلف وغیرہ وغیرہ یہ سب شریک تھے۔ لوگوں نے مختلف رائیں پیش کیں۔ ایک نے کہا محمدؐ کے ہاتھ پاؤں میں زنجیریں ڈال کر مکان میں بند کر دیا جائے" دوسرے نے کہا "جلاوطن کر دینا کافی ہے"۔ ابوجہل نے کہا "ہر قبیلہ سے ایک شخص انتخاب ہو، اور پورا مجمع ایک ساتھ مل کر تلواروں سے اُن کا خاتمہ کر دے۔ اس صورت میں اُن کا خون تمام قبائل میں بٹ جائے گا، اور آلِ ہاشم اکیلے تمام قبائل کا مقابلہ نہ کر سکیں گے"۔ اس اخیر رائے پر اتفاق ہوگیا، اور جھٹ پٹے میں آ کر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے آستانہ مبارک کا محاصرہ کر لیا۔ اہلِ عرب زنانہ مکان کے اندر گھسنا معیوب سمجھتے تھے، اس لیے باہر ٹھہرے رہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نکلیں تو یہ فرض ادا کیا جائے۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے قریش کو اس درجہ عداوت تھی تاہم آپؐ کی دیانت پر یہ اعتماد تھا کہ جس شخص کو کچھ مال یا اسباب امانت رکھنا ہوتا تھا، آپؐ ہی کے پاس لاکر رکھتا تھا۔ اس وقت بھی آپؐ کے پاس بہت سی امانتیں جمع تھیں۔ آپؐ کو قریش کے ارادے کی پہلے سے خبر ہو چکی تھی اس بنا پر حضرت علیؓ کو بلا کر فرمایا کہ "مجھ کو ہجرت کا حکم ہو چکا ہے، میں آج مدینہ روانہ ہو جاؤں گا۔ تم میرے پلنگ پر میری چادر اوڑھ کر سو رہو، صبح کو سب کی امانتیں جا کر واپس دے آنا"۔ یہ سخت خطرہ کا موقع تھا۔ حضرت علیؓ کو معلوم ہو چکا تھا کہ قریش آپؐ کے قتل کا ارادہ کر چکے ہیں، اور آج رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا بستر خواب قتل گاہ کی زمین ہے۔ لیکن فاتح خیبر کے لیے قتل گاہ فرش گل تھا۔

ہجرت سے دو تین دن پہلے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) دوپہر کے وقت حضرت ابوبکرؓ کے گھر پر گئے۔ دستور کے موافق دروازے پر دستک دی۔ اجازت کے بعد گھر میں تشریف لے گئے۔ حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا "کچھ مشورہ کرنا ہے، سب کو ہٹا دو"۔ بولے کہ "یہاں آپؐ کی حرم کے سوا اور کوئی نہیں ہے" (اس وقت حضرت عائشہؓ سے شادی ہو چکی تھی) آپؐ نے فرمایا "مجھ کو ہجرت کی اجازت ہو گئی ہے"۔ حضرت ابوبکرؓ نے نہایت بیتابی سے کہا "میرا باپ آپؐ پر فدا ہو کیا مجھ کو بھی ہمراہی کا شرف حاصل ہوگا"؟ ارشاد ہوا "ہاں" حضرت ابوبکرؓ نے ہجرت کے لیے چار مہینہ سے دو اونٹنیاں ببول کی پتیاں کھلا کھلا کر تیار کی تھیں، عرض کی کہ ان میں سے ایک آپؐ پسند فرمائیں۔ محسن عالم

ل (صحیح بخاری باب الہجرۃ) "س"

کو کسی کا احسان گوارا نہیں ہو سکتا تھا، ارشاد ہُوا " اچھا، مگر بہ قیمت " حضرت ابوبکرؓ نے مجبوراً قبول کیا، حضرت عائشہ رضؓ اُس وقت کمسن تھیں، ان کی بڑی بہن حضرت اسمارؓ نے جو حضرت عبداللہؓ بن زبیر کی ماں تھیں، سفر کا سامان کیا، دو تین دن کا کھانا، ناشتہ دان میں رکھا۔ نطاق، جس کو عورتیں کمر سے لپیٹتی ہیں، پھاڑ کر اس سے ناشتہ دان کا مُنھ باندھا۔ یہ وہ شرف تھا جس کی بنا پر آج تک اُن کو ذات النطاقین کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے[۱]۔

کفار نے جب آپؐ کے گھر کا محاصرہ کیا اور رات زیادہ گزر گئی تو قدرت نے اُن کو بے خبر کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن کو سوتا چھوڑ کر باہر آئے۔ کعبہ کو دیکھا اور فرمایا " مکہ! تُو مجھ کو تمام دُنیا سے زیادہ عزیز ہے، لیکن تیرے فرزند مجھ کو رہنے نہیں دیتے "۔ حضرت ابوبکر رضؓ سے پہلے سے قرارداد ہو چکی تھی۔ دونوں صاحب پہلے جبل ثور کے غار میں جا کر پوشیدہ ہُوئے، یہ غار آج بھی موجود ہے اور بوسہ گاہِ خلائق ہے[۲]۔ حضرت ابوبکرؓ کے بیٹے عبداللہؓ جو نوخیز جوان تھے، شب کو غار میں ساتھ سوتے، صبح منہ اندھیرے شہر چلے جاتے اور پتہ لگاتے کہ قریش کیا مشورے کر رہے ہیں، جو کچھ خبر ملتی شام کو آ کر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے عرض کرتے۔ حضرت ابوبکر رضؓ کا غلام کچھ رات گئے بکریاں چرا کر لاتا، آپؐ اور حضرت ابوبکر رضؓ اُن کا دُودھ پی لیتے۔ تین دن تک صرف یہی غذا تھی لیکن لیکن ابن ہشام نے لکھا ہے کہ روزانہ شام کو حضرت اسمارؓ گھر سے کھانا

---

[۱] صحیح بخاری باب الہجرۃ ۱ " س "

[۲] یہ غار مکہ سے تین میل داہنی جانب ہے، پہاڑ کی چوٹی قریباً ایک میل بلند ہے، سمندر یہاں سے دکھائی دیتا ہے۔ دیکھو زرقانی (ج ۱ صفحہ ۳۸۹) " س "

پکا کر غار میں پہنچا آتی تھیں، اسی طرح تین راتیں غار میں گزریں۔[1]

صبح کو قریش کی آنکھیں کھلیں تو پلنگ پر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بجائے حضرت علیؓ تھے۔ ظالموں نے آپ کو پکڑ کر اور حرم میں لے جا کر تھوڑی دیر محبوس رکھا، اور چھوڑ دیا۔[2] پھر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تلاش میں نکلے ڈھونڈتے ڈھونڈتے غار کے دہانے تک آ گئے۔ آہٹ پاکر حضرت ابوبکرؓ غمزدہ ہوئے، اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے عرض کی کہ "اب دشمن اس قدر قریب آ گئے ہیں کہ اگر اپنے قدم پر اُن کی نظر پڑ جائے تو ہم کو دیکھ لیں گے"! آپؐ نے فرمایا:

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (توبہ) گھبراؤ نہیں، خدا ہمارے ساتھ ہے۔

مشہور ہے کہ جب کفار غار کے قریب آ گئے تو خدا نے حکم دیا، دفعتہً ببول کا درخت اُگا، اور اس کی ٹہنیوں نے پھیل کر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو چھپا لیا۔ ساتھ ہی دو کبوتر آئے اور گھونسلا بنا کر انڈے دیے۔ حرم کے کبوتر انہی کبوتروں کی نسل سے ہیں۔ اس روایت کو مواہب لدنیہ میں تفصیل سے نقل کیا ہے اور زرقانی نے بزاز وغیرہ سے اس کے ماخذ بتائے ہیں، لیکن یہ تمام روایتیں غلط ہیں۔ اس روایت کا اصلی راوی عون بن عمرو ہے، اس کی نسبت امام فن رجال یحییٰ بن معین کا قول ہے: "لا شیئ" یعنی ہیچ ہے۔ امام بخاری نے کہا ہے کہ "وہ منکر الحدیث اور مجہول ہے"۔ اس روایت کا ایک اور راوی ابو مصعب مکی ہے، وہ مجہول الحال ہے۔ چنانچہ علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں عون بن عمرو کے

---

[1] یہ پوری تفصیل صحیح بخاری باب الہجرۃ میں ہے۔ باب مناقب المہاجرین میں بعض مزید حالات ہیں وہ بھی ہم نے شامل کر لیے ہیں۔

[2] تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۲۳۴۔ "س"

حال میں یہ تمام اقوال نقل کیے ہیں، اور خود اس روایت کا بھی ذکر کیا ہے[ل]

بہرحال، چوتھے دن آپؐ غار سے نکلے، عبداللہ بن اُریقط ایک کافر، جس پر اعتماد تھا، رہنمائی کے لیے اُجرت پر مقرر کر لیا گیا، وہ آگے آگے راستہ بتاتا تھا، ایک رات دن برابر چلے گئے، دوسرے دن دوپہر کے وقت دھوپ سخت ہوگئی تو حضرت ابوبکرؓ نے چاہا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سایہ میں آرام فرمالیں۔ چاروں طرف نظر ڈالی، ایک چٹان کے نیچے سایہ نظر آیا، سواری سے اُتر کر زمین جھاڑی، پھر اپنی چادر بچھادی۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے آرام فرمایا، تو تلاش میں نکلے کہ کہیں کچھ کھانے کو مل جائے تو لائیں، پاس ہی ایک چرواہا بکریاں چرا رہا تھا، اُس سے کہا، ایک بکری کا تھن گرد و غبار سے صاف کردے، پھر اس کے ہاتھ صاف کرائے اور دُودھ دوہا۔ برتن کے مُنہ پر کپڑا لپیٹ دیا کہ گرد نہ پڑنے پائے، دُودھ لے کر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آئے اور تھوڑا سا پانی ملا کر پیش کیا، آپؐ نے پی کر فرمایا کہ "کیا ابھی چلنے کا وقت نہیں آیا"؟ آفتاب اب ڈھل چکا تھا، اس لیے آپؐ وہاں سے روانہ ہوئے[۲]۔

قریش نے اشتہار دیا تھا کہ جو شخص محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یا ابوبکرؓ کو گرفتار کر کے لائے گا، اُس کو ایک خونبہا کے برابر (یعنی سَو اُونٹ) انعام دیا جائے گا۔ سُراقہ بن

[ل] سیرۃ النبی ج ۳ ص ۳۰۷ میں بہ ضمن "مشہور عام دلائل و معجزات کی روایتی حیثیت" ان روایات پر مفصل تنقید کی گئی ہے۔ "س" [۲] یہ پوری تفصیل حرف بہ حرف صحیح بخاری باب مناقب المہاجرین میں ہے۔ ہم نے تمام جزئیات اس لیے نقل کیں کہ اس سے حضرت ابوبکرؓ کی صفائی پسندی کا بھی اندازہ ہوتا ہے [۳] سُراقہ بعد میں اسلام لائے اور جب ایران فتح ہُوا، اور کسریٰ کے زیورات لُوٹ میں لائے، تو حضرت عمرؓ نے انہی کو وہ زیورات پہنا کر عالم نیرنگی کا تماشا دیکھا۔

جعشم نے سُنا تو انعام کی اُمید میں نکلا، عین اس حالت میں کہ آپؐ روانہ ہو رہے تھے، اُس نے آپؐ کو دیکھ لیا، اور گھوڑا دوڑا کر قریب آگیا، لیکن گھوڑے نے ٹھوکر کھائی، وہ گر پڑا۔ ترکش سے فال کے تیر نکالے کہ حملہ کرنا چاہیے یا نہیں؟ جواب میں "نہیں" نکلا۔ لیکن سَو اونٹوں کا گراں بہا معاوضہ ایسا نہ تھا کہ تیر کی بات مان لی جاتی۔ دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوا اور آگے بڑھا، اب کی گھوڑے کے پاؤں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے۔ گھوڑے سے اُتر پڑا اور پھر فال دیکھی۔ اب بھی وہی جواب تھا۔ لیکن مکرر تجربہ نے اُس کی ہمت پست کر دی، اور یقین ہو گیا کہ یہ کچھ اور آثار ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر قریش کے اشتہار کا واقعہ سُنایا، اور درخواست کی کہ مجھ کو امن کی تحریر لکھ دیجیے۔ حضرت ابو بکرؓ کے غلام عامر بن فہیرہ رضؓ نے چمڑے کے ایک ٹکڑے پر فرمانِ امن لکھ دیا۔[1]

حُسنِ اتفاق یہ کہ حضرت زبیر رضؓ شام سے تجارت کا سامان لے کر آ رہے تھے، انھوں نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اور حضرت ابو بکر رضؓ کی خدمت میں چند بیش قیمت کپڑے پیش کیے جو اس بے سرو سامانی میں غنیمت تھے۔

ابنِ سعد نے طبقات میں اس مقدس سفر کی تمام منزلیں گنائی ہیں۔ اگرچہ عرب کے نقشوں میں آج ان کا نام نہیں ملتا۔ تاہم عقیدت مند صرف نام سے لذت یاب ہو سکتے ہیں۔ خرار، ثنیۃ المرۃ، لقف، مدلجۃ، مرجح، حدائد، اذاخر، رابغ (یہ مقام آج بھی حجاج کے رستے میں آتا ہے، یہاں آپؐ نے مغرب کی نماز پڑھی) ذا سلم، عثانیۃ، قاحہ، عرج، جدوات، رکوبۃ، عقیق، جثجاثۃ۔

---

[1] صحیح بخاری باب ہجرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پریشانی میں بھی دوات قلم ساتھ رہتا تھا۔

تشریف آوری کی خبر مدینہ میں پہلے پہنچ چکی تھی، تمام شہر ہمہ تن چشم انتظار تھا، معصوم بچے فخر اور جوش میں کہتے پھرتے تھے کہ "پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) آ رہے ہیں" لوگ ہر روز تڑکے سے نکل نکل کر شہر کے باہر جمع ہوتے، اور دوپہر تک انتظار کر کے حسرت کے ساتھ واپس چلے آتے، ایک دن انتظار کر کے واپس جا چکے تھے کہ ایک یہودی نے قلعہ سے دیکھا اور قرائن سے پہچان کر پکارا، کہ "اہلِ عرب، لو تم جس کا انتظار کرتے تھے وہ آ گیا" تمام شہر تکبیر کی آواز سے گونج اُٹھا، انصار ہتھیار سج سج کر بیتابانہ گھروں سے نکل آئے۔

مدینہ منوّرہ سے تین میل کے فاصلے پر جو بالائی آبادی ہے، اُس کو عالیہ اور قبار کہتے ہیں۔ یہاں انصار کے بہت سے خاندان آباد تھے۔ ان میں سب سے زیادہ ممتاز عمرو بن عوف کا خاندان تھا، اور کلثومؓ بن الہدام خاندان کے افسر تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہاں پہنچے تو تمام خاندان نے جوشِ مسرت میں اللہ اکبر کا نعرہ مارا، یہ فخر اُن کی قسمت میں تھا کہ میزبانِ دوعالم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے انہی کی مہمانی قبول کی، انصار ہر طرف سے جوق جوق آتے اور جوشِ عقیدت کے ساتھ سلام عرض کرتے تھے۔

اکثر صحابہؓ جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پہلے مدینہ میں آ چکے تھے، وہ بھی انہی کے گھر میں اُترے تھے۔ چنانچہ حضرت ابو عبیدہؓ مقدادؓ، خبابؓ، سہیلؓ، صفوانؓ، عیاضؓ، عبداللہ ابن مخرمہؓ، وہبؓ بن سعد، معمرؓ بن ابی سرح، عمیرؓ بن عوف اب تک انہی کے مہمان تھے۔

جناب امیرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روانہ ہونے کے تین دن بعد مکہ

۱؎ صحیح بخاری صفحہ۔ ۲؎ طبقات ابن سعد سیرۃ نبوی ص۱۵۸ ۳؎ ابن سعد تذکرہ کلثومؓ بن ہدم

سے چلے تھے، وہ بھی آگئے اور یہیں ٹھہرے۔ تمام مورخین اور ارباب سیر لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں صرف چار دن قیام فرمایا لیکن صحیح بخاری میں چودہ دن ہے، اور یہی قرین قیاس ہے۔

یہاں آپؐ کا پہلا کام مسجد کا تعمیر کرانا تھا۔ حضرت کلثوم رضؓ کی ایک افتادہ زمین تھی، جہاں کھجوریں سکھائی جاتی تھیں، یہیں دست مبارک سے مسجد کی بنیاد ڈالی، یہی مسجد ہے جس کی شان میں قرآن مجید میں ہے:

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَی التَّقْوٰی	وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے ہی دن پرہیزگاری
مِنْ اَوَّلِ یَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ	پر رکھی گئی ہے، وہ اس بات کی زیادہ مستحق
فِیْهِ ط فِیْهِ رِجَالٌ یُّحِبُّوْنَ	ہے کہ تم اس میں کھڑے ہو، اس میں ایسے
اَنْ یَّتَطَهَّرُوْا ط وَاللّٰهُ یُحِبُّ	لوگ ہیں جن کو صفائی بہت پسند ہے،
الْمُطَّهِّرِیْنَ ۔ (توبہ۔۱۳)	اور خدا صاف رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

مسجد کی تعمیر میں مزدوروں کے ساتھ آپؐ خود بھی کام کرتے تھے۔ بھاری بھاری پتھروں کے اٹھاتے وقت جسم مبارک خم ہو جاتا تھا۔ عقیدت مند آتے اور عرض کرتے "ہمارے ماں باپ آپؐ پر فدا ہوں، آپؐ چھوڑ دیں ہم اٹھالیں گے"۔ آپؐ ان کی درخواست قبول فرماتے، لیکن پھر اسی وزن کا دوسرا پتھر اٹھا لیتے۔[له]

حضرت عبداللہ رضؓ بن رواحہ شاعر تھے، وہ بھی مزدوروں کے ساتھ شریک تھے۔ اور جس طرح مزدور کام کرنے کے وقت تھکن مٹانے کو گاتے جاتے ہیں، وہ یہ اشعار پڑھتے جاتے تھے:

اَفْلَحَ مَنْ یُّعَالِجُ الْمَسَاجِدَا — وہ کامیاب ہے جو مسجد تعمیر کرتا ہے

له وفاء الوفاء بحوالہ طبرانی کبیر (ج ۱ ص ۱۸۰)

ویقرأ القرآن قائما وقاعدا — اور اُٹھتے بیٹھتے قرآن پڑھتا ہے،

ولا یبیت اللیل عنہ راقدا — اور رات کو جاگتا رہتا ہے،

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی ہر ہر قافیہ کے ساتھ آواز ملاتے جاتے تھے۔

قُبا میں آپؐ کا داخلہ اسلام کے دَورِ خاص کی ابتدا ہے، اس لیے مورخین نے اس تاریخ کو زیادہ اہتمام کے ساتھ محفوظ رکھا ہے۔ اکثر مورخین کا اتفاق ہے کہ یہ آٹھ ربیع الاوّل ۱۳ نبوی (مطابق ۲۰ ستمبر ۶۲۲ء) تھی، محمد بن موسیٰ خوارزمی نے لکھا ہے کہ جمعرات کا دن، اور فارسی ماہ تیر کی چوتھی، اور رومی ماہ ایلول ۹۳۳ سکندری کی دسویں تاریخ تھی[۲]۔ مورخ یعقوبی نے ہیئت دانوں سے یہ زائچہ نقل کیا ہے:

آفتاب	برج سرطان میں	۲۳ درجہ ۶ دقیقہ پر
زحل	برج اسد میں	۲ درجہ
مشتری	برج حوت میں	۶ درجہ
زہرہ	برج اسد میں	۱۳ درجہ
عطارد	برج اسد میں	۱۵ درجہ

[۱] وفاء الوفاء بحوالہ ابن شبہ ج ۱ ص ۱۸۱ مصر

[۲] عینی شرح بخاری جلد دوم صفحہ ۲۵۴ (عینی مطبوعہ قسطنطنیہ میں مطبع کی غلطی سے ۷۳۳ سبعمائۃ لکھا گیا ہے۔ اس کو تسعمائۃ پڑھنا چاہیے۔ رومی ماہ ایلول کی دسویں کے بجائے جدید طریقہ حساب سے بیسویں ثابت ہوتی ہے۔ خوارزمی نے جمعرات کا دن بتایا ہے۔ لیکن جدید حساب سے دوشنبہ کا دن آتا ہے۔

چودہ[۱] دن کے بعد (جمعہ[۲] کو) آپؐ شہر کی طرف تشریف فرما ہوئے، (راہ میں بنی سالم کے محلے میں نماز کا وقت آ گیا۔ جمعہ کی نماز یہیں ادا فرمائی، نماز سے پہلے خطبہ دیا۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے پہلی نماز جمعہ، اور سب سے پہلا خطبہ نماز تھا۔ لوگوں کو جب تشریف آوری کی خبر معلوم ہوئی تو ہر طرف سے لوگ جوش مسرت سے پیش قدمی کے لیے دوڑے (آپؐ کے ننھالی رشتہ دار بنو نجار تھے) سج سج کر آئے[۳]۔ قبا سے مدینہ تک دورویہ جان نثاروں کی صفیں تھیں۔ راہ میں انصار کے خاندان آتے تھے۔ ہر قبیلہ سامنے آ کر عرض کرتا "حضور! یہ گھر ہے، یہ مال ہے، یہ جان ہے" آپؐ منت کا اظہار فرماتے اور دعائے خیر دیتے۔ شہر قریب آ گیا تو جوش کا یہ عالم تھا کہ پردہ نشین خاتونیں چھتوں پر نکل آئیں اور گانے لگیں:

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَیْنَا	چاند نکل آیا ہے،
مِنْ ثَنِیَّاتِ الْوَدَاعِ	کوہ وداع کی گھاٹیوں سے،
وَجَبَ الشُّکْرُ عَلَیْنَا	ہم پر خدا کا شکر واجب ہے۔
مَا دَعَا لِلّٰہِ دَاعِ	جب تک دعا مانگنے والے دعا مانگیں۔

---

[۱] خوارزمی کے حساب کے مطابق روز ورود (جمعرات) نہ لیا جائے تو ۱۴ دن کے بعد جمعہ ہوگا۔

[۲] یہ واقعہ بخاری کے متعدد ابواب مسجد، ہجرت وغیرہ میں مذکور ہے۔ [۳] وفاء الوفاء جلد اوّل صفحہ ۱۸۰ پہلے اشعار کے متعلق زرقانی میں نہایت محققانہ محدثانہ بحث کی ہے، اور ابن قیم کے اس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ ثنیۃ الوداع شام کی طرف ہے، نہ کہ مکہ کی طرف، مواہب میں لکھا ہے کہ یہ اشعار حلوانی نے شیخین کی شرط پر روایت کیے ہیں۔ بخاری میں بھی یہ اشعار منقول ہیں، مگر غزوۂ تبوک کے موقع پر، لیکن ان دونوں روایتوں میں کچھ تناقض نہیں، ممکن ہے دونوں موقعوں پر یہ اشعار پڑھے گئے ہوں۔

معصوم لڑکیاں دف بجا بجا کر گاتی تھیں :

نَحْنُ جَوَارٍ مِنْ بَنِی النَّجَّارِ — ہم خاندانِ نجار کی لڑکیاں ہیں ،

یَا حَبَّذَا مُحَمَّدًا مِنْ جَارٍ — محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیا اچھا ہمسایہ ہے ۔

آپؐ نے ان لڑکیوں کی طرف خطاب کر کے فرمایا "کیا تم مجھ کو چاہتی ہو؟" بولیں "ہاں"۔ فرمایا کہ "میں بھی تم کو چاہتا ہوں"۔

جہاں اب مسجدِ نبویؐ ہے ، اس سے متصل حضرت ابوایوبؓ انصاری کا گھر تھا ، کوکبۂ نبویؐ یہاں پہنچا ، سخت کشمکش تھی کہ آپؐ کی میزبانی کا شرف کس کو حاصل ہو ؟ قرعہ ڈالا گیا اور آخر یہ دولت ابوایوبؓ کے حصے میں آئی ۔

حضرت ابوایوبؓ کا مکان دو منزلہ تھا۔ انھوں نے بالائی منزل پیش کی ، لیکن آپؐ نے زائرین کی آسانی کے لیے نیچے کا حصہ پسند فرمایا۔ ابوایوبؓ دونوں وقت آپؐ کی خدمت میں کھانا بھیجتے ، اور آپؐ جو چھوڑ دیتے ، ابوایوبؓ اور ان کی زوجہ کے حصے میں آتا۔ کھانے میں جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں کا نشان

لہ ابوایوبؓ کا نام خالد ہے ، اصابہ فی احوال الصحابہ میں اسی نام سے ان کا ذکر کیا ہے اور وہیں یہ واقعہ لکھا ہے ، اکثر سیر اور تواریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ چونکہ ہر شخص اپنے گھر میں اتارنے کی درخواست کرتا تھا ، آپؐ نے فرمایا کہ "میرے ناقہ کو چھوڑ دو ، وہ خدا کی طرف سے مامور ہے"۔ چنانچہ ناقہ حضرت ابوایوبؓ کے گھر کے سامنے جا کر بیٹھ گیا ، اس لیے آپؐ نے انہی کے گھر پر قیام فرمایا۔ لیکن صحیح مسلم باب الہجرۃ میں ہے کہ جب لوگوں میں آپؐ کی میزبانی کے متعلق جھگڑا ہوا تو آپؐ نے کہا کہ "میں بنو نجار کے ہاں اتروں گا جو عبدالمطلب کے ماموں ہیں"۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمداً ایسا کیا تھا حضرت ابوایوب اسی خاندان سے تھے ۔ امام بخاری نے تاریخ صغیر میں تصریح کی ہے کہ ابوایوبؓ کے گھر اترنا اسی قرابت کی وجہ سے تھا ۔

پڑا ہوتا، ابو ایوب رضؓ بھی تبرکاً وہیں انگلیاں ڈالتے۔

ایک دن اتفاق سے بالائی منزل میں پانی کا برتن ٹوٹ گیا۔ اندیشہ ہوا کہ پانی بہ کر نیچے جائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف ہو، گھر میں اوڑھنے کا صرف ایک لحاف تھا، حضرت ابو ایوبؓ نے اس کو ڈال دیا کہ پانی جذب ہو کر رہ جائے[1]۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سات مہینہ تک یہیں قیام فرمایا۔ اس اثنا میں جب مسجد نبویؐ اور آس پاس کے حجرے تیار ہو گئے تو آپ نے نقل مکان فرمایا۔ تفصیل آگے آتی ہے۔

مدینہ میں آکر آپؐ نے حضرت زیدؓ (اور اپنے غلام ابو رافع) کو دو اونٹ اور پانسو درہم دے کر بھیجا کہ مکہ جاکر صاحبزادیوں اور حرم نبویؐ کو لے آئیں۔ حضرت ابو بکرؓ نے اپنے بیٹے عبداللہ رضؓ کو لکھا کہ وہ بھی اپنی ماں اور بہنوں کو لے کر چلے آئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں میں سے حضرت رقیہ رضؓ حضرت عثمان رضؓ کے ساتھ حبش میں تھیں، حضرت زینب رضؓ کو ان کے شوہر نے آنے نہ دیا۔ زید رضؓ صرف حضرت فاطمہ رضؓ زہرا (اور حضرت ام کلثوم رضؓ) اور حضرت سودہ رضؓ (زوجہ محترم نبویؐ) کو لے کر آئے۔ حضرت عائشہ رضؓ اپنے بھائی عبداللہ کے ساتھ آئیں[2]۔

مسجد نبویؐ اور ازواج مطہرات کے حجروں کی تعمیر

مدینہ میں قیام کے بعد سب سے پہلا کام ایک خانہ خدا کی تعمیر تھی۔ اب تک یہ معمول تھا کہ مویشی خانہ میں زیا جہاں موقع ملتا تھا آپ نماز

لہ ابن سعد (جز نساء صفحہ ۴۲)

پڑھا کرتے تھے[1] دولت کدہ کے قریب خاندانِ نجار کی زمین تھی جس میں کچھ قبریں تھیں، کچھ کھجور کے درخت تھے۔ آپؐ نے ان لوگوں کو بُلا کر فرمایا "میں یہ زمین بہ قیمت لینا چاہتا ہوں۔" وہ بولے کہ "ہم قیمت لیں گے، لیکن آپؐ سے نہیں بلکہ خدا سے۔" چونکہ اصل میں وہ زمین دو یتیم بچوں کی تھی، آپؐ نے خود ان یتیموں کو بُلا بھیجا، ان یتیم بچوں نے بھی اپنی کائنات نذر کرنی چاہی لیکن آپؐ نے گوارا نہ کیا۔ حضرت ابو ایوبؓ نے قیمت ادا کی، قبریں اُکھڑوا کر زمین ہموار کر دی گئی اور مسجد کی تعمیر شروع ہوئی۔ شہنشاہِ دو عالم، پھر مزدوروں کے لباس میں تھا۔ صحابہؓ پتھر اُٹھا اُٹھا کر لاتے تھے اور یہ رجز پڑھتے جاتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اُن کے ساتھ آواز ملاتے اور فرماتے[2]:

اَللّٰھُمَّ لَا خَیْرَ اِلَّا خَیْرُ الْاٰخِرَۃ — اے خدا! کامیابی صرف آخرت کی کامیابی ہے،

فَاغْفِرِ الْاَنْصَارَ وَالْمُھَاجِرَۃ — اے خدا! مہاجرین اور انصار کو بخش دے،

یہ مسجد ہر قسم کے تکلفات سے بری اور اسلام کی سادگی کی تصویر تھی۔ یعنی کچی اینٹوں کی دیواریں، برگِ خرما کا چھپر، کھجور کے ستون تھے۔ قبلہ بیت المقدس کی طرف رکھا گیا، لیکن جب قبلہ بدل کر کعبہ کی طرف ہو گیا تو شمالی جانب ایک نیا دروازہ قائم کر دیا گیا، فرش چونکہ بالکل خام تھا۔ بارش میں کیچڑ ہو جاتی تھی۔ ایک دفعہ صحابہ نماز کے لیے آئے تو کنکریاں لیتے آئے اور اپنی اپنی نشست گاہ پر بچھا لیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند فرمایا اور سنگریزوں کا فرش بنوا دیا۔ مسجد کے ایک سرے پر ایک مسقف چبوترہ تھا، جو صفہ کہلاتا تھا۔ یہ اُن

---

[1] ابو داؤد باب بناء المسجد [2] بخاری باب المساجد و باب الہجرۃ و حج و باب البیوع و عینی شرح بخاری جلد ۲ صفحہ ۳۵۷ و زرقانی۔

لوگوں کے لیے تھا جو اسلام لاتے تھے اور گھر بار نہیں رکھتے تھے۔

مسجد نبویؐ جب تعمیر ہو چکی تو مسجد سے متصل ہی آپ نے ازواج مطہرات رضؓ کے لیے مکان بنوائے۔ اس وقت حضرت سودہ رضؓ اور حضرت عائشہ عقد نکاح میں آچکی تھیں، اس لیے دو ہی حجرے بنے۔ جب اور ازواج آتی گئیں تو اور مکانات بنتے گئے۔ یہ مکانات کچی اینٹوں کے تھے۔ ان میں سے پانچ کھجور کی ٹٹیوں سے بنے تھے، جو حجرے اینٹوں کے تھے، اُن کے اندرونی حجرے بھی ٹٹیوں کے تھے۔ ترتیب یہ تھی کہ حضرت امّ سلمہ رضؓ، حضرت امّ حبیبہ رضؓ، حضرت زینب رضؓ، حضرت جویریہ رضؓ، حضرت میمونہ، حضرت زینبؓ بنت جحش کے مکانات شامی جانب تھے، اور حضرت عائشہ رضؓ، حضرت صفیہ رضؓ، حضرت سودہ رضؓ مقابل جانب تھیں[۱]۔ یہ مکانات مسجد سے اس قدر متصل تھے کہ جب آپؐ مسجد میں اعتکاف میں ہوتے تو مسجد سے سر نکال دیتے اور ازواج مطہرات رضؓ گھر میں بیٹھے بیٹھے آپؐ کے بال دھو دیتی تھیں۔

یہ مکانات چھ چھ، سات سات ہاتھ چوڑے اور دس دس ہاتھ لانبے تھے۔ چھت اتنی اونچی تھی کہ آدمی کھڑا ہو کر چھت کو چھو لیتا تھا، دروازوں پر کمل کا پردہ پڑا رہتا تھا[۲]۔ راتوں کو چراغ نہیں جلتے تھے[۳]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمسایہ میں جو انصار رہتے تھے اُن میں حضرت سعد رضؓ ابن عبادہ، حضرت سعدؓ بن معاذ، حضرت عمارۃؓ بن حزمؓ، اور حضرت

---

[۱] طبقات ابن سعد، جلد سیرت نبویؐ صفحہ ۱۶۱ [۲] منازل نبویؐ کا حال طبقات ابن سعد جزو ۸ صفحہ ۱۱۷، اور وفاء الوفاء میں تفصیلاً ہے [۳] بخاری باب الصلوٰۃ علی الفراش

ابو ایوب رض، رئیس اور دولت مند تھے۔ یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دودھ بھیج دیا کرتے تھے، اور اسی پر آپؐ بسر فرماتے تھے۔ حضرت سعد بن عبادہ نے التزام کرلیا تھا کہ رات کے کھانے پر ہمیشہ اپنے ہاں سے ایک بڑا بادیہ بھیجا کرتے تھے، جس میں کبھی سالن، کبھی دودھ، کبھی گھی ہوتا تھا[۱]۔ حضرت انس رض کی ماں حضرت امّ انس نے اپنی جائداد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرماکر اپنی دایہ حضرت امّ ایمن رض کو دے دی[۲]، اور خود فقر و فاقہ اختیار فرمایا۔

اذان کی ابتدا اسلام کے تمام عبادات کا اصلی مرکز وحدت و اجتماع ہے، اس وقت تک کسی خاص علامت کے نہ ہونے کی وجہ سے نمازِ جماعت کا کوئی انتظام نہ تھا۔ لوگ وقت کا اندازہ کرکے آتے تھے اور نماز پڑھتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ پسند نہ تھا۔ آپؐ نے ارادہ فرمایا کہ کچھ لوگ مقرر کردیے جائیں جو وقت پر لوگوں کو گھروں سے بلا لائیں۔ لیکن اس میں زحمت تھی۔ صحابہ کو بلا کر مشورہ کیا۔ لوگوں نے مختلف رائیں دیں۔ کسی نے کہا نماز کے وقت مسجد پر ایک علم کھڑا کردیا جائے، لوگ دیکھ دیکھ کر آتے جائیں گے۔ آپؐ نے یہ طریقہ ناپسند فرمایا۔ عیسائیوں اور یہودیوں کے یہاں اعلانِ نماز کے جو طریقے ہیں، وہ بھی آپؐ کی خدمت میں عرض کیے گئے۔ لیکن آپؐ نے حضرت عمر رض کی رائے پسند کی اور حضرت بلال رض کو حکم دیا کہ اذان دیں[۳]۔ اس سے ایک طرف تو نماز کی اطلاع عام ہو جاتی تھی، دوسری طرف دن میں پانچ دفعہ دعوتِ اسلام کا اعلان ہوجاتا تھا۔

---

[۱] طبقات ابن سعد، جلد کتاب النساء صفحہ ۱۱۶ [۲] صحیح بخاری ۳۵۸ باب فضل المنیحہ۔

[۳] ابو داؤد باب الاذان، بخاری باب الاذان، بخاری میں زید کے واقعہ کا ذکر نہیں۔

صحاح ستہ کی بعض کتابوں میں ہے کہ اذان کی تجویز عبداللہ بن زیدؓ نے پیش کی تھی، جو انھوں نے خواب میں دیکھی تھی۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ کو بھی خواب میں توارد ہُوا۔ لیکن صحیح بخاری کی روایت کے مقابلے میں کسی اور روایت کو ترجیح نہیں دی جا سکتی ہے[۱]

بخاری میں صاف تصریح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بوق اور ناقوس کی تجویزیں پیش کی گئیں، لیکن حضرت عمرؓ نے اذان کی تجویز پیش کی، اور آپ نے اس کے موافق حضرت بلالؓ کو بُلا کر اذان کا حکم دیا، خواب کا ذکر نہیں۔

مواخاۃ مہاجرین، مکہ معظمہ سے بالکل بے سروسامان آئے تھے۔ گو ان میں

---

[۱] یہ روایت صحیح بخاری کے علاوہ، صحیح مُسلم، نسائی اور ترمذی میں بھی ہے لیکن تمام روایات کو اور علماء کی تحقیقات کو سامنے رکھنے سے مسئلہ کی صحیح صُورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے دوسرے لوگوں کی رایوں کے مقابلے میں اپنی رائے یہ پیش کی تھی جیسا کہ بخاری والی روایت میں ہے کہ اولا تبعثون رجلا ینادی بالصلوٰۃ کہ ایک آدمی بھیجا جائے جو پکار کر نماز کا اعلان کر دے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی رائے کو پسند فرمایا اور الصلوٰۃ جامعۃ کے لفظ سے اس کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اور بعض دوسرے صحابہ نے بھی خواب میں اذان کے مروجہ الفاظ کے ساتھ اذان کو خواب میں دیکھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منجانب اللہ سمجھ کر قبول فرمایا، اور اسی کے مطابق اذان مروجہ جاری فرمائی گئی۔ فتح الباری و نووی و زرقانی و روض الانف باب بدء الاذان میں یہ تفصیلات بحوالہ سند مذکور ہیں۔ "س"

دولت مند اور خوشحال بھی تھے، لیکن کافروں سے چھپ چھپ کو نکلے تھے، اس لیے کچھ ساتھ نہ لا سکے تھے۔

اگرچہ مہاجرین کے لیے انصار کا گھر مہمان خانہ عام تھا، تاہم ایک مستقل انتظام کی ضرورت تھی۔ مہاجرین نذر اور خیرات پر بسر کرنا پسند نہیں کرتے تھے، وہ دست و بازو سے کام لینے کے خوگر تھے۔ تاہم چونکہ بالکل بکھرے ہوئے تھے اور ایک حبہ تک پاس نہ تھا، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیال فرمایا کہ انصار اور اُن میں رشتہ اخوت قائم کر دیا جائے۔ جب مسجد کی تعمیر قریب ختم ہوئی تو آپؐ نے انصار کو طلب فرمایا۔ حضرت انس رضؓ بن مالک جو اس وقت دس سالہ تھے، اُن کے مکان میں لوگ جمع ہوئے، مہاجرین کی تعداد پینتالیس[۴۵] تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کی طرف خطاب کر کے فرمایا "یہ تمہارے بھائی ہیں۔" پھر مہاجرین اور انصار میں سے دو دو شخص کو بلا کر فرماتے گئے کہ یہ اور تم بھائی بھائی ہو، اور اب وہ درحقیقت بھائی بھائی تھے۔ انصار نے مہاجرین کو ساتھ لے جا کر گھر کی ایک ایک چیز کا جائزہ دے دیا کہ آدھا آپ کا اور آدھا ہمارا ہے۔ سعد بنؓ الربیع جو عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے بھائی قرار پائے اُن کی دو بیویاں تھیں، عبدالرحمٰن رضؓ سے کہا کہ ایک کو میں طلاق دیتا ہوں، آپؐ اس سے نکاح کر لیجیے، لیکن انھوں نے احسان مندی کے ساتھ انکار کیا[۱]۔

انصار کا مال و دولت، جو کچھ تھا نخلستان تھے۔ روپے پیسے تو اس زمانہ میں تھے نہیں[۲]۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ یہ باغ

---

[۱] مواخاۃ کا ذکر، اور ایک ایک کا نام، ابن ہشام صفحہ ۱۷۸ میں ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن رضؓ بن عوف کا واقعہ صحیح بخاری کتاب المناقب باب اخاء النبی میں ہے، [۲] صحیح بخاری صفحہ ۳۱۳۔

ہمارے بھائیوں میں برابر تقسیم کر دیے جائیں۔ مہاجرین تجارت پیشہ تھے اور اس وجہ سے کھیتی کے فن سے بالکل نا آشنا تھے۔ اس بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی طرف سے انکار کیا۔ انصار نے کہا، سب کاروبار ہم خود انجام دے لیں گے جو کچھ پیداوار ہوگی اس میں نصف حصّہ مہاجرین کا ہوگا، مہاجرین نے اس کو منظور کیا۔[1]

یہ رشتہ بالکل حقیقی رشتہ بن گیا، کوئی انصاری مرتا تھا تو اس کی جائداد اور مال مہاجر[2] کو ملتا تھا اور بھائی بند محروم رہتے۔ یہ اس فرمانِ الٰہی کی تعمیل تھی:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا	جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور
وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ	خدا کی راہ میں مال و جان سے جہاد
اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	کیا اور وہ لوگ جنھوں نے ان
وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْا	لوگوں کو پناہ دی اور اُن کی مدد
اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ	کی، یہ لوگ باہم بھائی بھائی ہیں۔
بَعْضٍ ط (انفال - ۱۰)	

جنگ بدر کے بعد جب مہاجرین کو اعانت کی ضرورت نہ رہی تو یہ آیت اُتری:

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ	ارباب قرابت، ایک دوسرے کے
اَوْلٰى بِبَعْضٍ، (انفال - ۱۰)	زیادہ حقدار ہیں۔

---

[1] صحیح بخاری صفحہ ۳۱۲

[2] صحیح بخاری کتاب التفسیر آیہ واولو الارحام بعضھم اولی ببعض۔

اُس وقت سے یہ قاعدہ جاتا رہا۔ چنانچہ کتب تفسیر و حدیث میں یہ تصریح مذکور ہے۔

سنہ ۴ھ میں بنونضیر جب جلاوطن ہوئے اور ان کی زمین اور نخلستان قبضہ میں آئے تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے انصار کو بلا کر فرمایا کہ "مہاجرین نادار ہیں، اگر تمہاری مرضی ہو تو نئے مقبوضات تنہا اُن کو دے دیے جائیں اور تم اپنے نخلستان واپس لے لو۔" انصار نے عرض کی کہ نہیں ہمارے نخلستان بھائیوں ہی کے قبضے میں رہنے دیجیے اور نئے بھی اُنہی کو عنایت فرمایئے[۱]۔

دُنیا انصار کے اس ایثار پر ہمیشہ ناز کرے گی۔ لیکن یہ بھی دیکھو کہ مہاجرین نے کیا کیا؟ حضرت سعدؓ بن الربیع نے جب حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو ایک ایک چیز کا جائزہ دے کر نصف لے لینے کی درخواست کی تو اُنھوں نے کہا "خدا یہ سب آپ کو مبارک کرے، مجھ کو بازار کا رستہ بتا دیجیے۔" انھوں نے قینقاع کا، جو مشہور بازار تھا، جا کر راستہ بتا دیا۔ اُنھوں نے کچھ گھی، کچھ پنیر خریدا، اور شام تک خرید و فروخت کی۔ چند روز میں اتنا سرمایہ ہو گیا کہ شادی کر لی۔ رفتہ رفتہ اُن کی تجارت کو یہ ترقی ہوئی کہ خود اُن کا قول تھا کہ خاک پر ہاتھ ڈالتا ہوں تو سونا بن جاتی ہے۔ اُن کا اسباب تجارت سات سات سو اونٹوں پر لد کر آتا تھا اور جس دن مدینہ میں پہنچتا تمام شہر میں دھوم مچ جاتی تھی[۲]۔

---

[۱] فتوح البلدان، مطبوعہ یورپ صفحہ ۲۱۔ [۲] صحیح بخاری میں دو مختلف موقعوں پر یہ واقعہ مذکور ہے (کتاب البیوع، و باب کیف آخی النبی صلی اللہ علیہ وسلم، باب اخاء النبی بین المہاجرین و الانصار، باب الولیمہ، و لو بشاۃ) ص ۵۳، اسد الغابہ ج ۳ صفحہ ۲۱۴ و ۳۱۵ وغیرہ میں یہ واقعہ مذکور ہے۔

بعض صحابہؓ نے دکانیں کھول لیں۔ حضرت ابوبکرؓ کا کارخانہ سنخ میں تھا، جہاں وہ کپڑے کی تجارت کرتے تھے[1]۔ حضرت عثمانؓ بنو قینقاع کے بازار میں کھجور کی خرید و فروخت کرتے تھے[2]۔ حضرت عمرؓ بھی تجارت میں مشغول ہوگئے تھے[3]۔ اور شاید ان کی اس تجارت کی وسعت ایران تک پہنچ گئی تھی[4]۔ اور صحابہؓ نے بھی اسی قسم کی چھوٹی بڑی تجارت شروع کر دی تھی۔ صحیح بخاری میں روایت ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ پر لوگوں نے کثرت روایت کی بنا پر اعتراض کیا کہ اور صحابہؓ تو اس قدر روایت نہیں کرتے تو انھوں نے کہا "اس میں میرا کیا قصور ہے۔ اور لوگ بازار میں تجارت کرتے تھے۔ اور میں رات دن بارگاہِ نبوت میں حاضر رہتا تھا"۔

پھر جب خیبر فتح ہوا تو تمام مہاجرین نے یہ نخلستان انصار کو واپس کر دیے۔ صحیح مسلم باب الجہاد میں ہے:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما فرغ من قتال اھل خیبر وانصرف الی المدینۃ ردّ المھاجرون الی الانصار منائحھم التی کانوا منحوھم من ثمارھم۔	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب جنگ خیبر سے فارغ ہوئے اور مدینہ واپس آئے تو مہاجرین نے انصار کے عطیے جو نخلستان کی صورت میں تھے، واپس کر دیے۔

مہاجرین کے لیے مکانات کا یہ انتظام ہوا کہ انصار نے اپنے گھروں کے آس

---

[1] ابن سعد جلد ۳ صفحہ ۱۳۰ [2] مسند امام حنبل جلد ۱ صفحہ ۶۲ [3] مسند ابن حنبل جلد ۴ صفحہ ۴۰۰ [4] ابن حنبل جلد ۳ صفحہ ۳۴۷۔

پاس جو افتادہ زمینیں تھیں اُن کو دے دیں، اور جن کے پاس زمین نہ تھی انھوں نے اپنے مسکونہ مکانات دے دیے۔ سب سے پہلے حضرت حارثہؓ بن نعمان نے اپنی زمین پیش کی۔ بنو زہرہ مسجد نبویؐ کے عقب میں آباد ہوئے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے یہاں ایک قلعہ (جس کو گڑھی کہنا زیادہ موزوں ہوگا) بنوایا۔ حضرت زبیرؓ بن العوام کو ایک وسیع زمین ہاتھ آئی۔ حضرت عثمانؓ، حضرت مقدادؓ، حضرت عبیدؓ کو انصار نے اپنے مکانات کے پہلو میں زمینیں دیں[۱]۔

مواخاۃ کے رشتے سے جو لوگ آپس میں بھائی بھائی بنے، ان میں سے بعض حضرات کے نام یہ ہیں[۲]:

مہاجرین	انصار
حضرت ابوبکرؓ	حضرت خارجہ بنؓ زید انصاری
حضرت عمرؓ	حضرت عتبانؓ بن مالک انصاری
حضرت عثمانؓ	حضرت اوسؓ بن ثابت انصاری
حضرت ابوعبیدہؓ جراح	حضرت سعدؓ بن معاذ انصاری
حضرت زبیرؓ بن العوام	حضرت سلامہؓ بن وقش
حضرت مصعبؓ بن عمیر	حضرت ابوایوبؓ انصاری
حضرت عمارؓ بن یاسر	حضرت حذیفہؓ بن یمان
حضرت ابوذر غفاریؓ	حضرت منذرؓ بن عمرو
حضرت سلمانؓ فارسی	حضرت ابودرداءؓ

[۱] یہ پوری تفصیل معجم البلدان مدینہ منورہ کے ذکر میں ہے [۲] یہ تفصیل ابن ہشام صفحہ ۱۷۹ میں ہے۔

انصار	مہاجرین
حضرت ابو رویحہ رضؓ	حضرت بلال رضؓ
حضرت عباد بن بشر	حضرت ابو حذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ
حضرت ابی کعب رضؓ	حضرت سعید بن زید بن عمرو بن نفیل

مواخات کا رشتہ بظاہر ایک عارضی ضرورت کے لیے قائم کیا گیا۔ کہ بے خانماں مہاجرین کا چند روزہ انتظام ہو جائے لیکن درحقیقت یہ عظیم الشان اغراضِ اسلامی کی تکمیل کا سامان تھا۔

اسلام، تہذیبِ اخلاق و تکمیلِ فضائل کی شاہنشاہی ہے۔ اس سلطنتِ الٰہی کے لیے وزراء، اربابِ تدبیر، سپہ سالارانِ لشکر، ہر قابلیت کے لوگ درکار ہیں۔ شرفِ صحبت کی برکت سے مہاجرین میں ان قابلیتوں کا ایک گروہ تیار ہو چکا تھا، اور اُن میں یہ وصف پیدا ہو چکا تھا کہ اُن کی درسگاہِ تربیت سے اور اربابِ استعداد بھی تربیت پاکر نکلیں۔ اس بنا پر جن لوگوں میں رشتۂ اخوت قائم کیا گیا، اُن میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا، کہ اُستاد اور شاگرد میں وہ اتحادِ مذاق موجود ہو جو تربیت پذیری کے لیے ضرور ہے۔ تفحص اور استقصار سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص جس کا بھائی بنایا گیا، دونوں میں یہ اتحادِ مذاق ملحوظ رکھا گیا، اور جب اس بات پر لحاظ کیا جائے کہ اتنی کم مدت میں سیکڑوں اشخاص کی طبیعت اور فطرت اور مذاق کا صحیح اور پورا اندازہ کرنا، قریباً ناممکن ہے تو تسلیم کرنا پڑے گا، کہ یہ شانِ نبوت کی خصوصیات میں سے ہے۔

حضرت سعید رضؓ بن زید عشرۂ مبشرہ میں ہیں اُن کے والد زید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے ملتِ ابراہیمی کے پیرو ہو چکے تھے، اور گویا اسلام کے مقدمۃ الجیش تھے۔ حضرت سعید رضؓ نے اُن ہی کے دامنِ تربیت میں

پرورش پائی تھی، اس لیے اسلام کا نام سُننے کے ساتھ انھوں نے لبیک کہا۔ اُن کی ماں بھی اُن کے ساتھ یا ان سے پہلے اسلام لائیں۔ حضرت عمرؓ انہی کے گھر میں اور انہی کی ترغیب سے اسلام کی طرف مائل ہوئے تھے۔ علم و فضل کے لحاظ سے فضلائے صحابہ میں تھے۔ اُن کی اخوت حضرت ابیؓ بن کعب سے قائم کی گئی۔ جنھوں نے یہ مرتبہ حاصل کیا کہ حضرت عمرؓ اُن کو سید المسلمین کہتے تھے۔ بارگاہِ نبوت میں منصب انشا پر سب سے پہلے وہی ممتاز ہوئے، فنِ قرأت کے وہ امام تسلیم کیے[1] جاتے ہیں۔

حضرت ابو حذیفہؓ عتبہ بن ربیعہ کے فرزند تھے، جو قریش کا رئیس اعظم تھا، اس مناسبت سے اُن کو حضرت عبادؓ بن بشر کا بھائی بنایا گیا، جو قبیلہ اشہل کے سردار تھے۔

حضرت ابو عبیدہؓ جراح جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امین الامۃ کا خطاب دیا تھا، ایک طرف تو فاتح شام ہونے کی قابلیت رکھتے تھے، دوسری طرف اسلام کے مقابلے میں پدری اور فرزندی کے جذبات اُن پر کچھ اثر نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ غزوۂ بدر میں جب اُن کے باپ اُن کے مقابلے میں آئے تو انھوں نے پہلے حقوقِ اُبوت کی مراعات کی، لیکن بالآخر اسلام پر باپ کو نثار کر دینا پڑا۔ اُن کی تربیت میں حضرت سعدؓ بن معاذ دیے گئے جو قبیلہ اوس کے رئیس اعظم تھے، اُن میں بھی ایثار کا یہ وصف نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ بنو قریظہ ان کے حلیف تھے، اور عرب میں حلیف کا رشتہ اخوت اور اُبوت کے برابر ہوتا تھا، تاہم غزوۂ بنی قریظہ میں جب اسلام کا مقابلہ پیش آیا تو

---

[1] اصابہ ذکر ابیؓ بن کعب۔

انھوں نے اپنے چار سو حلیفوں کو اسلام پر نثار کر دیا۔

حضرت بلال رضؓ اور حضرت ابو رویحہ رضؓ، حضرت سلمان رضؓ فارسی اور حضرت ابو درداء رضؓ، حضرت عمار رضؓ بن یاسر اور حضرت حذیفہ رضؓ بن یمان، حضرت مصعب رضؓ اور حضرت ابو ایوب رضؓ میں جو وحدت موجود تھی، جس کی بدولت نہ صرف شاگرد بلکہ اُستاد بھی شاگرد سے اثر پذیر ہو سکتا تھا۔ حضرت عبدالرحمٰن رضؓ بن عوف مدینہ میں آئے تو پنیر سر پر رکھ کر بیچتے تھے۔ حضرت سعد رضؓ بن الربیع کی صحبت میں جو امیرالامرا تھے دولت اور امارت کے جس درجہ پر پہنچے ہم اُوپر لکھ آئے ہیں۔

انصار نے مہاجرین کی مہمانی اور ہمدردی کا جو حق ادا کیا، دُنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ بحرین جب فتح ہُوا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو بلا کر فرمایا کہ مَیں اس کو انصار میں تقسیم کر دینا چاہتا ہوں۔ اُنھوں نے عرض کی کہ "پہلے ہمارے بھائی مہاجروں کو اتنی ہی زمین عنایت فرمائیے، تب ہم لینا منظور کریں گے"۔[1]

ایک دفعہ ایک فاقہ زدہ شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا کہ سخت بھوکا ہوں۔ آپؐ نے گھر میں دریافت فرمایا کہ کچھ کھانے کو ہے؟ جواب آیا کہ "صرف پانی" آپؐ نے حاضرین کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کوئی ہے، جو اُن کو آج اپنا مہمان بنائے۔ حضرت ابو طلحہ رضؓ نے عرض کی "میں حاضر ہوں"۔ غرض وہ اپنے گھر لوا گئے، لیکن وہاں بھی برکت تھی۔ بیوی نے کہا صرف بچوں کا کھانا موجود ہے۔ اُنھوں نے بیوی سے کہا چراغ بُجھا دو، اور وہی کھانا مہمان کے سامنے لا کر رکھ دو۔ تینوں ساتھ کھانے پر بیٹھے رہے۔ اور اس طرح

---

[1] صحیح بخاری فضائل انصار رضؓ

ہاتھ چلاتے رہے کہ گویا کھا رہے ہیں۔ اسی واقعہ[1] کے بارے میں یہ آیت اتری ہے:

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (حشر-۱) — اور گو اُن کو خود تنگی ہو تاہم اپنے اُوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔

صفہ اور اصحابِ صفہ اصحابِ صفہ اسلامی لغت کا ایک متداول لفظ ہے گو اس کی حقیقت سے لوگ اچھی طرح واقف نہیں۔

"صفہ" سائبان کو کہتے ہیں۔ یہ ایک سائبان تھا جو مسجد نبوی کے کنارے پر مسجد سے ملا ہوا تیار کیا گیا تھا۔ صحابہؓ میں سے اکثر تو مشاغلِ دینی کے ساتھ ہر قسم کے کاروبار یعنی تجارت یا زراعت وغیرہ بھی کرتے تھے۔ لیکن چند لوگوں نے اپنی زندگی صرف عبادت اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تربیت پذیری پر نذر کر دی تھی۔ ان لوگوں کے بال بچے نہ تھے، اور جب شادی کر لیتے تھے تو اس حلقہ سے نکل آتے۔ اُن میں ایک ٹولی دن کو جنگل سے لکڑیاں چن لاتی اور بیچ کر اپنے بھائیوں کے لیے کچھ کھانا مہیا کرتی۔

یہ لوگ دن کو بارگاہِ نبوت میں حاضر رہتے اور حدیثیں سنتے اور رات کو اُسی چبوترہ (صفہ) پر پڑ رہتے۔ حضرت ابوہریرہؓ بھی انہی لوگوں میں تھے، ان میں کسی کے پاس چادر اور تہمد دونوں چیزیں کبھی ساتھ مہیا نہ ہو سکیں۔ چادر کو گلے سے اس طرح باندھ لیتے کہ رانوں تک لٹک آتی۔ اکثر انصار کھجور کی پھلی ہوئی شاخیں توڑ کر لاتے اور چھت میں لگا دیتے۔ کھجوریں جو ٹپک کر گرتیں، یہ اُٹھا کر کھا لیتے۔ کبھی دو دو دن کھانے کو نہیں ملتا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ رسول اللہ

---

[1] صحیح بخاری و فتح الباری فضائل انصار۔

صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لاتے اور نماز پڑھاتے، یہ لوگ اگر شریک نماز ہوتے لیکن بھوک اور ضعف سے عین نماز کی حالت میں گر پڑتے۔ باہر کے لوگ آتے اور ان کو دیکھتے تو سمجھتے کہ دیوانے ہیں[۱]۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب کہیں سے صدقہ آتا تو مسلم ان کے پاس بھیج دیتے۔ اور جب دعوت کا کھانا آتا تو ان کو بلا لیتے اور ان کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ راتوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو مہاجرین اور انصار پر تقسیم فرما دیتے یعنی اپنے مقدور کے موافق ہر شخص ایک ایک دو دو کو اپنے ساتھ لے جاتے اور ان کو کھانا کھلاتے۔

حضرت سعدؓ بن عبادہ نہایت فیاض اور دولتمند تھے، وہ کبھی کبھی اسی اسی مہمانوں کو اپنے ساتھ لے کر[۲] جاتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کا اس قدر خیال رکھتے تھے کہ جب ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے درخواست کی کہ میرے ہاتھوں میں چکی پیستے پیستے نیل پڑ گئے ہیں، مجھ کو ایک کنیز عنایت ہو تو فرمایا کہ "یہ نہیں ہو سکتا کہ میں تم کو دوں اور صفہ والے بھوکے رہیں[۳]"۔ راتوں کو عموماً یہ لوگ عبادت کرتے اور قرآن مجید پڑھا کرتے، ان کے لیے ایک معلم مقرر تھا، اس کے پاس جا کر پڑھتے تھے[۴] اسی بنا پر ان میں اکثر "قاری" کہلاتے تھے۔ دعوت اسلام کے لیے کہیں بھیجنا ہوتا تو یہ لوگ بھیجے جاتے، غزوۂ معونہ میں، انہی میں سے ستر آدمی اسلام سکھانے

---

[۱] صحیح ترمذی باب معیشۃ اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم [۲] زرقانی ج ۱ صفحہ ۳۰۴ مصر ذکر اصحاب صفہ و مسجد نبویؐ۔ [۳] زرقانی ج اول صفحہ ۳۰۴ مصر ذکر اصحاب صفہ۔

[۴] مسند ابن حنبل جلد ۳ صفحہ ۱۳۷۔

کے لیے بھیجے گئے تھے۔

ان کی تعداد گھٹتی اور بڑھتی رہتی تھی۔ کل تعداد ۴۰۰ تک پہنچی تھی، لیکن کبھی ایک زمانہ میں اس قدر تعداد نہیں ہوئی، نہ صفہ میں اس قدر گنجائش تھی۔ ان لوگوں کا مفصل حال[۱] ابن الاعرابی احمد بن محمد البصری المتوفی ۳۴۰ھ نے، جو ابن مندہ کے استاد تھے، نے ایک الگ تصنیف میں لکھا ہے۔ سلمی نے بھی اُن کے حالات میں ایک الگ کتاب لکھی ہے[۲]۔

مدینہ کے یہود اور اُن سے معاہدہ

مؤرخین عرب کا بیان ہے کہ مدینہ کے یہود نسلاً یہودی تھے، اور اس تقریب سے عرب آئے تھے، کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو عمالقہ کے مقابلے کے لیے بھیجا تھا۔ لیکن تاریخی قرائن سے اُس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ یہود گو تمام دُنیا میں پھیلے لیکن انھوں نے اپنے نام کہیں نہیں بدلے، آج بھی وہ جہاں ہیں، اسرائیلی نام رکھتے ہیں۔ بخلاف اس کے عرب کے یہودیوں کے نام، نضیر، قینقاع، مرحب، حارث وغیرہ ہوتے تھے، جو خالص عربی نام ہیں۔ یہود عموماً بزدل اور دنی الطبع ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُن سے لڑنے کے لیے کہا تو بولے:

فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (مائدہ۔۴) — تم مع اپنے خُدا کے جاؤ اور لڑو، ہم یہاں بیٹھے رہیں گے۔

---

[۱] (حافظ سیوطی نے دو صفحہ کا ایک رسالہ اصحاب صفہ کے نام میں لکھا ہے، اس رسالہ میں سو آدمیوں کے نام بہ ترتیب ہجا مذکور ہیں [۲] اصحاب صفہ کا حال بخاری باب المغازی وغیرہ اور صحیح مسلم میں جستہ جستہ مذکور ہے۔ زرقانی نے اور کتابوں سے لیکر اضافہ کیا ہے۔ مَیں نے یہ واقعات بخاری و مسلم کے علاوہ زرقانی ہی کے حوالے سے لکھے ہیں، (نیز مسند ابن حنبل جلد ۲ صفحہ ۱۳۷ میں بھی ہیں)۔

بخلاف اس کے مدینہ کے یہود نہایت دلیر، شجاع اور بہادر تھے۔

ان قرائنِ عقلی کے علاوہ ایک بڑے مورخ (یعقوبی) نے صاف تصریح کی ہے کہ قریظہ اور نضیر عرب تھے، جو یہودی بن گئے تھے۔

ثم کانت وقعة بنی النضیر، وھم فخذ من جذام، الا انھم تھودوا..... وکذالک قریظة۔ [2]

پھر بنو نضیر کا معرکہ ہوا، یہ قبیلہ جذام کا ایک خاندان تھا، لیکن یہودی ہو گیا تھا اور اسی طرح قریظہ بھی۔

مورخ مسعودی نے بھی کتاب الاشراف والتنبیہ [3] میں ایک روایت لکھی ہے، کہ "یہ جذام کے قبیلہ سے تھے۔ کسی زمانہ میں عمالقہ سے اور ان کی بت پرستی سے بیزار ہو کر حضرت موسیٰؑ پر ایمان لائے اور شام سے نقل مکان کر کے حجاز چلے آئے۔

یہ تین قبیلے تھے۔ بنو قینقاع، بنو نضیر اور قریظہ، مدینہ کے اطراف میں آباد تھے، اور مضبوط برج اور قلعے بنا لیے تھے۔

انصار کے جو دو قبیلے تھے، یعنی اوس اور خزرج، ان میں باہم جو اخیر معرکہ ہوا تھا، (جنگِ بعاث) اس نے انصار کا زور بالکل توڑ دیا تھا یہود اس مقصد کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھتے تھے کہ انصار باہم کبھی متحد نہ ہونے پائیں۔

---

[1] مسٹر مرگیولیوس نے یہود کے متعلق تفصیل سے محققانہ بحث کی ہے۔ ان کا میلانِ رائے یہ ہے اور غالباً صحیح ہے کہ یہودیوں کی اس بڑی آبادی میں ایک دو خاندان اصلی یہود بھی تھے۔ عرب جو یہودی ہوتے گئے وہ بھی ان میں شامل ہوتے گئے۔

[2] یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۹ [3] مطبوعہ یورپ صفحہ ۲۴۷۔

ان اسباب کی بنا پر جب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) مدینہ میں تشریف لائے تو پہلا کام یہ تھا کہ مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات واضح اور منضبط ہو جائیں، آپؐ نے انصار اور یہود کو بلا کر حسب ذیل شرائط پر ایک معاہدہ لکھوایا جس کو دونوں فریق نے منظور کیا۔ یہ معاہدہ ابن ہشام میں پورا مذکور ہے۔ خلاصہ یہ ہے:

۱۔ خونبہا اور فدیہ کا جو طریقہ پہلے سے چلا آتا تھا اب بھی قائم رہے گا۔

۲۔ یہود کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی، اور ان کے مذہبی امور سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔

۳۔ یہود اور مسلمان باہم دوستانہ برتاؤ رکھیں گے۔

۴۔ یہود یا مسلمانوں کو کسی سے لڑائی پیش آئے گی تو ایک فریق دوسرے کی مدد کرے گا۔

۵۔ کوئی فریق قریش کو امان نہ دے گا۔

۶۔ مدینہ پر کوئی حملہ ہوگا تو دونوں فریق شریک یکدگر ہوں گے۔

۷۔ کسی دشمن سے اگر ایک فریق صلح کرے گا تو دوسرا بھی شریک صلح ہوگا۔ لیکن مذہبی لڑائی اس سے مستثنیٰ ہوگی۔

واقعات متفرقہ اس سال انصار میں سے دو نہایت معزز شخصوں نے جو مقربین خاص میں تھے، وفات پائی۔ حضرت کلثومؓ بن ہدم اور حضرت اسعدؓ بن زرارہ، کلثومؓ وہ شخص ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب قباء میں تشریف لائے تو انہی کے مکان میں ٹھہرے۔ اکثر بڑے بڑے صحابہ بھی انہی کے گھر اترے تھے حضرت اسعدؓ بن زرارہ ان چھ شخصوں میں ہیں جنھوں نے سب سے پہلے مکہ میں جا کر آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ اور ابن سعد کی روایت کے موافق ان

پہلے شخصوں میں جس نے سب سے پہلے بیعت کے لیے ہاتھ بڑھایا، یہی اسعدؓ تھے۔ یہ فخر بھی انہی کو حاصل ہے کہ سب سے پہلے انہی نے مدینہ میں آکر جمعہ کی نماز قائم کی۔

چونکہ یہ قبیلۂ بنی نجار کے نقیب تھے، اس لیے ان کی وفات کے بعد اس قبیلہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ اُن کے بجائے کوئی شخص اس منصب پر مقرر کیا جائے۔ چونکہ یہ احتمال تھا کہ کوئی شخص مقرر ہوگا تو اوروں کو رشک ہوگا، اس لیے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ "میں خود تمہارا نقیب ہوں[1]"۔ چونکہ آپؐ کی ننہال اسی قبیلہ میں تھی، اس لیے اور قبائل کو رشک اور منافست کا موقع نہ تھا۔

حضرت اسعدؓ کی وفات کا آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نہایت صدمہ ہوا۔ منافقین اور یہود نے یہ طعنہ دینا شروع کیا کہ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر پیغمبر ہوتے تو اُن کو یہ صدمہ کیوں پہنچتا؟" آپؐ نے سنا تو فرمایا:

لا املک لنفسی ولا لصاحبی من اللہ شیئًا۔ (طبری ص ۱۲۶۱)

میں اپنے لیے اور اپنے ساتھیوں کے لیے خدا کے ہاں کوئی اختیار نہیں رکھتا۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ عین اُسی زمانہ میں دو بڑے رئیسانِ کفر نے بھی وفات پائی۔ یعنی ولید بن المغیرۃ جو حضرت خالدؓ کا باپ تھا، اور عاص بن وائل سہمی جس کے بیٹے حضرت عمروؓ بن عاص ہیں جو فاتح مصر اور حضرت امیر معاویہؓ کے وزیر اعظم تھے۔

اسی زمانہ میں حضرت عبداللہؓ بن زبیر کی ولادت ہوئی۔ ان کے والد حضرت

---

[1] طبری ص ۱۲۶۱ و ص ۱۲۶۲۔

زبیرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھیرے بھائی تھے اور اُن کی والدہ حضرت اسماؓ، حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی اور حضرت عائشہؓ کی بے مات بہن تھیں، اب تک مہاجرین میں سے کسی کے اولاد نہیں ہوئی تھی اس لیے یہ مشہور ہو گیا تھا کہ یہودیوں نے جادو کر دیا ہے، حضرت عبداللہؓ بن زبیر پیدا ہوئے تو مہاجرین نے خوشی کا نعرہ مارا۔

اب تک نمازوں میں صرف دو رکعتیں تھیں۔ اب ظہر و عصر و عشاء میں چار چار ہو گئیں۔ لیکن سفر کے لیے اب بھی وہی دو رکعتیں قائم رہیں۔

۲ھ

تحویلِ قبلہ و آغازِ غزوات

(اس سال سے اسلام کی زندگی میں دو عظیم الشان واقعات پیدا ہوتے ہیں: ایک یہ کہ اسلام اپنے لیے ایک خاص قبلہ قرار دیتا ہے، جو اب ۴۵ کروڑ قلوب کا مرکز ہے۔ دوسرا یہ کہ دشمنانِ اسلام اب مخالفت کے لیے تلوار اُٹھاتے ہیں اور مسلمان اس کی مدافعت کے لیے تیار ہوتے ہیں) +

تحویلِ قبلہ، شعبان ۲ھ ہر گروہ، ہر قوم اور ہر مذہب کے لیے ایک خاص امتیازی شعار ہوتا ہے، جس کے بغیر اُس قوم کی مستقل ہستی قائم نہیں ہو سکتی۔ اسلام نے یہ شعار قبلہ نماز قرار دیا جو اصل مقصد کے علاوہ اور بہت سے حکم و اسرار کا جامع ہے۔ اسلام کا خاص نمایاں وصف مساواتِ عام، جمہوریت اور توحیدِ عمل ہے، یعنی تمام مسلمان یکساں اور متحد الجہۃ نظر آئیں۔ مذہب اسلام کا رُکنِ اعظم نماز ہے، جس سے ہر روز پانچ وقت کام پڑتا ہے۔ نماز کی اصلی صورت یہ ہے کہ جمعیت اور افرادِ کثیر کے ساتھ ادا کی جائے لیکن اس طرح کہ ہزاروں لاکھوں اشخاص کی منفرد ہستیاں مٹ کر ایک ہستی بن جائے۔ اسی بنا پر نمازِ باجماعت میں ایک امام ہوتا ہے کہ مقتدیوں کی ایک ایک حرکت اس کے اشاروں سے وابستہ ہوتی ہے۔ اس لیے ضرور ہے کہ سب کا مرجع عمل بھی ایک نظر آئے۔

یہی اصول ہے جس کی بناء پر نماز کے لیے ایک قبلہ قرار پایا اور اس شعار کا دائرہ اس قدر وسیع کیا گیا کہ اس قبلہ کی طرف رُخ کرنا ہی کفر کے دائرے سے نکل آنا ہے۔ اب صرف یہ بحث باقی تھی کہ قبلہ کس سمت قرار دیا جائے۔ یہودی اور عیسائی بیت المقدس کو قبلہ سمجھتے تھے، کیونکہ اُن کی قومی اور مذہبی ہستی بیت المقدس سے وابستہ تھی۔ لیکن ابراہیمؑ بت شکن کے جانشینؐ کے لیے صرف کعبہ قبلہ ہو سکتا تھا، جو اس موحدِ اعظمؑ کی یادگار اور توحیدِ خالص کا سب سے بڑا مظہر ہے۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) جب تک مکہ میں تھے دو ضرورتیں ایک ساتھ درپیش تھیں۔ ملتِ ابراہیمی کی تاسیس و تجدید کے لحاظ سے کعبہ کی طرف رُخ کرنے کی ضرورت تھی، لیکن یہ مشکل تھی کہ قبلہ کی جو اصلی غرض ہے یعنی امتیاز و اختصاص، وہ نہیں حاصل ہوتی تھی۔ کیونکہ مشرکین اور کفار بھی کعبہ ہی کو اپنا قبلہ سمجھتے تھے۔ اس بناء پر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) مقامِ ابراہیم کے سامنے نماز ادا کرتے تھے، جس کا رُخ بیت المقدس کی طرف تھا۔ اس طرح دونوں قبلے سامنے آجاتے تھے۔ مدینہ میں دو گروہ آباد تھے۔ مشرکین جن کا قبلہ کعبہ تھا اور اہلِ کتاب جو بیت المقدس کی سمت نماز ادا کرتے تھے۔ شرک کے مقابلے میں یہودیت اور نصرانیت دونوں کو ترجیح تھی۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مدت یعنی تقریباً (۱۶) مہینے تک بیت المقدس کی طرف نماز ادا کی لیکن جب مدینہ میں اسلام زیادہ پھیل گیا تو اب کوئی ضرورت نہ تھی کہ اصل قبلہ کو چھوڑ کر دوسری طرف رُخ کیا جاتا، اس بناء پر یہ آیت اُتری اور دفعۃً قبلہ بدل گیا؛[۱]

---

[۱] اس مضمون میں جس قدر واقعات ہیں وہ صحیح بخاری (حدیث قبلہ نماز) اور فتح الباری شرح صحیح بخاری سے ماخوذ ہیں۔

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ (بقرہ - ۱۸)

تو اپنا مُنہ مسجد الحرام کی طرف پھیر دو اور جہاں کہیں رہو اسی طرف مُنہ پھیرو ۔

تحویلِ قبلہ نے یہودیوں کو سخت برہم کردیا، اُن کو مشرکین کے مقابلے میں مذہبی تفوّق کا دعویٰ تھا، اور اسلام سے پہلے مشرکین بھی اُن کے مذہبی امتیاز کے معترف تھے۔ یہاں تک کہ (جیسا ابوداؤد میں روایت ہے) جن لوگوں کی اولاد زندہ نہیں رہتی تھی۔ وہ منّتیں مانتے تھے کہ بچّہ زندہ رہے گا، تو ہم اس کو یہودی بنائیں گے۔ اسلام نے ان کے اس مذہبی اعزاز کو صدمہ پہنچایا۔ تاہم چونکہ اب تک اسلام کا قبلہ بیت المقدس ہی تھا، اس لیے وہ فخر کرتے تھے کہ اسلام بھی انہی کے قبلہ کی طرف رُخ کرتا ہے۔ جب اسلام نے قبلہ بھی بدل دیا تو اُن کی ناراضی اور برہمی کا پیالہ بالکل لبریز ہو گیا۔ اُنھوں نے یہ طعنہ دینا شروع کیا کہ محمّد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) چونکہ ہر بات میں ہماری مخالفت کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے قبلہ بھی مخالفت کے ارادے سے بدل دیا ہے، دُودلے اور ضعیف الایمان مسلمانوں کو یہ بات کھٹکتی تھی کہ قبلہ بدلنے کی چیز نہیں، اور اس سے بے استقلالی اور تزلزلِ اعتقاد کا اظہار ہوتا ہے۔ اس بنا پر قبلہ کی اصلیت اور ضرورت اور تحویلِ قبلہ کے مصالح کی متعلق چند آیتیں اُتریں، جن سے یہ مشکلیں حل ہوتی ہیں :

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا قُلْ لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ

سفہا یہ اعتراض کریں گے کہ مسلمانوں کا جو قبلہ تھا اس سے اُن کو کس نے پھیر دیا، کہہ دو کہ مشرق و مغرب سب خدا ہی کا ہے تیرا جو پہلے قبلہ تھا (کعبہ)

الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَا اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ۔ (بقرہ-۱۷)

اس کو جو ہم نے پھر قبلہ کر دیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ معلوم ہوجائے کہ پیغمبر کا پیرو کون ہے، اور پیچھے پھر جانے والا کون ہے، اور بے شبہ یہ قبلہ نہایت گراں اور ناگوار ہے، بجز ان لوگوں کے

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ

پورب پچھم رخ کرنا ہی کوئی ثواب کی بات نہیں، ثواب تو یہ ہے کہ کوئی خدا پر، قیامت پر، ملائکہ پر، خدا کی کتابوں پر، پیغمبروں پر ایمان لائے، اور خدا کی محبت میں عزیزوں کو، یتیموں کو، مسکینوں کو، مسافروں کو، سائلوں کو، غلاموں کو (آزاد کرانے میں) اپنی دولت دے۔

(بقرہ-۲۲)

ان آیتوں میں خدا نے پہلے یہ بتایا کہ قبلہ خود کوئی مقصود بالذات چیز نہیں، خدا کی عبادت کے لیے پورب پچھم سب برابر ہیں۔ خدا ہر جگہ ہے، ہر سمت ہے، ہر طرف ہے، پھر قبلہ کی تعیین کی ضرورت بتائی کہ وہ اختصاصی شعار ہے اور اصلی اور نمائشی مسلمانوں کو الگ کر دیتا ہے۔ بہت سے یہودی تھے جو منافقانہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے اور مسلمانوں کے ساتھ نماز میں بھی شرکت کرتے تھے، یہ اسلام کے لیے مار آستین تھے۔ لیکن جب قبلہ بیت المقدس کے بجائے کعبہ سے بدل گیا۔ تو نفاق کا راز بالکل فاش ہوگیا۔ کوئی یہودی کسی طرح یہ گوارا نہیں کرسکتا تھا کہ

جو چیز اس کی قومیت، مذہب، بلکہ اس کی ہستی کی بنیاد ہے (یعنی بیت المقدس) اسی سے اس کا رشتہ ٹوٹ جائے، پھر دوبارہ خدا نے اس نکتہ کو زیادہ واضح کر دیا، کہ کسی خاص قبلہ کی طرف رُخ کرنا اصلی ثواب نہیں بلکہ ثواب درحقیقت ایمان اور اعمالِ صالحہ کا نام ہے ۔

سلسلۂ غزوات

کیا عجیب بات ہے، اربابِ سیر، مغازی کی داستان جس قدر زیادہ دراز نفسی اور بلند آہنگی سے بیان کرتے ہیں، یورپ اُسی قدر اس کو زیادہ شوق سے جی لگا کر سُنتا ہے، اور چاہتا ہے کہ یہ داستان اور پھیلتی جائے۔ کیونکہ اُس کو اسلام کے جور و ستم کا جو مرقع آراستہ کرنا ہے اُس کے نقش و نگار کے لیے لہو کے چند قطرے نہیں بلکہ چشمہ ہائے خون درکار ہیں۔

یورپ کے تمام مؤرخوں نے سیرتِ نبویؐ کو اس انداز میں لکھا ہے کہ وہ لڑائیوں کا ایک مسلسل سلسلہ ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ زبردستی مسلمان بنائے جائیں۔

لیکن یہ خیال چونکہ واقع میں غلط اور سرتاپا غلط ہے۔ اس لیے مغازی کی ابتدا سے پہلے ضرور ہے کہ اس بحث کا فیصلہ کیا جائے۔

لہ غزوات کا سلسلہ جن اسباب سے پیدا ہُوا، اور جس قسم کے واقعات غزوات میں پیش آئے اُن کے لیے ہم نے ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے۔ کیونکہ ضمنی طریقے سے وہ ادا نہیں ہو سکتے تھے، لیکن یہ عنوان اچھی طرح سے اُسی وقت ذہن نشیں ہو سکتا ہے کہ ایک دفعہ تمام غزوات سرسری نظر سے گزر جائیں، اس لیے ہم نے اس کو تمام غزوات کے بعد لکھا ہے۔ ناظرین ابھی سے اس کا خیال رکھیں۔

عام خیال یہ ہے کہ اسلام جب تک مکہ میں تھا، مصائب گوناگوں کا آماجگاہ تھا۔ مدینہ میں آکر اس کی کلفتیں دُور ہوئیں، مگر یہ خیال صحیح نہیں، مکّہ میں جو مصیبت تھی گو سخت تھی، لیکن تنہا اور منفرد تھی۔ مدینہ میں آکر وہ متعدد اور گوناگوں بن گئی۔ مکّہ کل ایک قوم تھا۔ مدینہ میں جب انصار کے ساتھ یہود بھی تھے، جو عادات، خصائل، مذہب اور دیانت میں انصار سے بالکل مختلف اور اُن کے حریف مقابل تھے، اس پر ایک تیسری قسم (منافقین) کا اضافہ ہُوا، جو مارِ آستین ہونے کی وجہ سے دونوں سے زیادہ خطرناک تھے۔ مکّہ اگر قابو میں آجاتا تو حرم کی وسعتِ اثر کی وجہ سے تمام عرب کی گردنیں خم ہوجاتیں۔ لیکن مدینہ کا اثر چار دیواری تک محدود تھا۔ مدینہ اب تک بیرونی خطرات سے بالکل مطمئن تھا۔ لیکن رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی قیام گاہ ہونے نے اس کو قریش کے غیظ و غضب کا تاراج گاہ بنا دیا۔

آنحضرت (صلّی اللہ علیہ وسلّم) جب مکّہ سے چلے آئے تو چند ہی روز کے بعد قریش نے عبداللہ بن اُبی کو جو واقعۂ ہجرت کے قبل رئیس الانصار تھا، اور انصار نے اس کی تاجپوشی کی شاہانہ رسم ادا کرنے کے لیے تیاری کر لی تھی[1] خط لکھا جس کے الفاظ یہ تھے:

انکم آویتم صاحبنا و	تم نے ہمارے آدمی کو اپنے ہاں پناہ
انا نقسم باللّٰہ لتقاتلنّہ	دی ہے۔ ہم خدا کی قسم کھاتے ہیں
او تخرجنّہ، او لنسیرنّ	کہ یا تو تم لوگ ان کو قتل کر ڈالو، یا
الیکم باجمعنا حتّٰی نقتل	مدینہ سے نکال دو، ورنہ ہم سب

---

[1] بخاری باب (التسلیم فی مجلس فیہ اغلاط من المسلمین و المشرکین) "س"

مقاتلتکم و نستبیح نسائکم، لوگ تم پر حملہ کریں گے، اور تم کو فنا کر کے تمھاری عورتوں پر تصرف کریں گے۔

(سنن ابوداؤد صفحہ ۶۷ جلد ۲ باب خبر النضیر)

جب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ خبر معلوم ہوئی تو آپ عبداللہ کے پاس تشریف لے گئے، اس کو سمجھایا کہ "کیا تم اپنے بیٹوں اور بھائیوں سے لڑو گے؟" چونکہ انصار اکثر مسلمان ہو چکے تھے، اس لیے عبداللہ اس نکتہ کو سمجھا اور قریش کے حکم کی تعمیل نہ کر سکا۔ بدر کے بعد پھر قریش نے اسی مضمون کا خط لکھا چنانچہ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

تاہم قریش کی شہ سے منافقین و یہود مدینہ کا سر پھر چکا تھا۔ اسی زمانہ میں یعنی بدر سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنو الحارث بن خزرج کے محلے میں سوار ہو کر تشریف لے گئے۔ ایک جگہ مشرکین و منافقین مدینہ، یہود اور بعض مسلمان بیٹھے تھے، گدھے کے چلنے سے گرد اڑی، تو عبداللہ بن ابی نے منہ پر کپڑا ڈال دیا، اور حقارت سے بولا "گرد نہ اڑاؤ" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجمع کو سلام کیا اور کچھ قرآن کی آیتیں سنائیں۔ عبداللہ نے کہا۔[1] "اے شخص مجھ کو یہ پسند نہیں۔ اگر تمھاری بات سچ بھی ہو، تو ہماری مجلس میں آکر ہم کو نہ ستایا کرو، جو تمھارے پاس جائے اس سے بیان کیا کرو۔" مسلمان اس تحقیر سے برافروختہ ہو گئے، اور قریب تھا کہ کشت و خون ہو جائے۔ آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو ٹھنڈا کیا۔

اسی زمانہ کے قریب حضرت سعد بن معاذ جو قبیلہ اوس کے رئیس الاعظم

---

[1] صحیح مسلم صفحہ ۹۳ جلد ۲ و بخاری باب مذکور

تھے، عمرہ کرنے کے لیے مکہ معظمہ گئے۔ اُمیّہ بن خلف سے اور اُن سے مدت کا یارانہ تھا اور یہ تعلق اسلام کے بعد بھی قائم رہا۔ اس تعلق سے حضرت سعدرضؓ اب بھی اُمیّہ ہی کے مہمان ہوئے۔ ایک دن وہ اُمیّہ کو لے کر کعبہ کے طواف کو نکلے۔ اتفاق سے ابوجہل سامنے سے آگیا۔ اُمیّہ سے اُس نے پوچھا کہ یہ تمھارے ساتھ کون ہے؟ اُمیّہ نے کہا "سعد ہیں"۔ ابوجہل نے کہا "تم لوگوں نے صابیوں (کفار آنحضرت (صلّی اللہ علیہ وسلّم) اور اہلِ اسلام کو صابی یعنی مُرتد کہتے تھے) کو پناہ دی ہے۔ مَیں کبھی یہ نہیں دیکھ سکتا کہ تم کعبہ میں آسکو۔ خُدا کی قسم اگر تم اُمیّہ کے ساتھ نہ ہوتے تو زندہ بچ کر نہیں جا سکتے تھے"۔ حضرت سعدرضؓ نے کہا "اگر تم نے ہم کو حج سے روکا تو ہم تمھارا مدینہ کا راستہ روک دیں گے"[1] (یعنی شام کی تجارت کا راستہ)۔

حرم کی تولیت اور مجاورت کی وجہ سے تمام عرب قریش کا احترام کرتا تھا، اور مکہ سے مدینہ تک جو قبائل پھیلے ہوئے تھے سب قریش کے زیرِ اثر[2] تھے، اس بنا پر قریش نے تمام قبائل کو اسلام کا مخالف بنا دیا۔ ہجرت کے چھٹے سال تک یمن وغیرہ کے لوگ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے پاس نہیں پہنچ سکتے تھے چنانچہ سنہ ۵ھ میں جب بحرین سے عبدالقیس کی سفارت آئی تو لوگوں نے آنحضرت (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی خدمت میں عرض کی کہ مضر کے قبائل ہم کو آپ

---

[1] یہ پورا واقعہ مزید تفصیل کے ساتھ صحیح بخاری باب المغازی کی ابتدا میں مذکور ہے [2] ابن ہشام واقعات وفود میں ہے وذلک ان قریشا کانوا امام الناس .... وقادۃ العرب لا ینکرون ذلک وکانت قریش ھی التی نصبت الحرب لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم۔

تک پہنچنے نہیں دیتے، اس لیے ہم صرف ایام حج میں جب کہ لڑائی عموماً موقوف ہوجاتی ہے، آپؐ کی خدمت میں آسکتے ہیں[1]۔

قریش نے انہی باتوں پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ جیسا کہ اُنھوں نے عبداللہ بن اُبیّ کو لکھا تھا اُس کی تیاریاں کر رہے تھے کہ مدینہ پر حملہ کر کے اسلام کا استیصال کر دیں۔ مدت تک یہ حال رہا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) راتوں کو جاگ جاگ کر بسر کرتے تھے۔ صحیح نسائی میں ہے:

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اوّل ماقدم المدینۃ یسھر من اللیل۔	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں آئے تو راتوں کو جاگا کرتے تھے۔

صحیح بخاری باب الجہاد میں ہے کہ ایک دفعہ آپؐ نے فرمایا کہ "آج کوئی اچھا آدمی پہرہ دیتا"۔ چنانچہ حضرت سعدؓ بن وقاص نے ہتھیار لگا کر رات بھر پہرہ دیا تب آپؐ نے آرام فرمایا۔ اس سے بڑھ کر حاکم کی روایت ہے جس کے یہ الفاظ ہیں:

عن ابی کعب قال لما قدم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ المدینۃ وآوتھم الانصار رمتھم العرب عن قوس واحدۃ وکانوا لایبیتون الا بالسلاح ولا یصبحون الا فیہ	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ جب مدینہ آئے اور انصارؓ نے اُن کو پناہ دی تو تمام عرب ایک ساتھ اُن سے لڑنے کو آمادہ ہوگئے صحابہؓ صبح تک ہتھیار باندھ کر سوتے تھے۔

---

[1] وفد بنی عبدالقیس کے ذکر میں صحیح بخاری اور دیگر تمام کتابوں میں یہ واقعہ مذکور ہے [2] لباب النقول فی اسباب النزول للسیوطی سورۂ نور آیت وعداللہ الذین اٰمنوا منکم الخ مسند دارمی میں بھی یہ روایت مذکور ہے۔

مؤرخین مغازی کی ابتدا انہی واقعات سے کرتے ہیں کہ اسی سال خدا نے جہاد کی اجازت دی۔ لیکن ایک دقیقہ بیں انہی کی تصریحات سے پتہ لگا سکتا ہے کہ اصل واقعہ کیا تھا۔ مواہب لدنیہ اور زرقانی میں لکھا ہے کہ خدا نے ۱۲ صفر سنہ ۲ھ میں جہاد کی اجازت دی، اس کی سند میں امام زہری کا قول نقل کیا ہے:

اول اٰیۃ نزلت فی الاذن بالقتال اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرٌ۔ (زرقانی بحوالہ صحیح نسائی جلد ا صـ ۴۴۸)	پہلی آیت جو قتال کی اجازت میں نازل ہوئی وہ یہ ہے اُذِنَ لِلَّذِیْنَ الخ یعنی جن سے لڑائی کی جاتی ہے (مسلمان) ان کو بھی اب لڑنے کی اجازت دی جاتی ہے کیونکہ اُن پر ظلم کیا جا رہا ہے اور خدا ان کی مدد پر یقیناً قادر ہے۔

تفسیر ابن جریر میں ہے کہ قتال کے متعلق سب سے پہلے جو آیت نازل ہوئی وہ یہ ہے:

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ (بقرہ - ۲۴)	اور خدا کی راہ میں اُن لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔

لیکن غور سے دیکھو کہ دونوں آیتوں میں اُنہی لوگوں سے لڑنے کی اجازت ہے جو پہلے مسلمانوں سے لڑنے آتے ہیں اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان درحقیقت لڑنے پر مجبور کیے جاتے تھے۔

بہرحال واقعہ یہ ہے کہ مدینہ میں آکر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا سب سے پہلا کام حفاظتِ خود اختیاری کی تدبیر تھی۔ نہ صرف اپنی اور مہاجرین کی بلکہ انصار کی بھی۔ کیونکہ اس جرم میں کہ انصار نے مسلمانوں کو پناہ دی ہے۔ قریش

نے مدینہ کی بربادی کا فیصلہ کرلیا، اور اپنے تمام قبائل متحدہ میں یہ آگ بھڑکا دی تھی۔ اس بنا پر آپؐ نے دو تدبیریں اختیار کیں۔ **اوّل** یہ کہ قریش کی شامی تجارت جو اُن کا مایۂ غرور تھی بند کردی جائے تاکہ وہ صلح پر مجبور ہوجائیں اور یاد ہوگا کہ حضرت سعدؓ بن معاذ نے مکہ میں ابوجہل کو اسی کی دھمکی دی تھی **دوسرے** یہ کہ مدینہ کے قرب و جوار کے جو قبائل ہیں ان سے امن وامان کا معاہدہ ہوجائے۔

بدر سے پہلے جو مہمیں بھیجی گئیں

غرض ان حالات کی بنا پر غزوۂ بدر سے پہلے تو ننھی ننھی پچاس پچاس کی ٹکڑیاں مکہ کی طرف روانہ کی جانے لگیں۔ ابواء کی مہم سے پہلے بذاتِ خاص آپؐ کے کسی مہم میں شرکت نہیں کی، اس ابواء کی مہم سے پہلے جو صفر ۲ھ میں واقع ہوئی اور جس میں آپؐ نے خود شرکت فرمائی تھی، اربابِ سیر نے تین مہم کا ذکر کیا ہے جن کو ان کی زبان میں "سریہ" کہتے ہیں۔ سریہ حمزہؓ، سریہ عبیدہؓ بن حارث، سریہ سعدؓ بن ابی وقاص، لیکن ان میں سے کسی مہم میں کوئی کشت و خون نہیں ہوا، یا بیچ بچاؤ ہوگیا یا بچ کر نکل گئے۔ اربابِ سیرؒ نے ان سرایا کا مقصد یہ بتایا ہے کہ یہ قریش کے تجارتی قافلہ کو چھیڑنے کے لیے بھیجے جاتے تھے۔ یعنی سعدؓ کی تہدید کے مطابق اُن کی شامی تجارت کو بند کرنا مقصود تھا۔ مخالفین کہتے ہیں کہ صحابہ کو غارت گری کی تعلیم دی جاتی تھی۔ لیکن یہ الزام کس قدر جہالت پر مبنی ہے، کہ اوّل تو اسلام کی شریعت میں یہ سخت تر گناہ ہے، ثانیاً واقعہ کیا بتاتا ہے؟ کیا ان میں سے کسی مہم میں بھی یہ مذکور ہے کہ صحابہؓ نے قافلے کا مال لوٹ لیا؟ ثالثاً اگر ان سرایا کا مقصد لوٹنا اور ڈاکہ ڈالنا ہی ہوتا تھا تو قریش کے قافلۂ تجارت کے سوا یہ مقصد کہیں اور نہیں حاصل ہوسکتا تھا؟)

جُہینہ اطراف کے جن قبائل کے پاس معاہدہ کے لیے مہم بھیجی گئی۔ ان میں سب سے پہلے جہینہ کا قبیلہ ہے۔ جہینہ کا قبیلہ مدینہ سے تین منزل پر آباد تھا اور اُن کا کوہستان دُور تک پھیلا ہوا تھا، اُن سے معاہدہ ہوا کہ وہ فریقین سے یکساں[1] تعلقات رکھیں گے، یعنی دونوں سے الگ رہیں گے۔

صفر ۲ھ میں آپؐ ساٹھ مہاجرین کے ساتھ مدینہ سے نکلے اور ابواء تک گئے، جس کے قریب ہی غزوۂ ابواء یا غزوہ ودّان واقع ہوا اور جہاں آپؐ کی والدہ ماجدہ کا مزار ہے۔ ابواء کا صدر مقام فرع ہے جو ایک وسیع قصبہ ہے اور جہاں قبیلہ مُزنیہ آباد ہے، اور جو مدینہ سے تقریباً آٹھ منزل (۸۰ میل) ہے۔ یہ مدینہ کی اخیر سرحد ہے۔ ان اطراف میں قبیلہ بنو ضمرہ آباد تھا اور یہ نواح اُن کی حدود حکومت میں داخل تھے۔ یہاں آپؐ نے چند روز قیام کرکے بنو ضمرہ سے معاہدہ کیا، جن کا سردار مخشی بن عمرو ضمری تھا۔ معاہدہ کے یہ الفاظ تھے:

ھذا کتابٌ من محمد رسول اللّٰہ	یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریر
لبنی ضمرۃ فانھم آمنون	ہے بنو ضمرہ کے لیے، ان لوگوں
علی اموالھم وانفسھم و	کا جان اور مال محفوظ رہے گا
ان لھم النصر علی من	اور جو شخص ان پر حملہ کرے گا اس
رامھم الا ان یحاربوا فی	کے مقابلے میں ان کی مدد کی جائیگی
دین اللّٰہ مابلّ بحرٌ صوفۃ	بجز اس صورت کے کہ یہ لوگ مذہب

[1] اس واقعہ کا ذکر مؤرخین نے مستقل طور پر نہیں کیا بلکہ جہاں سب سے پہلے سریہ ضمرہ کا ذکر کیا ہے وہاں مجدی جہنی (رئیس قبیلہ) کی نسبت لکھا ہے۔ "کان موادعًا للفریقین"، یعنی اس نے دونوں فریق سے صُلح کر رکھی تھی۔

وان النبی اذا دعاھم لنصرہ اجابوہ الخ (روض الانف ج ۲ ص۵۸، و زرقانی جلد ۱ ص۴۵۹)

کے مقابلے میں لڑیں اور پیغمبر جب ان کو مدد کے لیے بلائیں گے تو یہ مدد کو آئیں گے۔

تمام محدثین، مغازی کی ابتدا اسی واقعہ سے کرتے ہیں۔ صحیح بخاری میں بھی اسی کو اول الغزوات قرار دیا ہے۔

قریبًا ایک مہینہ کے بعد کرز بن جابر فہری نے جو مکہ کے رؤسا میں تھا، مدینہ کی چراگاہ پر حملہ کیا اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مویشی لوٹ لیے۔ اس کا تعاقب کیا گیا، لیکن وہ بچ کر نکل گیا تھا (کرز بعد کو مسلمان ہوئے اور فتح مکہ میں تنہا راہ چلتے شہید ہوئے)۔[۱]

جمادی الثانی یعنی اس واقعہ کے تیسرے مہینے آپ دو سو مہاجرین کے ساتھ مدینہ سے نکلے اور مقام ذوالعشیرۃ پہنچ کر بنو مدلج سے معاہدہ کیا، یہ مقام مدینہ سے ۹ منزل پر ینبوع کے نواحی میں ہے۔

بنو مدلج، بنو ضمرہ کے حلیف تھے اور چونکہ بنو ضمرہ پہلے اسلام کے معاہد میں داخل ہو چکے تھے، اس لیے انھوں نے آسانی سے یہ شرطیں منظور کر لیں۔[۲]

---

[۱] اصابہ ذکر کرز فہری۔

[۲] میں تسلیم کرتا ہوں کہ مورخین نے دونوں پہلے واقعوں کی نسبت لکھا ہے کہ ان کا مقصد قریش کے کاروان کا لوٹنا تھا، لیکن اتفاق سے کاروان ہاتھ نہ آیا اور بچ کر نکل گیا۔ لیکن میں واقعات کا پابند ہوں۔ رائے اور قیاس سے غرض نہیں، اس قدر واقعہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان مقامات تک گئے اور وہاں کے قبائل سے معاہدہ کیا، اس سے آگے مورخین کا قیاس ہے کہ قریش کے کاروان پر حملہ کرنا مقصود تھا، گو یہ مقصد حاصل نہ ہو سکا۔ اگر خدانخواستہ کاروان کا لوٹنا ہی مقصود ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عیاذًا باللہ اس قدر بے تدبیر

چند روز کے بعد یعنی رجب سنہ ۲ھ میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت عبداللہ رضؓ بن جحش کو بارہ آدمیوں کے ساتھ بطنِ نخلہ کی طرف بھیجا۔ یہ مقام مکہ اور طائف کے بیچ میں مکہ سے ایک شبانہ روز کی مسافت پر ہے، آپؐ نے حضرت عبداللہ رضؓ کو ایک خط دے کر فرمایا تھا کہ دو دن کے بعد اس کو کھولنا۔ حضرت عبداللہ رضؓ نے خط کھولا تو لکھا تھا کہ "مقام نخلہ میں قیام کرو اور قریش کے حالات کا پتہ لگاؤ، اور اطلاع دو۔" اتفاق یہ کہ قریش کے چند آدمی جو شام سے تجارت کا مال لیے آتے تھے، سامنے سے نکلے، حضرت عبداللہ رضؓ نے اُن پر حملہ کیا، ان میں سے ایک شخص عمرو بن الحضرمی مارا گیا۔ دو گرفتار ہوئے۔ اور مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔ حضرت عبداللہ نے مدینہ میں آ کر یہ واقعہ بیان کیا، اور غنیمت کی چیزیں پیش کیں۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ "میں نے تم کو یہ اجازت نہیں دی تھی۔ غنیمت کے قبول کرنے سے بھی آپؐ نے انکار فرمایا صحابہ رضؓ نے حضرت عبداللہ رضؓ سے نہایت برہم ہو کر کہا:

صنعتم مالم تومروبه	تم نے وہ کام کیا (قافلہ لوٹنا) جس
وقاتلتم فی الشهر الحرام	کا تم کو حکم نہیں دیا گیا تھا اور ماہِ
ولم تومروا بقتال ۔	حرام میں لڑے، حالانکہ اس مہینہ
(طبری صفحہ ۱۲۷۵)	میں تم کو لڑنے کا حکم نہ تھا۔

جو لوگ گرفتار اور قتل ہوئے وہ بڑے معزز خاندان کے لوگ تھے۔ عمرو بن الحضرمی جو مقتول ہوا عبداللہ حضرمی کا بیٹا تھا، جو حرب بن امیہ (امیر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۸) فرض کرنا پڑے گا کہ ہر مرتبہ ناکامیابی ہوتی تھی، اور قافلہ بچ بچ کر نکل جاتا تھا یہاں تک کہ بار بار تجربہ کے بعد بھی بدر میں اسی قسم کی ناکامیابی ہوئی اور قافلہ صحیح وسلامت نکل گیا۔

معاویہ کا دادا) کا حلیف تھا۔ حرب قریش کا رئیس اعظم تھا اور عبدالمطلب کے بعد ریاست عام اسی کو حاصل ہوئی تھی۔ جو لوگ گرفتار ہوئے۔ یعنی عثمان و نوفل دونوں مغیرہ کے پوتے تھے۔ مغیرہ ولید کا باپ حضرت خالدؓ کا دادا، اور حرب کے دوسرے درجے کا رئیس تھا۔ اس بناء پر اس واقعہ نے تمام قریش کو مشتعل کر دیا۔ اور ثار یعنی انتقام خون کی بنیاد قائم ہوگئی۔ معرکۂ بدر کا سلسلہ اسی واقعہ سے وابستہ ہے۔ حضرت عروہ رضؓ بن زبیر حضرت عائشہؓ کے بھانجے تھے۔ انھوں نے تصریح کی ہے کہ غزوہ بدر اور تمام لڑائیاں جو قریش سے پیش آئیں سب کا سبب یہی حضرمی کا قتل ہے۔ علامہ طبری لکھتے ہیں :

وکان الذی ھذا وقعة بدر	اور جس چیز نے بدر کے واقعہ کو ابھارا،
وسائر الحروب التی کانت	اور وہ تمام لڑائیاں چھیڑ دیں، جو
بین رسول اللہ صلی اللہ علیہ	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرکین
وسلم و بین مشرکی قریش فیما	قریش میں پیش آئیں، سب کا سبب
قال عروۃ بن الزبیر ما کان	یہی تھا کہ واقد سہمی نے حضرمی کو
من قتل واقد بن عبد اللہ	قتل کر دیا تھا۔
السھمی عمرو بن الحضرمی۔	

چونکہ غزوۂ بدر تمام غزوات کی اصلی بنیاد ہے، اس لیے ہم پہلے اس واقعہ کو سادہ صورت میں لکھ کر پھر تفصیل سے اس کے متعلق گفتگو کریں گے۔

لہ اصابہ ترجمہ علاء حضرمی ۔ ؎۲ طبری صفحہ ۱۲۷۴ ؎۳ رص ۱۲۸۴ - " س"

غزوۂ بدر

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

رمضان سنہ ۲ھ

بدر ایک گاؤں کا نام ہے جہاں سال کے سال میلہ لگتا ہے۔ یہ مقام اس نقطہ کے قریب ہے جہاں شام سے مدینہ جانے کا راستہ دشوار گزار گھاٹیوں میں سے ہو کر گزرتا ہے۔ مدینہ منورہ سے قریباً ۸۰ میل کے فاصلے پر ہے +

جیسا کہ ہم اُوپر لکھ آئے ہیں، قریش نے ہجرت کے ساتھ ہی مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دی تھیں، عبداللہ بن اُبی کو انھوں نے خط لکھ بھیجا کہ یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کر دو، یا ہم اُن کے ساتھ تمھارا بھی فیصلہ کر دیتے ہیں قریش کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں مدینہ کی طرف گشت لگاتی رہتی تھیں۔ کرز فہری مدینہ کی چراگاہوں تک آ کر غارت گری کر گیا تھا +

حملہ کے لیے سب سے بڑی ضروری چیز مصارفِ جنگ کا بندوبست تھا، اس لیے اب کے موسم میں قریش کا جو کاروانِ تجارت شام کو روانہ ہُوا، اس سرو سامان سے روانہ ہُوا کہ مکہ کی تمام آبادی نے جس کے پاس جو رقم تھی کل کی کل دے دی[1] +

---

[1] ابن سعد صفحہ ۲۷ میں ابوسفیان سردارِ قافلہ کا قول لکھا ہے واللہ ما بمکۃ من قرشی ولا قرشیۃ له نش وصاعداً الا بعث بہ معناً ہمارے مورخین کو اسباب و نتائج کی جستجو نہیں ہوتی۔ اس لیے انھوں نے اس واقعہ کو محض ایک واقعہ کی حیثیت سے لکھ دیا۔ لیکن ان کو احساس نہیں کہ مکہ کو تمام سرمایہ کے اُگل دینے کی ضرورت کیا تھی +

نہ صرف مرد بلکہ عورتیں جو کاروبار تجارت میں بہت کم حصّہ لیتی ہیں، اُن کا بھی ایک ایک فرد اس میں شریک تھا، قافلہ ابھی شام سے روانہ نہیں ہُوا تھا کہ حضرمی کے قتل کا اتفاقیہ واقعہ پیش آگیا، جس نے قریش کی آتشِ غضب کو اور بھڑکا دیا۔

اسی اثنا میں یہ غلط خبر مکہ معظمہ میں پھیل گئی کہ مسلمان قافلہ کے لُوٹنے کو آرہے ہیں، قریش کے غیظ و غضب کا بادل بڑے زور شور سے اُٹھا اور تمام عرب پر چھا گیا۔

آنحضرت (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو ان حالات کی اطّلاع ہُوئی تو آپؐ نے صحابہؓ کو جمع کیا اور واقعہ کا اظہار فرمایا، حضرت ابوبکرؓ وغیرہ نے جان نثارانہ تقریریں کیں۔ لیکن رسول اللہ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) **انصار** کی طرف دیکھتے تھے۔ کیونکہ انصار نے بعیت کے وقت صرف یہ اقرار کیا تھا کہ وہ اس وقت "تلوار اُٹھائیں گے۔ جب دُشمن مدینہ پر چڑھ آئیں۔ حضرت سعدؓ بن عبادہ (سردارِ خزرج) نے اُٹھ کر کہا "کیا حضورؐ کا اِشارہ ہماری طرف ہے؟ خدا کی قسم آپ فرمائیں تو ہم سمندر میں کود پڑیں"۔

یہ صحیح مسلم کی روایت ہے۔ بخاری میں ہے کہ حضرت مقدادؓ نے کہا کہ "ہم موسیٰؑ کی قوم کی طرح یہ نہ کہیں گے کہ آپ اور آپ کا خدا جا کر لڑیں۔ ہم لوگ آپؐ کے داہنے سے، بائیں سے، سامنے سے، پیچھے سے لڑیں گے"۔ اُن کی اس تقریر سے رسول اللہ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کا چہرہ چمک اُٹھا۔

غرض ۱۲ رمضان ۲ھ کو آپؐ تقریباً تین سَو جاں نثاروں کے ساتھ شہر سے نکلے۔ ایک میل چل کر فوج کا جائزہ لیا، جو کم عمر تھے واپس کر دیے گئے[۱] کہ

---

[۱] ابن سعد صفحہ ۶۔

ایسے پُرخطر موقع پر بچوں کا کام نہیں۔ عمیرؓ بن ابی وقاص ایک کمسن بچہ تھے، جب ان سے واپسی کو کہا گیا تو رو پڑے۔ آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی۔ عمیرؓ کے بھائی حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے کمسن سپاہی کے گلے میں تلوار حمائل کی۔ اب فوج کی کل تعداد ۳۱۳ تھی جس میں ساٹھ مہاجر اور باقی انصار تھے۔ چونکہ غیبت کی حالت میں منافقین اور یہود کی طرف سے اطمینان نہ تھا، اس لیے ابولبابہ بن عبدالمنذر کو مدینہ کا حاکم مقرر فرمایا اور حکم دیا کہ مدینہ کو واپس جائیں۔ عالیہ (مدینہ کی بالائی آبادی) پر عاصم بن عدی کو مقرر فرمایا۔ ان انتظامات کے بعد آپؐ بدر کی طرف بڑھے، جدھر سے اہل مکہ کی آمد کی خبر تھی۔ دو خبر رساں بسبسہ اور عدی آگے روانہ کر دیے گئے تھے کہ قریش کی نقل و حرکت کی خبر لائیں۔ روحا، منصرف، ذات اجذال، معلاۃ، اثیل سے گزرتے ہوئے، ۱۷ رمضان کو بدر کے قریب پہنچے۔ خبر رسانوں نے خبر دی کہ قریش وادی کے دوسرے سرے تک آ گئے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہیں رک گئے اور فوجیں اتر پڑیں۔

مکہ معظمہ سے قریش بڑے سر و سامان سے نکلے تھے۔ ہزار آدمی کی جمعیت تھی۔ سو سواروں کا رسالہ تھا، رؤسائے قریش سب شریک تھے۔ ابولہب مجبوری کی وجہ سے نہ آسکا تھا، اس لیے اپنی طرف سے اس نے قائم مقام بھیج دیا تھا۔ رسد کا یہ انتظام تھا کہ امرائے قریش یعنی عباس بن عبدالمطلب، عتبہ بن ربیعہ، حارث بن عامر، نضر بن الحارث، ابوجہل، امیہ وغیرہ وغیرہ باری باری ہر روز دس دس اونٹ ذبح کرتے اور لوگوں کو کھلاتے تھے۔ عتبہؓ بن ربیعہ جو

۱؎ منتخب کنز العمال بہ روایت ابن عساکر، بدر ۲؎ معارف ابن قتیبہ (باب اسماء المطعمین من قریش فی غزاۃ بدر، وسیرۃ ابن اسحاق بہ روایت ابن ہشام غزوۂ بدر۔

قریش کا سب سے معزز رئیس تھا، فوج کا سپہ سالار تھا۔

قریش کو بدر کے قریب پہنچ کر جب معلوم ہوا کہ ابوسفیان کا قافلہ خطرہ کی زد سے نکل گیا ہے تو قبیلہ زہرہ اور عدی کے سرداروں نے کہا "اب لڑنا ضرور نہیں"۔ لیکن ابوجہل ... نہ مانا، زہرہ اور عدی کے لوگ واپس چلے گئے، باقی فوج آگے بڑھی۔

قریش چونکہ پہلے پہنچ گئے تھے۔ انھوں نے مناسب موقعوں پر قبضہ کر لیا تھا، بخلاف اس کے مسلمانوں کی طرف چشمہ یا کنواں تک نہ تھا۔ زمین ایسی ریتلی تھی کہ اونٹوں کے پاؤں ریتی میں دھنس دھنس جاتے تھے حضرت حبابؓ بن منذر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ جو مقام انتخاب کیا گیا ہے وحی کی رو سے ہے؟ یا فوجی تدبیر ہے؟ ارشاد ہوا کہ "وحی نہیں ہے"! حضرت حبابؓ نے کہا "تو بہتر ہو گا کہ آگے بڑھ کر چشمہ پر قبضہ کر لیا جائے اور آس پاس کے کنوئیں بیکار کر دیے جائیں[1]"۔ آپؐ نے یہ رائے پسند فرمائی اور اسی پر عمل کیا گیا۔ تائید ایزدی اور حسن اتفاق سے مینہ برس گیا جس سے گرد جم گئی اور جا بجا پانی کو روک کر چھوٹے چھوٹے حوض بنا لیے گئے کہ وضو اور غسل کے کام آئیں۔ اس قدرتی احسان کا خدا نے قرآن مجید میں بھی ذکر کیا ہے۔

وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً لِيُطَهِّرَكُمْ بِهِ (انفال)

اور جب کہ خدا نے آسمان سے پانی برسایا کہ تم کو پاک کرے۔

پانی پر اگرچہ قبضہ کر لیا گیا، لیکن ساقی کوثر (صلی اللہ علیہ وسلم) کا فیض عام تھا،

---

[1] ابن ہشام

اس لیے دشمنوں کو بھی پانی لینے کی عام اجازت تھی[۱]۔ یہ رات کا وقت تھا۔ تمام صحابہ نے کمر کھول کر رات بھر آرام کیا، لیکن صرف ایک ذات تھی (ذات نبوی) جو صبح تک بیدار اور مصروفِ دعا رہی۔ صبح ہوئی تو لوگوں کو نماز کے لیے آواز دی۔ بعدِ نماز جہاد پر وعظ فرمایا[۲]۔

قریش جنگ کے لیے بیتاب تھے۔ تاہم کچھ نیک دل بھی تھے، جن کے دل خونریزی سے لرزتے تھے۔ ان میں حکیم بن حزام (جو آگے چل کر اسلام لائے) نے سردارِ فوج عتبہ سے جا کر کہا "آپ چاہیں تو آج کا دن آپ کی نیک نامی کی ابدی یادگار رہ جائے"۔ عتبہ نے کہا کیونکر؟ حکیم نے کہا "قریش کا کچھ مطالبہ ہے وہ صرف حضرمی کا خون ہے، وہ آپ کا حلیف تھا، آپ اس کا خونبہا ادا کر دیجیے"۔ عتبہ نیک نفس آدمی تھا، اس نے نہایت خوشی سے منظور کیا لیکن چونکہ ابوجہل کا اتفاق رائے ضرور تھا حکیم عتبہ کا پیغام لے کر گئے۔ ابوجہل ترکش سے تیر نکال کر پھیلا رہا تھا، عتبہ کا پیغام سن کر بولا "ہاں عتبہ کی ہمت نے جواب دے دیا"۔ عتبہ کے فرزند حضرت ابوحذیفہ رضؓ اسلام لا چکے تھے، اور اس معرکہ میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ آئے تھے اس بنا پر ابوجہل نے یہ بدگمانی کی کہ عتبہ اس لیے لڑائی سے جی چراتا ہے کہ اس کے بیٹے پر آنچ نہ آئے۔

ابوجہل نے حضرمی کے بھائی عامر کو بلا کر کہا، دیکھتے ہو! تمہارا خون بہا تمہاری آنکھ کے سامنے آ کر نکلا جاتا ہے۔ عامر نے عرب کے دستور کے مطابق کپڑے پھاڑ ڈالے اور گرد اڑا کر واعمرواہ واعمرواہ کا نعرہ مارنا شروع کیا۔ اس واقعہ نے تمام فوج میں آگ لگا دی۔

---

[۱] ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۱۶، [۲] منتخب کنز العمال غزوۂ بدر بہ روایت مسند ابن حنبل و ابن ابی شیبہ۔

عتبہ نے ابوجہل کا طعنہ سُنا تو غیرت سے سخت برہم ہُوا، اور کہا کہ میدانِ جنگ بتادے گا کہ نامردی کا داغ کون اُٹھاتا ہے، یہ کہہ کر مغفر مانگا، لیکن اس کا سر اس قدر بڑا تھا کہ کوئی مغفر اس کے سر پر ٹھیک نہ اُترا۔ مجبوراً سر سے کپڑا لپیٹا اور لڑائی کے ہتھیار سجے۔

چونکہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے ہاتھ کو خون سے آلودہ کرنا پسند نہیں فرماتے تھے، صحابہؓ نے میدان کے کنارے ایک چھپر کا سائبان تیار کیا کہ آپؐ اس میں تشریف رکھیں۔ حضرت سعد بنؓ معاذ دروازہ پر تیغ بکف کھڑے ہوئے کہ کوئی ادھر نہ بڑھنے پائے۔

اگرچہ بارگاہِ الٰہی سے فتح و نصرت کا وعدہ ہو چکا تھا۔ عناصرِ عالم آمادۂ مدد تھے، ملائکہ کی فوجیں ہمرکاب تھیں، تاہم عالمِ اسباب کے لحاظ سے آپؐ نے اصولِ جنگ کے مطابق فوجیں مرتب کیں۔ مہاجرین کا عَلَم حضرت مصعبؓ بن عمیر کو عنایت فرمایا۔ خزرج کے علمبردار حضرت حبابؓ بن منذر، اور اوس کے حضرت سعد بنؓ معاذ مقرر ہوئے۔

صبح ہوتے ہوتے آپؐ نے صف آرائی شروع کی۔ دستِ مبارک میں ایک تیر تھا، اُس کے اشارے سے صفیں قائم کرتے تھے، کہ کوئی شخص تل بھر آگے یا پیچھے نہ رہنے پائے۔ .... لڑائی میں شور و غل عام بات ہے لیکن منع کر دیا گیا کہ کسی کے مُنہ سے آواز تک نہ نکلنے پائے۔

اس موقع پر بھی جب کہ دشمن کی عظیم الشان تعداد مقابل تھی اور مسلمانوں کی طرف ایک آدمی بھی آکر بڑھ جاتا تو کچھ نہ کچھ مسرت ہوتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمہ تن وفا تھے، (حضرت) حذیفہؓ بن الیمان اور (حضرت) حسیلؓ دو صحابی کہیں سے آرہے تھے۔ راہ میں کفار نے روکا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدد

کو جارہے ہو ؟ اُنھوں نے انکار کیا اور عدم شرکت کا وعدہ کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو صورت حال عرض کی، فرمایا ہم ہر حال میں وعدہ وفا کریں گے، ہم کو صرف خدا کی مدد درکار ہے۔

اب دو صفیں آمنے سامنے مقابل تھیں، حق و باطل، نور و ظلمت، کفر و اسلام؛

قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَأُخْرَى كَافِرَةٌ ، (آل عمران - ۲)	جو لوگ باہم لڑے اُن میں تمھارے لیے عبرت کا نشان ہے، ایک خدا کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا منکرِ خدا تھا۔

یہ عجیب منظر تھا، اتنی بڑی وسیع دُنیا میں **توحید** کی قسمت صرف چند جانوں پر منحصر تھی۔ صحیحین میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر سخت خضوع کی حالت طاری تھی۔ دونوں ہاتھ پھیلا کر فرماتے تھے، "خدایا! تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے آج پورا کر"۔ محویت اور بیخودی کے عالم میں چادر کندھے پر سے گر گر پڑتی تھی اور آپؐ کو خبر تک نہ ہوتی تھی۔ کبھی سجدہ میں گرتے تھے اور فرماتے تھے کہ "خدایا! اگر یہ چند نفوس آج مٹ گئے تو پھر قیامت تک تو نہ پوجا جائے گا"۱۔

اس بیقراری پر بندگانِ خاص کو رقت آگئی۔ حضرت ابو بکرؓ نے عرض کی "خدا اپنا وعدہ وفا کرے گا، آخر روحانی تسکین کے ساتھ؛

سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ (قمر - ۳)	فوج کو شکست دی جائے گی، اور وہ پُشت پھیر دیں گے۔

پڑھتے ہوئے لب مبارک فتح کی پیشین گوئی سے آشنا ہوئے۔

---

۱ صحیح مسلم (باب الوفاء بالعہد، کتاب الجہاد والسیر) "س"

قریش کی فوجیں اب بالکل قریب آگئیں تاہم آپؐ نے صحابہؓ کو پیش قدمی سے روکا، اور فرمایا کہ جب دشمن پاس آجائیں تو تیر سے روکو۔

یہ معرکہ ایثار اور جاں بازی کا سب سے بڑا حیرت انگیز منظر تھا۔ دونوں فوجیں سامنے آئیں تو لوگوں کو نظر آیا کہ خود اُن کے جگر کے ٹکڑے تلوار کے سامنے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے بیٹے (جو اب تک کافر تھے) میدانِ جنگ میں بڑھے تو حضرت ابوبکرؓ تلوار کھینچ کر نکلے۔ عتبہ میدان میں آیا تو حضرت حذیفہؓ (عتبہ کے فرزند تھے) اس کے مقابلے کو نکلے۔ حضرت عمرؓ کی تلوار ماموں کے خون سے رنگین تھی۔

لڑائی کا آغاز یوں ہوا کہ یہ سب سے پہلے عامر حضرمی جس کو بھائی کے خون کا دعویٰ تھا، آگے بڑھا، مہجع حضرت عمرؓ کا غلام اس کے مقابلے کو نکلا اور مارا گیا۔

عتبہ جو سردارِ لشکر تھا، ابوجہل کے طعنے سے سخت برہم تھا، سب سے پہلے وہی بھائی اور بیٹے کو لے کر میدان میں نکلا، اور مبارز طلبی کی، عرب میں دستور تھا کہ نامور لوگ کوئی امتیازی نشان لگا کر میدانِ جنگ میں جاتے تھے۔ عتبہ کے سینے پر شتر مرغ کے پر تھے۔ حضرت عوفؓ، حضرت معاذؓ، حضرت عبداللہؓ بن رواحہ مقابلہ کو نکلے۔ عتبہ نے نام پوچھا اور جب یہ معلوم ہوا کہ انصارؓ ہیں تو عتبہ نے کہا ہم کو تم سے غرض نہیں، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف خطاب کر کے پکارا کہ محمدؐ! یہ لوگ ہمارے جوڑ کے نہیں ہیں[3]

---

[1] استیعاب ذکر عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ [2] سیرت ابن ہشام (۴۸۸ مطبع محمد علی مصر)
[3] کتب حدیث میں جو الفاظ ہیں مختلف ہیں، ابوداؤد (کتاب الجہاد) میں ہے کہ عتبہ

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ارشاد کے مطابق انصار ہٹ آئے اور حضرت حمزہ رضؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبیدہ رضؓ میدان میں آئے۔ چونکہ (یہ لوگ خود پہنے ہوئے تھے جس سے چہرے چھپ گئے تھے[۱] عتبہ نے پوچھا تم کون ہو؟ سب نے نام و نسب بتائے۔ عتبہ نے کہا "ہاں اب ہمارا جوڑ ہے"!

عتبہ حضرت حمزہ رضؓ سے اور ولید حضرت علی رضؓ سے مقابل ہوا اور دونوں مارے گئے، لیکن عتبہ کے بھائی شیبہ نے حضرت عبیدہ رضؓ کو زخمی کیا۔ حضرت علیؓ نے بڑھ کر شیبہ کو قتل کر دیا، اور حضرت عبیدہ کو کندھے پر اٹھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے۔ حضرت عبیدہ رضؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کیا میں دولتِ شہادت سے محروم رہا؟ آپؐ نے فرمایا "نہیں تم نے شہادت پائی"۔ حضرت عبیدہ رضؓ نے کہا آج ابوطالب زندہ ہوتے تو تسلیم کرتے کہ اُن کے اس شعر کا مستحق میں ہوں[۲]:

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲۸) نے کہا کہ ہم کو اپنے برادران عم زاد سے غرض ہے، تم سے کام نہیں۔ انصاری محدثین نے اس کا مطلب یہ قرار دیا ہے کہ "اس سے انصار کی توہین منظور نہ تھی، بلکہ یہ غرض تھی کہ انتقامِ خون کا مطالبہ قریش سے ہے انصار سے نہیں"۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مکہ والے انصار کو اپنا ہمسر نہیں سمجھتے تھے۔ صحیح روایتوں میں مذکور ہے کہ جب ابوجہل انصار کے ہاتھ سے مارا گیا تو مرتے وقت اُس نے کہا کاش مجھ کو فلاحوں (کاشتکار) کے سوا کسی اور نے مارا ہوتا۔ انصار کھیتی کا پیشہ کرتے تھے جو قریش کے نزدیک معیوب تھا۔

[۱] ابن سعد غزوۂ بدر و بدایہ و نہایہ ابن کثیر ج ۳ صفحہ ۲۷۳ مصر) [۲] زرقانی ان واقعات میں روایتیں مختلف ہیں، اور قریباً سب ہم مرتبہ ہیں، اس لیے جو روایت اختیار کر لی جائے قابلِ الزام نہیں۔ ۱۲

ونسلمہ حتی نصرع حولہ
ونذھل عن ابنائنا والحلائل

ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس وقت دشمنوں کے حوالہ کرینگے جب اُن کے گرد لڑکر مرجائیں اور ہم اپنے بیٹوں اور بی بیوں سے بھلا نہ دیے جائیں۔

سعید بن العاص کا بیٹا (عبیدہ) سر سے پاؤں تک لوہے میں ڈوبا ہوا صف سے نکلا اور پکارا کہ "میں ابوکرش ہوں"۔ حضرت زبیرؓ اس کے مقابلے کو نکلے، اور چونکہ صرف اس کی آنکھیں نظر آتی تھیں، تاک کر آنکھ میں برچھی ماری، وہ زمین پر گرا اور مرگیا، برچھی اس طرح پیوست ہوگئی تھی کہ حضرت زبیرؓ نے اس کی لاش پر پاؤں اڑا کر کھینچا تو بڑی مشکل سے نکلی، لیکن دونوں سرے خم ہوگئے۔ یہ برچھی یادگار رہی یعنی حضرت زبیرؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مانگ لی، پھر چاروں خلفاء کے پاس منتقل ہوتی رہی۔ پھر حضرت عبداللہ بن زبیر کے پاس آئی۔[1]

حضرت زبیرؓ نے اس معرکہ میں کئی کاری زخم اُٹھائے۔ شانہ پر جو زخم تھا، اتنا گہرا تھا کہ اچھے ہوجانے پر اُس میں اُنگلی چلی جاتی تھی۔ چنانچہ اُن کے بیٹے (عروہ) بچپن میں اُن زخموں سے کھیلا کرتے تھے۔ جس تلوار سے لڑے تھے، وہ لڑتے لڑتے کرگئی تھی۔ چنانچہ جب عبداللہ بن زبیرؓ شہید ہوئے تو عبدالملک نے عروہ سے کہا تم زبیر کی تلوار پہچان لوگے؟ انھوں نے کہا ہاں، عبدالملک نے پوچھا کیونکر؟ بولے کہ بدر کے معرکہ میں اس میں دندانے پڑگئے تھے۔ عبدالملک

---

[1] صحیح بخاری غزوہ بدر میں پورا واقعہ منقول ہے۔ [2] یہ پوری تفصیل صحیح بخاری غزوۂ بدر کے ذکر میں ہے۔

نے تصدیق کی اور یہ مصرع پڑھا۔ بھن فلول من قراع الکتائب، عبدالملک نے تلوار عروہ کو دے دی، انھوں نے اُس کی قیمت انکوائی تو تین ہزار ٹھہری، اس کے قبضے پر چاندی کا کام تھا۔[1]

اب عام حملہ شروع ہوگیا۔ مشرکین اپنے بل بوتے پر لڑ رہے تھے۔ لیکن ادھر سرورِ عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) سر بسجدہ صرف خدا کی قوت کا سہارا ڈھونڈ رہا تھا۔ ابوجہل کی شرارت اور دشمنیِ اسلام کا عام چرچا تھا، اس بنا پر انصار میں سے معوّذ رضؓ اور معاذ رضؓ دو بھائیوں نے عہد کیا تھا کہ یہ شقی جہاں نظر آجائیگا یا اس کو مٹا دیں گے یا خود مٹ جائیں گے۔ حضرت عبدالرحمٰن رضؓ بن عوف کا بیان ہے کہ مَیں صف میں تھا کہ دفعتہً مجھ کو داہنے بائیں دو نوجوان نظر آئے۔ ایک نے مجھ سے کان میں پوچھا کہ ابوجہل کہاں ہے؟ مَیں نے کہا۔ برادر زادہ! ابوجہل کو پوچھ کر کیا کرے گا؟ بولا کہ "مَیں نے خدا سے عہد کیا ہے کہ ابوجہل کو جہاں دیکھ لوں گا یا اُسے قتل کر دوں گا یا خود لڑکر مارا جاؤں گا"؟ مَیں جواب نہیں دینے پایا تھا کہ دوسرے نوجوان نے بھی مجھ سے کانوں میں یہی باتیں کہیں۔ مَیں نے دونوں کو اشارہ سے بتایا کہ ابوجہل وہ ہے۔ بتانا تھا کہ دونوں باز کی طرح جھپٹے، اور ابوجہل خاک پر تھا۔ دونوں نوجوان عفراء کے بیٹے تھے[2] معوذ ومعاذ؛ ابوجہل کے بیٹے عکرمہ نے عقب سے آکر معاذ کے بائیں شانے پر تلوار ماری، جس سے بازو کٹ گیا لیکن تسمہ باقی رہا۔ معاذ رضؓ نے عکرمہ کا تعاقب کیا، وہ بچ کر نکل گیا۔ معاذ رضؓ اسی حالت میں لڑ رہے تھے، لیکن ہاتھ کے لٹکنے سے زحمت ہوتی تھی، ہاتھ کو پاؤں کے نیچے دبا کر کھینچا کہ تسمہ بھی الگ ہوگیا، اور اب

---

[1] یہ پوری تفصیل صحیح بخاری غزوۂ بدر کے ذکر میں ہے۔ [2] بعض روایتوں میں معاذ بن عمرو معاذ بن عفراء ہے۔

وہ آزاد تھے۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے لڑائی سے پہلے ارشاد فرمایا تھا کہ "کفار کے ساتھ جو لوگ آئے ہیں، اُن میں ایسے بھی لوگ ہیں جو خوشی سے نہیں بلکہ قریش کے جبر سے آئے ہیں۔" اُن لوگوں کے نام بھی آپؐ نے بتا دیے تھے۔ اُن میں ابو البختری بھی تھا، مُجذر کی نظر (جو انصار کے حلیف تھے) ابو البختری پر پڑی۔ مجذر نے کہا چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرے قتل سے منع فرمایا ہے، اس لیے تجھ کو چھوڑ دیتا ہوں۔ ابو البختری کے ساتھ اس کا ایک رفیق بھی تھا۔ ابو البختری نے کہا اس کو بھی؟ مجذر نے کہا "نہیں"۔ ابو البختری نے کہا تو میں خاتونانِ عرب کا یہ طعنہ نہیں سُن سکتا کہ ابو البختری نے اپنی جان بچانے کے لیے اپنے رفیق کا ساتھ چھوڑ دیا، یہ کہ کر ابو البختری یہ رجز پڑھتا ہوا مجذر پر حملہ آور ہوا، اور مارا گیا۔

لن یسلم ابن حُرَّۃٍ زمیلہ — شریف زادہ اپنے رفیق کو چھوڑ نہیں سکتا
حتّٰی یموت اویریٰ سبیلہ — جبتک کہ مرنہ جائے یا وہ اپنا راستہ نہ دیکھ لے۔

عتبہ اور ابو جہل کے مارے جانے سے قریش کا پائے ثبات اُکھڑ گیا اور فوج میں بے دلی چھا گئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا شدید دُشمن اُمیّہ بن خلف بھی جنگِ بدر میں شریک تھا۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے اس سے کسی زمانہ میں معاہدہ کیا تھا کہ وہ مدینہ میں آئے گا تو یہ اس کی جان کے ضامن ہوں گے۔ بدر میں اُس دُشمنِ خُدا سے انتقام لینے کا خوب موقع تھا، لیکن چونکہ عہد کی پابندی اسلام کا شعار ہے۔ حضرت عبدالرحمن رضا بن عوف نے چاہا کہ وہ بچ کر نکل جاتے، اس کو لے کر پہاڑ پر چلے گئے۔ اتفاق یہ کہ حضرت بلال رضؓ نے دیکھ لیا۔ انصار کو خبر کر دی۔ دفعۃً

لوگ ٹوٹ پڑے، اُنھوں نے اُمیہ کے بیٹے کو آگے کر دیا۔ لوگوں نے اس کو قتل کر دیا۔ لیکن اس پر بھی قناعت نہ کی اور اُمیہ کی طرف بڑھے، اُنھوں نے اُمیہ سے کہا کہ تم زمین پر لیٹ جاؤ، یہ لیٹ گیا تو یہ اُس پر چھا گئے کہ لوگ اس کو مارنے نہ پائیں۔ لیکن لوگوں نے ان کی ٹانگوں کے اندر سے ہاتھ ڈال کر اُس کو قتل کر دیا۔ حضرت عبد الرحمن رض کی بھی ایک ٹانگ زخمی ہوئی اور زخم کا نشان مدتوں تک قائم رہا[1]۔

ابو جہل اور عتبہ وغیرہ کے قتل کے بعد قریش نے سپر ڈال دی اور مسلمانوں نے ان کو گرفتار کرنا شروع کر دیا۔

حضرت عباس رض، عقیل (حضرت علیؓ کے بھائی) نوفل، اسود بن عامر، عبد اللہ بن زمعہ، اور بہت بڑے بڑے معزز لوگ گرفتار ہوئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ کوئی شخص جا کر خبر لائے، ابو جہل کا کیا انجام ہوا؟ حضرت عبد اللہ بن مسعود نے جا کر لاشوں میں دیکھا تو زخمی پڑا ہوا دم توڑ رہا تھا۔ بولے تو ابو جہل ہے؟ اس نے کہا "ایک شخص کو اُس کی قوم[2] نے قتل کر دیا تو یہ فخر کی کیا بات ہے"؟ ابو جہل نے ایک دفعہ ان کو تھپیڑ مارا تھا، انھوں نے اس کے انتقام میں اس کی گردن پر پاؤں رکھا۔ ابو جہل نے کہا او بکری چرانے والے! دیکھ تو کہاں پاؤں رکھتا ہے۔ حضرت عبد اللہ[3] بن مسعود اس کا سر کاٹ لائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر ڈال دیا۔

معزبی مورخین کو جن کے نزدیک عالم اسباب میں جو کچھ ہے صرف اسباب

---

[1] یہ پورا واقعہ صحیح بخاری میں ہے لیکن چونکہ کتاب المغازی میں نہیں بلکہ کتاب الوکالہ میں ہے، اس لیے ارباب سیر کی نظر نہیں پڑی [2] بخاری (غزوہ بدر) [3] ایضاً۔

ظاہری کے نتائج ہیں۔ حیرت ہے کہ تین سو پیدل آدمیوں نے ایک ہزار جن میں سو سواروں کا رسالہ تھا، کیونکر فتح پائی؟ لیکن تائیدِ آسمانی نے بارہا ایسے حیرت انگیز مناظر دکھائے ہیں۔ تاہم اس واقعہ میں ظاہر بینوں کے اطمینان کے سامان بھی موجود ہیں۔ اوّل تو قریش میں باہم اتفاق نہ تھا۔ عتبہ سردارِ لشکر لڑنے پر راضی نہ تھا۔ قبیلہ زہرہ کے لوگ بدر تک آکر واپس چلے گئے۔ پانی برسنے سے موقع جنگ کی یہ حالت ہوگئی تھی کہ قریش جہاں صف آرا تھے وہاں کیچڑ اور دلدل کی وجہ سے چلنا پھرنا مشکل تھا۔ قریش مرعوب ہوکر اسلامی فوج کا تخمینہ غلط کر رہے تھے، یعنی اپنی تعداد سے دوگنا، چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

يَرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ (آل عمران ۲)	وہ اپنی آنکھوں سے مسلمانوں کو اپنے آپ سے دوگنا دیکھ رہے تھے۔

کفار کی فوج میں کوئی ترتیب اور صف بندی نہ تھی۔ بخلاف اس کے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خود دستِ مبارک میں تیر لے کر نہایت ترتیب سے صفیں درست کی تھیں، مسلمان رات کو اطمینان سے سوئے تھے، صبح اٹھے تو تازہ دم تھے۔ بخلاف اس کے کفار بے اطمینانی کی وجہ سے رات کو سو نہ سکے تھے۔

تاہم یہ اسباب ہیں، اُن کا اجتماع اور تہیّہ یہی تائیدِ الٰہی ہے۔ پھر قریش اور مسلمانوں کی فوج کا باہم مقابلہ کرو تو نظر آئے گا کہ عام فوجی نظر کیا مسلمانوں کی فتح کی مقتضی تھی۔ قریش کی فوج میں بڑے بڑے دولتمند تھے، جو تنہا تمام فوج کی رسد کا سامان کرتے تھے۔ مسلمانوں کے پاس کچھ نہ تھا۔ قریش کی تعداد ایک ہزار تھی، مسلمان صرف ۳۰۰ تھے۔ قریش میں سو سوار تھے، مسلمانوں کی فوج میں صرف دو گھوڑے تھے۔ مسلمانوں میں بہت کم سپاہی تمام ہتھیاروں سے پورے تھے اور ادھر قریش کا ہر سپاہی لوہے میں غرق تھا۔

بایں ہمہ خاتمہ جنگ پر معلوم ہوا کہ مسلمانوں میں سے صرف ۱۴ شخصوں نے شہادت پائی، جن میں سے ۶ مہاجر اور باقی انصار تھے۔ لیکن دوسری طرف قریش کی اصلی طاقت ٹوٹ گئی۔ اور رؤسائے قریش جو شجاعت میں نامور اور قبائل کے سپہ سالار تھے، ایک ایک کر کے مارے گئے۔ اُن میں شیبہ، عتبہ، ابوجہل، ابوالبختری، زمعہ بن الاسود، عاص بن ہشام، اُمیہ بن خلف، منبہ بن الحجاج، قریش کے سرتاج تھے۔ قریباً ۷۰ آدمی قتل اور اسی قدر گرفتار ہوئے۔ اسیرانِ جنگ میں سے عقبہ اور نضر بن حارث قتل کر دیے گئے۔ باقی گرفتار ہو کر مدینہ میں آئے، ان میں حضرت عباس رضؓ عقیل (حضرت علی رضؓ کے بھائی) ابوالعاص (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد) بھی تھے۔

لڑائیوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جہاں کوئی لاش نظر آتی تھی۔ آپؐ اس کو زمین میں دفن[1] کرا دیتے تھے۔ لیکن اس موقع پر کشتوں کی تعداد زیادہ تھی، اس لیے ایک ایک کا الگ الگ دفن کرانا مشکل تھا، ایک وسیع کنواں تھا۔ تمام لاشیں آپؐ نے اس میں ڈلوا دیں، لیکن امیہ کی لاش پھول کر اس قابل نہیں رہی تھی کہ جگہ سے ہٹائی جاوے، اس لیے وہیں خاک میں دبا دی گئی۔

اسیرانِ جنگ جب مدینہ میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے آئے تو حضرت سودہ رضؓ (آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زوجہ محترمہ) بھی تشریف رکھتی تھیں، ان قیدیوں میں اُن کے عزیز سہیل بن عمر تھے، اُن پر نگاہ پڑی تو بیساختہ بول اُٹھیں کہ تم نے بھی عورتوں کی طرح خود بیڑیاں پہن لیں، یہ نہ ہو سکا کہ

---

[1] روض الانف۔

لڑکر مرجاتے تھے[1]

اسیرانِ جنگ دو دو چار چار صحابہ کو تقسیم کردیے گئے، اور ارشاد ہوا کہ آرام کے ساتھ رکھے جائیں، صحابہ رضؓ نے اُن کے ساتھ یہ برتاؤ کیا کہ اُن کو کھانا کھلاتے تھے اور خود کھجور کھا کر رہ جاتے تھے۔ ان قیدیوں میں ابو عزیز بھی تھے جو حضرت مصعب بن عمیر رضؓ کے بھائی تھے۔ اُن کا بیان ہے کہ مجھ کو جن انصاریوں نے اپنے گھر میں قید کر رکھا تھا، جب صبح یا شام کا کھانا لاتے تو روٹی میرے سامنے رکھ دیتے اور خود کھجوریں اُٹھا لیتے۔ مجھ کو شرم آتی اور میں روٹی اُن کے ہاتھ میں دے دیتا۔ لیکن وہ ہاتھ بھی نہ لگاتے اور مجھی کو واپس دیتے۔ اور یہ اس بنا پر تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید کی تھی کہ قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے[2]۔

قیدیوں میں ایک شخص سہیل بن عمرو تھا، جو نہایت فصیح اللسان تھا اور عام مجمعوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تقریریں کیا کرتا تھا۔ حضرت عمر رضؓ نے کہا یا رسول اللہ صلعم! اس کے دو نیچے کے دانت اُکھڑوا دیجیے کہ پھر اچھا نہ بول سکے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اگر اس کے عضو بگاڑوں گا (مثلہ) تو گو نبی ہوں، لیکن خدا اس کی جزا میں میرے اعضا بھی بگاڑے گا[3]۔

حضرت عباس رضؓ کے بدن پر کُرتا نہ تھا، لیکن اُن کا قد اس قدر اونچا تھا کہ کسی کا کُرتہ اُن کے بدن پر ٹھیک نہیں اترتا تھا۔ عبداللہ بن اُبی (رئیس المنافقین) نے کہ حضرت عباسؓ کا ہم قد تھا، اپنا کُرتہ منگوا کر دیا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ کے کفن کے لیے جو اپنا کُرتہ عنایت فرمایا تھا،

---

[1] ابن ہشام [2] طبری صفحہ ۱۳۳۸ [3] ایضاً صفحہ ۱۳۴۴۔

وہ اسی احسان کا معاوضہ تھا۔

عام روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں آکر صحابہ سے مشورہ کیا کہ اسیرانِ جنگ کے معاملے میں کیا کیا جائے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ سب اپنے ہی عزیز و اقارب ہیں، فدیہ لے کر چھوڑ دیے جائیں۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک اسلام کے مسئلے میں دوست دشمن، عزیز و بیگانہ، قریب و بعید کی تمیز نہ تھی، اس لیے انھوں نے یہ رائے دی کہ سب قتل کر دیے جائیں، اور ہم میں سے ہر شخص اپنے عزیز کو آپ قتل کرے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی رائے پسند کی اور فدیہ لے کر چھوڑ دیا، اس پر خدا کا عتاب آیا اور یہ آیت اتری:

لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ	اگر خدا کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا
لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ	جو کچھ تم نے لیا، اس پر بڑا عذاب
عَظِيْمٌ۔ (انفال - ۹)	نازل ہوتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ یہ عتابِ ربانی سن کر رو پڑے۔

یہ روایت تمام تاریخوں میں مذکور اور احادیث میں بھی موجود ہے، لیکن سببِ عتاب کے بیان میں اختلاف ہے۔ ترمذی میں جو روایت ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ اس وقت تک مالِ غنیمت کے متعلق احکام نہیں آئے تھے۔ عرب کے عام دستور کے موافق صحابہ رضی اللہ عنہم غنیمت میں مصروف ہو گئے۔ اس پر عتاب آیا، لیکن چونکہ اس کے متعلق پہلے کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا۔ اس لیے یہ جرم معاف کر دیا گیا، اور حکم آیا کہ مالِ غنیمت جو ہاتھ آ چکا حلال ہے۔

قرآن مجید میں عتاب کے بعد یہ الفاظ ہیں:

---

[1] صحیح بخاری صفحہ ۴۲۲ (باب الکسوۃ للاساری)

فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالاً طَيِّبًا۔ (انفال - ۹)

تو جو تم نے لوٹا ہے اب کھاؤ کہ حلال طیب ہے۔

اس آیت میں صاف تصریح ہے کہ مال جو ہاتھ آیا تھا وہ حلال کر دیا گیا، اور وہ مالِ غنیمت تھا۔ غرض صحیح مسلم اور ترمذی دونوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عتاب فدیہ لینے یا مالِ غنیمت کے لوٹنے پر تھا۔ صحیح مسلم میں یہ الفاظ ہیں کہ جب عتاب کی آیت نازل ہوئی تو آپؐ رونے لگے اور جب حضرت عمرؓ نے سبب دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا ابكي الذي عرض على اصحابك من اخذهم الفداء یعنی تمہارے ساتھیوں نے جو فدیہ لیا، اس پر جو خدا کی طرف سے پیش کیا گیا، اس پر میں رو رہا ہوں"۔ عموماً لوگوں نے غلط فہمی سے یہ سمجھا ہے کہ عتاب اس پر آیا کہ اسیرانِ جنگ کو قتل کیوں نہیں کر ڈالا۔ چنانچہ لوگوں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے:

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ (انفال - ۹)

کسی نبی کو یہ مناسب نہیں کہ بغیر اچھی طرح خونریزی کرنے کے لوگوں کو قیدی بنائے۔

لیکن اس آیت کا صرف یہ ماحصل ہے کہ میدانِ جنگ میں جب تک کافی خونریزی نہ ہو چکے، قیدی بنانا مناسب نہیں۔ اس سے یہ کیونکر ثابت ہو سکتا ہے کہ اگر خونریزی سے پہلے لوگ گرفتار کر لیے گئے تو لڑائی کے بعد بھی وہ قتل کیے جا سکتے ہیں۔

بہرحال اسیرانِ جنگ سے چار چار ہزار درہم فدیہ لیا گیا لیکن جو لوگ ناداری کی وجہ سے فدیہ ادا نہیں کر سکتے تھے، وہ چھوڑ دیے گئے۔ ان میں سے جو لکھنا جانتے تھے اُن کو حکم ہوا کہ دس دس بچوں کو لکھنا سکھا دیں[1] تو

[1] مسند ابن حنبل جلد اصفحہ ۲۴۷۔

چھوڑ دیے جائیں گے۔ حضرت زیدؓ بن ثابت نے اسی طرح لکھنا سیکھا تھا[1]

انصار نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ حضرت عباسؓ ہمارے بھانجے ہیں، ہم اُن کا فدیہ چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مساوات کی بنا پر گوارا نہیں فرمایا اور اُن کو بھی فدیہ ادا کرنا پڑا۔ فدیہ کی عام مقدار ۴، ۴ ہزار درہم تھی، لیکن اُمراء سے زیادہ لیا گیا۔ حضرت عباسؓ دولتمند تھے، اس لیے اُن سے بھی زیادہ رقم وصول کی گئی۔ اُنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی، لیکن اُن کو کیا معلوم تھا کہ اسلام نے جو مساوات قائم کی۔ اس میں قریب و بعید، عزیز و بیگانہ، عام و خاص کے تمام تفرقے مٹ چکے تھے۔ (لیکن ایک طرف تو ادائے فرض کی یہ مساوات تھی، دوسری طرف محبت کا یہ تقاضا تھا کہ حضرت عباسؓ کی کراہ سن کر آپؐ آرام نہ فرما سکے۔ لوگوں نے اُن کی گرہ کھولی تو آپؐ نے آرام فرمایا)۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے داماد ابوالعاص بھی اسیرانِ جنگ میں آئے تھے، اُن کے پاس فدیہ کی رقم نہ تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کو (جو ان کی زوجہ تھیں اور مکہ میں تھیں) کہلا بھیجا کہ فدیہ کی رقم بھیج دیں۔ حضرت زینبؓ کا جب نکاح ہوا تھا، تو حضرت خدیجہؓ نے جہیز میں اُن کو ایک قیمتی ہار دیا تھا حضرت زینبؓ نے زرِ فدیہ کے ساتھ وہ ہار بھی گلے سے اُتار کر بھیج دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو ۲۵ برس کا محبت انگیز واقعہ یاد آگیا، آپؐ بے اختیار رو پڑے اور صحابہؓ سے فرمایا کہ تمھاری مرضی ہو تو بیٹی کو ماں کی یادگار واپس کر دو، سب نے تسلیم کی

---

[1] بخاری صفحہ ۵۷۲ (ج اول کتاب المغازی)۔

گردنیں جھکا دیں اور وہ ہار واپس کر دیا[1]

(ابو العاص رہا ہو کر مکہ آئے اور حضرت زینبؓ کو مدینہ بھیج دیا۔ ابو العاص بہت بڑے تاجر تھے۔ چند سال کے بعد بڑے سروسامان سے شام کی تجارت لے کر نکلے۔ واپسی میں مسلمان دستوں نے ان کو مع تمام مال واسباب گرفتار کر لیا، اسباب ایک ایک سپاہی پر تقسیم ہو گیا، یہ چھپ کر حضرت زینبؓ کے پاس پہنچے، اُنھوں نے پناہ دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے فرمایا کہ اگر مناسب سمجھو تو ابو العاص کا اسباب واپس کر دو، پھر تسلیم کی گردنیں جھک گئیں اور سپاہیوں نے ایک ایک دھاگا تک لا لا کر واپس کر دیا۔ اب یہ وار ایسا نہ تھا جو خالی جاتا، ابو العاص مکہ آئے اور تمام شرکاء کو حساب سمجھا کر دولتِ اسلام سے فائز ہوئے اور کہہ دیا کہ میں اس لیے یہاں آکر اور حساب سمجھا کر جاتا ہوں تاکہ یہ نہ کہو کہ ابو العاص رضؓ ہمارا روپیہ کھا کر تقاضے کے ڈر سے مسلمان ہو گیا)[2]

بدر کی خبر مکہ میں پہنچی تو گھر گھر ماتم تھا، لیکن غیرت کی وجہ سے قریش نے منادی کرا دی کہ کوئی شخص رونے نہ پائے۔ اس لڑائی میں اسود کے تین لڑکے مارے گئے تھے، اس کا دل اُمنڈ آتا تھا، لیکن قومی عزت کے خیال سے رو نہیں سکتا تھا۔ اتفاق یہ کہ ایک دن کسی طرف سے رونے کی آواز آئی، سمجھا کہ قریش نے رونے کی اجازت دے دی ہے۔ نوکر سے کہا دیکھنا کون روتا ہے؟ کیا رونے کی اجازت ہو گئی۔ میرے سینے میں آگ لگ رہی ہے، جی کھول کر روؤں تو تسکین ہو جائے۔ آدمی نے آکر کہا ایک عورت کا اُونٹ گُم ہو گیا ہے، اس کے لیے رو رہی ہے۔ اسود کی زبان سے بے اختیار یہ شعر نکلے:

---

[1] تاریخ طبری صفحہ ۱۳۴۸ و ابوداؤد [2] تاریخ طبری)

اتبکی اَن یضلّ لہا بعیر	اُونٹ کے گُم ہونے پر روتی ہے
ویمنعھا من النوم السھود	اور اُس کو نیند نہیں آتی ، اُونٹ
ولا تبکی علی بکرو لٰکن	پر مت رو ، بدر پر آنسو بہا ، جہاں
علی بدر تقاصرت الجدود	قسمت نے کمی کی ، تجھ کو رونا ہے
فبکی ان بکیت علی عقیل	تو عقیل پر رو ، اور حارث پر رو ،
و بکیّ حارثا اسد الاسود	جو شیروں کا شیر تھا !

عمیر بن وہب قریش میں اسلام کا سخت دُشمن تھا ، وہ اور صفوان بن اُمیہ حجر میں بیٹھے ہُوئے مقتولینِ بدر کا ماتم کر رہے تھے صفوان نے کہا "خُدا کی قسم اب جینے کا مزہ نہیں "۔ عمیر نے کہا سچ کہتے ہو ، اگر مجھ پر قرض نہ ہوتا اور بچوں کا خیال نہ ہوتا تو مَیں سوار ہو کر جاتا اور محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کو قتل کر آتا ۔ میرا بیٹا بھی وہاں قید ہے صفوان نے کہا ، تم قرض کی اور بچّوں کی فکر نہ کرو ، اُن کا مَیں ذمّہ دار ہوں ۔ عمیر نے گھر آکر تلوار زہر میں بجھائی اور مدینہ پہنچا حضرت عمر رضؓ نے اس کے تیور دیکھ لیے ۔ گلا دبائے اس کو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں لائے ۔ آپؐ نے فرمایا عمر رضؓ ! چھوڑ دو عمیر قریب آجاؤ ، پوچھا کس ارادے سے آئے ؟ جواب دیا کہ بیٹے کو چھڑانے آیا ہوں ۔ فرمایا تلوار کیوں حمائل ہے ؟ عمیر نے کہا آخر تلواریں بدر میں کس کام آئیں ۔ فرمایا کیوں نہیں ، تم نے اور صفوان نے حجر میں بیٹھ کر میرے قتل کی سازش نہیں کی ؟ عمیر یہ بات سُن کر سنّاٹے میں آگیا ، بے اختیار ہو کر بولا محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم ، بیشک تم پیغمبر ہو ، بخدا میرے اور صفوان کے سوا اس معاملہ کی کسی کو خبر نہ تھی ، قریش جو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے قتل کی خبر سُننے کے منتظر تھے اُنھوں نے عمیر کے مسلمان ہونے کی خبر سُنی ۔

حضرت عمیرؓ مسلمان ہو کر بہادرانہ مکہ میں آئے جہاں کا ہر ذرہ اس وقت مسلمانوں کے خون کا پیاسا تھا۔ اُن کو اسلام کے دوستوں سے جس شدت کے ساتھ عداوت تھی، اُسی شدت سے وہ اب دشمنانِ اسلام کے دشمن تھے۔ یہاں پہنچ کر انھوں نے اسلام کی دعوت کو پھیلایا اور مجمعِ کثیر کو اس روشنی سے منور کر دیا۔[1]

غزوہ بدر کا بیان قرآن میں | اس غزوہ کو دیگر غزوات پر جو امتیازات حاصل ہیں، اُن میں ایک یہ بھی ہے کہ خود خدا نے اپنے کلامِ پاک میں اس کا مفصل ذکر کیا ہے اور ایک خاص سورہ (انفال) بدر کے احسانات و نعم کی تفصیل اور بعض مسائل متعلقہ بدر کی توضیح کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔ واقعہ کی اصل حقیقت جاننے کے لیے آسمان کے نیچے اس سے زیادہ کوئی صحیح ماخذ موجود نہیں:

(۱) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُہُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْہِمْ اٰیٰتُہٗ زَادَتْہُمْ اِیْمَانًا وَّعَلٰی رَبِّہِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ ج الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰہُمْ یُنْفِقُوْنَ ط اُولٰٓئِکَ ہُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَہُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّہِمْ وَمَغْفِرَۃٌ وَّرِزْقٌ کَرِیْمٌ ٥	مومن وہ ہیں کہ جب خدا کا نام لیا جائے تو اُن کے دل دہل جائیں، اور جب اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جائیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے خدا پر بھروسہ کرتے ہیں، جو نماز پہ پابندی پڑھتے ہیں، اور خدا نے جو اُن کو روزی دی ہے اس سے راہِ خدا میں بھی کچھ دیتے ہیں یہ ہیں سچے مومن اُن کے لیے خدا کے پاس رتبے ہیں، بخشش ہے اور اچھی روزی ہے۔

[1] (یہ تمام واقعات تاریخ طبری میں بحوالہ عروہ بن زبیرؓ مذکور ہیں، صفحہ ۱۳۵۴)

كَمَا أَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ	جس طرح اے پیغمبر تیرا خدا تجھ کو حق پر
بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ص وَإِنَّ فَرِيقًا	تیرے گھر سے (بدر تک) نکال لایا حالانکہ
مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ لَكَارِهُونَ	مسلمانوں کا ایک گروہ اس سے ناخوش
يُجَادِلُونَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَمَا	تھا، وہ تجھ سے حق ظاہر ہوئے پیچھے
تَبَيَّنَ كَأَنَّمَا يُسَاقُونَ إِلَى	بھی جھگڑتا ہے، گویا کہ وہ موت کی
الْمَوْتِ وَهُمْ يَنظُرُونَ ۝	طرف ہنکائے جارہے ہیں، اور وہ موت
وَإِذْ يَعِدُكُمُ اللَّهُ إِحْدَى	کو دیکھ رہے ہیں، اور جب خدا تم سے قریش
الطَّائِفَتَيْنِ أَنَّهَا لَكُمْ وَ	کے قافلہ اور قریش کی فوج میں سے ایک
تَوَدُّونَ أَنَّ غَيْرَ ذَاتِ	کا وعدہ کرتا ہے کہ وہ تمہارے لیے ہے
الشَّوْكَةِ تَكُونُ لَكُمْ وَ	تم چاہتے ہو کہ بے خرخشہ والا گروہ تم کو
يُرِيدُ اللَّهُ أَن يُحِقَّ الْحَقَّ	مل جائے (یعنی قافلہ) اور خدا یہ چاہتا ہے
بِكَلِمَتِهِ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكَافِرِينَ ۝	کہ حق کو اپنے حکم سے ثابت کرے، اور
لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ	باطل کو مٹائے، گو گنہگار اس سے رنجیدہ
وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ ۝ إِذْ	ہوں، یاد کرو، جب تم اپنے پروردگار
تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ	سے فریاد کر رہے تھے اس نے تمہاری
لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُم بِأَلْفٍ	سنی (اور کہا) میں تمہاری لگاتار ہزار
مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ ۝	فرشتوں سے مدد کروں گا، خدا نے یہ
وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ وَ	صرف مسلمانوں کی خوشی اور اطمینان
لِتَطْمَئِنَّ بِهِ قُلُوبُكُمْ وَمَا	قلب کے لیے کیا اور فتح تو صرف
النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِندِ اللَّهِ إِنَّ	خدا کے پاس ہے، خدا غالب و دانا
اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ إِذْ يُغَشِّيكُمُ	ہے، یاد کرو جب تمہارے چین کے لیے

النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ
عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً
لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ
عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَ
لِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ
بِهِ الْاَقْدَامَ ○ اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ
اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ
فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَاُلْقِيْ
فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا
الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ
وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ○
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ
وَرَسُوْلَهٗ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ
وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ
الْعِقَابِ ○ ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ
وَاَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ
النَّارِ ○ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا
اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ○
وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ
اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا

اپنی طرف سے اونگھ تم پر طاری کر رہا
تھا اور آسمان سے پانی برسا رہا تھا کہ
تم کو پاک کرے اور شیطان کی ناپاکی
تم سے دور کرے اور تمہارے دل
مضبوط کرے اور ثابت قدم رکھے،
یاد کرو جب فرشتوں کو حکم دے رہا
تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں مسلمانوں
کو ثابت قدم رکھنا۔ میں کافروں
کے دل میں رعب ڈال دوں گا،
کافروں کی گردنیں مارو اور ہر جوڑ
پر مارو، یہ اس لیے کہ انھوں نے
خدا اور خدا کے رسول سے دشمنی کی
ہے اور جو خدا اور خدا کے رسول سے
دشمنی کرے گا خدا اس کو سخت عذاب
دینے والا ہے، یہ ہے عذاب، اس کا
مزہ چکھو، کافروں کے لیے عذاب
دوزخ ہے۔ مسلمانو! جب میدان
جنگ میں کافروں کے مقابل آؤ
تو پشت نہ پھیرو، اور بجز اس کے
لڑنے کے لیے مڑے یا کسی دستہ کی طرف
پھرے، جو کوئی پشت پھیرے، وہ خدا

إِلَىٰ فِئَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ
مِّنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ
وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ، فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ
وَلَٰكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ وَمَا
رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ
اللَّهَ رَمَىٰ ۝ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِينَ
مِنْهُ بَلَاءً حَسَنًا إِنَّ اللَّهَ
سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ ذَٰلِكُمْ وَأَنَّ
اللَّهَ مُوهِنُ كَيْدِ الْكَافِرِينَ ۝
إِن تَسْتَفْتِحُوا فَقَدْ جَاءَكُمُ
الْفَتْحُ ، وَإِن تَنتَهُوا فَهُوَ
خَيْرٌ لَّكُمْ وَإِن تَعُودُوا
نَعُدْ ۝ وَلَن تُغْنِيَ عَنكُمْ
فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَلَوْ كَثُرَتْ
وَأَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ ۝

کا غضب لائے گا، اور اس کا ٹھکانا
جہنم ہوگا، اور کیا برا ٹھکانا ہے۔
مسلمانو! ان کافروں کو تم نے نہیں
مارا، لیکن خدا نے مارا، اور اے محمدؐ!
تم نے نہیں پھینکا، جب تم نے پھینکا
لیکن خدا نے پھینکا، تاکہ اپنی طرف سے
اہل ایمان کو اچھا انعام دے، خدا دانا
اور بینا ہے، اور کافروں کے داؤ
پیچ کو کمزور کرنے والا ہے، اگر فتح
چاہتے تھے، تو فتح آچکی، اب
اگر رک جاؤ تو بہتر ہے، اور تم پھر
مخالفت پر آمادہ ہوگے تو ہم پھر
مسلمانوں کی مدد کریں گے، یاد رکھو
کہ تمہاری جمعیت کچھ مفید نہیں، گو
وہ کتنی ہی کثیر ہو، اور خدا مومنوں
کے ساتھ ہے۔

(انفال - ۲)

(۲) وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُم
مِّن شَيْءٍ فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ
وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ
وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ
السَّبِيلِ ۝ إِن كُنتُمْ آمَنتُم

(۲) اور جان لو کہ جو مال غنیمت ملے
تو اس کا پانچواں حصہ خدا کے لیے
اور اس کے رسول کے لیے، اہل قرابت
کے لیے، یتیموں کے لیے، مسکینوں
کے لیے اور مسافروں کے لیے ہے،

بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا
يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ
وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ
اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا
وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى
وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَلَوْ
تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي
الْمِيْعٰدِ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ
اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا لِّيَهْلِكَ
مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّ
يَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ
وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○
اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ
قَلِيْلًا وَلَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّ
فَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ
وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ
بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ○ وَاِذْ
يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ
اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّيُقَلِّلُكُمْ
فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ
اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا وَاِلَى اللّٰهِ

اگر خدا پر تم ایمان لا چکے ہو اور حق و باطل
میں فرق کر دینے والے دن میں
(یعنی بدر میں) خدا نے اپنے بندے
پر جو (فتح) اتاری، اس کو مان چکے،
جب دونوں فوجیں آمنے سامنے آگئیں
اور خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے،
جب تم قریب کے میدان میں اور قریش کی
فوج دور کے میدان میں اور قافلہ تم سے
نیچے تھا، اگر تم ایک دوسرے سے وقت
مقرر کر کے آتے تو وقت میں اختلاف
ہو جاتا، لیکن خدا نے یہ اس لیے کر دیا)
تاکہ جو ہونے والا تھا، خدا اس کو کر دے،
تاکہ جس کو مرنا ہو وہ بھی دلیل دیکھ کے
مرے، اور جس کو زندہ رہنا ہے وہ
بھی دلیل دیکھ کے زندہ رہے، اور (خدا)
سننے والا اور جاننے والا ہے (یاد کرو)
جب خدا تم کو جنگ کی حالت میں
ان کو تھوڑا دکھا رہا تھا، اگر زیادہ
کر کے دکھاتا تو تم سست پڑ جاتے
اور باہم جھگڑنے پڑتے لیکن خدا نے
محفوظ رکھا، وہ سینوں کے بھید سے واقف

تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ه يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا
وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ
تُفْلِحُوْنَ، وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ
رَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا
وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَ
اصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ
وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا
مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّ
رِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ
عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ بِمَا
يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ (انفال)
(٣) مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ
اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ
تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا
وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ وَاللّٰهُ
عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ لَوْلَا كِتٰبٌ
مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ
اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ
فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا
طَيِّبًا وَّاتَّقُوا اللّٰهَ، اِنَّ اللّٰهَ

ہے، جب تمہاری نظر میں خدا ان کو تھوڑا
دکھا رہا تھا اور تم کو ان کی نگاہ میں، تاکہ جو
ہونیوالا ہے خدا اس کو پورا کرے اور اسی کی طرف
تمام معاملے پھرتے ہیں مسلمانو! جب کسی ستہ فوج
سے مقابلہ آپڑے تو ثابت قدم رہو اور خدا
اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور جھگڑا نہ کرو، ورنہ
سست پڑ جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائیگی،
مستقل رہو، خدا مستقل لوگوں کے ساتھ ہے اور ان
لوگوں (یعنی قریش) کی طرح نہ بنو جو اپنے گھروں
سے مغرورانہ نمائش اور دکھاوے کیلیا تھا اور خدا
کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہوئے نکلے، اور خدا
ان کے تمام کاموں کو گھیرے ہوئے ہے ۔
(٣) پیغمبر کے لیے یہ مناسب نہ تھا کہ اس
کے پاس قیدی ہوں، تا آنکہ خوب زمین
میں لڑ نہ لے، تم دنیا کی دولت چاہتے ہو
(قیدی ہونگے تو فدیہ ہاتھ آئیگا) اور خدا آخرت
چاہتا ہے، خدا دانا اور توانا ہے۔ اگر خدا کی
تقدیر پہلے نہ ہو چکی ہوتی تو تم نے جو قیدیوں
سے لے لیا، اس پر دردناک عذاب پہنچتا
اب جو کچھ تم کو غنیمت میں ملا، کھاؤ، وہ
حلال و طیب ہے، اور خدا سے ڈرا کرو

اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ (انفال ۹)	خدا آمرزگار اور مہربان ہے ۔
یٰۤاَیُّھَا النَّبِیُّ قُلْ لِّمَنْ	اے پیغمبر تمھارے ہاتھ میں جو قیدی
فِیْۤ اَیْدِیْکُمْ مِّنَ الْاَسْرٰۤی	ہیں اُن سے کہو کہ خدا اگر تمھارے دلوں
اِنْ یَّعْلَمِ اللّٰہُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ	میں کچھ نیکی دیکھے گا تو تم سے جو لیا گیا
خَیْرًا یُّؤْتِکُمْ خَیْرًا مِّمَّاۤ	ہے اس کے بدلے وہ نیکی عطا کریگا اور
اُخِذَ مِنْکُمْ وَ یَغْفِرْ لَکُمْ	تمھیں معاف کریگا، وہ بخشش اور
وَ اللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ وَ	مہربانی والا ہے، اور اگر یہ قیدی تجھ سے
اِنْ یُّرِیْدُوْا خِیَانَتَکَ فَقَدْ	خیانت کرنا چاہتے ہیں تو اس سے پہلے
خَانُوا اللّٰہَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْکَنَ	وہ خدا کے ساتھ خیانت کر چکے ہیں،
مِنْھُمْ وَ اللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ ۝	اسی لیے تو خدا نے اُن کو تمھارے قابو
(انفال ۱۰)	میں کر دیا، خدا دانا اور باخبر ہے ۔

خدا نے اِسی احسان کو اُحد کے موقع پر یاد دلایا ہے ۔

وَلَقَدْ نَصَرَکُمُ اللّٰہُ بِبَدْرٍ	یقیناً خدا نے تمھاری بدر میں مدد کی
وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّۃٌ فَاتَّقُوا اللّٰہَ	جب تم کمزور تھے، تو خدا سے ڈرو
لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ (آلِ عمران ۱۳)	تاکہ تم شکر گزار بن جاؤ ۔

غزوۂ بدر پر دوبارہ نظر

سادہ واقعات بیان کرنے کے بعد اب وقت آیا ہے کہ محققانہ طور سے اس بات پر بحث کی جائے کہ غزوۂ بدر کا مقصد جیسا کہ عام مورخین نے بیان کیا ہے، کاروانِ تجارت کو لوٹنا تھا، یا قریش کے حملے کا دفاع تھا۔

مَیں اس بات سے خوب واقف ہوں کہ تاریخ اور محکمۂ عدالت میں فرق ہے۔ مجھ کو یہ بھی معلوم ہے کہ تاریخ کا اندازِ بیان مقدمۂ دیوانی یا فوجداری کے فیصلے لکھنے سے بالکل مختلف ہے۔ مَیں اس کو بھی تسلیم کرتا ہوں کہ میرا منصب واقعہ نگاری ہے، فیصلہ نویسی نہیں۔ لیکن موقع ایسا آ پڑا ہے کہ ایک واقعۂ تاریخی نے مقدمۂ عدالت کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ اس لیے مجھ کو اپنے منصب سے ہٹ کر فصلِ مقدمہ کا قلم ہاتھ میں لینا پڑتا ہے۔

اس بات کا مجھ کو مطلق خوف نہیں کہ اس فیصلہ میں عام مورخین اور اربابِ سِیَر میرے حریفِ مقابل ہیں، نہایت جلد نظر آ جائے گا کہ حق اکیلا تمام دنیا پر فتح پا سکتا ہے۔ سلسلۂ کلام کے اچھی طرح پیشِ نظر رکھنے کے لیے سب سے پہلے ہم کو بتا دینا چاہیے کہ (ہماری تحقیقات کے رُو سے) واقعہ کی اصل صورت کیا تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرمی کے قتل نے تمام مکہ کو جوشِ انتقام سے لبریز کر دیا تھا اور اس سلسلہ میں چھوٹی چھوٹی لڑائیاں بھی پیش آ گئیں۔ دونوں فریق

ایک دوسرے سے پُرحذر رہتے تھے، اور جیسا کہ ایسی حالتوں میں عام قاعدہ ہے غلط خبریں خود بخود مشہور ہو کر پھیل جاتی ہیں۔ اسی اثنا میں ابوسفیان قافلہ تجارت کے ساتھ شام گیا، اور ابھی وہ شام میں تھا کہ یہ خبر وہاں مشہور ہو گئی کہ مسلمان قافلے پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ ابوسفیان نے وہیں سے مکہ کو آدمی دَوڑایا کہ قریش کو خبر ہو جائے۔ قریش نے لڑائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ مدینہ میں یہ مشہور ہوا کہ قریش ایک جمعیتِ عظیم لے کر مدینہ آ رہے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدافعت کا قصد کیا اور بدر کا معرکہ پیش آیا۔

اس بحث کے فیصلے کے لیے سب سے پہلے اُن واقعات کو یکجا لکھ دینا چاہیے، جن پر دونوں فریق کا اتفاق ہے۔ تاکہ وہ انفصالِ بحث میں اصولِ موضوعہ کے طور پر کام آئیں، وہ یہ ہیں:

(۱) قرآن مجید میں اگر کسی واقعہ کا صاف ذکر ہے تو اُس کے مقابلے میں کسی روایت اور تاریخ کا اعتبار نہ کیا جائے گا۔

(۲) کتبِ حدیث میں صحت کے لحاظ سے باہم جو فرقِ مراتب ہے اس کا لحاظ رکھا جائے گا۔

اس قدر عموماً مُسلّم ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر معلوم ہوئی کہ قریش بڑی تیاری کے ساتھ مکہ سے نکلے ہیں تو آپؐ نے صحابہؓ سے مخاطب ہو کر ان کا استمزاج کیا۔ مہاجرین نے نہایت جوش کے ساتھ آمادگی ظاہر کی۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انصار کی مرضی دریافت کرنا چاہتے تھے۔ یہ دیکھ کر سعدؓ یا اور کوئی معزز انصاری اُٹھے اور کہا، یا رسول اللہ! کیا آپؐ کا رُوئے سخن ہماری طرف ہے؟ ہم وہ لوگ نہیں ہیں جنھوں نے موسیٰؑ سے کہا تھا کہ تم اور تمہارا خدا دونوں جا کر لڑو ہم یہیں بیٹھے رہیں گے۔ خدا کی قسم اگر آپؐ حکم دیں تو ہم

آگ اور سمندر میں کود پڑیں۔

یہ بھی مسلّم ہے کہ صحابہ میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو شرکت سے ہچکچاتے تھے۔ چنانچہ خود قرآن مجید میں تصریح ہے:

وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ (انفال-۱)	اور مسلمانوں کا ایک گروہ قطعاً ناخوش تھا۔

عموماً ارباب سیر اور محدثین نے تصریح کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کی رضامندی جو خاص طور پر دریافت کی، اس کی وجہ یہ تھی کہ انصار نے مکہ میں جب آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کی تو صرف یہ اقرار کیا تھا کہ "جب کوئی دشمن خود مدینہ پر حملہ آور ہوگا تو انصار مقابلہ کریں گے۔" یہ اقرار نہ تھا کہ مدینہ سے باہر نکل کر بھی لڑیں گے۔ ان واقعات کے بعد اب مرکز بحث یہ ہے کہ "یہ واقعات کہاں پیش آئے"۔ ارباب سیر لکھتے ہیں کہ مدینہ سے جب آپؐ نکلے تو صرف قافلۂ تجارت پر حملہ کرنا مقصود تھا۔ دو چار منزل چل کر معلوم ہوا کہ قریش فوجیں لیے چلے آتے ہیں۔ اُس وقت آپؐ نے مہاجرین اور انصار کو جمع کیا کہ ان کا عندیہ دریافت فرمائیں آگے کے واقعات یہیں پیش آئے لیکن کتب سیر، تاریخ، اور تمام دیگر شہادتوں سے بالاتر ایک اور چیز ہمارے پاس موجود ہے (قرآن) جس کے آگے ہم سب کو گردن جھکا دینی چاہیے:

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۙ يُجَادِلُوْنَكَ فِى الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ	جس طرح تجھ کو تیرے خدا نے تیرے گھر سے حق پر نکالا درآنحالیکہ مسلمانوں کا ایک گروہ اس کو پسند نہیں کرتا تھا۔ یہ لوگ حق کے ظاہر ہوئے پیچھے تجھ سے حق بات میں جھگڑا کرتے تھے گویا کہ موت کی

يَنْظُرُوْنَ ۝ وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (انفال ع ۱)

طرف ہنکائے جا رہے ہیں اور موت کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، اور جب کہ خدا تم سے یہ وعدہ کرتا تھا کہ دو جماعتوں میں سے کوئی جماعت تم کو ہاتھ آئے گی، اور تم یہ چاہتے تھے کہ بے کھٹکے والی جماعت تم کو ہاتھ آجائے اور اللہ یہ چاہتا تھا کہ کہ حق کو اپنی باتوں سے قائم کردے اور کافروں کی

(۱) ترکیب نحوی کی رو سے وَاِنَّ میں جو واو ہے، حالیہ ہے۔ جس کے یہ معنی ہیں، کہ مسلمانوں کا ایک گروہ جو جی چراتا ہے۔ یہ موقع عین وہ موقع تھا جب آپؐ مدینہ سے نکل رہے تھے، نہ کہ مدینہ سے نکل کر جب آپؐ آگے بڑھے، کیونکہ واو حالیہ کے لحاظ سے خروج من البیت، اور اس گروہ کے جی چرانے کا وقت اور زمانہ ایک ہی ہونا چاہیے +

(۲) آیت مذکورہ میں بہ تصریح مذکور ہے کہ یہ جس وقت کا واقعہ ہے اُس وقت دو گروہ سامنے تھے، ایک کاروانِ تجارت، اور ایک قریش کی فوج جو مکہ سے آرہی تھی۔ ارباب سیر کہتے ہیں کہ آیت قرآنی میں یہ اس وقت کا واقعہ مذکور ہے جب آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم بدر کے قریب پہنچ چکے تھے۔ لیکن بدر کے قریب پہنچ کر تو کاروانِ تجارت صحیح سلامت بچ کر نکل گیا تھا اس وقت یہ کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ "دونوں میں سے ایک کا وعدہ ہے" اس لیے یہ بالکل ظاہر ہے کہ قرآن مجید کے نص کے مطابق یہ واقعہ اس وقت کا ہونا چاہیے جب دونوں گروہ کے ہاتھ آنے کا احتمال ہو سکتا ہو، اور یہ صرف وہ وقت ہو سکتا ہے جب آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم مدینہ میں تھے، اور دونوں طرف کی خبریں

آگئی تھیں کہ اُدھر ابوسفیان کاروانِ تجارت لے کر چلا ہے اور ادھر قریش جنگ کے سروسامان کے ساتھ مکہ سے نکل چکے ہیں۔

(۳) سب سے زیادہ قابلِ لحاظ یہ امر ہے کہ قرآن مجید کی آیت مذکورہ بالا میں کفار کے دو فریق کا خدا نے بیان کیا ہے۔ ایک قافلہ تجارت اور دوسرا صاحب شوکت یعنی کفارِ قریش جو مکہ سے لڑنے کے لیے آ رہے تھے۔ آیت میں تصریح ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت ایسی تھی جو چاہتی تھی کہ کاروانِ تجارت پر حملہ کیا جائے خدا نے ان لوگوں پر ناراضی ظاہر کی اور فرمایا:

وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ، (انفال ع ۱)	اور تم چاہتے ہو کہ بے خرخشہ والا گروہ تم کو ہاتھ آجائے اور خدا یہ چاہتا ہے کہ اپنی باتوں سے حق کو قائم کردے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔

ایک طرف وہ لوگ ہیں جو قافلہ تجارت پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، دوسری طرف خدا ہے جو چاہتا ہے کہ حق کو قائم کردے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔ اب سوال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان دو میں سے کس کے ساتھ ہیں؟ عام روایتوں کے مطابق اس سوال کا کیا جواب ہوگا، میں اس تصور سے کانپ اٹھتا ہوں۔

(۴) اب واقعہ کی نوعیت پر غور کرو۔ واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ سے اس سروسامان کے ساتھ نکل رہے ہیں کہ تین سو سے زیادہ جانباز مہاجر و انصار ہیں، ان میں فاتحِ خیبر اور حضرت امیر حمزہ سید الشہداء بھی ہیں، جن میں سے ہر ایک بجائے خود ایک لشکر ہے۔ باوجود اس کے (جیسا کہ قرآن مجید میں بہ تصریح مذکور ہے) ڈر کے مارے کچھ صحابہ کا دل بیٹھا جاتا ہے، اور ان کو نظر

آتا ہے کہ کوئی ان کو موت کے مُنہ میں لیے جاتا ہے:

وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ، يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ ۔ (انفال - ۱)	اور مسلمانوں کی ایک جماعت کارہ تھی، وہ تجھ سے حق ظاہر ہوئے پیچھے بھی جھگڑا کرتی تھی، گویا کہ موت کی طرف ہنکائے جا رہے ہیں۔

اگر صرف قافلہ تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو یہ خوف، یہ اضطراب، یہ پہلو تہی کس بنا پر تھی؟ اس سے پہلے بارہا (بقول ارباب سیر) قافلۂ قریش پر حملہ کرنے کے لیے تھوڑے تھوڑے آدمی بھیج دیے گئے تھے، اور کبھی ان کو ضرر نہیں پہنچا تھا۔ اس دفعہ اسی قافلے کا اتنا ڈر ہے کہ تین سو چیدہ اور منتخب فوج ہے اور پھر لوگ ڈر کے مارے سہمے جاتے ہیں۔ یہ قطعی دلیل ہے کہ مدینہ ہی میں خبر آگئی تھی کہ قریش مکہ سے جمعیت عظیم لے کر مدینہ پر آ رہے ہیں۔

(۵) قرآن مجید میں ایک اور آیت اسی بدر کے واقعہ کے متعلق نازل ہوئی ہے، اور اس وقت جب آپؐ مدینہ ہی میں تشریف رکھتے تھے۔ چنانچہ صحیح بخاری تفسیر سورۂ نسا میں تصریحًا مذکور ہے۔ آیت یہ ہے:

لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِيْنَ دَرَجَةً ۔ (نسآء - ۱۳)	بجز معذوروں کے، وہ لوگ جو بیٹھ رہے، اور وہ لوگ جو خدا کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرتے ہیں برابر نہیں ہو سکتے، خدا نے مجاہدین کو جو مال اور جان سے جہاد کرتے ہیں، درجہ میں فضیلت دی ہے۔

صحیح بخاری میں اس آیت کے متعلق حضرت ابن عباس رضؓ کا قول نقل کیا ہے کہ یعنی وہ لوگ جو بدر میں شریک نہیں ہوے، اور وہ جو شریک ہوے، دونوں برابر نہیں ہوسکتے۔ صحیح بخاری میں یہ بھی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو پہلے غیر اولی الضرر کا جملہ نہ تھا۔ یہ آیت سُن کر حضرت عبداللہؓ بن مکتوم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوے اور اپنے اندھے پن کا عذر کیا، اس پر وہیں یہ جملہ نازل ہوا "غیر اولی الضرر" یعنی معذوروں کے سوا۔ یہ صاف اس بات کی دلیل ہے کہ مدینہ ہی میں معلوم ہوگیا تھا کہ قافلے پر حملہ کرنا نہیں بلکہ لڑنا اور جان دینا ہے۔

(۶) کفارِ قریش جو مکہ سے لڑنے کے لیے بدر میں آئے، اُن کی نسبت قرآن مجید میں ہے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا	اور (اُن لوگوں کی طرح نہ بنو) جو اپنے
مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَرِئَاءَ	گھروں سے مغرورانہ نمائشی اور خدا
النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ	کی راہ سے روکتے ہوے نکلے۔

(انفال۔ ۶)

اگر قریش صرف قافلۂ تجارت کے بچانے کے لیے نکلتے تو خدا یہ کیوں کہتا کہ وہ اظہارِ شان اور دکھاوے کے لیے خدا کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہوے نکلے، اس میں اظہارِ شان اور دکھاوے کی کیا بات تھی؟ اور خدا کی راہ سے لوگوں کو روکنا کیا تھا؟ البتہ چونکہ درحقیقت وہ مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے نکلے تھے، جس سے مقصود اپنے زور اور قوت کا اعلان و نمائش اور اسلام کی ترقی کا انسداد تھا، اس لیے خدا نے اس کو غرور و نمائش اور صد عن سبیل اللہ کہا۔

(۷) قرآن مجید کے بعد احادیث نبویؐ کا درجہ ہے۔ احادیث کی متعدد کتابوں میں

غزوۂ بدر کا مفصّل و مجمل ذکر ہے لیکن حضرت کعبؓ بن مالک والی حدیث کے سوا اور کسی حدیث میں یہ واقعہ میری نظر سے نہیں گزرا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدر میں قریش کے قافلۂ تجارت کے لُوٹنے کے لیے نکلے تھے۔

حضرت کعبؓ کی حدیث یہ ہے:

عن عبد اللہ بن کعب، قال کعب لم اتخلف عن رسول اللہ صلعم فی غزوۃ غزاھا الا غزوۃ تبوک غیر انی کنت تخلفت فی غزوۃ بدر ولم یعاتب احد تخلف عنھا، انما خرج النبی صلی اللہ علیہ وسلم یرید عیر قریش، حتی جمع اللہ بینہ و بینھم علی غیر میعاد۔

کعبؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر کسی غزوہ سے پیچھے نہیں رہا، بجز غزوۂ تبوک کے، اور ہاں غزوۂ بدر میں بھی شریک نہ تھا، اور جو اس میں شریک نہ ہوا اُس پر کچھ عتاب نہیں ہوا، کیوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے قافلہ کے لیے نکلے تھے کہ خدا نے دونوں فریق کو اچانک مقابل کر دیا۔

اس کے برخلاف حضرت انسؓ کی حدیث ہے جو صحیح مسلم میں ہے:

۱۔ عن انس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شاور حین بلغہ اقبال ابی سفیان قال فتکلم ابوبکر فاعرض عنہ ثم تکلم عمر فاعرض عنہ فقام سعد بن عبادۃ فقال ایانا ترید یا رسول اللہ

۱۔ انسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ابوسفیان کے آنے کی خبر معلوم ہوئی تو آپ نے توجہ نہ فرمائی، پھر حضرت ابوبکرؓ بولے تو آپؐ نے توجہ نہ فرمائی، پھر حضرت عمرؓ بولے آپؐ نے اُن کی طرف

وَالّذی نفسی بیدہ لو امرتنا ان نخیضها البحر لاخضناها۔ ولو امرتنا ان نضرب اکبادها الی برک الغماد لفعلنا قال فندب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم الناس فانطلقوا حتی نزلوا بدرا،

بھی توجہ نہ کی، پھر حضرت سعد بن عبادہ رضی کھڑے ہوئے اور کہا یا رسول اللہ! کیا آپ کا روئے خطاب ہم انصار کی طرف ہے؟ خدا کی قسم اگر دریا میں سواری ڈالنے کا آپ حکم دیں تو ہم ڈال دینگے، اور اگر برک الغماد تک جانے کا حکم دیں گے تو ہم کرینگے حضرت انس رض کہتے ہیں کہ اس کے بعد آپ نے لوگوں کو شرکت جنگ کی دعوت دی، لوگ چل پڑے اور بدر پر اترے۔

٢- ووردت علیهم روایا قریش وفیهم غلام اسود لبنی الحجاج فاخذوہ فکان اصحاب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم یسألونہ عن ابی سفیان و اصحابہ فیقول مالی علم بابی سفیان ولکن هذا ابوجهل وعتبة وشیبة وامیة بن خلف فاذا قال ذالک ضربوہ فقال نعم انا اخبرکم هذا ابوسفیان فاذا ترکوہ فسألوہ فقال مالی بابی سفیان علم ولکن هذا ابوجهل وعتبہ

٢- اور پہلے قریش کا ہراول آکر اترا، اس میں بنی حجاج کا ایک حبشی غلام تھا مسلمانوں نے اس کو گرفتار کرلیا، اور اس سے ابوسفیان کا حال پوچھنے لگے، وہ کہتا تھا مجھے ابوسفیان کی خبر نہیں لیکن یہ ابوجہل، عتبہ، شیبہ، اُمیہ بن خلف آرہے ہیں، جب وہ یہ کہتا تو لوگ اس کو مارتے، وہ کہتا اچھا ابوسفیان کو بتاتا ہوں، تب اس کو چھوڑ دیتے، تو پھر پوچھتے تو وہ کہتا مجھ کو ابوسفیان کی خبر نہیں لیکن ابوجہل، عتبہ، شیبہ، امیہ بن خلف رؤسائے قریش آرہے ہیں لیکن جب وہ یہ کہتا تب

وشیبة وامیة بن خلف فی الناس فاذا قال ھذا ایضًا ضربوہ ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم یصلّی ولمّا رای ذلك انصرف قال والذی نفسی بیدہ لتضربوہ اذا صدقکم وتترکوہ اذا کذبکم، (صحیح مسلم باب غزوہ بدر)

اس کو مارتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں مشغول تھے۔ آپؐ نے یہ دیکھ کر فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے جب وہ سچ کہتا ہے تو تم اس کو مارتے ہو، اور جب جھوٹ بولتا ہے تو چھوڑ دیتے ہو۔

حدیث کے پہلے ٹکڑے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب ابوسفیان کے آنے کا حال معلوم ہوا اُسی وقت آپؐ نے مہاجرین وانصار سے مشورہ کیا اور انصار سے اعانت کی خواہش کی، اور یہ متفقًا ثابت ہے کہ ابوسفیان کی آمد کا حال مدینہ ہی میں معلوم ہو چکا تھا۔ اس بنا پر یہ محقق طور پر ثابت ہو گیا کہ اس غزوہ کی شرکت کے لیے آپؐ نے انصار سے مدینہ ہی میں خواہش کی تھی۔ ورنہ اگر باہر نکل کر یہ معاملہ پیش آتا جیسا کہ کتب سیرت میں مذکور ہے تو اس وقت انصار وہاں کہاں ہوتے؟ اور نیز اسی ٹکڑے میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے مشورہ کے بعد لوگوں کو شرکت کی دعوت دی۔ حالانکہ ارباب سیر کے مطابق واقع یہ ہونا چاہیے کہ انصار معاہدہ اور معمولِ سابق کے خلاف شرکت کے لیے نکلے! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے پھر ان کا عندیہ دریافت فرمایا! اور اس کے بعد شرکت کے لیے آمادہ کیا! ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ ایک مجنونانہ بات ہے۔

حدیث کے دوسرے ٹکڑے سے بہ وضاحت تمام محقق ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کو وحی کے ذریعے سے یا کسی اور طریقہ سے یہ پہلے ہی معلوم تھا کہ تجارتی قافلہ کا نہیں بلکہ جنگی فوج کا مقابلہ ہے، گو عام لوگوں کو یہ معلوم نہ ہو۔

اس حدیث میں ایک گرہ اور کھولنا ہے۔ اگر پہلے صرف ابوسفیان کا آنا معلوم ہوا تھا اور قریش کے حملے کی خبر نہ تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس اصرار اور سروسامان سے کیوں اجتماع کا اہتمام فرماتے؟ اس لیے ابوسفیان کی آمد کے بجائے موقع کا اقتضایہ ہے کہ یہ ہو کہ "جب مشرکین مکہ کی آمد کی خبر معلوم ہوئی" چنانچہ اسی واقعہ کو ان ہی الفاظ کے ساتھ امام احمد بن حنبل نے مسند[1] میں، ابن ابی شیبہ نے مصنف[2] میں، ابن جریر نے تاریخ میں[3] اور بیہقی نے دلائل میں روایت کیا ہے اور اس کو "صحیح" کہا ہے اور اس کے راوی معرکۂ بدر کے ہیرو اسد اللہ علیؓ بن ابی طالب ہیں:

عن علی قال لما قدمنا المدینۃ اصبنا من ثمارھا فاجتویناھا واصابنا بھا وعک وکان النبی صلعم یتخبر عن بدر فلما بلغنا ان المشرکین قد اقبلوا سار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی بدر وبدر بئر فسبقنا المشرکین الیھا۔ (اس کے بعد بدر کے تمام واقعات و جزئیات مذکور ہیں)۔	حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جب ہم مدینہ آئے تو وہاں پھل کھانے کو ملے جو ہمارے ناموافق مزاج تھے، اس لیے ہم لوگ بیمار ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدر کو پوچھا کرتے تھے، جب ہم کو خبر ملی کہ مشرکین آرہے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بدر کو چلے۔ بدر ایک کنویں کا نام ہے، جہاں ہم مشرکین سے پہلے پہنچ گئے۔

اس میں صاف تصریح ہے کہ مشرکینِ مکہ کے حملے کی خبر سن کر آپؐ نکلے تھے اور

---

[1] جلد اول صفحہ ۱۱۷، [2] منتخب کنز العمال غزوۂ بدر [3] جلد ۳ صفحہ ۱۲۸۹۔

بدر آکر قیام فرمایا تھا۔ اس پوری حدیث میں ابوسفیان کے قافلۂ تجارت کا ذکر تک نہیں ہے)۔

ان قطعی نصوص کے بعد اگرچہ کسی اور استدلال کی ضرورت نہیں۔ لیکن لِیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ کے طور پر واقعاتِ ذیل پر لحاظ کرنا چاہیے:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پہلے قریش کے قافلوں پر حملہ کرنے کے لیے جس قدر سرایا بھیجے اور جن میں بیس تیس آدمی سے لے کر سو سو، دو دو سو تک کی جمعیت تھی۔ ان میں کسی انصاری کو نہیں بھیجا۔ ارباب سیر اس خاص امر کو بہ تصریح لکھتے ہیں اور اس تصریح کی اس لیے ضرورت سمجھتے ہیں کہ انصار نے بیعت کے وقت مدینہ سے باہر نکلنے کا اقرار نہیں کیا تھا۔ اس بنا پر اگر اس دفعہ بھی مدینہ سے نکلنے کے وقت صرف قافلۂ تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو انصار ساتھ نہ ہوتے، حالانکہ اس واقعہ میں انصار کی تعداد مہاجرین سے زیادہ تھی یعنی کل فوج ۳۰۵ تھی، جن میں ۸۴ مہاجرین اور باقی سب انصار تھے۔

یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ جس وقت مدینہ سے آپؐ نکلے یہ خبر آچکی تھی کہ قریش مدینہ پر آرہے ہیں، اسی بنا پر آپؐ نے انصار کو مخاطب کیا کیونکہ معاہدۂ بیعت کے موافق اب انصار سے کام لینے کا وقت آچکا تھا۔

(۲) مکہ سے جو قافلہ تجارت کے لیے شام کو جایا کرتا تھا، مدینہ کے پاس سے ہو کر گزرتا تھا۔ مدینہ سے مکہ تک جس قدر قبائل آباد تھے عموماً قریش کے زیر اثر تھے۔ بخلاف اس کے مدینہ سے شام تک کے حدود تک قریش کا اثر نہ تھا۔ اس بنا پر اگر کاروانِ تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو شام کی طرف بڑھنا تھا، یہ بالکل خلاف قیاس ہے کہ کاروانِ تجارت شام سے آرہا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہو چکی ہے اور آپؐ بجائے اس کے کہ شام کی طرف بڑھیں مکہ کی

طرف جاتے ہیں اور پانچ منزل مکہ کی طرف جا کر خبر آتی ہے کہ قافلہ بچ کر نکل گیا اور قریش سے جنگ پیش آجاتی ہے۔

(۳) واقعات کی ترتیب یہ ہے:

۱۔ قریش نے عبداللہ بن اُبی کو خط لکھا کہ "محمدؐ اور ان کے رفقا کو مدینہ سے نکال دو، ورنہ ہم مدینہ آکر تم کو بھی برباد کردیں گے۔" (بحوالہ سنن ابی داؤد اُوپر گزر چکا)۔

۲۔ ابوجہل نے سعد بن معاذ سے کہا کہ تم نے ہمارے مجرموں کو پناہ دی ہے، اگر امیہؓ کی ضمانت نہ ہوتی تو میں تم کو قتل کردیتا۔

۳۔ کرز بن جابر نے جمادی الثانی ۲ھ میں مدینہ کی چراگاہ پر حملہ کیا۔ اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اونٹ لوٹ لیے۔

۴۔ اس کے بعد ہی رجب ۲ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن جحش کو تجسس کے لیے بھیجا کہ قریش کی نقل و حرکت کی خبر لائیں۔

۵۔ عبداللہ بن جحش نے (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کے خلاف) قریش کا ایک مختصر سا قافلہ لوٹ لیا اور ایک آدمی قتل اور دو اسیر کیے۔

قریش نے مکہ میں جو کچھ مسلمانوں کے ساتھ کیا تھا اس کو پیش نظر رکھو، پھر یہ خیال کرو کہ اُن کا جوش انتقام کسی طرح کم نہیں ہوتا اور وہ عبداللہ بن اُبی کو لکھتے ہیں کہ ہم مدینہ آکر تم کو اور محمد دونوں کو فنا کردیں گے۔ کرز فہری مدینہ پر چھاپہ مارتا ہے، اسی اثنا میں قریش کا اشتعال اس سے اور بڑھ جاتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن جحشؓ نے ان کا قافلہ لوٹ لیا اور ان کے دو معزز خاندان کے ممبر اسیر کرلیے، ان تمام باتوں کے ساتھ قریش صبر کرتے ہیں اور کسی قسم کے انتقام کا ارادہ نہیں کرتے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے قافلے کو جس میں مکہ کی

کل کائنات بھی لوٹنے کے لیے نکلتے ہیں، تب مجبوراً اُن کو مدافعت کے لیے نکلنا پڑتا ہے، اس پر بھی بدر کے قریب پہنچ کر جب اُن کو معلوم ہوتا ہے کہ قافلہ بچ نکل گیا تو اُن کے بڑے بڑے سردار اور خود عتبہ جو سالارِ لشکر تھا رائے دیتا ہے کہ اب لڑنے کی ضرورت نہیں، واپس چلنا چاہیے۔ کیا واقعات کا یہ نقشہ قریش کے جوشِ عداوت اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شانِ نبوت کے موافق ہے؟

(۴) اربابِ سیر عموماً لکھتے ہیں کہ "جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں صحابہؓ کو کاروانِ تجارت پر حملہ کرنے کی ترغیب دی تو لوگوں نے چنداں مستعدی ظاہر نہیں کی۔ کیونکہ لوگ سمجھے کہ کوئی مہم اور معرکہ وجہاد نہیں ہے بلکہ صرف تحصیلِ غنیمت ہے۔ اس لیے جن لوگوں کو مال کی حاجت تھی وہ گئے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انصار میں جس قدر اعیانِ قوم اور سرِ لشکر تھے، سب گئے۔ زر و مال کے محتاج اگر تھے تو مہاجرین تھے لیکن جانے والوں میں انصار کی تعداد مہاجرین سے دُگنی تگنی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے استمزاج کے جواب میں جن لوگوں نے جاں نثارانہ فقرے کہے تھے، مہاجرین میں حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ و مقدادؓ تھے، اور انصار میں حضرت سعدؓ بن عبادہؓ تھے۔ حضرت سعدؓ بن عبادہ غزوۂ بدر میں شریک نہ ہوسکے تھے اور مدینہ سے باہر نہیں جاسکے تھے اس لیے قطعاً یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ حضرت سعدؓ نے یہ جواب مدینہ ہی میں دیا تھا کہ وہیں قریش کے حملے کا حال معلوم ہوگیا تھا اور اس لیے یہ قطعی ہے کہ مدینہ ہی میں اس بات کی ضرورت پیش آئی تھی کہ انصار کا استمزاج لیا جائے۔

۸۔ عام اربابِ سیر، بلکہ احادیث کی کتابوں میں بھی منقول ہے کہ غزوۂ بدر

لہ صحیح مسلم و صحیح بخاری غزوۂ بدر۔

میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو چلنے کی ترغیب دی تو کچھ لوگ آمادہ نہ ہوئے اور کسمسائے، جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ جانتے تھے کہ جہاد یا غزوہ نہیں ہے صرف قافلے کا مال لوٹنا ہے، اس لیے یہ اپنی مرضی پر موقوف ہے جس کا جی چاہے جائے جس کا جی چاہے نہ جائے، طبری میں ہے:

قالوا لما سمع رسول اللہ صلی اللہ	لوگوں نے بیان کیا ہے کہ جب آنحضرت
علیہ وسلم بابی سفیان مقبلا	صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسفیان کا
من الشام ندب المسلمین	شام سے روانہ ہونا سنا تو مسلمانوں
الیھم وقال ھذہ عیر	کو بلایا اور فرمایا کہ قریش کا قافلہ
قریش فیھا اموالھم فاخرجوا	آرہا ہے، جس میں ان کا مال ہے، چلو
الیھا لعل اللہ ان ینفلکموھا	شاید خدا تم کو اس میں سے مالِ غنیمت
فانتدب الناس فخف بعضھم	دلوائے، لوگ آمادہ ہوئے لیکن بعضوں
وثقل بعضھم وذلک انھم	نے پہلو تہی کی، کیونکہ وہ سمجھے کہ آنحضرت
لم یظنوا ان رسول اللہ یلقی	صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی لڑائی تو
حربا (صفحہ ۱۲۹۲)	پیش نہیں آئے گی۔

لیکن یہ واقعات صریح آیاتِ قرآنی کے خلاف ہیں، قرآن مجید میں بہ تصریح موجود ہے کہ جو لوگ مدینہ سے نکلتے ہوئے کسمساتے تھے، وہ عدمِ ضرورت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ ان کو یہ نظر آتا تھا کہ موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔

وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ	اور مسلمانوں کا ایک فریق نکلنے سے
لَکٰرِھُوْنَ یُجَادِلُوْنَکَ فِی الْحَقِّ	ناراض تھا، وہ تجھ سے حق کے متعلق جھگڑتا
بَعْدَ مَا تَبَیَّنَ کَاَنَّمَا یُسَاقُوْنَ	تھا، بعد اس کے کہ حق ظاہر ہو گیا تھا،
اِلَی الْمَوْتِ، (انفال-۱)	وہ گویا موت کی طرف ہنکائے جا رہے ہیں۔

(۶) تمام کتب احادیث اور سیر میں تصریح ہے کہ مدینہ منورہ سے ایک میل چل کر (مقام بیرابی عنبہ میں) آپ نے فوج کا جائزہ لیا اور حضرت عبداللہؓ بن عمر وغیرہ اس بنا پر واپس بھیج دیے گئے کہ اُن کی عمریں پندرہ برس سے کم تھیں، یا یہ کہ سن بلوغ کو نہیں پہنچے تھے۔ اگر صرف قافلے کا لوٹنا مقصود ہوتا تو یہ کام نوخیز نوجوان زیادہ خوبی سے انجام دے سکتے ہیں لیکن چونکہ واقع میں **جہاد** مقصود تھا جو ایک فریضۂ الٰہی ہے، اور اس کے لیے بلوغ کی قید ہے اس لیے نابالغ لوگ واپس کر دیے گئے کہ ابھی اس کے اہل نہیں۔

(۷) حافظ ابن عبدالبر نے استیعاب[۱] میں روایت کی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو قافلۂ قریش پر حملہ کرنے کی ترغیب دی تو خثیمہؓ نے جو ایک انصاری تھے اپنے بیٹے سعدؓ سے کہا کہ مجھے جانے دو، اور تم یہاں مستورات کی خبر گیری کرو۔ سعدؓ نے کہا "حضور! اگر کوئی اور موقع ہوتا تو ضرور میں آپ کو اپنے اوپر ترجیح دیتا۔ لیکن یہ شہادت کا درجہ ہے میں اس کو کیونکر چھوڑ سکتا ہوں"۔ چنانچہ قرعہ اندازی ہوئی اور سعدؓ کے نام قرعہ نکلا، **سعدؓ** شریک جنگ ہو کر شہید ہوئے۔

اس سے صاف ثابت ہے کہ قافلہ لوٹنا نہیں بلکہ **جہاد** پیشِ نظر تھا، اور لوگوں کو دولت شہادت کے حاصل ہونے کی آرزو ہے۔

غزوۂ بدر کا اصلی سبب عرب کا خاصۂ قومی تھا کہ جب کسی قبیلے کا کوئی آدمی کسی طریقہ سے کسی کے ہاتھ سے قتل ہو جاتا تھا تو ایک سخت ہنگامہ کارزار قائم ہو جاتا تھا۔ دونوں طرف ٹڈی دل اُمنڈ آتا تھا اور خون کی ندیاں بہ جاتی تھیں۔ یہ

---

[۱] استیعاب تذکرۂ سعدؓ بن خثیمہ، اصابہ اور طبقات میں یہ واقعہ بہ اختلاف الفاظ منقول ہے۔

لڑائیاں مدتوں تک قائم رہتی تھیں۔ قبیلے کے قبیلے کٹ جاتے تھے، تاہم یہ سلسلہ بند نہیں ہوتا تھا۔ عرب لکھے پڑھے نہ تھے تاہم مقتول کا نام کاغذ پر درج ہوکر خاندان میں وراثۃً چلا آتا تھا۔ بچوں کو یہ نام یاد کرایا جاتا تھا کہ بڑے ہوکر اس خون کا انتقام لینا ہے۔ داحس اور بسوس کی قیامت خیز لڑائیاں جو چالیس چالیس برس قائم رہیں اور جن میں ہزاروں لاکھوں جانیں برباد ہوگئیں، اسی بنا پر ہوئیں۔ عربی زبان میں اس انتقام کو **ثار** کہتے ہیں، اور یہ عرب کی قومی تاریخ کا سب سے بڑا اہم لفظ ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں حضرت عبداللہ بن جحش کے واقعہ میں عمرو بن حضرمی قتل کردیا گیا تھا حضرمی عتبہ بن ربیعہ کا حلیف تھا جو تمام قریش کا سردار تھا۔ بدر اور تمام غزوات کا سلسلہ اسی خون کا انتقام تھا، عروہ بن زبیر حضرت عائشہ رضؓ کے بھانجے نے اس واقعہ کو بتصریح بیان کیا ہے:

وکان الذی هاج وقعة	جس چیز نے غزوہ بدر اور دیگر وہ
بدر وسائر الحروب التی	تمام لڑائیاں برپا کیں جو آنحضرت
کانت بین رسول الله صلی الله	صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرکین عرب
علیه وسلم وبین مشرکی قریش	کے درمیان واقع ہوئیں، وہ جیسا کہ
فیما قال عروة بن الزبیر	عروہ بن زبیر کا بیان ہے، عمرو
ما کان من قتل واقد[1] بن	بن حضرمی کا قتل کیا جانا ہے جس

[1] عبداللہ بن جحش جن کی سرداری میں یہ قتل واقع ہوا، حضرت حمزہ رضؓ کے بھانجے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ماموں زاد کے بھائی تھے، قاتل یعنی واقد بن عبداللہ حضرت عمر رضؓ کے خاندان کے حلیف تھے اور حضرت عمر رضؓ کے آغاز خلافت تک زندہ رہے، دیکھو طبقات ابن سعد ذکر عبداللہ بن جحش و واقد بن عبداللہ۔

عبداللہ التمیمی عمرو بن الحضرمیؓ کو واقد بن عبداللہ تمیمی نے قتل کر دیا تھا۔ (تاریخ طبری ص ۱۲۸۴)

ایک عام غلطی جس نے واقعہ بحث طلب میں غلطی پیدا کر دی ہے، یہ ہے کہ سب سے پہلے جو لڑائی کفار سے ہوئی وہ **بدر** تھی۔ حالانکہ بدر سے پہلے لڑائیاں شروع ہو چکی تھیں۔ **عروہ** بن الزبیر نے غزوۂ بدر کے متعلق عبدالملک کو جو خط لکھا تھا اُس کے ابتدائی فقرے یہ ہیں:

ان ابا سفیان بن حرب اقبل	ابوسفیان بن حرب تقریباً ستر سوار
من الشام فی قریب من	کے ساتھ شام سے آ رہا تھا جو کل
سبعین راکبا من قبائل	کے کل قریشی تھے، آنحضرت صلی اللہ
قریش فذکروا الرسول اللہ	علیہ وسلم اور صحابہ سے اس کا تذکرہ
صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ و	ہوا، اور دونوں فریق میں لڑائی
قد کان الحرب بینھم	شروع ہو چکی تھی، اور اُدھر کے
فقتلت قتلیٰ وقتل ابن الحضرمی	چند لوگ جن میں ابن حضرمی بھی
فی اناس بنخلۃ واسرت	تھا، مارے جا چکے تھے اور کچھ قید
اساری من قریش	بھی ہو چکے تھے ....
وکانت تلک الوقعۃ ھاجت	.... اور اسی واقعہ نے آنحضرت
الحرب بین رسول اللہ صلی اللہ	صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش میں
علیہ وسلم و بین قریش واول ما	جنگ برپا کر دی تھی اور یہی سب سے
اصاب بہ بعضھم بعضاً	پہلا واقعہ تھا جس میں دونوں فریق
من الحرب وذلک قبل	نے ایک دوسرے کو صدمہ پہنچایا،
مخرج ابی سفیان واصحابہ	اور یہ لڑائی ابوسفیان کی روانگی شام

الی الشام۔ (طبری صفحہ ۱۲۸۵) سے پہلے وقوع میں آچکی تھی۔

اس میں تصریح ہے کہ ابوسفیان جب شام کو روانہ بھی نہیں ہُوا تھا، اُسی وقت لڑائی شروع ہو چکی تھی، غزوۂ بدر ابوسفیان کی واپسیِ شام کے بعد واقع ہُوا ہے۔

اصلیتِ واقعہ کی تحقیق کا سب سے بڑا اصلی ذریعہ یہ ہے کہ خود حریفانِ جنگ کی شہادت بہم پہنچائی جائے۔ اس قسم کی شہادتیں بہت کم ہاتھ آسکتی ہیں لیکن خوش قسمتی سے یہاں اس قسم کی شہادت موجود ہے۔ حضرت حکیمؓ بن حزام (حضرت خدیجہ رضؓ کے بھتیجے) غزوۂ بدر میں شریک تھے اور اس وقت تک کافر تھے۔ وہ عمر میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پانچ برس بڑے تھے، اور گو زمانہ جاہلیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہایت محبت رکھتے تھے اور نبوت کے بعد بھی یہ محبت قائم رہی۔ تاہم فتحِ مکہ تک ایمان نہیں لائے۔ وہ رؤسائے قریش میں تھے۔ حرم کا ایک بڑا منصب یعنی رفادہ ان ہی کے ہاتھ میں تھا۔ دار الندوہ کے مہتمم اور مالک بھی وہی تھے، وہ مروان بن حکم کے زمانۂ خلافت تک زندہ رہے ایک دفعہ وہ مروان سے ملنے گئے، مروان نے نہایت تعظیم و تکریم کی۔ صدرِ مجلس سے اُٹھ کر ان کے پاس آبیٹھا، اور کہا بدر کا واقعہ بیان کیجیے۔ اُنھوں نے واقعہ کے ابتدائی حالات بیان کر کے کہا کہ جب ہماری فوجیں میدان میں اُتریں تو میں عتبہ کے پاس گیا اور میں نے اس سے یہ کہا :

یا ابا الولید ھل لک ان تذھب بشرف ھذا الیوم ما بقیت۔	اے ابوالولید! کیا تم چاہتے ہو کہ تمام عمر کے لیے ساری نیک نامی تم ہی کو

لہ اصابہ تذکرۂ حکیمؓ بن حزام۔

قالَ افعل ماذا؟ قلت انکم لا تطلبون من محمد الادم ابن الحضرمی وھو حلیفک فتحمل دیتہ فترجع بالناس[۱]

ہاتھ آئے؟ عتبہ نے کہا کیونکر؟ میں نے کہا، تم (یعنی قریش) محمد سے ابن حضرمی کے خون کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے اور وہ تمہارا حلیف تھا، اس لیے تم اس کا خونبہا ادا کر دو کہ سب لوگ واپس چلے جائیں۔

عتبہ نے یہ تجویز پسند کی، لیکن ابوجہل نے نہ مانا، اور حضرمی کے بھائی عامر حضرمی کو بلا کر کہا، خون کا بدلہ سامنے ہے، کھڑے ہو کر قوم سے دہائی دو، عامر عرب کے دستور کے موافق ننگا ہو گیا اور پکارا[۲]

واعمراہ واعمراہ - ہائے عمر (حضرمی) ہائے عمر!

آغاز جنگ کے وقت سب سے پہلے جو شخص میدانِ جنگ میں نکلا، وہ یہی عامر حضرمی تھا۔

حکیم بن حزام اور عامر حضرمی غزوۂ بدر تک کافر تھے۔ عتبہ و ابوجہل جو سردارانِ قریش تھے، کفر پر تادم مرگ قائم رہے۔ اگر اس درجہ کے لوگ غزوۂ بدر کو حضرمی کے خون کا انتقام سمجھتے تھے اور سمجھتے رہے، تو ہم کو کچھ پروا نہیں کرنی چاہیے کہ اوروں نے جو اس کے سیکڑوں برس بعد پیدا ہوئے، اس کا سبب قافلۂ تجارت کا بچانا سمجھا، وشتان بینہما۔

ایک ضروری نکتہ گو یہ امر اب قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ غزوۂ بدر کا سبب کاروانِ تجارت پر حملہ کرنا نہ تھا، تاہم اس گرہ کا کھولنا ضرور ہے کہ ایسے صاف اور صریح

---

[۱] طبری صفحہ ۱۳۱۳ (و سیرۃ ابن ہشام بمضاہ ذکر غزوۂ بدر) "س"

[۲] پوری تفصیل طبری صفحہ ۱۳۱۴ تا ۱۳۱۶ میں ہے۔

واقعہ کے متعلق تمام ارباب سیر نے متفقاً کیوں غلطی کی؟ اور صحیح بخاری وغیرہ میں یہ تصریحات کیوں پائی جاتی ہیں کہ بدر کی ابتدا قافلہ ہی پر حملہ کرنے کی غرض سے ہوئی تھی۔

اصل یہ ہے کہ اصول جنگ کے موافق، اکثر غزوات میں یہ ظاہر نہیں کیا جاتا تھا کہ کدھر جانا اور کس غرض سے جانا مقصود ہے؟ صحیح بخاری (غزوہ تبوک) میں حضرت کعبؓ بن مالک جو مشہور صحابی ہیں، اُن کا قول نقل کیا ہے:

ولم یکن رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم یرید غزوۃ الا ورّیٰ بغیرھا،	اور آنحضرت صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم جب کسی غزوہ کا ارادہ فرماتے تھے تو کسی اور موقع کا توریہ فرماتے تھے۔

"توریہ" کے معنی شارحین بخاری نے یہ لکھے ہیں کہ "آپؐ ایسے موقع پر مبہم اور محتمل المعنیین الفاظ استعمال فرماتے تھے"۔ گو میرے نزدیک یہ کلیہ اس معنی میں صحیح نہیں۔ تاہم واقعات کے استقصا سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ بعض موقعوں پر واقعہ اس طرح مبہم رکھا جاتا تھا کہ لوگ مختلف قیاس پیدا کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ جنگ بدر میں سعدؓ بن خثیمہ کو پہلے ہی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ قافلہ نہیں بلکہ فوج کا مقابلہ ہے۔ بخلاف اس کے صحیح بخاری میں ان ہی کعبؓ بن مالک کا قول منقول ہے کہ بدر میں صرف قافلہ سے تعرض کرنا مقصود تھا۔

دیباچہ میں ہم لکھ آئے ہیں کہ راوی (جس میں صحابہؓ بھی داخل ہیں) بہت سے موقعوں پر جو واقعہ بیان کرتا ہے، وہ حقیقت میں واقعہ نہیں بلکہ اُس کا استنباط ہوتا ہے، یعنی اس نے اس کو یوں ہی سمجھا۔ بدر میں بھی یہی صورت پیش آئی اور اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ صحابہؓ نے مختلف قیاس کیے اور جو قیاس مذاق عام کے مناسب تھا وہی پھیل گیا۔

بدر کے نتائج | بدر کے معرکے نے مذہبی اور ملکی حالت پر گوناگوں اثرات پیدا کیے، اور حقیقت میں یہ اسلام کی ترقی کا قدم اولین تھا۔ قریش کے تمام بڑے بڑے رؤسا جن میں سے ایک ایک اسلام کی ترقی کی راہ میں سدِ آہن تھا، فنا ہو گئے۔ عتبہ اور ابوجہل کی موت نے قریش کی ریاستِ عامہ کا تاج ابوسفیان کے سر پر رکھا، جس سے دولتِ اموی کا آغاز ہوا۔ لیکن قریش کے اصلی زور و طاقت کا معیار گھٹ گیا۔

مدینہ میں اب تک عبداللہ بن ابی بن سلول علانیہ کافر تھا، لیکن اب بظاہر وہ اسلام کے دائرے میں آ گیا۔ گو تمام عمر منافق رہا اور اسی حالت میں جان دی، قبائلِ عرب جو سلسلۂ واقعات کا رُخ دیکھتے تھے۔ اگرچہ رام نہیں ہوئے، لیکن سہم گئے۔

ان موافق حالات کے ساتھ مخالف اسباب میں بھی انقلاب شروع ہو گیا، یہود سے معاہدہ ہو چکا تھا کہ وہ ہر معاملہ میں یک سُو رہیں گے، لیکن اس فتحِ نمایاں نے اُن میں حسد کی آگ بھڑکا دی اور وہ اس کو ضبط نہ کر سکے۔ چنانچہ اس کی تفصیل یہودیوں کے واقعات میں بالتفصیل آتی ہے۔

قریش کو پہلے صرف حضرمی کا رونا تھا، بدر کے بعد ہر گھر ماتم کدہ تھا، اور مقتولین بدر کے انتقام کے لیے مکہ کا بچہ بچہ مضطر تھا۔ چنانچہ سویق کا واقعہ اور اُحُد کا معرکہ اسی جوش کا مظہر تھا۔

غزوۂ سویق، ذی الحجہ سنہ ۲ ھ | **ابوسفیان** اب قریش کا رئیس تھا، اور اس منصب کا سب سے بڑا فرض، غزوۂ بدر کا انتقام تھا۔ اُس نے بدر سے مشرکین کی واپسی پر منت مانی تھی کہ جب تک مقتولانِ بدر کا انتقام نہ لے گا، نہ غسل جنابت کریگا نہ سر میں تیل ڈالے گا، چنانچہ دو سُو شتر سواروں کے ساتھ مدینہ پر بڑھا، یہود کی

نسبت معلوم تھا کہ وہ مسلمانوں کے مقابلے میں مدد دیں گے؛ اس لیے پہلے حیی ابن اخطب کے پاس گیا، لیکن اُس نے دروازہ نہ کھولا، مایوس ہوکر سلام بن مشکم کے پاس آیا، وہ یہود بنونضیر کا سردار تھا، اور تجارتی خزانہ اسی کے زیر اہتمام رہتا تھا، اُس نے بڑے جوش سے استقبال کیا، خوشگوار کھانے کھلائے، شراب پلوائی، مدینہ کے مخفی راز بتائے، صبح کو ابوسفیان عُریض پر حملہ آور ہوا، جو مدینہ سے ۳ میل کے فاصلے پر ہے، ایک انصاری کو جن کا نام سعد رضؓ بن عمرو تھا قتل کیا، چند مکانات اور گھاس کے انبار جلادیے۔ ان باتوں سے اُس کے نزدیک قسم پوری ہوگئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپؐ نے تعاقب کیا۔ ابوسفیان کے پاس رسد کا سامان صرف ستو تھا۔ گھبراہٹ میں ستو کے بورے پھینکتا گیا جو مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔ عربی میں ستو کو سویق کہتے ہیں، اس لئے یہ واقعہ غزوۂ سویق کے نام سے مشہور ہے۔

حضرت فاطمہؓ زہرا کی شادی ذیحجہ ۲ھ

حضرت فاطمہ رضؓ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں میں سب سے کمسن تھیں۔ اب اُن کی عمر ۱۸ برس کی ہو چکی تھی، اور شادی کے پیغام آنے لگے تھے۔ ابنِ سعد نے روایت کی ہے کہ سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی۔ آپؐ نے فرمایا کہ جو خُدا کا حُکم ہوگا، پھر حضرت عمر رضؓ نے جرأت کی، ان کو بھی آپؐ نے کچھ جواب نہیں دیا، بلکہ وہی الفاظ فرمائے لیکن بظاہر یہ روایت صحیح نہیں معلوم ہوتی حافظ ابن حجرؒ نے اصابہ میں ابن سعد کی اکثر روایتیں حضرت فاطمہ رضؓ کے حال میں روایت کی ہیں، لیکن اس کو نظر انداز کردیا ہے۔

بہرحال حضرت علی رضؓ نے جب درخواست کی تو آپؐ نے حضرت فاطمہؓ کی مرضی دریافت کی، وہ چُپ رہیں، یہ ایک طرح کا اظہارِ رضا تھا۔ آپؐ نے حضرت علی رضؓ

سے پوچھا کہ تمھارے پاس مہر میں دینے کے لیے کیا ہے؟ بولے کچھ نہیں، آپؐ نے فرمایا" اور وہ حطمیہ زرہ کیا ہوئی (جنگِ بدر میں ہاتھ آئی تھی) عرض کی وہ تو موجود ہے آپؐ نے فرمایا بس وہ کافی ہے۔

ناظرین کو خیال ہوگا کہ بڑی قیمتی چیز ہوگی، لیکن اگر وہ اس کی مقدار جاننا چاہتے ہیں تو جواب یہ ہے کہ صرف سوا سو روپئے،[1] زرہ کے سوا اور جو کچھ حضرت علیؓ کا سرمایہ تھا وہ ایک بھیڑ کی کھال اور ایک بوسیدہ یمنی چادر تھی۔ حضرت علیؓ نے یہ سب سرمایہ حضرت فاطمہ زہراؓ کے نذر کیا۔ حضرت علیؓ اب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے پاس رہتے تھے۔ شادی کے بعد ضرورت ہوئی کہ الگ گھر کریں۔ حضرت حارثہؓ بن نعمان انصاری کے متعدد مکانات تھے، جن میں سے وہ کئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نذر کر چکے تھے۔ حضرت فاطمہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ انہی سے کوئی اور مکان دلوا دیجیے۔ آپؐ نے فرمایا کہ کہاں تک؟ اب اُن سے کہتے شرم آتی ہے۔ حضرت حارثہؓ نے سُنا تو دوڑے آئے کہ حضور میں اور میرے پاس جو کچھ ہے، سب آپؐ کا ہے۔ خدا کی قسم میرا جو مکان آپؐ لے لیتے ہیں، مجھ کو اس سے زیادہ خوشی ہوتی ہے کہ وہ میرے پاس رہ جائے۔ غرض اُنھوں نے اپنا ایک مکان خالی کر دیا۔ حضرت فاطمہؓ اس میں اٹھ گئیں۔

شہنشاہِ کونینؐ نے سیدۂ عالم کو جو جہیز دیا، وہ بان کی چارپائی، چمڑے کا گدا جس کے اندر روئی کے بجائے کھجور کے پتے تھے۔ ایک چھاگل، ایک مشک، دو چکیاں، اور دو مٹی کے گھڑے تھے۔

حضرت فاطمہؓ جب نئے گھر میں جا بسیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے

(۱؎ غلطی سے پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں سوا روپے چھپ گیا ہے اسکی تصحیح کر لی جائے۔ س)

پاس تشریف لے گئے۔ دروازے پر کھڑے ہوکر اذن مانگا، پھر اندر آئے، ایک برتن میں پانی منگوایا، دونوں ہاتھ اس میں ڈالے اور حضرت علی رضؓ کے سینے اور بازوؤں پر پانی چھڑکا (پھر حضرت فاطمہؓ کو بلایا، وہ شرم سے لڑکھڑاتی آئیں، اُن پر بھی پانی چھڑکا اور فرمایا کہ مَیں نے اپنے خاندان میں سب سے افضل شخص سے تمھارا نکاح کیا ہے[۱]

واقعاتِ متفرقہ سنہ ۲ ھ

(مورخین کے بیان کے مطابق اسی سال رمضانِ مبارک کے روزے فرض ہوئے۔

صدقہ عید الفطر کا حکم بھی اسی سال سے جاری ہوا۔ پہلے آپؐ نے ایک خطبہ دیا۔ جس میں اس صدقہ کے فضائل بیان فرمائے، پھر صدقہ کا حکم دیا۔

عید الفطر کی نماز باجماعت عیدگاہ میں بھی اسی سال ادا فرمائی، اس سے پہلے عید کی نماز نہیں ہوتی تھی۔

اربابِ سیر کی ترتیب کے مطابق غزوۂ بنی قینقاع کا ذکر بھی اسی سال کے واقعات میں ہونا چاہیے تھا، لیکن اتصال و تسلسلِ واقعہ کی بنا پر وہ آئندہ مذکور ہوگا)۔

---

[۱] یہ پوری تفصیل طبقات ابن سعد اور اصابہ سے ماخوذ ہے۔

۳ھ

غزوۂ احدؔ[1]

(وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (آل عمران)[2])

عرب میں صرف ایک شخص کا قتل لڑائی کا ایک سلسلہ چھیڑ دیتا تھا جو سیکڑوں برس تک ختم نہیں ہو سکتا تھا، طرفین میں سے جس کو شکست ہوتی تھی، وہ انتقام کو ایسا فرضِ مؤبّد جانتا تھا جس کے ادا کیے بغیر اس کی ہستی قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ بدر میں قریش کے ستر آدمی مارے گئے جن میں اکثر وہ تھے جو قریش کے تاج و افسر تھے تمام مکہ جوشِ انتقام سے لبریز تھا۔

قریش کا کاروانِ تجارت جو جنگِ بدر کے زمانے میں نفعِ کثیر کے ساتھ شام سے واپس آرہا تھا، اس کا راس المال حصہ داروں کو تقسیم کر دیا گیا تھا۔ لیکن زرِ منافع امانت کے طور پر محفوظ تھا۔

---

[1] مدینہ منورہ سے شمالی جانب قریباً ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر ایک پہاڑ کا نام ہے۔

[2] صحیح بخاری باب غزوۂ احد میں ہے کہ یہ آیت غزوۂ اُحُد میں نازل ہوئی۔

قریش کو کشتگانِ بدر کے ماتم سے فرصت ملی تو اس فرض کے ادا کا خیال آیا۔ چند سردارانِ قریش جن میں ابوجہل کا بیٹا عکرمہ بھی تھا۔ اُن لوگوں کو جن کے عزیز و اقارب جنگِ بدر میں قتل ہو چکے تھے، ساتھ لے کر ابوسفیان کے پاس گئے اور کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہماری قوم کا خاتمہ کر دیا۔ اب انتقام کا وقت ہے، ہم چاہتے ہیں کہ مالِ تجارت کا جو نفع اب تک جمع ہے، وہ اس کام میں صرف کیا جائے۔ یہ ایک ایسی درخواست تھی، جو پیش ہونے سے پہلے قبول کر لی گئی تھی۔ لیکن قریش کو اب مسلمانوں کے قوّت و زور کا اندازہ ہو چکا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ جنگِ بدر میں جس سامان سے وہ گئے تھے اُس سے اب کچھ زیادہ درکار ہے۔ عرب میں جوش پھیلانے اور دلوں کے گرمانے کا سب سے بڑا آلہ شعر تھا، قریش میں دو شاعر، شاعری میں مشہور تھے، عمرو جمحی اور مسافع، عمرو جمحی غزوۂ بدر میں گرفتار ہو گیا تھا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اقتضائے رحم سے اس کو رہا کر دیا تھا۔ قریش کی درخواست پر، وہ اور مسافع مکہ سے نکلے اور تمام قبائلِ قریش میں اپنی آتش بیانی سے آگ لگا آئے۔

لڑائیوں میں ثابت قدمی اور جوشِ جنگ کا بڑا ذریعہ خاتونانِ حرم تھیں، جس لڑائی میں خاتونیں ساتھ ہوتی تھیں، عرب جانوں پر کھیل جاتے تھے کہ شکست ہو گی تو عورتیں بے حرمت ہوں گی۔ بہت سی عورتیں ایسی تھیں جن کی اولاد جنگِ بدر میں قتل ہو چکی تھی، اس لیے وہ خود جوشِ انتقام سے لبریز تھیں اور انھوں نے منتیں مانی تھیں کہ اولاد کے قاتلوں کا خون پی کر دم لیں گے۔

غرض جب فوجیں تیار ہوئیں تو بڑے بڑے معزز گھرانوں کی عورتیں بھی فوج میں شامل ہوئیں۔ اُن میں سے بعض کے نام حسب ذیل ہیں:

---

(۱) طبری (ج ۳ ص ۳۸۶) زرقانی (ج ۲ ص ۳۰) نے ان چھ خواتین کے سوا سُلافہ بنت سعد

۱۔ ہند	عتبہ کی بیٹی اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی ماں ۔
۲۔ اُمِّ حکیم	عکرمہ (فرزند ابوجہل) کی بیوی ۔
۳۔ فاطمہ (بنت ولید)	حضرت خالدؓ کی بہن ۔
۴۔ بُرزہ	مسعود ثقفی جو طائف کا رئیس تھا، اس کی بیٹی ۔
۵۔ رئطہ	عمرو بن العاص کی زوجہ ۔
۶۔ خناس	حضرت مُصْعَبؓ بن عُمیر کی ماں ۔

حضرت حمزہ رضؓ نے ہند کے باپ عتبہ کو بدر میں قتل کیا تھا۔ جبیر بن مطعم کا چچا بھی حضرت حمزہ کے ہاتھ سے مارا گیا تھا، اس بنا پر ہند نے وحشی کو جو جبیر کا غلام اور حربہ اندازی میں کمال رکھتا تھا، حضرت حمزہ رضؓ کے قتل پر آمادہ کیا اور یہ اقرار ہوا کہ اس کارگزاری کے صلے میں وہ آزاد کر دیا جائے گا۔

حضرت عباس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا گو اسلام لا چکے تھے لیکن اب تک مکہ ہی میں مقیم تھے، اُنھوں نے تمام حالات لکھ کر ایک تیز رو قاصد کے ہاتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجے اور قاصد کو تاکید کی کہ تین رات دن میں مدینہ پہنچ جائے ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبریں پہنچیں تو آپؐ نے پانچویں شوال

(بقیہ حاشیہ ص۳۷۵) وعمیرہ بنت علقمہ دو اور خاتونوں کا ذکر کیا ہے، ان میں خناس اور عمیرہ کے سوا باقی خواتین بعد کو مسلمان ہوگئیں۔ خناس اور عمیرہ کے اسلام کے متعلق کچھ معلوم نہیں ۔

(زرقانی علی المواہب) "س"

۳ھ کو دو خبر رساں جن کے نام انس اور مونس تھے، خبر لانے کے لیے بھیجے انھوں نے آکر اطلاع دی کہ قریش کا لشکر مدینہ کے قریب آگیا اور مدینہ کی چراگاہ (عریض) کو اُن کے گھوڑوں نے صاف کر دیا۔

آپؐ نے حبابؓ بن منذر کو بھیجا کہ فوج کی تعداد کی خبر لائیں، انھوں نے آکر صحیح تخمینہ سے اطلاع دی۔ چونکہ شہر پر حملے کا اندیشہ تھا، ہر طرف پہرے بٹھا دیے گئے۔ حضرت سعدؓ ابن عبادہ اور حضرت سعدؓ بن معاذ ہتھیار لگا کر تمام رات مسجد نبویؐ کے دروازے پر پہرہ دیتے رہے۔

صبح کو آپؐ نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ مہاجرین نے عموماً اور انصار میں سے اکابر نے رائے دی کہ عورتیں باہر قلعوں میں بھیج دی جائیں اور شہر میں پناہ گیر ہو کر مقابلہ کیا جائے۔ عبداللہ بن ابی بن سلول جو اب تک کبھی شریکِ مشورہ نہیں کیا گیا تھا، اس نے بھی یہی رائے دی۔ لیکن اُن نوخیز صحابہ نے جو جنگِ بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے، اس بات پر اصرار کیا کہ شہر سے نکل کر حملہ کیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لے گئے، اور زرہ پہن کر باہر تشریف لائے۔ اب لوگوں کو ندامت ہوئی کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خلافِ مرضی نکلنے پر مجبور کیا، سب نے عرض کی کہ ہم اپنی رائے سے باز آتے ہیں۔ ارشاد ہوا کہ پیغمبر کو زیبا نہیں کہ ہتھیار پہن کر اُتار دے۔

قریش بدھ کے دن مدینہ کے قریب پہنچے اور کوہِ اُحد پر پڑاؤ ڈالا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن نمازِ جمعہ پڑھ کر ایک ہزار صحابہ کے ساتھ شہر سے نکلے، عبداللہ بن اُبی تین سَو کی جمعیت لے کر آیا تھا، لیکن یہ کہہ کر واپس چلا

لہ طبری (ج ۳ ص ۱۳۸۹ مطبوعہ یورپ) س ۲ه زرقانی ج ۲ ص ۲۵) س

گیا کہ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے میری رائے نہ مانی"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اب صرف سات سو صحابہؓ رہ گئے۔ ان میں ایک سو زرہ پوش تھے۔ مدینہ سے نکل کر فوج کا جائزہ لیا گیا، اور جو لوگ کمسن تھے واپس کر دیے گئے۔ ان میں حضرت زیدؓ بن ثابت، حضرت براءؓ بن عازب، حضرت ابو سعیدؓ خدری، حضرت عبداللہؓ بن عمر اور حضرت عرابہؓ اوسی بھی تھے۔ لیکن جان نثاری کا یہ ذوق تھا کہ نوجوانوں میں سے حضرت رافعؓ بن خدیج سے کہا گیا کہ تم عمر میں چھوٹے ہو واپس جاؤ، تو وہ انگوٹھوں کے بل تن کر کھڑے ہو گئے کہ قد اونچا نظر آئے۔ چنانچہ ان کی یہ ترکیب چل گئی اور وہ لے لیے گئے۔ سمرۃ ایک نوجوان، جو ان کے ہم سن تھے، انھوں نے یہ دلیل پیش کی کہ میں رافع کو لڑائی میں پچھاڑ لیتا ہوں اس لیے اگر ان کو اجازت ملتی ہے تو مجھ کو بھی ملنی چاہیے۔ دونوں کا مقابلہ کرایا گیا اور سمرۃ نے رافعؓ کو زمین پر دے مارا، اس بنا پر ان کو اجازت مل گئی۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اُحد کو پشت پر رکھ کر صف آرائی کی حضرت مصعبؓ بن عمیر کو علم عنایت کیا۔ حضرت زبیرؓ بن العوام رسالے کے افسر مقرر ہوئے۔ حضرت حمزہؓ کو اس حصہ فوج کی کمان ملی جو زرہ پوش نہ تھے۔ پشت کی طرف احتمال تھا کہ دشمن اُدھر سے آئیں، اس لیے پچاس تیر اندازوں کا ایک

ؔ طبری جلد ۲ صفحہ ۱۳۹۱ (یہ طبری کی روایت ہے لیکن بعض دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت رافعؓ کو اجازت مل جانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس نوجوانی میں ہی تیراندازی میں کمال رکھتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ان کا یہ حال معلوم ہوا تو اُن کو شرکت کی اجازت دے دی۔ ابن ہشام ذکر غزوۂ اُحد و زرقانی ج ۲ ص ۲۹ و بدایہ ابن کثیر ج ۴ ص ۱۵ (س) ؔ ایضاً، ص ۱۳۹۴۔

دستہ متعین فرمایا اور حکم دیا کہ "گو لڑائی فتح ہو جائے تاہم وہ جگہ سے ..... نہ ہٹیں" حضرت عبداللہ بن جبیرؓ ان تیراندازوں کے افسر مقرر ہوئے

قریش کو بدر میں تجربہ ہو چکا تھا، اس لیے انھوں نے نہایت ترتیب سے صف آرائی کی۔ میمنہ پر خالد بن ولید کو مقرر کیا، میسرہ عکرمہ کو دیا جو ابوجہل کے فرزند تھے۔ سواروں کا دستہ صفوان بن اُمیہ کی کمان میں تھا، جو قریش کا مشہور رئیس تھا۔ تیراندازوں کے دستے الگ تھے، جن کا افسر عبداللہ بن ابی ربیعہ تھا۔ طلحہ علمبردار تھا۔ دو سو گھوڑے کوتل رکاب میں تھے کہ ضرورت کے وقت کام آئیں +

سب سے پہلے طبلِ جنگ کے بجائے خاتونانِ قریش دف پر اشعار پڑھتی ہوئی بڑھیں، جن میں کشتگان بدر کا ماتم اور انتقامِ خون کے رجز تھے، ہند (ابوسفیان کی بیوی) آگے آگے اور چودہ عورتیں ساتھ ساتھ تھیں، اشعار یہ تھے:

نحنُ بناتُ طارق	ہم آسمان کے تاروں کی بیٹیاں ہیں
نمشیُ علی النّمارق	ہم قالینوں پر چلنے والیاں ہیں
ان تقبلوا نعانق	اگر تم بڑھ کر لڑو گے تو ہم تم سے گلے ملیں گے
او تدبروا نفارق	اور پیچھے قدم ہٹایا تو ہم تم سے الگ ہو جائیں گے

لڑائی کا آغاز اس طرح ہوا کہ ابو عامر جو مدینہ منورہ کا ایک مقبولِ عام شخص تھا، اور مدینہ چھوڑ کر مکہ میں آباد ہو گیا تھا، ڈیڑھ سو آدمیوں کے ساتھ میدان میں آیا۔ اسلام سے پہلے زہد اور پارسائی کی بنا پر تمام مدینہ اس کی عزت کرتا تھا۔ چونکہ اُس کو خیال تھا کہ انصار جب اُس کو دیکھیں گے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ میدان میں آکر پکارا "مجھ کو پہچانتے ہو؟"

مَیں ابو عامر ہوں۔" انصار نے کہا " ہاں او بدکار! ہم تجھ کو پہچانتے ہیں، خدا تیری آرزو بر نہ لائے "

قریش کا علم بردار طلحہ صف سے نکل کر پکارا " کیوں مسلمانو! تم میں کوئی ہے، کہ یا مجھ کو جلد دوزخ میں پہنچا دے یا خود میرے ہاتھوں بہشت میں پہنچ جائے۔[1] حضرت علی رضؓ مرتضیٰ نے صف سے نکل کر کہا " مَیں ہوں " یہ کہ کر تلوار ماری اور طلحہ کی لاش زمین پر تھی۔ طلحہ کے بعد اس کے بھائی عثمان نے جس کے پیچھے پیچھے عورتیں اشعار پڑھتی آتی تھیں، علم ہاتھ میں لیا اور رجز پڑھتا ہوا حملہ آور ہوا:

اِنَّ عَلٰی اَھلِ اللِّوَاءِ حَقًّا	علم بردار کا فرض ہے کہ نیزہ کو خون
اَن تَخْضِبَ الصَّعْدَۃَ اَوْ تَنْدَقَّا	میں رنگ دے، یا وہ ٹکرا کر ٹوٹ جائے۔

حضرت حمزہ رضؓ مقابلے کو نکلے اور شانے پر تلوار ماری کہ کمر تک اُتر آئی۔ ساتھ ہی ان کی زبان سے نکلا کہ " مَیں ساقی حجاج کا بیٹا ہوں "

اب عام جنگ شروع ہو گئی۔ حضرت حمزہ رضؓ، حضرت علی رضؓ، حضرت ابو دجانہ رضؓ، فوجوں کے دل میں گھسے اور صفیں کی صفیں صاف کر دیں۔ حضرت ابو دجانہ رضؓ عرب کے مشہور پہلوان تھے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دستِ مبارک میں تلوار لے کر فرمایا، " کون اس کا حق ادا کرتا ہے " ؟ اس سعادت کے لیے دفعۃً بہت سے ہاتھ بڑھے، لیکن یہ فخر حضرت ابو دجانہ رضؓ کے نصیب میں تھا، اس غیر متوقع عزت نے اُن کو بادۂ شجاعت سے مست کر دیا۔ سر پر سرخ رومال باندھا اور اکڑتے تنتے ہوئے فوج سے نکلے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] یہ اس بات پر طنز تھا کہ مسلمان ایسا سمجھتے ہیں +

نے ارشاد فرمایا کہ "یہ چال خدا کو سخت ناپسند ہے، لیکن اس وقت پسند ہے"!
حضرت ابودجانہ رضؓ فوجوں کو چیرتے لاشوں پر لاشے گراتے بڑھتے چلے جاتے تھے، یہاں تک کہ ہند سامنے آگئی، اس کے سر پر تلوار رکھ کر اٹھا لی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار اس قابل نہیں کہ عورت پر آزمائی جائے۔
حضرت حمزہ رضؓ دو دستی تلوار مارتے جاتے تھے اور جس طرف بڑھتے تھے صفیں کی صفیں صاف ہو جاتی تھیں، اسی حالت میں سباع غبشانی سامنے آگیا، پکارے کہ "او ختانۃ النساء کے بچے! کہاں جاتا ہے"؟ یہ کہ کر تلوار ماری وہ خاک پر ڈھیر تھا۔

وحشی جو ایک حبشی غلام تھا، اور جس سے جبیر بن مطعم اُس کے آقا نے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ حمزہ کو قتل کردے تو آزاد کر دیا جائے گا، وہ حضرت حمزہ رضؓ کی تاک میں تھا۔ حضرت حمزہ رضؓ برابر آئے تو اس نے چھوٹا سا نیزہ جس کو حربہ کہتے ہیں اور جو حبشیوں کا خاص ہتھیار ہے پھینک کر مارا، جو ناف میں لگا اور پار ہو گیا۔ حضرت حمزہ رضؓ نے اس پر حملہ کرنا چاہا، لیکن لڑکھڑا کر گر پڑے اور رُوح پرواز کر گئی۔[1]

کفار کے علم بردار لڑ لڑ کر قتل ہو جاتے تھے۔ تاہم علم گرنے نہیں پاتا تھا، ایک کے گرنے سے پہلے دوسرا جانباز بڑھ کر علم کو ہاتھ میں لے لیتا تھا۔ ایک شخص نے جس کا نام صؤاب تھا، جب علم ہاتھ میں لیا تو کسی نے بڑھ کر اس زور سے تلوار ماری کہ دونوں ہاتھ ساتھ کٹ کر گر پڑے، لیکن وہ قومی علم کو اپنی آنکھوں سے خاک پر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ علم کے گرنے کے ساتھ سینہ کے بل زمین پر گرا،

---

[1] صحیح بخاری باب قتل حمزہ، صفحہ ۵۸۳۔

اور عَلم کو سینہ سے دبالیا، اسی حالت میں یہ کہتا ہُوا مارا گیا کہ "میں نے اپنا فرض ادا کر دیا"۔ عَلم دیر تک خاک پر پڑا رہا، آخر ایک بہادر خاتون (عمرہ بنت علقمہ) دلیرانہ بڑھی اور عَلم کو ہاتھ میں لے کر بلند کیا، یہ دیکھ کر ہر طرف سے قریش سمٹ آئے اور اُکھڑے ہوئے پاؤں پھر جم گئے۔

ابو عامر کفار کی طرف سے لڑ رہا تھا، لیکن اس کے بیٹے حضرت حنظلہ رضؓ اسلام لا چکے تھے، اُنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے باپ کے مقابلے میں لڑنے کی اجازت مانگی۔ لیکن رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ گوارا نہ کیا کہ بیٹا باپ پر تلوار اُٹھائے۔ حضرت حنظلہ رضؓ نے کفار کے سپہ سالار (ابو سفیان) پر حملہ کیا اور قریب تھا کہ اُن کی تلوار ابو سفیان کا فیصلہ کر دے، دفعۃً پہلو سے شداد بن الاسود نے جھپٹ کر اُن کے وار کو روکا اور اُن کو شہید کر دیا۔ تاہم لڑائی کا پلہ مسلمانوں ہی کی طرف بھاری تھا۔ علم برداروں کے قتل اور حضرت علی رضؓ اور حضرت ابو دجانہ رضؓ کے بے پناہ حملوں سے فوج کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ بہادر نازنینیں جو رجز سے دلوں کو اُبھار رہی تھیں، بدحواسی کے ساتھ پیچھے ہٹیں اور مطلع صاف ہو گیا۔ لیکن ساتھ ہی مسلمانوں نے لوٹ شروع کر دی۔ یہ دیکھ کر تیر انداز جو پُشت پر مقرر کیے گئے تھے وہ بھی غنیمت کی طرف جھکے۔

حضرت عبداللہ رضؓ بن جبیر نے بہت روکا لیکن وہ رُک[۲] نہ سکے۔ تیر اندازوں کی جگہ خالی دیکھ کر خالد نے عقب سے حملہ کیا، عبداللہ رضؓ بن جبیر چند جانبازوں کے ساتھ جم کر لڑے لیکن سب کے سب شہید ہوئے۔ اب راستہ صاف تھا، خالد نے سواروں کے دستے کے ساتھ نہایت بے جگری سے حملہ کیا۔ لوگ لوٹنے

---

[۱] ابن ہشام و طبری (ج ۳ ص ۱۴۰۱) "س"۔ [۲] صحیح بخاری غزوۂ اُحُد، صفحہ ۵۷۹،

میں مصروف تھے، مُڑ کر دیکھا تو تلواریں برس رہی ہیں۔ بدحواسی میں دونوں فوجیں اس طرح باہم مل گئیں کہ خود مسلمان مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ حضرت مصعب رضؓ بن عمیر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صورت میں مشابہ اور علم بردار تھے، ابن قمیہ نے اُن کو شہید کر دیا، اور غل مچ گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت پائی، اس آواز سے عام بدحواسی چھا گئی، بڑے بڑے دلیروں کے پاؤں اُکھڑ گئے۔

بدحواسی میں اگلی صفیں پچھلی صفوں پر ٹوٹ پڑیں اور دوست دشمن کی تمیز نہ رہی۔ حضرت حذیفہ رضؓ کے والد (یمان) اس کشمکش میں آ گئے اور ان پر تلواریں برس پڑیں۔ حضرت حذیفہ رضؓ چلاتے رہے کہ میرے باپ ہیں، لیکن کون سُنتا تھا۔ غرض وہ شہید ہو گئے، اور حضرت حذیفہ رضؓ نے ایثار کے لہجے میں کہا، "مسلمانو! خدا تم کو بخش دے"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مڑ کر دیکھا تو صرف گیارہ جاں نثار پہلو میں ہیں جن میں حضرت علی مرتضیٰ رضؓ، حضرت ابوبکر رضؓ، حضرت سعد بن ابی وقاص رضؓ، حضرت زبیر رضؓ بن العوام، حضرت ابودجانہ رضؓ، حضرت طلحہ کا نام بہ تخصیص معلوم ہے۔ صحیح بخاری میں یہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف حضرت طلحہ رضؓ اور حضرت سعد رضؓ رہ گئے تھے[۱]۔

اس ہلچل اور اضطراب میں اکثروں نے تو بالکل ہمت ہار دی۔ لیکن جانبازوں کا بھی زور نہیں چلتا تھا، جو جہاں تھا وہیں گھِر کر رہ گیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی کو خبر نہ تھی۔ حضرت علی رضؓ تلوار چلاتے اور دشمنوں کی صفیں اُلٹتے جاتے تھے، لیکن کعبۂ مقصود (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کا پتہ نہ تھا۔ حضرت انس رضؓ کے چچا ابن نضر لڑتے بھڑتے موقع سے آگے نکل گئے۔ دیکھا تو حضرت

---

[۱] صحیح بخاری غزوۂ اُحد صفحہ ۵۸۱،

عمرؓ نے مایوس ہو کر ہتھیار پھینک دیا ہے، پوچھا یہاں کیا کرتے ہو؟ بولے "اب لڑ کر کیا کریں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو شہادت پائی"! ابن نضر نے کہا "اُن کے بعد ہم زندہ رہ کر کیا کریں گے؟" یہ کہ کر فوج میں گھُس گئے اور لڑ کر شہادت پائی لڑائی کے بعد جب اُن کی لاش دیکھی تو اسّی۸۰ سے زیادہ تیر، تلوار اور نیزے کے زخم تھے۔ کوئی شخص پہچان تک نہ سکا۔ اُن کی بہن نے اُنگلی دیکھ کر پہچانا[۱]

جاں نثاران خاص برابر لڑتے جاتے تھے لیکن نگاہیں سرورِ عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ڈھونڈھتی تھیں۔ سب سے پہلے حضرت کعبؓ بن مالک کی نظر پڑی، چہرۂ مبارک پر مغفر تھا، لیکن آنکھیں نظر آتی تھیں۔ حضرت کعبؓ نے پہچان کر پُکارا "مسلمانو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہیں"۔ یہ سُن کر ہر طرف سے جاں نثار ٹوٹ پڑے۔ کفار نے اب ہر طرف سے ہٹ کر اُسی رُخ پر زور دیا، دَل کا دَل ہجوم کر کے بڑھتا تھا، لیکن ذوالفقار کی بجلی سے یہ بادل پھٹ پھٹ کر رہ جاتا تھا۔ ایک دفعہ ہجوم ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کون مجھ پر جان دیتا ہے"؟ زیادؓ بن سکن پانچ انصاری لے کر اس خدمت کے ادا کرنے کے لیے بڑھے، اور ایک ایک نے جانبازی سے لڑ کر جانیں فدا کر دیں[۲]۔ حضرت زیادؓ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اُن کا لاشہ قریب لاؤ۔ لوگ اُٹھا کر لائے، کچھ کچھ جان باقی تھی، قدموں پر مُنہ رکھ دیا،

---

[۱] صحیح بخاری غزوۂ اُحُد صفحہ ۵۷۹ و صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۱۳۸، باب ثبوت الجنتہ للشہید؟ س [۲] صحیح مسلم غزوۂ اُحد میں ہے کہ سات انصاری تھے اور ساتوں نے باری باری اپنی جانیں فدا کیں) +

اور اسی حالت میں جان دی ۔ ۵

بچہ ناز رفتہ باشد زجہاں نیاز مندے
کہ بہ وقت جاں سپردن بسرش رسیدہ باشی

ایک بہادر مسلمان اس عالم میں بھی بے پروائی کے ساتھ کھڑا کھجوریں کھا رہا تھا، اس نے بڑھ کر پوچھا کہ "یا رسول اللہ! اگر میں مارا گیا تو کہاں ہوں گا؟" آپؐ نے فرمایا "جنت میں" اِس بشارت سے بے خود ہو کر وہ اس طرح کفار پر ٹوٹ پڑا کہ مارا گیا۔ ۵

عبداللہ بن قمیہ جو قریش کا مشہور بہادر تھا، صفوں کو چیرتا پھاڑتا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب آگیا اور چہرۂ مبارک پر تلوار ماری، اس کے صدمے سے مغفر کی دو کڑیاں چہرۂ مبارک میں چبھ کر رہ گئیں۔ چاروں طرف سے تلواریں اور تیر برس رہے تھے۔ یہ دیکھ کر جانثاروں نے آپؐ کو دائرہ میں لے لیا، ابودجانہؓ جھک کر سپر بن گئے۔ اب جو تیر آتے تھے اُن کی پیٹھ پر آتے تھے۔ حضرت طلحہؓ نے تلواروں کو ہاتھ پر روکا۔ ایک ہاتھ کٹ کر گر پڑا۔ بے درد رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر تیر برسا رہے تھے، اور آپ کی زبان پر یہ الفاظ تھے:

رَبِّ اغفر قومی فانھم — اے خدا میری قوم کو بخش دے
لا یعلمون — وہ جانتے نہیں۔

حضرت ابوطلحہؓ جو حضرت انسؓ کے علاتی باپ تھے، مشہور قدر انداز تھے، انھوں نے اس قدر تیر برسائے کہ دو تین کمانیں اُن کے ہاتھ میں ٹوٹ

---

۵ بخاری غزوۂ اُحد ص۵۷۹ "س" ۵ صحیح مسلم غزوۂ اُحد ج ۲ ص ۹۰

ٹوٹ کر رہ گئیں۔ انھوں نے سپر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر اوٹ کر لیا تھا کہ آپؐ پر کوئی وار نہ آنے پائے۔ آپؐ کبھی گردن اٹھا کر دشمنوں کی فوج کی طرف دیکھتے تو عرض کرتے کہ آپؐ گردن نہ اٹھائیں، ایسا نہ ہو کہ کوئی تیر لگ جائے، یہ میرا سینہ سامنے ہے۔[1] حضرت سعدؓ وقاص بھی مشہور تیر انداز تھے، اور اس وقت آپؐ کے رکاب میں حاضر تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ترکش اس کے آگے ڈال دیا اور فرمایا "تم پر میرے ماں باپ قربان۔ تیر مارتے جاؤ"[2]۔

اسی حالت میں آپؐ کی زبان سے عبرت کے لہجے میں یہ لفظ نکلا "وہ قوم کیا فلاح پا سکتی ہے جو اپنے پیغمبر کو زخمی کرتی ہے"۔ بارگاہِ خداوندی میں یہ الفاظ پسند نہ آئے اور یہ آیت اتری:

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ — تم کو اس معاملہ میں کچھ اختیار نہیں ہے

چنانچہ صحیح بخاری غزوۂ اُحد میں یہ واقعہ مذکور ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثابت قدموں کے ساتھ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے کہ دشمن ادھر نہیں آسکتے تھے، ابوسفیان نے دیکھ لیا، فوج لے کر پہاڑی پر چڑھا، لیکن حضرت عمرؓ اور چند صحابہؓ نے پتھر برسائے، جس سے وہ آگے نہ بڑھ سکا۔[3]

آپؐ کی وفات کی خبر مدینہ میں پہنچی تو اخلاص شعار نہایت بے تابی کے ساتھ دوڑے، جناب فاطمہ زہراؓ نے آکر دیکھا تو ابھی تک چہرہ مبارک سے خون جاری ہے۔ حضرت علیؓ سپر میں بھر کر پانی لائے۔ جناب سیدہؓ دھوتی

---

[1] صحیح بخاری غزوۂ اُحد ص ۵۸۱، [2] صحیح بخاری غزوۂ اُحد ص ۵۸۰، [3] طبری ص ۱۴۲۱ و ص ۱۴۱۰۔

تھیں لیکن خون نہیں تھمتا تھا، بالآخر چٹائی کا ایک ٹکڑا جلایا اور زخم پر رکھ دیا، خون فوراً تھم گیا[۱]

ابوسفیان سامنے کی پہاڑی پر چڑھ کر پکارا کہ "یہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں؟" آپ نے حکم دیا کوئی جواب نہ دے۔ ابوسفیان نے حضرت ابوبکر رضؓ اور عمر رضؓ کا نام لے کر پکارا، اور جب کچھ آواز نہ آئی تو پکار کر بولا سب مارے گئے۔ حضرت عمر رضؓ سے ضبط نہ ہو سکا، بول اٹھے " او دشمن خدا! ہم سب زندہ ہیں"

ابوسفیان نے کہا:

اعل ھبل[۲] — اے ہبل تو اونچا رہ

صحابہ رضؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے کہا:

اللہ اعلیٰ واجل — خدا اونچا اور بڑا ہے

ابوسفیان نے کہا:

لنا العزیٰ ولا عزیٰ لکم — ہمارے پاس عزیٰ[۳] ہے تمہارے پاس نہیں

صحابہ رضؓ نے کہا:

اللّٰہ مولانا ولا مولیٰ لکم — خدا ہمارا آقا ہے اور تمہارا کوئی آقا نہیں

ابوسفیان نے کہا "آج کا دن بدر کے دن کا جواب ہے۔ فوج کے لوگوں نے مُردوں کے ناک کان کاٹ لیے ہیں۔ میں نے یہ حکم نہیں دیا تھا لیکن مجھ کو معلوم ہوا تو کچھ رنج بھی نہیں ہوا[۴]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مستورات اور بچوں کو حضرت یمان رضؓ اور حضرت

---

[۱] صحیح بخاری غزوۂ اُحد (ج ۲ ص ۵۸۴) ۱۲ [۲] بُت کا نام [۳] بُت کا نام ہے لفظی معنی عزت کے ہیں [۴] یہ تمام تفصیل بخاری غزوۂ اُحد کے ذکر میں ہے۔

ثابت رضؓ کی حفاظت میں مدینہ کے پاس کے قلعوں میں بھیج دیا تھا، ان لوگوں کو شکست کی خبر معلوم ہوئی تو سب کو چھوڑ کر اُحد کی طرف بڑھے، حضرت ثابت رضؓ مشرکوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ حضرت یمان رضؓ کو مسلمان ہجومِ عام میں پہچان نہ سکے، اُن پر تلواریں برس پڑیں، اُن کے صاحبزادے حضرت حذیفہ رضؓ نے ہرچند "ہاں ہاں" کہا اور پہچنوایا کہ میرے باپ ہیں۔ لیکن ہنگامے میں کون سنتا تھا؟ حذیفہ رضؓ یہ کہ کر رہ گئے کہ "مسلمانو! خدا تمھارے اس گناہ کو بخش دے"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت یمانؓ کا خونبہا مسلمانوں کی طرف سے ادا کرنا چاہا، لیکن حضرت حذیفہ رضؓ نے معاف کر دیا۔ ابن ہشام میں یہ واقعہ بہ تفصیل مذکور ہے۔ صحیح بخاری میں بھی ہے، لیکن مختصر ہے +

خاتونانِ قریش نے انتقامِ بدر کے جوش میں مسلمانوں کی لاشوں سے بھی بدلہ لیا۔ ان کے ناک کان کاٹ لیے۔ ہند (حضرت امیر معاویہ کی ماں) نے ان پھولوں کا ہار بنایا، اور اپنے گلے میں ڈالا۔ حضرت حمزہ کی لاش پر گئی اور ان کا پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکالا اور چبا گئی، لیکن گلے سے نہ اُتر سکا، اس لیے اُگل دینا پڑا۔ تاریخوں میں ہند کا لقب جو "جگر خوار" لکھا جاتا ہے، اسی بنا پر لکھا جاتا ہے۔ ہند فتحِ مکہ میں ایمان لائی۔ لیکن جس طرح ایمان لائی وہ عبرت خیز ہے، تفصیل آگے آئے گی +

اس غزوہ میں اکثر خاتونانِ اسلام نے بھی شرکت کی۔ حضرت عائشہ رضؓ اور حضرت اُمِّ سلیمؓ جو حضرت انس رضؓ کی ماں تھیں زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں، صحیح بخاری میں حضرت انس رضؓ سے منقول ہے کہ میں نے حضرت عائشہ رضؓ اور اُمِّ سلیم رضؓ کو دیکھا کہ پائینچے چڑھائے ہوئے مشک بھر بھر کر لاتی تھیں، اور زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں۔ مشک خالی ہو جاتی تھی تو جا کر بھر لاتی تھیں[1]۔

[1] صفحہ ۵۸۱ کتاب المغازی غزوۂ اُحد

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت امِّ سلیط رضؓ نے بھی جو حضرت ابو سعید خدری رضؓ کی ماں تھیں، یہی خدمت انجام دی[1]۔

عین اس وقت جب کہ کافروں نے عام حملہ کر دیا تھا، اور آپؐ کے ساتھ صرف چند جاں نثار رہ گئے تھے، حضرت امِّ عمارۃ رضؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچیں اور سینہ سپر ہوگئیں۔ کفّار جب آپؐ پر بڑھتے تھے تو تیر اور تلوار سے روکتی تھیں۔ ابن قمیّہ جب دَرّاتا ہوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ گیا تو حضرت امِّ عمارۃ رضؓ نے بڑھ کر روکا، چنانچہ کندھے پر زخم آیا اور غار پڑ گیا۔ انھوں نے بھی تلوار ماری، لیکن وہ دُہری زرہ پہنے ہوئے تھا، اس لیے کارگر نہ ہوئی[2]۔

حضرت صفیّہ رضؓ (حضرت حمزہ رضؓ کی بہن) شکست کی خبر سُن کر مدینہ سے نکلیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے صاحبزادے حضرت زبیر رضؓ کو بُلا کر ارشاد کیا کہ حمزہ کی لاش نہ دیکھنے پائیں۔ حضرت زبیر رضؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام سُنایا، بولیں کہ مَیں اپنے بھائی کا ماجرا سُن چکی ہوں۔ لیکن خدا کی راہ میں یہ کوئی بڑی قربانی نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی، لاش پر گئیں، خون کا جوش تھا اور عزیز بھائی کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے لیکن اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن کہ کر چپ ہوگئیں اور مغفرت کی دُعا مانگی[3]۔

انصار میں سے ایک عفیفہ کے باپ، بھائی، شوہر سب اس معرکہ میں

---

[1] صحیح بخاری صفحہ ۵۸۲ ذکر امِّ سلیط رضؓ [2] ابن ہشام صفحہ ۸۴ (۲) مطبع محمد علی مصر
[3] طبری (۱۴۲۱)۔

مارے گئے تھے، باری باری تین سخت حادثوں کی صدا اس کے کانوں میں پڑتی جاتی تھی، لیکن وہ ہر بار صرف یہی پوچھتی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیسے ہیں؟ لوگوں نے کہا بخیر ہیں، اس نے پاس آکر چہرۂ مبارک دیکھا اور بے اختیار پکار اٹھیں:[1]

كُلُّ مُصِيبَةٍ بَعْدَكَ جَلَلٌ، تیرے ہوتے سب مصیبتیں ہیچ ہیں۔

میں بھی اور باپ بھی، شوہر بھی، برادر بھی فدا
اے شہِ دیں! ترے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم؟

مسلمانوں کی طرف ستر آدمی مارے گئے، جن میں زیادہ تر انصار تھے۔ لیکن مسلمانوں کے افلاس کا یہ حال تھا کہ اتنا بھی کپڑا نہ تھا کہ شہداء کی پردہ پوشی ہو سکتی، حضرت مصعب رضؓ بن عمیر ایک صحابی تھے کہ ان کا پاؤں چھپایا جاتا تو سر کھل جاتا اور سر ڈھانکا جاتا تو پاؤں کھل جاتا، آخر پاؤں اذخر کی گھاس سے چھپا دیے گئے، یہ وہ حیرت انگیز منظر تھا کہ بعد کو بھی یہ واقعہ مسلمانوں کو یاد آجاتا تو آنکھیں تر ہو جاتیں۔ شہداء بے غسل اسی طرح خون میں لتھڑے ہوئے دو دو ملا کر ایک ایک قبر میں دفن کیے گیے۔ جس کو قرآن زیادہ یاد ہوتا اس کو مقدم کیا جاتا۔ ان شہداء پر نماز جنازہ بھی اس وقت نہیں پڑھی گئی۔[2] آٹھ برس کے بعد وفات

---

[1] طبری ص ۱۴۲۵، [2] یہ صحیح بخاری کی روایت ہے لیکن دوسری کتابوں میں بعض ایسی روایتیں بھی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ رضؓ پر تو خصوصیت کے ساتھ اور دوسرے شہداء پر نماز جنازہ پڑھی۔ یہ شہداء ایک ایک کر کے اور بعض میں ہے کہ دس دس کر کے لائے جاتے تھے اور آپؐ ان پر نمازِ جنازہ پڑھتے تھے۔ اور حضرت حمزہ رضؓ کی لاش مبارک پر ہر جماعت کے ساتھ گویا ستر دفعہ یا سات دفعہ نماز ادا کی گئی۔ شرح

سے ایک دو برس پہلے جب آپؐ ادھر سے گزرے تو بے اختیار آپؐ پر رقت طاری ہوئی، اور اس طرح آپؐ نے پُردرد کلمات فرمائے جیسے کوئی زندوں اور مُردوں سے رخصت ہو رہا ہو، اور اس کے بعد آپؐ نے ایک خطبہ دیا کہ "مسلمانو! تم سے یہ خوف نہیں کہ پھر مشرک بن جاؤ گے، لیکن یہ ڈر ہے کہ دُنیا میں نہ پھنس جاؤ"[۱]

دونوں فوجیں جب میدان سے الگ ہوئیں تو مسلمان زخم سے چور تھے، تاہم یہ خیال کر کے کہ ابوسفیان مسلمانوں کو مغلوب سمجھ کر دوبارہ حملہ آور نہ ہو، آپؐ نے مسلمانوں کی طرف روئے خطاب کر کے فرمایا کہ کون اُن کا تعاقب کرے گا، فوراً ستّر آدمیوں کی ایک جماعت اس مہم کے لیے تیار ہو گئی، جن میں حضرت ابوبکرؓ و زبیرؓ بھی داخل[۲] تھے۔

ابوسفیان اُحد سے روانہ ہو کر جب مقام روحا پہنچا، یہاں خیال آیا کہ کام ناتمام رہ گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے ہی سے گمان تھا۔ دوسرے ہی دن آپؐ نے اعلان کرا دیا کہ کوئی واپس نہ جائے۔ چنانچہ حمراء الاسد تک جو مدینہ سے ۸ میل ہے تشریف لے گئے۔ قبیلہ خزاعہ اس وقت تک ایمان نہیں لایا تھا، لیکن درپردہ اسلام کا طرفدار تھا، اس کا رئیس معبد خزاعی شکست کی خبر سُن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور واپس جا کر ابوسفیان سے ملا، ابوسفیان نے اپنا ارادہ ظاہر کیا، معبد نے کہا "میں دیکھتا آتا ہوں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس سروسامان سے آرہے ہیں کہ ان کا مقابلہ ناممکن ہے"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۹۰) معانی الآثار طحاوی باب الصلوٰۃ علی الشہداء و نصب الرایہ زیلعی باب احادیث الصلوٰۃ علی الشہید و مغازی واقدی صفحہ ۳ مطبوعہ کلکتہ) "س" [۱] یہ تمام واقعات صحیح بخاری غزوۂ اُحد کے متفرق ابواب میں ہیں۔ [۲] صحیح بخاری صفحہ ۵۸۴ - "س" [۳] طبری صفحہ ۱۴۲۸، ۱۴۲۹

غرض ابوسفیان واپس گیا[۱] یہی واقعہ ہے جس کو مورخین نے تکثیرِ غزوات کے شوق میں ایک نیا غزوہ بنا لیا ہے اور حمراء الاسد کا ایک نیا عنوان قائم کیا ہے ۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) مدینہ میں تشریف لائے تو تمام مدینہ ماتم کدہ تھا۔ آپؐ جس طرف سے گزرتے تھے گھروں سے ماتم کی آوازیں آتی تھیں آپؐ کو عبرت ہوئی کہ سب کے عزیز واقارب ماتم داری کا فرض ادا کر رہے ہیں لیکن حمزہ رضؓ کا کوئی نوحہ خواں نہیں ہے ۔ رقت کے جوش میں آپؐ کی زبان سے بے اختیار نکلا :

اَمَّا حَمْزَۃُ فَلَا بَوَاکِیَ لَہٗ[۲] ، لیکن حمزہ کا کوئی رونے والا نہیں ۔

انصار نے یہ الفاظ سُنے تو تڑپ اُٹھے ۔ سب نے جا کر اپنی بیویوں کو حکم دیا کہ دولت کدہ جا کر حضرت حمزہ رضؓ کا ماتم کرو ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو دروازے پر پردہ نشینانِ انصار کی بھیڑ تھی ، اور حضرت حمزہ رضؓ کا ماتم بلند تھا ، اُن کے حق میں دعائے خیر کی اور فرمایا میں تمہاری ہمدردی کا شکر گزار ہوں لیکن مُردوں پر نوحہ کرنا جائز نہیں ۔ (عرب میں دستور تھا کہ مُردوں پر عورتیں زور زور سے نوحہ اور بین کرتی تھیں ، کپڑے پھاڑ لیتی تھیں ، گال نوچتی ، گالوں پر تھپڑ مارتی تھیں ، اور چیختی چلاتی تھیں ۔ یہ رسمِ بد اسی دن سے بند کر دی گئی ، اور فرمایا گیا کہ آج سے کسی مُردہ پر نوحہ نہ کیا جائے[۳] یہ بھی بعد کو ارشاد ہوا کہ اس طرح ماتم کرنا مسلمان کی شان نہیں[۴] ۔

---

[۱] (مسند احمد ج ۲ ص ۸۴) " س " [۲] ابن ہشام (غزوۂ اُحد) اور مُسند احمد (ج ۲ ص ۸۴) [۳] صحیح بخاری کتاب الجنائز ، " س "

(قرآن مجید میں سورۂ آل عمران میں غزوۂ اُحد کا مفصّل ذکر موجود ہے)۔

واقعاتِ متفرقہ ۳ھ اس سال یعنی ۳ھ حضرت امام حسن (رضی اللہ عنہ) کی ولادت ہوئی۔ رمضان کی پندرھویں تاریخ تھی۔ اسی سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت حفصہ رضؓ سے جو حضرت عمر رضؓ کی صاحبزادی تھیں اور غزوۂ بدر کے زمانے میں بیوہ ہوگئی تھیں نکاح کیا، اسی سال حضرت عثمان رضؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی صاحبزادی حضرت امّ کلثوم رضؓ سے شادی کی۔

وراثت کا قانون بھی اسی سال نازل ہوا، اب تک وراثت میں ذوی الارحام کا کوئی حصّہ نہ تھا۔ اُن کے حقوق کی بھی تفصیل کی گئی۔ مُشرکہ کا نکاح مسلمان سے اب تک جائز تھا، اس سال اس کی بھی تحریم نازل ہوئی۔

۴ھ

سلسلۂ غزوات و سرایا

تمام قبائل عرب بجز ایک دو کے، اسلام کے دشمن تھے۔ دشمنی زیادہ تر اس بنا پر تھی کہ ہر قبیلہ بُت پرستی کو اپنا دین و آئین سمجھتا تھا، اسلام اسی کو مٹاتا تھا، اس کے ساتھ قریش کا اثر تمام عرب پر تھا۔ حج کے زمانے میں تمام قبائل مکہ میں جمع ہوتے تھے اور قریش ان کو اسلام کی دشمنی پر برانگیختہ کرتے تھے۔ ایک اور بڑا سبب یہ تھا کہ تمام قبائل کی وجہ معاش لوٹ اور غارتگری تھی، اور اسلام اس کو نہ صرف قولاً بلکہ عملاً بھی روکتا تھا۔ اس لیے وہ جانتے تھے کہ اسلام اگر قائم ہو گیا تو ہمارے ذرائع معاش بند ہو جائیں گے۔ تاہم بدر کی فتح نے ایک عام رعب بٹھا دیا تھا، جس کی وجہ سے تمام قبیلے اپنی اپنی جگہ

لہ غزوہ اور سریہ میں جو فرق ہے اس کی نسبت علمائے سیرت مختلف الرائے ہیں۔ زیادہ مقبول یہ رائے ہے کہ جس واقعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود شریک ہوئے وہ غزوہ کے نام سے موسوم ہے، اور جس میں صحابہ افسر مقرر کر کے بھیج دیے جاتے تھے وہ سریہ کہلاتا تھا۔

خاموش بیٹھ گئے۔ لیکن اُحد کی شکست نے حالت بدل دی اور دوبارہ تمام قبائل دفعۃً اٹھ کھڑے ہوئے۔ سیرت نبویؐ میں سرایا (چھوٹی چھوٹی لڑائیاں) کا جو ایک وسیع سلسلہ پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ اسی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ عام مورخوں نے اگرچہ اپنی عادت کے موافق ان لڑائیوں کے ذکر میں ان کے اسباب سے بحث نہیں کی۔ لیکن ابن سعد نے طبقات میں، اور ائمہ فن نے قریباً ہر واقعہ کا سبب لکھ دیا ہے۔ یعنی کسی خاص قبیلہ نے مدینہ پر چڑھائی کا ارادہ کیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدافعت کے لیے فوجیں بھیجیں۔

سریہ ابی سلمہ ۱۔ سب سے پہلے ۱۔ محرم ۴ھ میں طلحہ اور خویلد نے اپنے قبیلہ کو جو فید کے کوہستانی علاقہ قطن میں رہتا تھا، مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ نے حضرت ابو سلمہ کو ایک سو پچاس مہاجرین اور انصار کے ساتھ اس طرف روانہ کیا، یہ خبر سن کر اُن کی جماعت منتشر ہو گئی[۱]۔

سریہ ابن اُنیس اس کے بعد محرم ۴ھ میں سفیان بن خالد جو قبیلہ لحیان کا تھا اور جو کوہستان عُرنہ کا رئیس تھا، مدینہ پر حملے کا قصد کیا۔ اس کے مقابلے کے لیے آپؐ نے حضرت عبداللہ بن اُنیس کو بھیجا۔ جنھوں نے لطائف الحیل سے موقع حاصل کیا اور سفیان کو قتل کر دیا[۲]۔

---

[۱] ابن سعد صفحہ ۳۵ (ج ۲ قسم اول) اصل عبارت یہ ہے بلغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان طلیحۃ وسلمۃ ابنی خویلد قد سارا فی قومھما ومن اطاعھما یدعونھما الی حرب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ [۲] طبقات ابن سعد صفحہ ۳۶۔ اصل عبارت یہ ہے وذالک انہ بلغ رسول اللہ علیہ وسلم ان سفین بن خالد الھذلی ..... قد جمع الجموع لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

صفر سنہ ۴ھ میں ابو برار کلابی[1] جو قبیلہ کلاب کا رئیس تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور درخواست کی کہ چند لوگوں کو میرے ساتھ کر دیجیے کہ میری قوم کو اسلام کی دعوت دیں۔ آپ نے فرمایا "مجھ کو نجد کی طرف سے ڈر ہے"[2] ابو برار نے کہا "ان کا میں ضامن ہوں" آپ نے منظور فرمایا اور ستر انصار ساتھ کر دیے۔ یہ لوگ نہایت مقدس اور درویش تھے اور اکثر اصحاب صفہ میں سے تھے۔ اُن کا معمول تھا کہ دن بھر لکڑیاں چُنتے، شام کو فروخت کر کے کچھ اصحاب صفہ کی نذر کرتے، کچھ اپنے لیے رکھتے۔

بیر معونہ

ان لوگوں نے بیر معونہ پہنچ کر قیام کیا، اور حرام بن ملحان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط دے کر عامر بن طفیل (بن مالک بن جعفر کلابی عامری) کے پاس بھیجا۔ جو قبیلہ کا رئیس تھا۔ عامر نے حرام کو قتل کر دیا، اور آس پاس کے جو قبائل تھے یعنی عُصَیّہ، رعل، ذکوان، سب کے پاس آدمی دوڑا دیے کہ تیار ہو کر آئیں۔ ایک بڑا لشکر تیار ہو گیا اور عامر کی سرداری میں آگے بڑھا۔ صحابہ حرام کی واپسی کے منتظر تھے۔ جب دیر لگی تو خود روانہ ہوئے۔ راستے میں عامر کی فوج کا سامنا

---

[1] (ابو برار بعد کو اسلام لائے یا نہیں، اس میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ ذہبی کہتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ یہ اسلام نہیں لائے۔ اصابہ میں ہے کہ ان کے قبول اسلام کی کوئی روایت نہیں ہے۔ تاہم بعض روایات کی بنا پر ایک جماعت کا خیال ہے کہ اسلام لائے تھے۔ زرقانی ج ۲ ص ۸۶ "س")

[2] (اور یہ کچھ بیجا بھی نہ تھا عامر بن طفیل جو ان اطراف کا رئیس تھا اُس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ "میرے تمہارے درمیان تین باتیں ہیں، بادیہ کے مالک تم بنو، اور شہروں کا میں بنوں، یا اپنے بعد مجھ کو اپنا جانشین بناؤ، ورنہ غطفان۔

ہوا، کفار نے اُن کو گھیر لیا، اور سب[۱] کو قتل کر دیا۔ صرف عمرو رضؓ بن امیہ کو عامر نے یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ "میری ماں نے ایک غلام آزاد کرنے کی منت مانی تھی، میں تجھ کو آزاد کرتا ہوں"۔ یہ کہہ کر ان کی چوٹی کاٹی اور چھوڑ دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو اس قدر صدمہ ہوا کہ تمام عمر کبھی نہیں ہوا۔ مہینہ بھر نماز فجر میں ان ظالموں کے حق میں بددُعا کی۔ حضرت عمرو رضؓ بن اُمیہ نے (واپسی میں راستہ میں بنی عامر کے) دو[۲] آدمیوں کو قتل کر دیا تھا، (جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امان دے چکے تھے۔ مگر حضرت عمرو رضؓ بن امیہ کو اس کا علم نہ تھا۔ وہ یہ سمجھے کہ ہم نے بنی عامر سے اُن کی اس بے وفائی کا بدلہ لے لیا جو اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے ساتھ کیا ہے[۳]۔ (جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سُنا تو) اس پر آپؐ نے ناراضی ظاہر فرمائی اور دونوں کے خونبہا ادا کر دینے کا اعلان فرمایا۔

واقعہ رجیع انہی دنوں عضل اور قارہ جو دو مشہور قبیلے ہیں، اُن کے چند آدمی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے کہ ہمارے قبیلہ نے اسلام قبول کر لیا ہے، چند لوگوں کو ہمارے ہاں بھیجیے کہ اسلام کے احکام اور عقائد سکھائیں۔ آپؐ نے دس شخص ساتھ کر دیے، جن کے سردار حضرت عاصم رضؓ بن ثابت تھے۔ یہ لوگ جب

(۱) صحابہ کی اس جماعت میں حضرت کعب رضؓ بن زید بھی تھے، کفار نے سمجھا کہ یہ بھی شہید ہو گئے ہیں، لیکن ان میں جان باقی تھی اور بعد کو زندہ بچ گئے اور غزوہ خندق میں شہید ہوئے۔ زرقانی ج ۲ صفحہ ۸۸، "س" (۲) حضرت عمرو رضؓ بن امیہ اور حضرت منذر رضؓ بن محمد عقبہ انصاری پیچھے تھے۔ جب یہ مقام حادثہ پر پہنچے تو حضرت منذر کو شہید کر دیا گیا اور حضرت عمرو رضؓ بن امیہ کو قید کر لیا گیا اور بعد کو وہ چھوڑ دیے گئے۔ زرقانی ج ۲ صفحہ ۸۹، "س"

(۳) البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۴ صفحہ ۷۳، زرقانی ج ۲ صفحہ ۹۲)

مقام رجیع پر پہنچے جو عُسفان اور مکّہ کے وسط میں ہے، تو ان غداروں نے بد عہدی کی اور قبیلہ بنو لحیان کو اشارہ کیا کہ ان کا کام تمام کر دیں۔ بنو لحیان دو سو آدمی لے کر جن میں ایک سو تیر انداز تھے، ان لوگوں کے تعاقب میں چلے، اور اُن کے قریب آ گئے۔ ان لوگوں نے بڑھ کر ایک ٹیکرے پر پناہ لی۔ تیر اندازوں نے اُن سے کہا کہ "اُتر آؤ ہم تم کو امن دیتے ہیں۔" حضرت عاصم رضؓ نے کہا "میں کافر کی پناہ میں نہیں آتا۔" یہ کہہ کر خُدا سے خطاب کیا کہ اپنے پیغمبر کو خبر پہنچا دے۔" غرض وہ مع سات آدمیوں کے لڑ کر تیر اندازوں کے ہاتھ سے شہید ہوئے (قریش نے چند آدمیوں کو بھیجا کہ عاصم کے بدن سے گوشت کا ایک لوتھڑا کاٹ لائیں کہ ان کی شناخت ہو۔ قدرت خداوندی نے شہید مسلم کی یہ تحقیر گوارا نہ کی، شہد کی مکھیوں نے لاش پر پرا ڈال دیا، قریش ناکام پھر گئے) لیکن (تین) شخصوں[۱] نے جن (میں سے دو) کے نام خبیب رضؓ اور حضرت زید رضؓ بن الدثنہ) تھے، کافروں کے وعدہ پر اعتماد کیا اور ٹیکرے سے اُتر آئے۔ کافروں نے بد عہدی کر کے اُن کی مشکیں کس لیں، اور مکّہ میں لے جا کر بیچ ڈالا۔ حضرت خبیب رضؓ نے جنگِ اُحد میں حارث بن عامر کو قتل کیا تھا، اس لیے ان کو حارث کے

---

[۱] بخاری و کتاب المغازی نے اس موقع پر جن تیسرے بزرگ کا ذکر کیا ہے، ان کا نام نہیں لکھا ہے۔ ابن اسحاق نے ان کا نام حضرت عبداللہ بن طارق بتایا ہے بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ رضؓ اسی وقت اسی موقع پر شہید کر دیے گئے۔ لیکن دوسری روایتوں میں ہے کہ یہاں سے آگے چل کر مکّہ کے راستے میں یہ مقام ظہران ان کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔

(زرقانی ج ۲ صفحہ ۷۴ "س")

کے لڑکوں نے خریدا کہ باپ کے بدلے میں قتل کریں گے۔ چند روز انہی کے گھر میں رہے۔ ایک دن حارث کی نواسی کو کھلا رہے تھے۔ اتفاق سے ہاتھ میں چھری تھی، بچی کی ماں اتفاقاً کہیں سے آگئی، دیکھا کہ حضرت خبیبؓ کے ہاتھ میں ننگی چھری ہے۔ کانپ اٹھی، حضرت خبیبؓ نے کہا "کیا تو یہ سمجھی کہ میں اس کو قتل کردوں گا، ہمارا یہ کام نہیں"۔ خاندان حارث ان کو حرم کے حدود سے باہر لے گیا، اور قتل کرنا چاہا۔ انھوں نے دو رکعت نماز پڑھنے کی اجازت مانگی، قاتلوں نے اجازت دی۔ انھوں نے دو رکعت نماز پڑھ کر کہا "دیر تک پڑھنے کو جی چاہتا تھا، لیکن تم کو خیال ہوگا کہ موت سے ڈرتا ہوں"۔ پھر یہ اشعار پڑھے:

وما ان ابالی حین اقتل مسلما	جب میں اسلام کے لیے قتل کیا جا رہا ہوں
علی ای شق کان للہ مصرعی	تو مجھ کو اس کی پروا نہیں کہ کس پہلو قتل کیا جاؤنگا،
وذالک فی ذات الالہ ان یشأ	یہ جو کچھ ہے خالصاً خدا کے لیے ہے اگر وہ چاہیگا تو
یبارک علی اوصال شلو ممزع	جسم کے ان پارہ پارہ ٹکڑوں پر برکت نازل کریگا۔

اسی زمانہ سے دستور ہے کہ کسی کو قتل کرتے ہیں تو مقتول پہلے دو رکعت نماز ادا کرلیتا ہے[۵] (اور یہ مستحب سمجھا جاتا ہے)[۳] +

---

(۱) حارث کے بیٹے ابو سروعہ جنھوں نے حضرت خبیبؓ کو شہید کیا تھا، بعد کو مسلمان ہوئے اور شرفِ صحابیت سے سرفراز ہوئے۔ زرقانی ج ۲ ص۸۲ "س" (۲) صحیح بخاری میں اسی طرح لکھا ہے "س" (۳) طبری صفحہ ۱۴۳۵ و طبقات ابن سعد، اشعار اور اکثر جزئیات واقعہ صحیح بخاری غزوۃ الرجیع سے لیے گئے ہیں۔ نیز صحیح بخاری ہل یستاسر ومن لم یستاسر وصلی رکعتین عند القتل) (۴) اس نماز کے استحباب کی اصلی وجہ یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ

دوسرے صاحب حضرت زید رضؓ تھے، ان کو صفوان بن امیہ نے قتل کے ارادے سے خریدا تھا، اور ان کے قتل کے وقت قریش کے معزز سردار تماشا دیکھنے آئے، جن میں ابوسفیان بھی تھا۔ جب قاتل نے تلوار ہاتھ میں لی تو ابوسفیان نے کہا، "سچ کہنا اس وقت تمہارے بدلے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) قتل کیے جاتے تو کیا تم اس کو اپنی خوش قسمتی نہ سمجھتے"؟ بولے خدا کی قسم میں تو اپنی جان کو اس کے برابر بھی عزیز نہیں رکھتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تلووں میں کانٹا چبھ جائے"! صفوان کے غلام نسطاس [۱] نے ان کی گردن ماردی +

ان لڑائیوں کا سلسلہ یہود کی لڑائیوں سے مل جاتا ہے، اور چونکہ یہود کے واقعات اور ان کی سرگزشت تاریخ اسلام سے گوناگوں تعلقات رکھتی ہے، اس لیے ہم اُن کے واقعات مستقل حیثیت سے لکھتے ہیں اور اس غرض کے لیے کسی قدر ہم کو پچھلے زمانہ کی طرف واپس آنا پڑے گا +

واقعات متفرقہ ۴ھ اسی سال شعبان میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی +

اسی سال ازواج مطہرات رضؓ میں سے حضرت زینبؓ بنت خزیمہ نے انتقال

(بقیہ حاشیہ ص ۳۹۹) علیہ وسلم کو حضرت خبیبؓ کے اس فعل کی اطلاع ملی تو آپؐ نے اس کو پسند فرمایا، (شرح سیر کبیر سرخسی اوّل ص ۱۵۰) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس استحسان نے اس نماز کو استحباب کا درجہ عطا فرمایا (الروض الانف ج ۲ ص ۱۷۱) محدثین کی اصطلاح میں اس صورت حال کو تقریر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں یعنی حضور کے سامنے کوئی فعل کیا گیا ہو یا حضورؐ کی عدم موجودگی میں کیا گیا ہو، اور حضورؐ کو اس کی اطلاع ملی ہو، مگر آپؐ نے اس پر انکار نہ فرمایا ہو تو اس سے بھی اس فعل کا مسنون و مستحب یا جائز ہونا سمجھا جائیگا" س"

(۱) نسطاس رضؓ نے بعد کو اسلام قبول کیا، زرقانی ج ۲ ص ۸۴" س"

فرمایا، جن سے اسی سال نکاح بھی ہوا تھا۔

اسی سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن ثابت کو حکم دیا کہ وہ عبرانی زبان لکھنا پڑھنا سیکھ لیں اور فرمایا کہ مجھ کو یہود پر اطمینان نہیں۔ تاریخوں میں لکھا ہے کہ حضرت زید نے صرف پندرہ دن میں عبرانی زبان سیکھ لی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں عبری زبان سے لوگ بہت کچھ آشنا تھے۔

اسی سال شوال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام سلمہ رضی سے نکاح فرمایا۔

اسی سال یہودیوں نے آپ کے سامنے ایک یہودی کا مقدمہ پیش کیا اور آپ نے توراۃ کے مطابق رجم کا حکم دیا، (تفصیل ان واقعات کی دوسرے حصوں میں آئے گی)۔

بعض مورخوں کے نزدیک شراب کی حرمت کا حکم بھی اسی سال نازل ہوا لیکن اس میں روایتیں نہایت مختلف ہیں۔ پوری تحقیق احکام شرعیہ کے ذکر میں آئے گی۔

یہودیوں کیساتھ معاہدہ اور جنگ

۲ھ و ۴ھ

اُوپر گزر چکا ہے کہ یہود، مدت دراز سے مدینہ پر فرماں روا تھے۔ انصار نے آکر اُن کے ساتھ تعلقات پیدا کیے اور رفتہ رفتہ حریفانہ اقتدار حاصل کیا۔ لیکن جنگِ بعاث نے اُن کی قومی طاقت توڑ دی، اور اب وہ اس قابل نہیں رہے تھے کہ یہود سے ہمسری کا دعویٰ کر سکتے۔

یہود کے تین قبیلے تھے، قینقاع، نضیر، قریظہ، یہ سب مدینہ کے اطراف اور حوالی میں آباد تھے اور عموماً زمیندار، دولت مند، تجارت پیشہ اور صناع تھے۔ قینقاع زرگری کا پیشہ کرتے تھے۔ اور چونکہ سب میں زیادہ بہادر اور شجاع تھے، اس لیے ہمیشہ اُن کے پاس اسلحہ جنگ کے ذخیرے مہیا رہتے تھے۔ انصار عموماً اُن کے مقروض اور زیر بار تھے۔ ملکی اور تجارتی افسری کے ساتھ اُن لوگوں کا مذہبی اور علمی اثر بھی تھا۔ انصار عموماً بُت پرست اور جاہل تھے۔ اس بنا پر وہ یہود کو عزت کی آنکھ سے دیکھتے، اور ان کو اپنے سے زیادہ مہذب اور شائستہ سمجھتے تھے۔ جن لوگوں کے بچے زندہ نہیں رہتے تھے، وہ منت مانتے تھے کہ ہمارا بیٹا زندہ رہے گا تو ہم اس کو یہودی بنا دیں گے۔ چنانچہ مدینہ

میں اس قسم کے بہت سے جدید الیہودیۃ[۱] موجود تھے۔

یہود میں امتداد زمانہ سے نہایت اخلاق ذمیمہ پیدا ہوگئے تھے۔ ان کے امتیازی خصائص زندگی یہ تھے کہ ہر طرف لین دین کا کاروبار پھیلا رکھا تھا، اور تمام آبادی اُن کے قرضوں میں زیر بار تھی اور چونکہ تنہا وہی صاحب دولت تھے اس لیے نہایت بے رحمی سے سُود کی بڑی شرحیں مقرر کرتے تھے، اور قرضہ کی کفالت میں لوگوں کے بال بچے یہاں تک مستورات کو رہن رکھواتے تھے کعب اشرف نے خود اپنے انصاری دوستوں سے یہی درخواست کی تھی[۲]، اور مختلف طریقوں سے لوگوں کے مال اور جائداد پر تصرف کرتے تھے۔

طماعی اور حرص کی شدت سے یہ حالت تھی کہ معصوم بچوں کو دو چار روپے کے زیور کے لیے پتھر مار ڈالتے تھے[۳] دولت کی بہتات سے زنا اور بدکاری کا عام رواج تھا، اور چونکہ زیادہ تر امرا اس کے مرتکب ہوتے تھے اس لیے ان کو سزا نہیں دے سکتے تھے۔ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی سے دریافت فرمایا کہ "کیا تمھاری شریعت میں زنا کی سزا صرف دُرّہ مارنا ہے"؟ اس نے کہا نہیں، بلکہ سنگسار کرنا ہے، لیکن ہمارے شرفا میں زنا کی کثرت ہوگئی اور جب کوئی شریف اس جُرم میں پکڑا جاتا تو ہم اس کو چھوڑ دیتے تھے البتہ عام آدمیوں کو یہ سزا دیتے تھے۔ بالآخر یہ قرار پایا کہ سنگسار کرنے کی سزا دُرّہ سے بدل دی جائے تاکہ شریف اور رذیل سب کو یکساں سزا دی جاسکے[۴]۔

---

[۱] ابوداؤد ج ۲ ص ۹ کتاب الجہاد باب الاسیر، [۲] بخاری و مسلم ذکر قتل کعب اشرف
[۳] صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۱۰۱۶ کتاب الدیات، باب اذا قتل بحجر او بعصا "س"۔
[۴] اسباب النزول، واحدی صفحہ ۱۴۵ مصر (و صحیح مسلم ص ۹۴ ذکر رجم الیہود) "س"

اسلام مدینہ میں آیا تو یہود کو نظر آیا کہ اب اُن کا جابرانہ اور خود غرضانہ اقتدار قائم نہیں رہ سکتا! اسلام جس قدر روز بروز مدینہ میں پھیلتا جاتا تھا اسی قدر یہودیوں کے مذہبی وقار کو جو اُن کو مدتوں سے حاصل تھا، زوال ہوتا جاتا تھا۔ مدینہ کے مشرکین میں یہودیت جو تدریجاً پھیل رہی تھی دفعتہً رُک گئی۔ نئے نئے فتوحات کی بدولت انصار جس قدر دولتمند ہوتے جاتے تھے، یہودیوں کے قرض کے شکنجوں سے آزاد ہوتے جاتے تھے۔ یہودیوں میں جو اخلاقِ بد عموماً پھیلے ہوئے تھے اور جن پر دولتمندی اور مذہبی پیشوائی نے پردہ ڈال رکھا تھا، اب ان کا راز فاش ہونے لگا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ ان سے معاہدہ کیا تھا کہ ان کے جان و مال سے کچھ تعرض نہیں کیا جائے گا اور ان کو ہر قسم کی مذہبی آزادی حاصل ہوگی لیکن منصبِ نبوت کی حیثیت سے، ذمائمِ اخلاق پر وعظ اور تذکیر آپ کا فرضِ نبوت تھا۔ قرآن مجید میں اُن کے اخلاق کی پردہ دری پر صاف صاف آیتیں نازل ہوتی تھیں:

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ، (مائدہ - ۶)	وہ جھوٹ باتوں کے سننے والے اور مالِ حرام کے بڑے کھانے والے ہیں۔
وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (مائدہ ۹)	اور تو ان میں سے اکثروں کو دیکھے گا کہ گناہ اور تعدی کی طرف بڑی تیزی سے بڑھتے ہیں
وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ (نساء - ۲۲)	اور چونکہ یہ سود خوری کرتے ہیں حالانکہ ان کو سود سے منع کر دیا گیا تھا، اور چونکہ یہ لوگوں کا مال خورد برد کر جاتے ہیں۔

ان اسباب نے تمام یہود میں اسلام کی طرف سے سخت ناراضی پھیلا دی۔

انھوں نے طرح طرح سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیتیں دینی اور اسلام کے خلاف کوششیں کرنی شروع کیں۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم تھا کہ ان کی ہر طرح کی ایذا رسانیوں کی برداشت کریں:

وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا أَذًى كَثِيرًا ۚ وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ (آل عمران-۱۹)	اور اہل کتاب اور مشرکوں سے تم بہت سی ایذا کی باتیں سنوگے، اور اگر صبر کیے رہو اور پرہیزگاری پر قائم رہو تو یہ ہمت کے کام ہیں۔

یہودیوں نے معمول کر لیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سلام علیکم کرتے تو بجائے السلام علیك کے السام علیك کہتے تھے، جس کے معنی یہ ہیں کہ "تجھ کو موت آئے"۔ ایک دفعہ حضرت عائشہ رض بھی موجود تھیں، انھوں نے سنا تو ان کو سخت غصہ آیا، اور بے اختیار ہو کر بول اٹھیں کہ "کمبختو! تم کو موت آئے"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "نرمی سے کام لو"۔ حضرت عائشہ رض نے کہا "آپؐ نے کچھ سنا بھی کہ ان لوگوں نے کیا کہا"؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ ہاں، لیکن یہ کافی ہے کہ میں نے علیك کہہ دیا۔[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف مجاملت اور درگزر ہی پر اکتفا نہیں فرماتے تھے، اکثر معاشرت کی باتوں میں یہود کے ساتھ اتفاق فرماتے اور ان کی مذہبی توقیر قائم رکھنا چاہتے تھے۔ اہل عرب کی عادت تھی کہ بالوں میں مانگ نکالتے تھے، بخلاف اس کے یہودی بالوں کو یوں ہی چھوڑ دیتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ

---

[1] یہ واقعہ صحیح بخاری کے متعدد ابواب میں مذکور ہے۔

علیہ وسلّم بھی یہودیوں ہی کی موافقت کرتے تھے۔ صحیح بخاری میں ہے:

وَکَانَ یحبّ موافقۃ اھل الکتاب فیما لم یؤمر فیہ بشیٍٔ۔
(بخاری کتاب اللباس باب الفرق)
(ج ۲ صفحہ ۸۷۷)

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن چیزوں میں جن میں کوئی خاص حکم الٰہی نہیں ہوتا تھا، اہلِ کتاب کی موافقت پسند فرماتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم جب مدینہ میں تشریف لائے تو دیکھا کہ یہودی عاشورہ کے دن روزہ رکھتے تھے۔ آپؐ نے بھی حکم دیا کہ لوگ عاشورہ کا روزہ رکھیں[۱]۔ کسی یہودی کا جنازہ گزرتا تو آپؐ تعظیماً کھڑے ہو جاتے[۲]۔

ایک دفعہ ایک یہودی نے حضرت موسیٰؑ کی فضیلت اس طرح بیان کی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے بھی افضل ہیں۔ اس پر ایک انصاری کو غصّہ آگیا۔ انھوں نے اس کو تھپڑ مارا۔ یہودی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے شکایت کی، آپؐ نے فرمایا "مجھ کو اور پیغمبروں پر (ایسی) فضیلت نہ دو (جس سے ان کا نقص لازم آئے۔ قیامت کے دن لوگ بیہوش ہو جائیں گے اور سب سے پہلے مجھ کو ہوش آئے گا، اس وقت میں دیکھوں گا کہ موسیٰؑ عرش کا پایہ تھامے کھڑے ہیں[۳]۔"

احکامِ الٰہی جو قرآن مجید میں نازل ہو رہے تھے، سرتاپا اہلِ کتاب کے ساتھ مدارات اور معاشرت کی ترغیب میں تھے۔

وَطَعَامُ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ حِلٌّ لَّکُمْ (مائدہ ۔ ۱)

اور اہلِ کتاب کا کھانا تمھارے لیے حلال ہے۔

---

[۱] بخاری جلد اوّل صفحہ ۵۶۲ (باب اتیان الیہود النبی صلی اللہ علیہ وسلّم حین قدم المدینۃ) (س) [۲] بخاری (ج ۱ صفحہ ...) باب الجنائز [۳] بخاری جلد ۲ صفحہ ۶۶۸ تفسیر سورۂ اعراف۔

عموماً اُن کی قدر و منزلت کا خیال دلایا جاتا تھا:

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ	اے بنی اسرائیل! میری نعمتوں کا خیال
الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ	کرو جو مَیں نے تم کو دیں اور یہ کہ میں نے
عَلَی الْعٰلَمِیْنَ o (بقرہ - ۱۵)	تم کو تمام عالم پر فضیلت دی ہے

تبلیغِ اسلام کی حیثیت سے جو کچھ اس وقت اُن کے سامنے پیش کیا جاتا تھا صرف اس قدر تھا:

قُلْ یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا	کہ دو کہ اے اہلِ کتاب! ایک ایسی بات
اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍۭ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ	کی طرف آؤ جس کو ہم تم دونوں یکساں
اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشْرِکَ	مانتے ہیں، وہ یہ کہ ہم خُدا کے سوا کسی کو نہ
بِہٖ شَیْئًا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا	پوجیں اور اس کا کسی کو شریک نہ بنائیں
بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ ؕ	اور ہم میں سے کوئی خدا کو چھوڑ کر کسی کو اپنا
فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْھَدُوْا	رب نہ بنائے تو اگر وہ منہ پھیر لیں تو تم
بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۔ (آلِ عمران ۷ع)	کہ دو کہ اچھا تم گواہ رہو ہم تو مسلمان ہیں۔

اِن باتوں میں سے ایک بھی اُن کے معتقدات اور مزعومات کے خلاف نہ تھی، لیکن ان تمام مہربانیوں اور اظہارِ لُطف و مدارات کا جو صلہ تھا یہ تھا کہ انھوں نے ہر طرح سے اسلام کی خانہ براندازی کا عزم کر لیا۔

اسلام کی عظمت اور وقار کم کرنے کے لیے مشرکوں سے کہتے تھے کہ مذہب میں مسلمانوں سے تو تم ہی اچھے ہو:

وَیَقُوْلُوْنَ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوْا	اور ان کافروں کی نسبت کہتے ہیں
ھٰٓؤُلَآءِ اَھْدٰی مِنَ الَّذِیْنَ	کہ مسلمانوں سے یہ زیادہ ہدایت یافتہ
اٰمَنُوْا ، (نساء ۸)	ہیں۔

مذہب اسلام کی بے اعتباری پھیلانے کے لیے یہاں تک آمادہ ہوئے کہ مُسلمان ہوکر پھر مُرتد ہوجائیں تاکہ لوگوں کو خیال ہو کہ اگر یہ مذہب سچا ہوتا تو اس کو قبول کر کے کوئی کیوں چھوڑ دیتا:

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ، (آل عمران - ۸)

اور اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ مسلمانوں پر جو اُترا ہے اس پر صبح کو ایمان لاؤ اور شام کو اس سے پھر جاؤ، شاید کہ وہ لوگ (مسلمان) بھی پھر جائیں۔

ان باتوں کے علاوہ، اسلام کی بربادی کی مُلکی تدبیریں اختیار کیں۔ وہ یہ جانتے تھے کہ مُسلمانوں کو جو قوّت ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ انصار کے دو قبیلے "اوس" اور "خزرج" جو باہم لڑتے بھڑتے رہتے تھے، اسلام نے اُن کو باہم متحد کر دیا ہے۔ اِن دونوں کو اگر پھر لڑا دیا جائے تو اسلام خود بخود فنا ہو جائیگا۔ عرب میں پچھلی کینہ آوریوں کو تازہ کر دینا نہایت آسان کام تھا۔ ایک دفعہ دونوں قبیلوں کے بہت سے آدمی جلسہ میں بیٹھ کر بات چیت کر رہے تھے۔ چند یہودیوں نے اس صحبت میں جاکر جنگِ بعاث کا تذکرہ چھیڑا۔ یہ وہ لڑائی تھی، جس میں انصار کے یہ دونوں قبیلے آپس میں لڑے تھے، اور اسی لڑائی نے اُن کی تمام قوّت برباد کر دی تھی۔ اس لڑائی کے تذکرے نے دونوں کو پُرانے واقعے یاد دلائے۔ اور دفعۃً عداوت کی دبی ہوئی آگ بھڑک اُٹھی۔ لعن وطعن سے گزر کر تلواریں کھنچ گئیں۔ حُسنِ اتفاق سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوگئی۔ آپؐ نے فوراً موقع پر پہنچ کر وعظ وپند سے دونوں فریق کو ٹھنڈا کیا، اس پر یہ آیت اُتری[1]:

---

[1] اصابہ فی احوال الصحابہ للحافظ ابن حجر العسقلانی، مطبوعہ مصر جلد ا صفحہ ۸۸۔

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اِنْ تُطِيْعُوْا	مسلمانو! اگر تم اہلِ کتاب کے بعض
فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ	لوگوں کا کہا مانو گے تو وہ تم کو ایمان
يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ	لائے بعد پھر کافر بنا دیں گے۔

(آل عمران - ۱۰۰)

منافقین کا ایک گروہ پہلے سے موجود تھا، جو اگرچہ بظاہر مسلمان ہوگیا تھا، لیکن درحقیقت اسلام کا سخت دشمن تھا۔ اس گروہ کا سردار عبداللہ بن اُبی بن سلول تھا۔ یہودیوں نے اس کو نہایت آسانی سے درپردہ ملا لیا، اور اُن کے ساتھ مل کر سازش شروع کی۔ اتفاق یہ کہ عبداللہ بن اُبی پہلے سے بھی بنی نضیر کا حلیف اور ہم پیمان تھا۔

قریش نے بدر سے پہلے عبداللہ بن اُبی کو لکھا تھا کہ "مسلمانوں کو نکال دو، ورنہ ہم آکر تمھارا استیصال کر دیں گے"۔ لیکن جب اس میں کامیابی نہیں ہوئی، جس کی تفصیل اُوپر گزر چکی ہے تو بدر کے بعد اُنھوں نے یہود کو خط لکھا:

انکم اھل الحلقۃ والحصون	تم لوگوں کے پاس اسلحۂ جنگ اور قلعہ جات
وانکم تقاتلن صاحبنا	ہیں، تم ہمارے حریف (محمد صلی اللہ علیہ وسلم)
او لنفعلن کذا وکذا، ولا	سے لڑو ورنہ ہم تمھارے ساتھ یہ یہ کریں گے،
یحول بیننا وبین خدم	اور یہ کوئی چیز ہم کو تمھاری عورتیں کے
نسائکم شئ[1]	کڑول تک پہنچنے سے روک نہ سکے گی۔

ابوداؤد نے چونکہ بنو نضیر کے ذکر میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے اس لیے صرف بنو نضیر کا نام لیا ہے۔ ورنہ قریش کا خط عام یہود کے نام تھا اور نتیجہ بھی

---

[1] سنن ابی داؤد، ذکر نضیر (کتاب الخراج والامارۃ) "س"

عام تھا۔ اسی بنا پر محدث حاکم نے بنو نضیر اور قینقاع دونوں کے واقعے کو ایک ہی واقعہ خیال کیا ہے، غرض اب یہ حالت ہوگئی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم راتوں کو گھر سے نکلتے تھے تو یہودیوں کی وجہ سے جان کا خطرہ رہتا تھا۔ حضرت طلحہ بن برار ایک صحابی تھے، (انھوں نے انتقال کے وقت) وصیت کی کہ اگر میں رات کے وقت مروں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر نہ کرنا، اس لیے کہ یہود کی طرف سے ڈر ہے، ایسا نہ ہو کہ میری وجہ سے آپ پر حادثہ گزر جائے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر نے اصابہ میں ابوداؤد وغیرہ کی سند سے پورا واقعہ نقل کیا ہے[۱]۔

شوال سنہ ۲ھ
غزوۂ بنی قینقاع

بدر کی فتح نے یہود کو زیادہ اندیشہ ناک کر دیا، ان کو علانیہ نظر آیا کہ اسلام اب ایک طاقت بنا جاتا ہے اور چونکہ قبائلِ یہود میں سب سے زیادہ جری اور بہادر قینقاع تھے[۲]۔ اس لیے سب سے پہلے انھی نے اعلانِ جنگ کی جرأت کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو معاہدہ کیا تھا، سب سے پہلے انھی نے اس کی عہد شکنی کی۔ ابن ہشام و طبری نے ابن اسحاق کی روایت سے عاصم بن قتادہ انصاری کی روایت نقل کی ہے:

ان بنی قینقاع کانوا اول یھودٍ نقضوا ما بینھم و بین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، وحاربوا فیما بین بدرٍ و احدٍ	بنو قینقاع پہلے یہود تھے جنھوں نے اس معاہدہ کو جو ان میں اور آنحضرت صلی اللہ میں تھا توڑ ڈالا، اور بدر اور احد کے درمیانی زمانہ میں مسلمانوں سے لڑائی کی۔

---

[۱] دیکھو اصابہ ترجمہ طلحہ بن برار [۲] طبقات ابن سعد ج ۲ قسم اول ص ۱۹، "س"۔

ابن سعد نے غزوۂ بنو قینقاع کے ذکر میں لکھا ہے:

فلمّا کانت وقعة بدر — واقعۂ بدر میں یہودیوں نے شورش
اظهروا البغی والحسد و — اور حسد ظاہر کیا اور عہد کو
نبذوا العهد والمرّة۔ — توڑ دیا۔

زرقانی ج ۱ ص ۵۲۹

ایک اتفاقیہ سبب پیش آگیا جس نے اس آگ کو اور بھڑکا دیا۔ ایک انصاری (کی بیوی) مدینہ کے بازار میں ایک یہودی کی دکان میں (نقاب پوش آئیں) یہودیوں نے ان کی بے حرمتی کی۔ ایک مسلمان یہ دیکھ کر غیرت سے بیتاب ہوگیا اور اس نے یہودی کو مار ڈالا، یہودیوں نے مسلمان کو قتل کر دیا۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کو جب یہ حالات معلوم ہوئے تو اُن کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ "خدا سے ڈرو، ایسا نہ ہو تم پر بھی بدر والوں کی طرح عذاب آئے"۔ بولے کہ "ہم قریش نہیں ہیں، ہم سے معاملہ پڑے گا تو ہم دکھا دیں گے کہ لڑائی اس کا نام ہے"۔ چونکہ ان کی طرف سے نقضِ عہد اور اعلانِ جنگ ہوگیا تھا مجبور ہو کر آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے لڑائی کی، وہ قلعہ بند ہوئے۔ پندرہ دن تک محاصرہ رہا۔ بالآخر اس پر راضی ہوئے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم جو فیصلہ کریں گے اُن کو منظور ہوگا۔ عبداللہ بن اُبیّ ان کا حلیف تھا، اس نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم سے درخواست کی کہ وہ جلا وطن کر دیئے جائیں۔ غرض وہ اذرعات

ل عام ارباب سیر کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم اُن کو قتل کر دینا چاہتے تھے۔ عبداللہ ابن اُبیّ کے اصرار سے مجبور ہو گئے۔ لیکن سنن ابی داؤد میں جس طرح یہ واقعہ مذکور ہے، اس سے اس قیاس کی غلطی ثابت ہوتی ہے۔

میں جو شام کے علاقے میں ہے، جلا وطن کر دیے گئے۔ یہ سات سو شخص تھے جن میں تین سو زرہ پوش تھے، یہ شوال ۲ھ کا واقعہ ہے۔

قتل کعب بن اشرف ربیع الاول ۳ھ

یہودیوں میں کعب بن اشرف ایک مشہور شاعر تھا۔ اس کے باپ اشرف نے جو قبیلہ طے سے تھا، مدینہ میں بنو نضیر کا حلیف ہو کر اس قدر عزت اور اعتبار پیدا کیا، کہ ابو رافع ابن ابی الحقیق جو یہود کا مقتدا اور تاجر الحجاز جس کا خطاب[1] تھا، اس کی لڑکی سے شادی کی، کعب اس کے بطن سے پیدا ہوا۔ اس دو طرفہ رشتہ داری کی بنا پر کعب یہود اور عرب سے برابر کا تعلق رکھتا تھا، اور شاعری کی وجہ سے قوم پر اس کا عام اثر تھا۔ رفتہ رفتہ دولتمندی کی وجہ سے تمام یہودیانِ عرب کا رئیس بن گیا۔ یہودی علماء اور پیشوایانِ مذہب کی تنخواہیں مقرر کیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں تشریف لائے اور علمائے یہود اس سے ماہواریں لینے آئے تو اس نے ان لوگوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق رائے دریافت کی، اور جب اپنا ہم خیال بنا لیا تب اُن کے مقررہ روزینے جاری کیے[2]۔

اس کو اسلام سے سخت عداوت تھی، بدر کی لڑائی میں سردارانِ قریش مارے گئے، تو اس کو نہایت صدمہ ہوا۔ تعزیت کے لیے مکہ گیا۔ کشتگانِ بدر کے پُر درد مرثیے جن میں انتقام کی ترغیب تھی۔ لوگوں کو جمع کر کے نہایت درد سے پڑھتا اور روتا اور رُلاتا تھا۔ ابنِ ہشام نے ان واقعات کے ساتھ اشعار بھی نقل کیے ہیں۔ اگرچہ اس قسم کے اشعار اکثر مصنوعی ہیں۔ تاہم جہاں تک اس زمانے کی

---

[1] صحیح بخاری باب قتل الناائم المشرک [2] الخمیس صفحہ ۴۶۴ [3] زرقانی ج ۲ صفحہ ۹ بحوالہ ابن اسحاق وغیرہ۔

زبان معلوم ہوتی ہے، ہم ایک دو شعر نقل کرتے ہیں:

طحنت رحی بدر لمهلك اهله	جنگِ بدر کی چکی نے اہلِ بدر کو پیس ڈالا،
ولمثل بدر تستهل وتدمع	بدر جیسے واقعات کے لیے رونا پیٹنا چاہیے
کم قد اُصیبَ به من ابیض ماجد	کتنے شریف سپید و بارونق چہرے جن کے
ذی بهجة تاوی الیه الضُیّع،	یہاں اہلِ حاجت پناہ لیتے تھے، مارے گئے۔

مدینہ میں واپس آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں اشعار کہنا، اور لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے برخلاف برانگیختہ کرنا شروع کیا[1]۔

عرب میں شاعری کا وہ اثر تھا جو آج یورپ میں بڑے بڑے ملکی مدبروں کی پرجوش تقریروں اور نامور اخبارات کی تحریروں کا ہوتا ہے۔ تنہا ایک شاعر قبیلہ میں شعر کے اثر سے آگ لگا دیتا تھا۔

ایک روایت میں ہے کہ مکہ میں چالیس[2] آدمی لے کر گیا، وہاں ابوسفیان سے ملا، اور اس کو بدر کے انتقام پر برانگیختہ کیا، اور ابوسفیان سب کو لے کر حرم میں آیا۔ سب نے حرم کا پردہ تھام کر معاہدہ کیا کہ بدر کا انتقام لیں[3] گے۔

اس پر اکتفا نہ کر کے قصد کیا کہ چھپکے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرا دے۔

علامہ یعقوبی اپنی تاریخ میں بنو نضیر کے واقعہ میں لکھتے ہیں:

---

[1] ابوداؤد میں ہے وکان کعب بن الاشرف یھجو النبی صلی اللہ علیہ وسلم ویحرض علیہ کفار قریش، (ابوداؤد جلد ۲ باب کیف کان اخراج الیہود کتاب الخراج والامارہ) "س" ابن سعد میں ہے، کان رجلا شاعرا یھجو النبی واصحابہ ویحرض علیہ۔ تفسیر ابن جریر طبری ج ۵ صفحہ ۹، میں ہے، ان کعب بن اشرف انطلق الی المشرکین من کفار قریش فاستجاشہم علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم وامرھم ان یغزوہ، "س" [2] خمیس ۱۷ ص ۵ غالباً

كعب بن الاشرف اليهودي الذي اراد ان يمكر برسول الله صلى الله عليه وسلم۔ — کعب بن اشرف یہودی جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دھوکے میں قتل کر دینا چاہا۔

اس روایت کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں بذکر کعب اشرف ایس عکرمہ کی سند سے نقل کی ہے کہ کعب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت میں بلایا اور لوگوں کو متعین کر دیا، کہ جب آپؐ تشریف لائیں تو دھوکے سے آپؐ کو ہلاک کر دیں۔ حافظ ابن حجر نے گو لکھا ہے کہ اس روایت کی سند میں ضعف ہے۔ لیکن جب قرائن اور دیگر شواہد موجود ہیں تو یہ ضعف رفع ہو جاتا ہے۔

فتنہ انگیزی کا زیادہ اندیشہ ہوا تو آپؐ نے بعض صحابہؓ سے شکایت کی اور آپ کی مرضی سے حضرت محمدؓ بن مسلمہ نے بہ مشورہ رؤسائے اوس جا کر اس کو ربیع الاول سنہ ۳ھ میں قتل کر دیا، ارباب روایت نے لکھا ہے کہ حضرت محمدؓ بن مسلمہ نے آپؐ کی خدمت میں یہ بھی عرض کیا تھا کہ "ہم کو کچھ کہنے کی اجازت دی جائے" ارباب سیر نے اس کے معنی یہ لگائے ہیں کہ انھوں نے جھوٹ باتیں کہنے کی اجازت مانگی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی، کیونکہ اَلْحَرْبُ خُدْعَةٌ "یعنی لڑائی میں دھوکا دینا جائز ہے" لیکن بخاری کی روایت میں صرف یہ لفظ ہے:

فاذن لی ان اقول — ہم کو اجازت دی جائے کہ ہم گفتگو کریں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۱۳) یہ وہی پہلا واقعہ ہے۔ ابن خمیس نے اس کے متعلق مزید تفصیل بیان کی ہے (لہ ج، ۲ صفحہ ۲۵۹) "س" (لہ ابن سعد، مغازی صفحہ ۲۱)

اس سے غلط گوئی کی اجازت کہاں نکلتی ہے ؟ لیکن جو گفتگو ہوئی اس سے کعب اور عموماً یہود کے اخلاق اور دلی خیالات کا پتہ چلتا ہے۔ حضرت محمدؓ بن مسلمہ نے نے کہا "ہم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پناہ دے کر تمام عرب کو اپنا دشمن بنالیا اور ہم سے بار بار صدقہ مانگا جاتا ہے۔ اب تمہیں سے کچھ رکھ کر قرض لینا ہے" کعب نے کہا "تم خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اکتا جاؤ گے اچھا قرض کے لیے اپنی بیویوں کو رہن رکھو" محمدؓ بن مسلمہ نے کہا "تمھارے اس حسن و جمال کے سبب سے ہم کو اپنی بیویوں پر وفاداری کا یقین نہیں" اس نے کہا "اچھا اپنے بچوں کو گرو رکھو" انھوں نے کہا "اس سے تو تمام عرب میں ہماری بدنامی ہوگی۔ ہم اپنے ہتھیار گرو رکھیں گے، اور تم جانتے ہو آجکل ان کی جیسی ضرورت ہے"

صحیح بخاری میں جو روایت ہے اس میں قتل کا واقعہ اس طرح منقول ہے کہ ان لوگوں نے دوستانہ طریقے سے اس کو گھر سے باہر بلایا، پھر بال سونگھنے کے بہانے سے اس کی چوٹی پکڑلی اور قتل کر ڈالا۔ لیکن روایت میں یہ مذکور نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان باتوں کی اجازت دی تھی۔ اس وقت عرب میں ان طریقوں سے قتل کرنا معیوب بات نہ تھی۔ آگے چل کر نہایت مفصل طور سے ایک مستقل عنوان میں یہ بحث آئے گی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح تدریج کے ساتھ عرب کے ان طریقوں کی اصلاح کی۔

غزوۂ بنو نضیر
ربیع الاول سنہ ۴ھ

حضرت عمرو بن امیہ نے قبیلۂ عامر کے (جو) دو آدمی قتل کردیے تھے اور جن کا خونبہا اب تک واجب الادا تھا، اور جس کا ایک حصہ معاہدہ کی رو سے یہود بنی نضیر پر واجب الادا تھا، اس کے

---

۱ زرقانی ج ۲ ص ۱۳ و صحیح بخاری قتل کعب بن اشرف "س" ۲ صحیح بخاری باب قتل کعب دکتاب المغازی "س"

مطالبہ[۵] کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنو نضیر کے پاس تشریف لے گئے انھوں نے قبول کیا، لیکن در پردہ یہ سازش کی کہ ایک شخص چپکے سے بالاخانے پر چڑھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھر گرا دے۔ اتفاق سے اُس وقت آپ بالاخانے کی دیوار کے سایے میں کھڑے تھے۔ عمرو بن حجاش ایک یہودی اس ارادے سے کوٹھے پر چڑھا، آپؐ کو اس کے ارادے کا حال معلوم ہوگیا اور آپؐ فوراً مدینہ واپس چلے آئے[۵۲]

اُوپر گزر چکا ہے کہ قریش نے بنو نضیر کو کہلا بھیجا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کر دو، ورنہ ہم خود آکر تمھارا بھی استیصال کر دیں گے۔ بنو نضیر پہلے سے اسلام کے دُشمن تھے۔ قریش کے پیغام نے ان کو اور زیادہ آمادہ کیا۔ بنو نضیر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پیغام بھیجا کہ آپؐ تیس آدمیوں کو لے کر آئیں، ہم بھی اپنے احبار لے کر آئیں گے۔ آپ کا کلام سُن کر اگر ہمارے احبار آپؐ کی تصدیق کریں گے تو

---

(۵) بنی نضیر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت کے متعلق جو گفتگو فرمائی اس کی دو تشریحیں کی گئیں ہیں، ایک تشریح تو وہ ہے جس کو مصنف نے اختیار فرمایا ہے، دوسری تشریح یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو نضیر سے جو گفتگو فرمائی تھی اس کا ماحصل یہ ہے کہ قبیلۂ عامر کو دیت کس طرح ادا کی جائے اور ان کے یہاں دیت کا دستور کیا ہے۔ بنی نضیر اور قبیلۂ عامر کے باہم تعلقات اچھے تھے اس لیے ان سے اس مسئلہ میں گفتگو قرین قیاس بھی ہے (سیرۃ حلبیہ ج ۲ ص ۲۷۶) "س" ۵۲ یہ روایت ابن ہشام وغیرہ میں مذکور ہے۔ زرقانی نے موسیٰ بن عقبہ کی مغازی سے جو صحیح ترین مغازی ہے یہ عبارت نقل کی ہے وانواقد دسّوا الی قریش فی قتالہ صلی اللہ علیہ وسلم فحضوہم علی القتال، دلوہم علی العورۃ (زرقانی جلد ۲ ص ۹۳) یعنی ان لوگوں نے قریش سے در پردہ سازش کر کے ان کو آمادہ جنگ کیا اور ان کو مخفی موقع بتلائے۔

ہم کو بھی کچھ عذر نہ ہوگا، چونکہ وہ بغاوت کی تیاری کر چکے تھے، آپؐ نے کہلا بھیجا کہ جب تک تم ایک معاہدہ نہ لکھ دو میں تم پر اعتماد نہیں کر سکتا لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوئے۔ آپؐ یہودِ بنی قریظہ کے پاس تشریف لے گئے، اور ان سے تجدید معاہدہ کی درخواست کی، اُنھوں نے تعمیل کی۔ بنو نضیر کے لیے یہ نظیر موجود تھی کہ اُن کے برادرانِ دینی نے معاہدہ لکھ دیا ہے، لیکن وہ کسی طرح معاہدہ کرنے پر راضی نہ ہوئے[1]۔ بالآخر انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ آپؐ تین آدمی لے کر آئیں، ہم بھی تین عالم ساتھ لے کر آتے ہیں۔ یہ علماء اگر آپؐ پر ایمان لائیں گے تو ہم بھی لائیں گے۔ آپؐ نے منظور فرمایا۔ لیکن راہ میں آپؐ کو ایک صحیح ذریعہ سے معلوم ہوا کہ یہود تلواریں باندھ کر تیار ہیں کہ جب آپؐ تشریف لائیں تو آپؐ کو قتل کر دیں[2]۔

بنو نضیر کی سرکشی کے مختلف اسباب تھے۔ وہ نہایت مضبوط قلعوں میں پناہ گزیں تھے، جن کا فتح کرنا آسان نہ تھا۔ اس کے ساتھ عبداللہ بن

---

[1] یہ تمام تفصیل سنن ابی داؤد (خبر النضیر کتاب الخراج والامارہ "ص ") میں ہے تعجب ہے کہ اربابِ سیرت ابوداؤد کی اس روایت سے بالکل بے خبر ہیں۔

[2] فتح الباری واقعہ غزوہ بنو نضیر جلد سابع صفحہ ۲۵۵، فتح الباری میں یہ روایت ابن مردویہ سے نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے۔ صحیح بخاری سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بنو نضیر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قسم کی عیاری کا ارادہ کیا تھا۔ بخاری میں ترجمۃ الباب یہ ہے باب حدیث بنی النضیر و مخرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الیھم فی دیۃ الرجلین وما ارادوا من الغدر برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اُبی نے کہلا بھیجا تھا کہ تم اطاعت نہ کرنا، بنو قریظہ تمہارا ساتھ دیں گے، اور میں دو ہزار آدمی لے کر تمہاری اعانت کو آؤں گا۔" قرآن مجید میں ہے:

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ نَافَقُوۡا	تم نے دیکھا! منافق اپنے کافر
یَقُوۡلُوۡنَ لِاِخۡوَانِہِمُ الَّذِیۡنَ	بھائیوں سے کہتے ہیں کہ تم نکلوگے
کَفَرُوۡا مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ لَئِنۡ	تو ہم بھی تمہارے ساتھ نکلیں گے،
اُخۡرِجۡتُمۡ لَنَخۡرُجَنَّ مَعَکُمۡ	اور ہم تمہارے باب میں کسی کا کہنا
وَلَا نُطِیۡعُ فِیۡکُمۡ اَحَدًا اَبَدًا	نہ مانیں گے، اور اگر تم سے کوئی
وَّاِنۡ قُوۡتِلۡتُمۡ لَنَنۡصُرَنَّکُمۡ ۔	لڑا تو ہم بھی تمہاری مدد کو
(سورۂ حشر۔ ۲)	آئیں گے۔

لیکن بنو نضیر کے تمام خیالات غلط نکلے۔ بنو قریظہ نے ان کا ساتھ نہیں دیا، اور منافق علانیہ اسلام کے مقابلے میں آ نہیں سکتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پندرہ دن تک ان کا محاصرہ کیا۔ قلعہ کے گرد جو اُن کے نخلستان تھے، اُن کے چند درخت کٹوا دیے۔ سہیلی نے روض الانف میں لکھا ہے کہ سب نخلستان نہیں کاٹا گیا، بلکہ صرف لینۃ جو ایک خاص قسم کی کھجور ہے اور عرب کی عام خوراک نہیں ہے اُس کے درخت کٹوا دیے گئے تھے۔ قرآن مجید میں بھی اس کا ذکر ہے:

مَا قَطَعۡتُمۡ مِّنۡ لِّیۡنَۃٍ اَوۡ	تم نے لینہ کے جو درخت کٹوائے
تَرَکۡتُمُوۡہَا قَآئِمَۃً عَلٰۤی اُصُوۡلِہَا	اور جس قدر قائم رہنے دیے سب
فَبِاِذۡنِ اللّٰہِ وَلِیُخۡزِیَ الۡفٰسِقِیۡنَ	خدا کے حکم سے تھا، تاکہ خدا فاسقوں
(سورۂ حشر۔ ۱)	کو رسوا کرے۔

ممکن ہے کہ درختوں کے جھنڈ سے کمین گاہ کا کام لیا جاتا ہو، اس لیے وہ

صاف کرادیے گئے کہ محاصرہ میں کوئی چیز حائل نہ ہو[1]

بالآخر بنو نضیر اس شرط پر راضی ہوئے کہ جس قدر مال و اسباب اونٹوں پر لے جاسکیں لے جائیں، اور مدینہ سے باہر نکل جائیں۔ چنانچہ سب گھروں کو چھوڑ چھوڑ کر نکل گئے، ان میں سے معزز رؤسا مثلاً سلام بن ابی الحقیق، کنانہ بن الربیع، حُیَیٌ بن اخطب خیبر چلے گئے، وہاں لوگوں نے اُن کا اس قدر احترام کیا کہ خیبر کا رئیس تسلیم کر لیا[2] اس واقعہ کو اس غرض سے یاد رکھنا چاہیے کہ یہ غزوۂ خیبر کی داستان کا دیباچہ ہے۔

بنو نضیر اگرچہ وطن چھوڑ کر نکلے، لیکن اس شان سے نکلے کہ جشن کا دھوکا ہوتا تھا، اونٹوں پر سوار تھے، ساتھ ساتھ باجا بجتا جاتا تھا، مطربہ عورتیں دف بجاتی اور گاتی تھیں۔ عروۃ بن الورد عبسی مشہور شاعر کی بیوی کو یہود نے خرید لیا تھا، وہ بھی ساتھ ساتھ تھی۔ اہلِ مدینہ کا بیان ہے کہ اس سرو سامان کی سواری کبھی ان کی نظر سے نہیں تھی[3] ہتھیاروں کا ذخیرہ جو ان لوگوں نے چھوڑا، اس میں پچاس[5] زرہیں، پچاس خود اور تین سو چالیس

---

(۱) مصنف کے اس خیال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ امام احمدؒ کے نزدیک درخت وغیرہ میدان جنگ میں اسی وقت کاٹے جاتے ہیں جبکہ کاٹے بغیر چارہ کار نہ ہو۔ محدثین نے امام احمد کا یہ قول اسی واقعہ کے ضمن میں لکھا ہے۔ نیز اس موقع پر یہ بھی لکھا ہے کہ اسحاق کا قول ہے کہ اگر دشمن درختوں کے آڑ میں ہو تو ان میں آگ لگا دینا سنت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان ائمہ کے نزدیک اس موقع پر درخت کا کاٹنا جنگی ضرورت کا اقتضا تھا۔ عمدۃ القاری ج ۸ ص ۱۹۱ "س"

(۲) طبری صفحہ ۱۴۵۲ (۳) یہ تفصیل طبری میں ہے (ص ۱۴۵۲) "س"

تلواریں تھیں۔ ان کے جانے کے بعد یہ جھگڑا پیش آیا کہ انصار کی اولاد جنھوں نے یہودی مذہب اختیار کرلیا تھا اور یہودی ان کو اتحادِ مذہب کی وجہ سے ساتھ لیے جاتے تھے۔ انصار نے ان کو روک لیا کہ ہم ان کو نہ جانے دیں گے۔ اس پر قرآن مجید کی یہ آیت اُتری:

لَآ اِكْرَاهَ فِی الدِّيْنِ۔ یعنی مذہب میں زبردستی نہیں ہے۔

ابوداؤد نے کتاب الجہاد "باب فی الاسیر یکرہ علی الاسلام" کے عنوان کے نیچے اس واقعہ کو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کیا ہے۔

Altaf Hussain Ladla

۵ھ

غزوۂ مُریسیع، واقعہ اِفک و غزوۂ احزاب

قریش اور یہود کی متفقہ سازش نے اب مکہ سے لے کر مدینہ تک آگ لگا دی۔ جس قدر قبائل تھے سب نے مدینہ پر حملے کی تیاریاں شروع کر دیں، سب سے پہلے انمار اور ثعلبہ نے یہ ارادہ کیا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہو گئی۔ ۱۰ محرم ۵ھ کو آپؐ مدینہ سے چار سو صحابہ کو لے کر نکلے، اور ذات الرقاع تک تشریف لے گئے۔ لیکن آپؐ کی آمد سُن کر وہ پہاڑوں میں بھاگ[1] گئے۔

ربیع الاول ۵ھ میں یہ خبر آئی کہ دومۃ الجندل میں کفار کی ایک عظیم الشان فوج جمع ہو رہی ہے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک ہزار کی جمعیت لے کر مدینہ سے نکلے، اُن کو خبر ہوئی تو وہ بھاگ گئے۔

غزوۂ مُریسیع[2] یا بنی مصطلق
شعبان ۵ھ

خزاعہ ایک قبیلہ تھا جو قریش کا حلیف اور ہم عہد تھا۔ قریش کو ایک زمانہ میں یہ خیال آیا کہ ہم ابراہیم

[1] ابن سعد غزوۂ ذات الرقاع صفحہ ۴۳۔ صحیح بخاری سے ظاہر ہوتا ہے کہ غزوہ ذات الرقاع خندق کے بعد واقع ہوا، صلوٰۃ الخوف سب سے پہلے اسی غزوہ میں ادا کی گئی۔ [2] ابن اسحاق نے جس کی

کی نسل سے ہیں۔ اس لیے ہم کو اوروں سے ہر باب میں ممتاز ہونا چاہیے۔
حج کا ایک بڑا رکن عرفات کے میدان میں قیام کرنا ہے لیکن چونکہ یہ میدان، حرم کی حدود سے باہر ہے۔ قریش نے یہ قاعدہ قرار دیا کہ لوگ عرفات جائیں، لیکن ہم کو عرفات کے بجائے مزدلفہ میں ٹھہرنا چاہیے، جو حدودِ حرم کے اندر ہے۔ اسی قسم کی اور امتیازی باتیں قائم کیں، ان خصائص کی بنا پر اپنا لقب احمس رکھا۔ لیکن اس قدر فیاضی کی کہ جو لوگ ان پابندیوں کو قبول کر لیتے تھے ان کو بھی یہ لقب دے دیتے، اور ان سے رشتہ ناتہ کرتے تھے، قبیلہ خزاعہ[۵] کو بھی یہ شرف عطا کیا تھا۔

خزاعہ کا ایک خاندان بنو المصطلق کہلاتا تھا، وہ مقام مریسیع میں جو مدینہ منورہ سے ۹ منزل ہے آباد تھا۔ اس خاندان کا رئیس حارث بن ابی ضرار تھا۔ اس نے قریش کے اشارے سے یا خود مدینہ پر حملے کی تیاریاں شروع کیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو مزید تحقیقات کے لیے حضرت زید رضی بن خصیب کو بھیجا۔ انھوں نے واپس آکر خبر کی تصدیق کی۔ آپ نے صحابہ کو تیاری کا حکم دیا۔ ۲ شعبان کو فوجیں مدینہ سے روانہ ہوئیں۔ مریسیع میں خبر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۲۱) پیروی طبری اور ابن ہشام نے کی ہے، اس غزوہ کو سنہ ۶ھ میں ذکر کیا ہے۔ موسیٰ بن عقبہ کی روایت ہے کہ سنہ ۵ھ میں واقع ہوا۔ امام بخاری نے بھی صحیح میں اس اختلاف کا ذکر کیا ہے لیکن غلطی سے سنہ ۵ھ کے بجائے ابن عقبہ کی طرف سنہ ۴ھ کی نسبت کی ہے۔ علامہ ابن حجر نے فتح الباری (جلد ۷، صفحہ ۳۳۲) میں بیہقی، حاکم، موسیٰ بن عقبہ اور ابو معشر کی روایتوں سے سنہ ۵ھ کو ترجیح دی ہے۔ ابن سعد نے بھی سنہ ۵ھ ہی لکھا ہے تفصیل کے لیے دیکھو فتح الباری) ۱۲

۵ یہ واقعات ابن ہشام نے تفصیل سے لکھے ہیں (صفحہ ۶۷ جلد اول)

خبر پہنچی تو حارث کی جمعیت منتشر ہوگئی، اور وہ خود بھی کسی طرف نکل گیا لیکن مریسیع میں جو لوگ آباد تھے، اُنھوں نے صف آرائی کی اور دیر تک جم کر تیر برساتے رہے مسلمانوں نے دفعۃً ایک ساتھ حملہ کیا تو اُن کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ (دس) آدمی مارے گئے اور باقی گرفتار ہوگئے، جن کی تعداد تقریباً ۶۰۰ تھی۔ غنیمت میں دو ہزار اُونٹ اور پانچ ہزار بکریاں ہاتھ آئیں۔

یہ ابن سعد کی روایت ہے، صحیح بخاری[۱] اور صحیح مسلم[۲] میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو المصطلق پر اس حالت میں حملہ کیا کہ وہ بالکل بے خبر اور غافل تھے اور اپنے مویشیوں کو پانی پلا رہے تھے۔ ابن سعد[۳] نے اس روایت کو بھی نقل کیا ہے لیکن لکھا ہے کہ پہلی روایت زیادہ صحیح ہے۔ اس پر حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا کہ صحیحین کی روایت پر سیرت کی روایتوں کو ترجیح نہیں ہو سکتی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ صحیحین کی روایت بھی اصول حدیث کے رُو سے قابل حجت نہیں کہ اس روایت کا سلسلہ نافع تک پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے اور جنگ میں شریک ہونا تو ایک طرف، نافع نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا بھی نہ تھا، اس لیے یہ روایت اصطلاح محدثین میں منقطع[۴] ہے۔

---

[۱] باب العتق [۲] کتاب الجہاد والسیر [۳] طبقات ابن سعد جلد مغازی صفحہ ۴۵ و ۴۶

[۴] معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے صرف آغاز سند کو ملاحظہ فرما کر اس روایت کو منقطع قرار دیا ہے، ورنہ متن حدیث کے بعد تصریح ہے کہ حدثنی هذا الحديث عبد الله ابن عمرو كان فی ذالك الجيش یعنی نافع نے اس روایت کو حضرت عبداللہ بن عمر سے سنا جو اس لڑائی میں شریک تھے۔ (مسلم کتاب الجہاد و بخاری کتاب العتق) اس تصریح کے بعد یہ روایت منقطع نہیں باقی رہتی ہے۔ "س"

یہ لڑائی ایک معمولی لڑائی تھی، لیکن اتفاق سے بعض شہرت پذیر واقعات ایسے پیش آئے جن کی وجہ سے اس لڑائی کا خاص عنوان قائم کیا جاتا ہے۔ اس جنگ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ غنیمت کے لالچ سے بہت سے منافقین بھی فوج میں داخل ہو گئے تھے۔ یہ بدباطن ہر موقع پر فتنہ گری کی کوشش کرتے تھے۔ ایک دن چشمہ سے پانی لینے پر ایک مہاجر اور انصاری میں جھگڑا ہو گیا۔ انصاری نے عرب کے قدیم طریقہ پر یا للانصار کا نعرہ مارا، (انصار کی جے) مہاجر نے بھی یا معاشر المہاجرین کے نعرہ سے جواب دیا۔ نعرے سن کر قریش و انصار نے تلواریں کھینچ لیں، اور قریب تھا کہ جنگ چھڑ جائے لیکن چند لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ عبداللہ ابن ابی جو رئیس المنافقین تھا، اس کو موقع ہاتھ آیا۔ انصار سے مخاطب ہو کر کہا "تم نے یہ بلا خود مول لی، مہاجرین کو تم نے بلا کر اتنا کر دیا کہ اب وہ خود تم سے برابر کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اب بھی ہاتھ سے نہیں گیا ہے، تم دستگیری سے ہاتھ اٹھا لو تو وہ خود یہاں سے نکل جائیں گے"!

(یہ واقعہ لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آ کر کہا حضرت عمرؓ بھی موجود تھے، غصہ سے بے تاب ہو گئے اور عرض کی کہ کسی کو ارشاد ہو اس منافق کی گردن اڑا دے۔ آپؐ نے فرمایا کہ کیا تم یہ چرچا پسند کرتے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھ والوں کو قتل کر دیا کرتے ہیں؟[1])

یہ عجیب بات ہے کہ عبداللہ بن ابی جس درجہ کا منافق اور دشمن اسلام تھا، اس کے صاحبزادے کہ ان کا نام بھی عبداللہ تھا، اسی قدر اسلام کے جان نثار تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضی کی بنا پر یہ خبر پھیل گئی تھی کہ آپؐ

---

[1] دیکھو صحیح بخاری صفحہ ۸۲۸۔

عبداللہ بن اُبَیؓ کے قتل کا حکم دینے والے ہیں۔ یہ سُن کر وہ خدمتِ اقدسؐ میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ دُنیا جانتی ہے کہ میں باپ کا کس قدر خدمتگزار ہوں، لیکن اگر یہ مرضی ہے تو مجھی کو حکم ہو، میں ابھی اس کا سر کاٹ لاتا ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ آپؐ کسی اَور کو حکم دیں اور میں غیرت و محبت کے جوش میں آکر قاتل کو قتل کر دوں۔" آپؐ نے اطمینان دلایا کہ قتل کی بجائے میں اس پر مہربانی کروں گا[۵]۔ یہ ارشاد اس طرح پُورا ہوا کہ جب وہ مرا تو کفن کے لیے آپؐ نے خود پیراہنِ مبارک عنایت فرمایا۔ جنازہ کی نماز پڑھائی (حضرت عمرؓ نے دامن تھام لیا کہ منافق کے جنازے کی نماز پڑھتے ہیں!) لیکن دریائے کرم کا بہاؤ کون روک سکتا تھا؟

حضرت جویریہؓ کا واقعہ

لڑائی میں جو لوگ گرفتار ہوئے اُن میں حضرت جویریہؓ بھی تھیں، جو حارث بن ابی ضرار کی بیٹی تھیں۔ ابن اسحاق کی روایت ہے، جو بعض حدیث کی کتابوں میں بھی ہے کہ تمام اسیرانِ جنگ لونڈی غلام بنا کر تقسیم کر دیے گئے۔ حضرت جویریہؓ حضرت ثابتؓ بن قیس کے حصے میں آئیں۔ انھوں نے حضرت ثابت سے درخواست کی کہ "مکاتبت کر لو" یعنی مجھ سے کچھ روپیہ لے کر چھوڑ دو"۔ حضرت ثابتؓ نے منظور کیا۔ حضرت جویریہ کے پاس روپیہ نہ تھا، چاہا کہ لوگوں سے چندہ مانگ کر یہ رقم ادا کر دیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھی آئیں۔ حضرت عائشہؓ بھی وہاں موجود تھیں۔ ابن اسحاق نے حضرت عائشہؓ کی زبانی روایت کی ہے جو یقیناً اُن کی

---

[۵] یہ تمام واقعات نہایت تفصیل سے ابن سعد اور طبری نے لکھے ہیں اور صحیح بخاری کے مختلف ابواب میں بھی مذکور ہیں۔

ذاتی رائے ہے کہ چونکہ حضرت جویریہؓ نہایت شیریں ادا تھیں، میں نے اُن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاتے دیکھا تو سمجھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ان کے حسن و جمال کا وہی اثر ہوگا جو مجھ پر ہوا۔ غرض وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئیں۔ (آپؐ نے فرمایا اگر اس سے بہتر برتاؤ تمہارے ساتھ کیا جائے تو قبول کروگی؟ اُنھوں نے پوچھا وہ کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا تمہاری طرف سے مَیں روپیہ ادا کردوں اور تم کو اپنی زوجیت میں لے لوں۔ حضرت جویریہؓ نے کہا میں نے منظور کیا ہے۔ آپؐ نے تنہا وہ تمام رقم ادا کردی اور اُن سے شادی کرلی"۔

یہ ابن اسحاق کی روایت ہے جو ابن ہشام اور ابو داؤد، دونوں میں موجود ہے لیکن دوسرے طریق روایت میں اس سے زیادہ واضح بیان مذکور ہے۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ حضرت جویریہ رضؓ کا باپ (حارث) رئیس عرب تھا۔ حضرت جویریہ رضؓ جب گرفتار ہوئیں تو حارث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور کہا کہ میری بیٹی کنیز نہیں بن سکتی، میری شان اس سے بالاتر ہے، آپؐ اُس کو آزاد کردیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ خود جویریہؓ کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے؟ حارث نے جاکر جویریہ سے کہا کہ محمدؐ نے تیری مرضی پر رکھا، دیکھنا مجھ کو رُسوا نہ کرنا۔ اُنھوں نے کہا "میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہنا پسند کرتی ہوں"۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے شادی کرلی۔

یہ روایت حافظ ابن حجر نے اصابہ میں، ابن مندہ سے نقل کرکے لکھا ہے کہ اسکی

---

[۱] ابوداؤد کتاب العتاق۔

سند صحیح ہے؛" ابن سعد میں بھی یہ روایت مذکور ہے۔ ابن سعد نے طبقات میں یہ روایت بھی کی ہے کہ حضرت جویریہ رضؓ کے والد نے ان کا زرِ فدیہ ادا کیا، اور جب وہ آزاد ہوگئیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے نکاح کیا۔

اس نکاح کا اثر حضرت جویریہ رضؓ سے جب آپؐ نے نکاح کیا تو تمام اسیرانِ جنگ جو اہلِ فوج کے حصّے میں آگئے تھے دفعتاً رہا کر دیے گئے۔ فوج نے کہا کہ جس خاندان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شادی کر لی وہ غلام نہیں ہو سکتا[1]۔

واقعۂ اِفک واقعۂ اِفک یعنی حضرت عائشہ رضؓ پر منافقین نے جو تہمت لگائی تھی، وہ اسی لڑائی سے واپسی پر پیش آیا تھا۔ احادیث اور سیَر کی کتابوں میں اس واقعہ کو نہایت تفصیل سے نقل کیا ہے، لیکن جس واقعہ کی نسبت قرآن مجید میں صاف مذکور ہے کہ سُننے کے ساتھ لوگوں نے یہ کیوں نہیں کہہ دیا کہ "بالکل افترا ہے" اس کو تفصیل کے ساتھ لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

البتہ اس واقعہ سے یہ اندازہ کرنا چاہیے کہ محض جھوٹ اور بیہودہ خبر بھی کس طرح پھیل جاتی ہے۔ یہ خبر اصل میں منافقین نے مشہور کی تھی۔ لیکن بعض مسلمان دھوکے میں آگئے جن کو تہمت لگانے کی سزا دی گئی، جیسا کہ صحیح مسلم وغیرہ میں مذکور ہے۔

آجکل کے عیسائی مورّخوں نے بھی قدیم مورّخوں کی طرح اس واقعہ کو اس جوشِ مسرّت سے لکھا ہے کہ خود بخود ان کے قلم میں روانی آگئی ہے لیکن ہم ان سے توقع بھی یہی کر سکتے تھے۔

یہ تمام لڑائیاں اُس عام جنگ کا پیش خیمہ تھیں جو تمام عرب اور یہود متفقہ

---

[1] سنن ابی داؤد کتاب العتق (باب فی بیع المکاتب اذا فسخت المکاتبۃ) "س"

قوت سے کرنا چاہتے تھے اور جس کو جنگ احزاب کہتے ہیں ۔

غزوۂ احزاب
یعنی تمام عرب کی متحدہ جنگ
ذوقعدہ ۵ھ

بنو نضیر[1] مدینہ سے نکل کر خیبر پہنچے تو انھوں نے ایک نہایت عظیم الشان سازش شروع کی، اُن کے رؤسا میں سے سلام بن ابی الحقیق، حیی بن اخطب، کنانہ بن الربیع وغیرہ مکہ معظمہ گئے اور قریش سے مل کر کہا "اگر ہمارا ساتھ دو تو اسلام کا استیصال کر دیا جا سکتا ہے" قریش اس کے لیے ہمیشہ تیار تھے۔ قریش کو آمادہ کر کے یہ لوگ قبیلہ غطفان کے پاس گئے اور ان کو لالچ دیا کہ خیبر کا نصف محاصل اُن کو ہمیشہ دیا کریں گے (اور یہ پہلے سے بھی تیار تھے۔ قصہ غزوہ خونہ میں یاد ہوگا کہ عامر رئیس قبیلہ نے اسی غطفان کے حملے کی دھمکی دی تھی، اس لیے یہ فوراً تیار ہو گئے) بنو اسد غطفان کے حلیف تھے، غطفان نے ان کو لکھ

---

[1] طبری میں ہے کان الذی جر غزوۃ رسول اللہ الخندق فیما قیل ما کان من اجلاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنی النضیر عن دیارھم رج ۳ ص ۱۴۶۳) مغازی کی سب سے زیادہ معتبر کتاب مغازی موسیٰ بن عقبہ ہے۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری (ج ۷، ص ۳۱۰) غزوہ احزاب کے ذکر میں اس کی یہ عبارت نقل کی ہے۔ اخرج حیی بن اخطب بعد قتل بنی النضیر الی مکۃ یحرض قریشا علی حرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وخرج کنانۃ بن الربیع بن ابی الحقیق یسعی فی بنی غطفان و یحضھم علی قتال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی ان لھم نصف تمر خیبر فاجابہ عیینۃ بن حصن بن حذیفۃ .... بن بدر الفزاری الی ذالک وکتبوا الی حلفائھم من بنی اسد فاقبل الیھم طلحہ بن خویلد فیمن اطاعہ، الخ [2] صحیح بخاری غزوۃ الرجیع۔

بھیجا کہ تم بھی فوجیں لے کر آؤ۔ قبیلہ بنو سلیم سے قریش کی قرابت تھی، اس تعلق سے انھوں نے بھی ساتھ دیا۔ بنو سعد کا قبیلہ یہود کا حلیف تھا۔ اس بنا پر یہود نے اُن کو بھی آمادہ کیا۔ غرض تمام قبائل عرب سے لشکر گراں تیار ہو کر مدینہ کی طرف بڑھا۔ فتح الباری میں تصریح ہے کہ اُن کی تعداد (دس ہزار) تھی۔[۱]

یہ لشکر تین مستقل فوجوں[۲] میں تقسیم (تھا) غطفان کی فوجیں[۳] عُیَیْنَہ بن حصن فزاری کی کمان میں تھیں جو عرب کا مشہور سردار تھا۔ بنو اسد طُلَیْحَہ کی افسری میں تھے، اور ابوسفیان (بن حرب) سپہ سالار کل تھا۔[۴]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خبریں سُنیں تو صحابہ سے مشورہ کیا۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ فارسی ایرانی ہونے کی وجہ سے خندق کے طریقے سے واقف تھے۔ اُنھوں نے رائے دی کہ کُھلے میدان میں نکل کر مقابلہ کرنا مصلحت نہیں، ایک محفوظ مقام میں لشکر جمع کیا جائے اور گرد خندق کھود لی جائے۔ خندق در اصل فارسی کا "کندہ" کا معرّب ہے، جس کے معنی کھودنے گئے کے ہیں، کاف، خ، سے اور

---

(۱) طبقات ابن سعد ج ۲ قسم اوّل ص ۴۷ و فتح الباری ج ۷ ص ۳۰۱) "س" (۲) طبقات ابن سعد ج ۲ قسم اوّل ص ۴۷) "س" (۳) افسروں کی یہ تفصیل پورے لشکر کی نہیں بلکہ مصنف نے صرف مشہور قبائل کے فوجی افسروں کا تذکرہ کر دیا ہے۔ اس سلسلہ میں مورخین نے دوسرے قبائل کے فوجی افسروں کے نام بھی بتلائے ہیں۔ چنانچہ بنو سُلَیم سفیان بن عبد شمس کی افسری میں تھے۔ قبیلہ اشجع کا سردار مسعود بن رُخَیلہ تھا۔ بنو مُرّہ حارث بن عوف کے ماتحت تھے۔ حارث اور طُلَیحہ بعد کو مسلمان ہو گئے تھے۔ زرقانی ج ۲ ص ۱۲۱، طبقات ابن سعد ج ۲ قسم اوّل ص ۴۷) "س" (۴) طبقات ابن سعد ج ۲ قسم اوّل ص ۴۷)، "س"

ہائے ہوز قاف سے بدل گئی ہے۔ جس طرح "پیادہ" سے "بیدق" ہو گیا ہے۔
تمام لوگوں نے اس رائے کو پسند کیا اور خندق کھودنے کے آلات مہیا کیے گئے۔

مدینہ میں تین جانب مکانات اور نخلستان کا سلسلہ تھا، جو شہر پناہ کا کام دیتا تھا۔ صرف شامی رُخ کھلا ہوا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین ہزار صحابہ کے ساتھ شہر سے باہر نکل کر اسی مقام میں خندق کی تیاریاں شروع کیں۔ یہ ذوقعدہ ۵ھ کی ۸ تاریخ تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدود خود قائم کیے۔ داغ بیل ڈال کر دس دس آدمیوں پر دس دس گز زمین تقسیم کی۔ خندق کا عمق پانچ گز رکھا گیا۔ بیس دن میں ۳ ہزار متبرک ہاتھوں سے انجام پائی۔

یاد ہو گا کہ مسجد نبوی بن رہی تھی تو سرورِ دوجہاں ؐ مزدوروں کی صورت میں تھے۔ آج بھی وہی عبرت انگیز منظر ہے۔ جاڑے کی راتیں ہیں۔ تین تین دن کا فاقہ ہے، مہاجرین اور انصار اپنی پیٹھوں پر مٹی لاد لاد کر پھینکتے ہیں، اور جوشِ محبت میں ہم آواز ہو کر کہتے ہیں:

نحن الذین بایعوا محمدا　　علی الجہاد ما بقینا ابدا

سرورِ عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی مٹی پھینک رہے ہیں، شکم مبارک پر گرد اٹ گئی ہے۔ اسی حالت میں یہ رجز زبان پر ہے:

واللہ لولا اللہ ما اھتدینا　　ولا تصدقنا ولا صلینا
فانزلن سکینۃ علینا　　وثبت الاقدام ان لاقینا
ان الالی قد بغوا علینا　　اذا ارادوا فتنۃ ابینا

اَبَیْنَا کا لفظ جب آتا تھا تو آواز زیادہ بلند ہو جاتی تھی اور مکرر

کہتے تھے۔[1] اس کے ساتھ انصار کے حق میں دُعا بھی دیتے جاتے تھے اور یہ موزوں الفاظ زبان پر آتے تھے:

اللّٰھم انہ لاخیر الاخیر الآخرۃ   فبارک فی الانصار والمھاجرۃ

پتھر کھودتے کھودتے اتفاقاً ایک سخت چٹان آ گئی۔ کسی کی ضرب کام نہیں دیتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ تین دن کا فاقہ تھا اور پیٹ پر پتھر بندھا ہوا تھا۔ آپؐ نے دستِ مبارک سے پھاوڑا مارا تو چٹان ایک تودۂ خاک تھی۔[2]

سلع کی پہاڑی کو پشت پر رکھ کر صف آرائی کی گئی۔ مستورات شہر کے محفوظ قلعوں میں بھیج دی گئیں، اور چونکہ بنو قریظہ کے حملے کا اندیشہ تھا، اس لیے حضرت سلمہ بن اسلم ۲۰۰ آدمیوں کے ساتھ متعین کیے گئے کہ ادھر سے حملہ نہ ہونے پائے۔

بنو قریظہ کے یہود اب تک الگ تھے لیکن بنو نضیر نے اُن کو ملا لینے کی کوشش کی۔ حیی بن اخطب (حضرت صفیہؓ کا باپ) خود قریظہ کے سردار کعب بن اسد کے پاس گیا، اس نے ملنے سے انکار کیا۔ حیی نے کہا "میں فوجوں کا دریائے بیکراں لایا ہوں۔ قریش اور تمام عرب اُمنڈ آیا ہے، اور ایک محمد کے خون کا پیاسا ہے، یہ موقع ہاتھ سے دینے کے قابل نہیں، اب اسلام کا خاتمہ ہے"۔ کعب اب بھی راضی نہ تھا۔ اس نے کہا میں نے محمد کو ہمیشہ صادق الوعد پایا، اُن سے عہد شکنی کرنا خلافِ مروّت ہے لیکن حیی کا جادو رائیگاں نہیں جا سکتا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حال معلوم ہوا، تو تحقیق اور اتمامِ حجت کے

---

[1] صحیح بخاری غزوۂ احزاب [2] ایضاً

لیے سعدؓ بن معاذ اور حضرت سعدؓ بن عبادہ کو بھیجا اور فرمایا کہ اگر درحقیقت بنو قریظہ نے معاہدہ توڑ دیا ہے تو وہاں سے آکر اس خبر کو مبہم لفظوں میں بیان کرنا کہ لوگوں میں بے دلی نہ پھیلنے پائے۔ دونوں صاحبوں نے بنو قریظہ کو معاہدہ یاد دلایا، تو انھوں نے کہا "ہم نہیں جانتے محمدؐ کون ہیں اور معاہدہ کیا چیز ہے؟"

غرض بنو قریظہ نے اس بے شمار فوج میں اور اضافہ کردیا۔ قریش، یہود اور قبائلِ عرب کی دس ہزار فوجیں تین حصوں میں تقسیم ہو کر مدینہ کے تین طرف اس زور و شور سے حملہ آور ہوئیں کہ مدینہ کی زمین دہل گئی۔

اس معرکہ کی تصویر خود اللہ تعالیٰ نے کھینچی ہے:

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا (سورۂ احزاب-۱۰)	جب کہ دشمن اوپر کی طرف اور نشیب کی طرف سے آپڑے اور جب آنکھیں ڈگنے لگیں، اور کلیجے منہ میں آگئے، اور تم خدا کی نسبت طرح طرح کے گمان کرنے لگے، تب مسلمانوں کی جانچ کا وقت آگیا، اور وہ بڑے زور کے زلزلے میں ڈال دیے گئے۔

فوجِ اسلام میں منافقوں کی تعداد بھی شامل تھی، جو بظاہر مسلمانوں کے ساتھ تھے، لیکن موسم کی سختی، رسد کی قلت، متواتر فاقے، راتوں کی بے خوابی، بیشمار فوجوں کا ہجوم ایسے واقعات تھے، جنھوں نے اُن کا پردہ فاش کردیا، آآکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے اجازت مانگنی شروع کی کہ ہمارے گھر محفوظ نہیں، ہم کو شہر میں واپس چلے جانے کی اجازت دی جائے۔

يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ وَّ	کہتے ہیں کہ ہمارے گھر کھلے پڑے

مَاهِيَ بِعَوْرَةٍ ۚ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا (احزاب-۱۳) ہیں، اور وہ کھلے نہیں بلکہ ان کو بھاگنا مقصود ہے۔

لیکن جاں نثارانِ اسلام کا طلائے اخلاص اسی کسوٹی پر آزمانے کے قابل تھا:

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۫ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّاۤ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا (احزاب-۲۲) جب مسلمانوں نے قبائل کی فوجیں دیکھیں تو بول اٹھے کہ یہ وہی ہے جس کا وعدہ خدا نے اور اس کے رسول نے کیا تھا اور خدا اور اس کا رسول دونوں سچے تھے اور اس بات نے ان کے یقین و اطاعت کو اور بھی بڑھا دیا۔

قریباً ایک مہینہ تک اس سختی سے محاصرہ قائم رہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ پر تین تین فاقے گزر گئے۔ ایک دن صحابہ نے بیتاب ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنے شکم کھول کر دکھائے کہ پتھر بندھے ہیں، لیکن جب آپؐ نے شکم مبارک کھولا تو ایک کے بجائے دو پتھر[1] تھے۔ محاصرہ اس قدر شدید اور پرخطر ہو گیا تھا کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے خطاب کر کے فرمایا کہ کوئی ہے، جو باہر نکل کر محاصرین کی خبر لائے؟ تین دفعہ آپؐ نے یہ الفاظ فرمائے لیکن حضرت زبیرؓ کے سوا اور کوئی صدا نہیں آئی۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسی موقع پر حضرت زبیرؓ کو حواری کا لقب

---

[1] شمائل ترمذی، عرب کی عادت تھی کہ سخت بھوک میں پتھر باندھتے تھے جس سے کمر جھکنے نہیں پاتی تھی۔

دیا۔[1]

محاصرین نے اُدھر تو خندق کا محاصرہ کر رکھا تھا، اُدھر دوسری سمت اس غرض سے مدینہ پر حملہ کرنا چاہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے اہل و عیال یہیں قلعوں میں پناہ گزین تھے۔

محاصرین خندق کو عبور نہیں کر سکتے تھے، اس لیے دُور سے تیر اور پتھر برساتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خندق کے مختلف حصّوں پر فوجیں تقسیم کر دی تھیں جو محاصرین کے حملوں کا مقابلہ کرتی تھیں۔ ایک حصّہ خود آپؐ کے اہتمام میں تھا۔

محاصرے کی سختی دیکھ کر آپ کو خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو انصار ہمّت ہار جائیں، اس لیے آپؐ نے غطفان سے اس شرط پر معاہدہ کرنا چاہا کہ مدینہ کی پیداوار کا ایک ثلث اُن کو دے دیا جائے۔ حضرت سعد بن عبادہؓ، اور حضرت سعدؓ بن معاذ کو جو رؤسائے انصار تھے، بُلا کر مشورہ کیا۔ دونوں نے عرض کی کہ اگر یہ خدا کا حکم ہے تو انکار کی مجال نہیں، لیکن اگر رائے ہے تو یہ عرض ہے کہ کفر کی حالت میں بھی کوئی شخص ہم سے خراج مانگنے کی جرأت نہ کر سکا اور اب تو اسلام نے ہمارا پایہ بہت بلند کر دیا ہے۔ یہ استقلال دیکھ کر آپؐ کو اطمینان ہُوا۔ حضرت سعدؓ نے معاہدے کا کاغذ ہاتھ میں لے کر تمام عبارت مٹا دی[2] اور کہا

---

[1] صحیح بخاری ذکر غزوۂ احزاب و صحیح مسلم کتاب الفضائل لیکن ابن ہشام میں اس موقع پر حضرت حذیفہؓ بن یمان کا نام ہے، اس لیے محدثین میں ان دونوں ناموں کے دو واقعوں کی تطبیق میں اختلاف ہے حافظ ابن حجر اور زرقانی نے دلائل یہ ثابت کیا ہے کہ محاصرین میں سے قریش کی تحقیق حال کے لیے حضرت حذیفہؓ اور بنو قریظہ کی تحقیق خبر کے لیے حضرت زبیرؓ گئے تھے۔ یہ تفصیل واقدی اور نسائی نے اپنی روایتوں میں کی ہے۔ فتح الباری ج ۷ ص۳۱۲ زرقانی ج ۲ ص۱۳۱۔

[2] طبری صفحہ ۱۴۷۴ (ج ۳)۔

ان لوگوں سے جو بن آئے کر دکھائیں +

اب مشرکوں کی طرف سے حملے کا یہ انتظام کیا گیا کہ قریش کے مشہور جنرل یعنی ابوسفیان، خالد بن ولید، عمرو بن العاص، ضرار بن الخطاب، جبیرہ کا ایک ایک دن مقرر ہوا۔ ہر جنرل اپنی باری کے دن پوری فوج لے کر لڑتا تھا، خندق کو عبور نہیں کر سکتے تھے، لیکن خندق کا عرض چونکہ زیادہ نہ تھا، اس لیے باہر سے پتھر اور تیر برساتے تھے +

چونکہ اس طریقہ میں کامیابی نہیں ہوئی اس لیے قرار پایا کہ اب عام حملہ کیا جائے۔ تمام فوجیں یکجا ہوئیں، قبائل کے تمام سردار آگے آگے تھے۔ خندق ایک جگہ سے اتفاقاً کم عریض تھی، یہ موقع حملہ کے لیے انتخاب کیا گیا۔ عرب کے مشہور بہادروں یعنی ضرار، جبیرہ، نوفل، عمرو بن عبدِ وُدّ نے خندق کے اس کنارے سے گھوڑوں کو مہمیز کیا تو اُس پار تھے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور بہادر عمرو بن عبدِ وُدّ تھا، وہ ایک ہزار سواروں کے برابر مانا جاتا تھا۔ جنگِ بدر میں زخمی ہو کر واپس چلا گیا تھا اور قسم کھائی تھی کہ جب تک انتقام نہ لوں گا بالوں میں تیل نہ ڈالوں گا۔ اس وقت اُس کی عمر ۹۰ برس کی تھی، تاہم سب سے پہلے وہی آگے بڑھا (اور عرب کے دستور کے موافق پکارا کہ مقابلے کو کون آتا ہے؟ حضرت علیؓ نے اُٹھ کر کہا "میں"۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا کہ یہ عمرو بن عبدِ وُدّ ہے۔ حضرت علیؓ بیٹھ گئے۔ لیکن عمرو کی آواز کا اور کسی طرف سے جواب نہیں آتا تھا۔ عمرو دوبارہ پکارا اور پھر وہی صرف ایک صدا جواب میں تھی۔ تیسری دفعہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ عمرو ہے، تو حضرت علیؓ نے عرض کی ہاں میں جانتا ہوں کہ یہ عمرو ہے۔ غرض آپؐ نے اجازت دی، خود دست مبارک سے تلوار عنایت کی، سر پر عمامہ باندھا +

عمرو کا قول تھا کہ کوئی شخص دنیا میں اگر مجھ سے تین باتوں کی درخواست کرے تو ایک ضرور قبول کروں گا۔ حضرت علیؓ نے عمرو سے پوچھا کہ کیا واقعی یہ تیرا قول ہے؟ پھر حسب ذیل گفتگو ہوئی:

حضرت علیؓ — مَیں درخواست کرتا ہوں کہ تُو اسلام لا!

عمرو — یہ نہیں ہو سکتا۔

حضرت علیؓ — لڑائی سے واپس چلا جا۔

عمرو — میں خاتونانِ قریش کا طعنہ نہیں سن سکتا۔

حضرت علیؓ — مجھ سے معرکہ آرا ہو۔

عمرو ہنسا، اور کہا مجھ کو اُمید نہ تھی کہ آسمان کے نیچے یہ درخواست بھی میرے سامنے پیش کی جائے گی۔ حضرت علیؓ پیادہ تھے، عمرو کی غیرت نے یہ گوارا نہ کیا، گھوڑے سے اُتر آیا، اور پہلی تلوار گھوڑے کے پاؤں پر ماری کہ کونچیں کٹ گئیں۔ پھر پوچھا کہ تم کون ہو؟ آپ نے نام بتایا۔ اس نے کہا مَیں تم سے لڑنا نہیں چاہتا۔ آپ نے فرمایا "ہاں! لیکن مَیں چاہتا ہوں"! عمرو اب غصہ سے بے تاب تھا، پر تلے سے تلوار نکالی اور آگے بڑھ کر وار کیا۔ حضرت علیؓ نے سپر پر روکا، لیکن تلوار سپر میں ڈوب کر نکل آئی، اور پیشانی پر لگی۔ گو زخم کاری نہ تھا، تاہم یہ طغرا آپ کی پیشانی پر یادگار رہ گیا۔ قاموس میں لکھا ہے کہ حضرت علیؓ کو ذوالقرنین بھی کہتے تھے۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کی پیشانی پر دو زخموں کے نشان تھے۔ ایک عمرو کے ہاتھ کا اور ایک ابن ملجم کا۔ دشمن کا وار ہو چکا تو حضرت علیؓ نے وار کیا۔ اُن کی تلوار شانہ کاٹ کر نیچے اُتر آئی ساتھ ہی حضرت علیؓ نے اللہ اکبر کا نعرہ مارا اور فتح کا اعلان ہو گیا۔ عمرو کے ابد ضرار اور جبیرہ نے حملہ کیا۔ لیکن جب ذوالفقار کا ہاتھ بڑھا تو پیچھے ہٹنا پڑا۔ حضرت

عمرؓ فاروق نے ضرار کا تعاقب کیا۔ ضرار نے مڑ کر برچھے کا وار کرنا چاہا لیکن روک لیا اور کہا عمر! اس احسان کو یاد رکھنا۔

نوفل بھاگتے ہوئے خندق میں گرا۔ صحابہ نے تیر مارنے شروع کیے۔ اُس نے کہا "مسلمانو! میں شریفانہ موت چاہتا ہوں"۔ حضرت علیؓ نے درخواست منظور کی اور خندق میں اُتر کر تلوار سے مارا کہ شریفوں کے شایان تھا۔[1]

حملے کا یہ دن بہت سخت تھا۔ تمام دن لڑائی رہی۔ کفّار ہر طرف سے تیر اور پتھروں کا مینہ برسا رہے تھے اور ایک دم کے لیے یہ بارش تھمنے نہ پاتی تھی۔ یہی دن ہے جس کا ذکر احادیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متصل[2] چار نمازیں قضا ہوئیں اور سنگ باری سے جگہ سے ہٹنا ناممکن تھا۔

مستورات جس قلعہ میں تھیں بنو قریظہ کی آبادی سے متصل تھا۔ یہودیوں نے یہ دیکھ کر کہ تمام جمعیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے قلعہ پر حملہ کیا۔ ایک یہودی قلعہ کے پھاٹک تک پہنچ گیا، اور قلعہ پر حملہ کرنے کا موقع ڈھونڈ رہا تھا۔ حضرت صفیہؓ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی) نے دیکھ لیا۔ مستورات کی حفاظت کے لیے حضرت حسّانؓ (شاعر) متعین کر دیے گئے تھے۔ حضرت صفیہؓ نے اُن سے کہا کہ اُتر کر اس کو قتل کر دو، ورنہ یہ جا کر دشمنوں کو پتہ دے گا۔ حضرت حسّانؓ کو ایک عارضہ ہو گیا تھا جس نے ان میں اس قدر جُبن پیدا کر دیا تھا کہ وہ لڑائی کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے

---

[1] یہ حالات اگرچہ اجمالاً تمام کتابوں میں ہیں لیکن ہم نے جو تفصیل لکھی ہے ابن سعد اور خمیس سے ماخوذ ہے۔ [2] اس امر میں محدثین میں سخت اختلاف ہے کہ چار نمازیں قضا ہوئیں یا ایک، اور چار قضا ہوئیں تو ایک ہی دن یا کئی دن، یا کئی دن کی ملا کر، زرقانی میں یہ بحث مفصل ہے۔

تھے، اس بنا پر معذوری ظاہر کی اور کہا کہ میں اس کام کا ہوتا تو یہاں کیوں ہوتا، حضرت صفیہ رضؓ نے خیمے کی ایک چوب اُکھاڑلی اور اُتر کر یہودی کے سر پر اس زور سے ماری کہ سر پھٹ گیا۔ حضرت صفیہ رضؓ چلی آئیں اور حسّان رضؓ سے کہا کہ ہتھیار اور کپڑے چھین لاؤ۔ حسّان رضؓ نے کہا، جانے بھی دیجیے مجھ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ حضرت صفیہ رضؓ نے کہا، اچھا جاؤ اس کا سر کاٹ کر قلعہ کے نیچے پھینک دو کہ یہودی مرعوب ہوجائیں۔ لیکن یہ خدمت بھی حضرت صفیہ رضؓ ہی کو انجام دینا پڑی۔ یہودیوں کو یقین ہوا کہ قلعہ میں بھی کچھ فوج متعیّن ہے اس خیال سے پھر انھوں نے حملے کی جرأت[1] نہ کی ؛

محاصرہ کو جس قدر طول ہوتا جاتا تھا، محاصرہ کرنے والے ہمت ہارتے جاتے تھے۔ دس ہزار آدمیوں کو رسد پہنچانا آسان کام نہ تھا۔ پھر باوجود سردی کے موسم کے اس زور کی ہوا چلی کہ طوفان آگیا۔ خیموں کی طنابیں اُکھڑ اُکھڑ گئیں کھانے کے دیگچے چولھوں پر اُلٹے اُلٹ جاتے تھے۔ اس واقعہ نے فوجوں سے بڑھ کر کام دیا۔ اسی بنا پر قرآن مجید نے اس بادِ صرصر کو عسکرِ الٰہی سے تعبیر کیا ہے :

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا	مسلمانو! خدا کے اس احسان کو یاد کرو
نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ	جبکہ تم پر فوجیں آپڑیں تو ہم نے ان پر
جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا	آندھی بھیجی اور فوجیں بھیجیں جو تم کو
وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا۔ (احزاب ۲)	دکھائی نہیں دیتی تھیں ؛

نعیم بن مسعود اشجعی ایک غطفانی رئیس تھے۔ قریش، اور یہود دونوں اُن کو

---

[1] زرقانی بحوالہ طبرانی و بزار و ابویعلی بہ سند حسن، دیکھو صفحہ ۱۲۹ جلد ۲، و ابن ہشام۔

مانتے تھے، وہ اسلام لاچکے تھے، لیکن کفار کو ابھی اس کا علم نہ تھا، انھوں نے قریش اور یہود سے الگ الگ جا کر اس قسم کی باتیں کیں جس سے دونوں میں پھوٹ پڑ گئی +

ابن اسحاق کی روایت ہے کہ نعیم نے اس تفرقہ اندازی میں دونوں سے (ایسی) باتیں کہیں جن سے دونوں ایک دوسرے سے بدگمان ہو جائیں اور اس بنا پر کہیں کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اَلحَربُ خُدعَۃٌ کی تعلیم کی تھی، لیکن ابن اسحاق نے روایت کی سند نہیں نقل کی، اور اگر کرتے بھی تو ابن اسحاق کا یہ پایہ نہیں کہ ایسا واقعہ محض اُن کی سند سے قبول کر لیا جائے۔ اس کے علاوہ واقعات اس قسم کے جمع تھے کہ دونوں فریقوں کا اتحاد بغیر اس کے توڑ دیا جا سکتا تھا، کہ کوئی غلط بات بیان کی جائے۔ ابن اسحاق کی روایت میں بھی اس قدر مذکور ہے کہ نعیم نے یہود سے کہا کہ قریش تو چار دن کے بعد یہاں سے چلے جائیں گے، تمھارا اور مسلمانوں کا ہموطنی کا ساتھ ہے، اس لیے تم کیوں بیچ میں پڑ کر ہمیشہ کے لیے لڑائی مول لیتے ہو اور اگر اس پر آمادہ ہی ہو تو قریش سے کہو کہ وہ کچھ معتزز آدمی ضمانت کے طور پر تمھارے ہاں بھجوا دیں کہ اگر قریش لڑائی کا فیصلہ کیے بغیر جانا چاہیں تو تم ان لوگوں کو روک لینا +

یہ بھی ظاہر ہے کہ یہودِ بنو قریظہ اوّل اوّل نقضِ عہد پر راضی نہ تھے اور کہتے تھے کہ ہم محمدؐ سے معاہدہ کیوں توڑیں۔ لیکن حیی بن اخطب نے اسی شرط پر اُن کو راضی کیا تھا کہ "قریش چلے گئے تو میں خیبر چھوڑ کر تمھارے پاس آجاؤں گا۔" قریش اس قسم کی ضمانت نہیں منظور کر سکتے تھے۔ اس لیے جب انھوں نے انکار کیا ہوگا تو دونوں میں پھوٹ پڑ گئی ہوگی۔ اس کے لیے

ایک صحابی کو دروغ بیانی کی کیا ضرورت تھی؟

بہر حال موسم کی سختی، محاصرہ کا امتداد، آندھی کا زور، رسد کی قلت، یہود کی علیحدگی، یہ تمام اسباب ایسے جمع ہو گئے تھے کہ قریش کے پائے ثبات اب ٹھہر نہیں سکتے تھے۔ ابوسفیان نے فوج سے کہا، رسد ہو چکی، موسم کا یہ حال ہے۔ یہود نے ساتھ چھوڑ دیا، اب محاصرہ بیکار ہے۔ یہ کہہ کر طبل رحیل بجنے کا حکم دیا۔ غطفان بھی اس کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ بنو قریظہ محاصرہ

(مصنف کے اس قیاس کی تائید مغازی موسیٰ بن عقبہ کی روایت سے ہوتی ہے جس کو مختصراً مصنف ابن ابی شیبہ میں اور تفصیل کے ساتھ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے۔ اس روایت کی رو سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بنو قریظہ نے اس جنگ میں شرکت اسی شرط کے ساتھ کی تھی کہ قریش ضمانت کے طور پر اپنے کچھ معزز آدمی بنو قریظہ کے سپرد کریں گے۔ لیکن انھوں نے یہ شرط پوری نہیں کی اور اس لیے ان کے دل میں قریش کی طرف سے بے اطمینانی پیدا ہوئی اور انھوں نے خفیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس شرط کے ساتھ مصالحت کا پیغام بھیجا کہ بنو نضیر کو جو خیبر کو جلاوطن کر دیے گئے تھے پھر مدینہ آنے کی اجازت دے دی جائے۔ نعیم بن مسعود ثقفی جو اسی موقع پر مسلمان ہونے آئے ایک ایسے آدمی تھے جو پیٹ کے ہلکے تھے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دانستہ راز کے طور پر بنی قریظہ کے اس مخفی پیغام کا ذکر فرما دیا۔ انھوں نے جا کر یہ قریش تک پہنچا دیا۔ اس سے قریش کو بنو قریظہ سے بدگمانی پیدا ہو گئی اور اس طرح قریش اور بنو قریظہ کے اتفاق کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ دیکھیے مصنف ابن ابی شیبہ کتاب المغازی باب غزوۂ خندق والبدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۴، ص ۱۱۳ مصر "س"

محاصرہ چھوڑ کر اپنے قلعوں میں چلے آئے اور مدینہ کا اُفق ۲۰ - ۲۲ دن تک غبار آلود رہ کر صاف ہو گیا۔

وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا	اور خدا نے کافروں کو غصّہ میں
بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا	بھرا ہوا ہٹا دیا کہ ان کو کچھ ہاتھ
وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ	نہ آیا اور مسلمانوں کو لڑنے کی نوبت
(احزاب - ۳)	نہ آنے دی۔

اس معرکہ میں فوجِ اسلام کا جانی نقصان کم ہوا، لیکن انصار کا سب سے بڑا بازو ٹوٹ گیا، یعنی حضرت سعدؓ بن معاذ جو قبیلہ اوس کے سردار تھے زخمی ہوئے اور پھر جانبر نہ ہو سکے۔ ان کے زخم کھانے کا واقعہ موثر اور عبرت انگیز ہے۔

حضرت عائشہؓ جس قلعہ میں پناہ گزیں تھیں، حضرت سعد بن معاذ کی ماں بھی وہیں ان کے ساتھ تھیں۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ میں قلعہ سے نکل کر باہر پھر رہی تھی، عقب سے پاؤں کی آہٹ معلوم ہوئی، مُڑ کر دیکھا تو سعد ہاتھ میں حربہ لیے جوش کی حالت میں بڑی تیزی سے بڑھے جا رہے ہیں اور یہ شعر زبان پر ہے:

لَبِّثْ قَلِيْلًا يُدْرِكُ الْهَيْجَا جَمَلْ	لَا بَاسَ بِالْمَوْتِ اِذَا الْمَوْتُ نَزَلْ
ذرا ٹھہر جا تا کہ لڑائی میں ایک اور شخص پہنچ جائے	وقت جب آ گیا تو موت سے کیا ڈرہے

حضرت سعدؓ کی ماں نے سنا تو پکاریں، بیٹا دوڑ کر جا تو نے دیر لگا دی۔ سعدؓ کی زرہ اس قدر چھوٹی تھی کہ ان کے دونوں ہاتھ باہر تھے۔ حضرت

---

[1] ابن ہشام و طبری و خمیس۔

عائشہ رض نے سعد رض کی ماں سے کہا، کاش سعد رض کی زرہ لمبی ہوتی۔ اتفاق یہ کہ ابن العرقہ نے تاک کر کھلے ہاتھ پر تیر مارا، جس سے اکحل کی رگ کٹ گئی۔ خندق کا معرکہ ہوچکا تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اُن کے لیے مسجد کے صحن میں ایک خیمہ کھڑا کرایا اور ان کی تیمارداری شروع کی۔ اس لڑائی میں رفیدہ ایک خاتون شریک تھیں جو اپنے پاس دوائیں رکھتی تھیں یہ خیمہ اُنہی کا تھا اور وہ علاج کی نگران تھیں۔ آنحضرت ص نے خود دستِ مبارک سے مشقص سے کر داغا۔ لیکن پھر ورم کر آیا۔ دوبارہ داغا، لیکن فائدہ نہ ہوا۔ آٹھ دن کے بعد یعنی بنو قریظہ کی ہلاکت کے بعد زخم کھل گیا اور اُنھوں نے وفات پائی۔

بنو قریظہ کا خاتمہ اُوپر گزر چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آغازِ قیام میں یہود کے ساتھ معاہدہ کیا تھا اور ان کو جان و مال و مذہب ہر چیز میں امن و آزادی بخشی لیکن جب قریش نے ان کو تحریض و تہدید کا خط لکھا تو

---

[1] یہ خمیس کا بیان ہے، حافظ ابن حجر نے اصابہ (ذکر رفیدہ) میں امام بخاری کی ادب المفرد سے نقل کیا ہے کہ رفیدہ ایک خاتون تھیں جو زخمیوں کا علاج کرتی تھیں، حضرت سعد رض انہی کے پاس علاج کے لیے رکھے گئے تھے۔ ابن سعد نے رفیدہ کے ذکر میں لکھا ہے کہ ان کا ایک خیمہ مسجد نبوی کے پاس تھا، اسی میں وہ بیماروں اور زخمیوں کا علاج کرتی تھیں۔ صحیح بخاری میں بھی رفیدہ کے خیمے اور ان کے جراح خانہ کا ذکر ہے۔

[2] مسلم باب التداوی۔

وہ آمادۂ بغاوت ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن لوگوں سے تجدید معاہدہ کرنی چاہی، بنو نضیر نے انکار کیا، اور وہ جلاوطن کر دیے گئے۔ لیکن بنو قریظہ نے نئے سرے سے معاہدہ کر لیا[۱] چنانچہ اُن کو امن دے دیا گیا۔ صحیح مسلم میں ان واقعات کو اختصار کے ساتھ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

عن ابن عمران یهود بنی النضیر و قریظة حاربوا رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فاجلی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم بنی النضیر و اقر قریظة و منّ علیهم۔	حضرت عبد اللہ بن عمر سے روایت ہے کہ بنو نضیر اور قریظہ کے یہود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑائی کی تو آپ نے بنو نضیر کو جلاوطن کر دیا اور قریظہ کو رہنے دیا اور ان پر احسان کیا۔

(صحیح مسلم ذکر اجلاء الیہود من الحجاز)

بنو نضیر جب جلاوطن ہوئے تو اُن کے رئیس الاعظم حُیی بن اخطب، ابورافع سلام ابن ابی الحُقیق خیبر میں جا کر آباد ہوئے اور وہاں ریاست عام حاصل کر لی۔ جنگِ احزاب اُن ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ قبائلِ عرب میں دَورہ کر کے تمام مُلک میں آگ لگا دی اور قریش کے ساتھ مل کر مدینہ پر حملہ آور ہوئے۔ اس وقت تک قریظہ معاہدہ پر قائم تھے لیکن حُیی بن اخطب نے ان کو بہکا کر توڑ لیا اور اُن سے وعدہ کیا کہ خدانخواستہ اگر قریش حملہ سے

---

(۱) واقدی نے حُیی بن اخطب کی زبانی بنو قریظہ کے اس معاہدہ کر کے ٹھہر جانے کے واقعہ کو اُن کی سازشی چال ظاہر کیا ہے۔ "حُیی بن اخطب نے کہا کہ وہ اس لیے ٹھہر گئے ہیں، تاکہ موقع پاکر کفار سے مل کر مسلمانوں پر حملہ کر سکیں"۔ مغازی واقدی ص ۳۶۲، کلکتہ "س"

دست بردار ہو کر چلے گئے تو میں خیبر چھوڑ کر یہیں آرہوں گا۔ چنانچہ اُس نے یہ عہد وفا کیا۔

قریظہ نے احزاب میں علانیہ شرکت[1] کی اور شکست کھا کر ہٹ آئے تو اسلام کے سب سے بڑے دشمن حُیَی بن اخطب کو ساتھ لائے[2]۔

اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ان کا آخری فیصلہ کیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احزاب سے فارغ ہو کر حکم دیا، کہ ابھی لوگ ہتھیار نہ کھولیں اور قریظہ کی طرف بڑھیں۔ قریظہ اگر صلح و آشتی سے پیش آتے تو قابلِ اطمینان تصفیہ کے بعد اُن کو امن دیا جاتا، لیکن وہ مقابلے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ فوج سے آگے بڑھ کر جب حضرت علیؓ اُن کے قلعوں کے پاس پہنچے تو انھوں نے علانیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو (نعوذ باللہ) گالیاں دیں[3]۔ غرض ان کا محاصرہ کیا گیا، اور تقریباً ایک مہینے محاصرہ رہا۔ بالآخر انھوں نے درخواست پیش کی کہ حضرت سعدؓ بن معاذ جو فیصلہ کریں ہم کو منظور ہے۔

حضرت سعدؓ بن معاذ اور ان کا قبیلہ (اوس) قریظہ کا حلیف اور ہم عہد

---

[1] سر ولیم میور صاحب اربابِ سیر کی یہ روایت تسلیم نہیں کرتے کہ بنو قریظہ نے اس جنگ میں کوئی عملی حصہ لیا تھا۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو قرآن مجید میں جہاں احزاب کا ذکر ہے وہاں اس کا ذکر ضرور ہوتا لیکن قرآن میں صاف یہ الفاظ ہیں، وانزل الذین ظاهروهم من اهل الکتاب، مظاهرۃ (امداد) سے بڑھ کر اور کون لفظ درکار ہے۔ [2] طبری ج ۳ ص ۱۴۸۷ و ۱۴۸۸ و ابن ہشام صفحہ ۱۴۶ جلد دوم۔ [3] طبری ج ۳ ص ۱۴۸۵ میں ہے حتی اذا دنا من الحصون سمع منها مقالۃ قبیحۃ لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منهم۔

تھا۔ عرب میں یہ تعلق ہم نسبی سے بڑھ کر تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی درخواست منظور کی۔

قرآن مجید میں جب تک کوئی خاص حکم نہیں آتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم توراۃ کے احکام کی پابندی فرماتے تھے۔ چنانچہ اکثر مسائل مثلاً قبلہ نماز، رجم قصاص بالمثل وغیرہ وغیرہ میں جب تک خاص وحی نہیں آئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے توراۃ ہی کی پابندی فرمائی۔ حضرت سعد رضؓ نے جو فیصلہ کیا یعنی یہ کہ لڑنے والے قتل کیے جائیں، عورتیں اور بچے قید ہوں، مال و اسباب غنیمت قرار دیا جائے[۱] توراۃ کے مطابق تھا۔ توراۃ کتاب تثنیہ، اصحاح ۲۰۔ آیت ۱۰ میں ہے:۔

"جب کسی شہر پر حملہ کرنے کے لیے تو جائے تو پہلے صلح کا پیغام دے۔ اگر وہ صلح تسلیم کریں اور تیرے لیے دروازے کھول دیں تو جتنے لوگ موجود ہوں سب تیرے غلام ہو جائیں گے لیکن اگر صلح نہ کریں تو تو ان کا محاصرہ کر، اور جب تیرا خدا تجھ کو ان پر قبضہ دلادے تو جس قدر مرد ہوں، سب کو قتل کر دے۔ باقی بچے، عورتیں، جانور اور جو چیزیں شہر میں موجود ہوں، سب تیرے لیے مالِ غنیمت ہوں گی۔"

---

[۱] صحیح مسلم جلد (۲) صفحہ ۹۵ (باب جواز قتال من نقض العہد و جواز انزال اہل الحصون علی حکم حاکم عدل اہل للحکم "س") اور نیز بخاری (باب مرجع النبی صلی اللہ علیہ وسلم من الاحزاب "س") میں یہ واقعہ مفصل مذکور ہے۔ مارگولیس صاحب فرماتے ہیں کہ چونکہ سعدؓ بن معاذ کو اس جنگ میں ایک قریظی نے تیر سے زخمی کیا تھا، جس سے وہ بالآخر ہلاک ہو گئے اس لیے انھوں نے بنو قریظہ کی نسبت ایسا بے رحمانہ فیصلہ کیا۔ لیکن وہ تیر انداز ابن العرقہ قریشی تھا۔ صحیح بخاری و مسلم میں صاف یہ تصریح ہے۔

احادیث میں مذکور ہے کہ سعد نے جب یہ فیصلہ کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے یہ آسمانی فیصلہ کیا۔ یہ اسی توراۃ کے حکم کی طرف اشارہ تھا۔ یہودیوں کو جب یہ حکم سنایا گیا تو جو فقرے اُن کی زبان سے نکلے، اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ خود بھی اسی فیصلے کو حکمِ الٰہی کے موافق سمجھتے تھے۔

حُیَیّ بن اخطب جو ان تمام فتن کا بانی تھا، مقتل میں لایا گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس نے نظر اٹھا کر دیکھا اور یہ فقرے کہے:

اما واللہ مالُمتُ نفسی فی عداوتک ولکنہ من یخذل اللہ یخذل۔	ہاں خدا کی قسم مجھ کو اس کا افسوس نہیں کہ میں نے کیوں تیری عداوت کی، لیکن بات یہ ہے کہ جو شخص خدا کو چھوڑ دیتا ہے، خدا بھی اس کو چھوڑ دیتا ہے۔

پھر لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا:

ایّھا الناس انہ لا باس بامر اللہ کتاب وقدر وملحمۃ کتبھا اللہ علی بنی اسرائیل[۱]۔	لوگو! خدا کے حکم کی تعمیل میں کچھ مضائقہ نہیں، یہ ایک حکم الٰہی تھا، یہ لکھا ہوا تھا ایک سزا تھی جو خدا نے بنو اسرائیل پر لکھی تھی۔

حُیَیّ بن اخطب کی نسبت یہ بات خاص طور پر لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ جب وہ جلاوطن ہو کر خیبر جا رہا تھا تو اس نے یہ معاہدہ کیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت پر کسی کو مدد نہ دے گا۔ اس معاہدے پر اُس نے خدا کو ضامن کیا تھا۔ لیکن احزاب میں اس نے اس معاہدے کی جس طرح تعمیل کی، اس کا حال

---

[۱] یہ دونوں عبارتیں ابن ہشام (غزوۂ بنی قریظہ) میں ہیں۔ طبری میں بھی قریباً یہی الفاظ ہیں [۲] بلاذری مطبوعہ یورپ صفحہ ۲۲ (یہ روایت مصنف ابن ابی شیبہ کتاب المغازی باب بنی قریظہ میں بھی مذکور ہے) (س)

ابھی گزر چکا۔

بنو قریظہ کے متعلق مخالفین اسلام نے بڑے زور کے ساتھ ظلم و بیرحمی کا اعتراض کیا ہے۔ لیکن واقعات حسب ذیل ہیں:

۱۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں آکر ان کے ساتھ دوستانہ معاہدہ کیا۔ جس میں اُن کے مذہب کو پوری آزادی دی گئی اور جان و مال کی حفاظت کا اقرار کیا گیا۔

۲۔ بنو قریظہ رُتبہ میں بنو نضیر سے کم تھے۔ یعنی بنو نضیر کا کوئی آدمی قریظہ کے کسی آدمی کو قتل کر دیتا تھا تو اس کو صرف آدھا خوں بہا دینا پڑتا تھا بخلاف اس کے بنو قریظہ پورا خونبہا ادا کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریظہ پر یہ احسان کیا کہ ان کا درجہ بنو نضیر کے برابر کر دیا۔[۱]

۳۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو نضیر کی جلاوطنی کے وقت بنو قریظہ سے دوبارہ تجدید معاہدہ کی۔

۴۔ باوجود ان باتوں کے عہد شکنی کی اور جنگ احزاب میں شریک ہوئے۔

۵۔ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن قلعہ میں حفاظت کے لیے بھیج دی گئی تھیں، ان پر حملہ کرنا چاہا۔

۶۔ حُیَی بن اخطب جو بغاوت کے جُرم میں جلاوطن کر دیا گیا تھا، جس نے تمام عرب کو برانگیختہ کر کے جنگ احزاب قائم کر دی تھی، اس کو اپنے ساتھ لائے جو آتش جنگ کے اشتعال کا دیباچہ تھا۔

---

[۱] ابوداؤد (ج ۲ کتاب الدیات باب النفس بالنفس)۔ "س"

ان حالات کے ساتھ بنو قریظہ کے ساتھ اور کیا سلوک کیا جا سکتا تھا۔

یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ عرب میں محالفت کا معاہدہ اخوت حقیقی کے برابر تھا۔ بنو قریظہ انصار کے حلیف تھے اور اسی بنا پر تمام انصار (اوس) نے ان کی نہایت الحاح کے ساتھ سفارش کی۔ حضرت سعدؓ بن معاذ اوس کے سردار تھے اور دراصل معاہدہ کے وہی ذمہ دار تھے۔ وہ سخت کش مکش میں تھے۔ ان کے حلیفوں کی موت و حیات کا مسئلہ تھا جن کی حمایت پر کل انصار (اوس) مصر تھے۔ لیکن حضرت سعدؓ بن معاذ اس فیصلہ کے سوا اور کیا کر سکتے تھے۔

مقتولین کی تعداد ارباب سیر نے ۶۰۰ سے زاید بیان کی ہے۔ لیکن صحاح میں ۴۰۰ ہے۔ ان میں صرف ایک عورت تھی اور وہ اس قصاص میں ماری گئی تھی کہ اس نے قلعہ پر سے ایک پتھر گرا کر ایک مسلمان (خلادؓ) کو قتل کر دیا تھا۔ اس عورت نے جس دلیری اور جرأت سے جان دی، سنن ابی داؤد میں وہ حسب ذیل حیرت انگیز طریقہ سے مذکور ہے۔

اُس کو معلوم ہو چکا تھا کہ مقتولین کی فہرست میں اس کا نام بھی ہے۔ قتل گاہ میں مجرم آتے اور عدم کو روانہ ہوتے جاتے تھے۔ ایک ایک کا نام پکارا جا رہا تھا اور یہ ہوش رُبا صدا بار بار اس کے کانوں میں آتی تھی لیکن وہ بے تکلف حضرت عائشہؓ سے باتیں کرتی جاتی اور بات بات پر ہنستی جاتی تھی۔ دفعتہً قاتل نے اس کا نام پکارا، وہ بے تکلف اُٹھ کھڑی ہوئی۔ حضرت عائشہؓ نے پوچھا کہاں؟ بولی میں نے ایک جرم کیا تھا اس کی

---

(۱) ابن ہشام غزوۂ بنی قریظہ (۲) سنن ابو داؤد کتاب الجہاد باب قتل النساء (س)

سزا اٹھانے جاتی ہوں۔ خوشی خوشی قتل گاہ میں آئی اور تلوار کے نیچے سر رکھ دیا۔

حضرت عائشہ رضؓ جب اس واقعہ کو بیان کرتی تھیں تو نہایت حیرت کے لہجے میں بیان کرتی تھیں۔

ریحانہ کا غلط واقعہ

متعدد ارباب سیر نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریظہ کے قیدیوں میں سے ایک یہودی عورت جس کا نام ریحانہ تھا، اس کی نسبت حکم دیا کہ الگ کر لی جائے، اور پھر چند روز کے بعد اس کو اپنے حرم میں داخل کر لیا۔ چنانچہ جن مؤرخین نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لونڈیوں سے بھی متمتع ہوتے تھے۔ انھوں نے دو مثالیں پیش کی ہیں۔ ایک یہی ریحانہ اور دوسری ماریہ قبطیہ، عیسائی مؤرخوں نے اس واقعہ کو صحیح قرار دے کر نہایت ناگوار صورت میں دکھایا ہے۔ ایک مؤرخ نہایت طعن آمیز الفاظ میں لکھتا ہے کہ "بانیِ اسلام جب سات سو مقتولین کی لاشوں کے تڑپنے کا تماشا دیکھ چکا تو گھر پر آکر تفریحِ خاطر کے لیے ...

......"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ سرے سے یہ واقعہ ہی غلط ہے۔

ریحانہ کے حرم میں داخل ہونے کی جس قدر روایتیں ہیں، سب واقدی کی یا ابن اسحاق سے ماخوذ ہیں۔ لیکن واقدی نے بتصریح بیان کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح کیا تھا۔ ابن سعد نے واقدی کی جو روایت نقل کی ہے، اس میں خود ریحانہ کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

فاعتقنی وتزوج بی — پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو آزاد کر دیا۔ اور مجھ سے نکاح کر لیا۔

حافظ ابن حجر نے اصابہ میں محمد بن الحسن کی تاریخِ مدینہ سے جو روایت

نقل کی ہے، اس کے یہ الفاظ ہیں :

وکانت ریحانۃ القرظیۃ	اور ریحانہ قرظیہ جو آنحضرت صلی اللہ
زوج النبی صلی اللہ علیہ	علیہ وسلم کی زوجہ (محترم) تھیں، اس
وسلم تسکنہ	مکان میں رہتی تھیں +

حافظ ابن مندہ کی کتاب (طبقات الصحابہ) تمام محدثینِ مابعد کا ماخذ ہے، اس میں یہ الفاظ ہیں[۱] :

واستسری ریحانۃ من بنی	ریحانہ کو گرفتار کیا اور پھر آزاد کر دیا
قریظۃ ثم اعتقھا فلحقت	تو وہ اپنے خاندان میں چلی گئیں،
باھلھا واحتجبت وھی عند	اور وہیں پردہ نشین ہو کر
اھلھا	رہیں +

حافظ ابن حجر اس عبارت کو نقل کر کے لکھتے ہیں :

وھذہ فائدۃ جلیلۃ اغفلھا ابن الاثیر،

حافظ ابن مندہ کی عبارت سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو آزاد کر دیا تھا، اور اپنے خاندان میں جا کر بیویوں کی طرح پردہ نشین ہو کر رہیں +

ہمارے نزدیک محقق واقعہ یہی ہے، اور اگر یہی مان لیا جائے کہ وہ حرم نبوی میں آئیں، تب بھی قطعاً وہ منکوحات میں تھیں کنیز نہ تھیں[۲] +

---

[۱] دیکھو اصابہ فی احوال الصحابہ ذکر ریحانہؓ (ج ۴ ص ۳۰۹)۔ [۲] حضرت ریحانہ کے متعلق کتبِ سیر میں تین قسم کی روایتیں ہیں : ایک یہ کہ آپؐ نے اُن کو آزاد کر دیا، اور وہ اپنے خاندان والوں کے پاس جا کر پردہ نشین ہو کر رہیں۔ یہ روایت ابن مندہ کی

حضرت زینبؓ سے نکاح
۵ھ

اس سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینبؓ سے نکاح کیا۔ نکاح ایک معمولی بات ہے اور اس کی تفصیل کا موقع ازواجِ مطہرات کا عنوان ہے لیکن اس واقعہ میں ایسے حالات جمع ہو گئے جنھوں نے مخالفین کے نزدیک اس کو ایک مہتم بالشان مسئلہ بنا دیا۔ عیسائی مورخوں نے اس واقعہ کو نہایت آب و رنگ سے لکھا ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص و نکتہ چینی (عیاذاً باللہ) کے لیے ان کے نزدیک اور کوئی واقعہ بکار آمد نہیں ہو سکتا۔

ہم اس واقعہ کو تفصیل سے لکھتے ہیں، جس سے اس نکتہ کو اچھی طرح ذہن نشین کرانا مقصود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات پر نکتہ چینی کا موقع جو دشمنوں کو ہاتھ آتا ہے اس کا اصلی مخرج کیا ہے؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زیدؓ کو جو آپؐ کے آزاد کردہ غلام تھے متبنیٰ بنا لیا تھا۔ جب وہ سن بلوغ کو پہنچے تو آپؐ نے ان کی شادی حضرت زینبؓ

(بقیہ حاشیہ ص۴۵۰) مگر اس کی تائید میں کوئی دوسری روایت نہیں۔ دوسری قسم کی روایت یہ ہے آپؐ نے ان کو آزاد کر کے مثل دیگر امہات المومنین کے رکھنا چاہا، مگر انھوں نے اس کی غیر معمولی ذمہ داری محسوس کر کے باندی بن کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہنا قبول کیا، یہ روایت ابن اسحاق کی ہے۔ تیسری قسم کی روایت یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مختار بنا دیا تو انھوں نے اسلام قبول کیا۔ تو آپؐ نے ان کو آزاد کر کے اُن سے نکاح کر لیا۔ یہ روایت واقدی کی ہے۔ ابن سعد نے واقدی سے مختلف سلسلوں سے اسی روایت کو ذکر کیا ہے اور واقدی نے اسی کو اثبت کہا ہے۔ دیکھیے کتاب البدایہ ابن کثیر جلد ۵ ص۳۰۵ اور امام زہری نے بھی زوجیت کی تائید کی ہے بحوالہ سابق تفصیل کے لیے دیکھیے اصابہ ذکر ریحانہ"۔ س"

سے کرنی چاہی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی پھوپھیری بہن تھیں، (اُن کی ماں اُمیمہ، عبدالمطلب کی بیٹی تھیں) لیکن چونکہ وہ غلام رہ چکے تھے، اس لیے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو یہ نسبت گوارا نہ تھی:

وکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارادان یزوجھا زید بن حارثہ مولاہ فکرھت ذالک۔[۱]	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نکاح اپنے غلام زید سے کر دینا چاہا تو انھوں نے ناپسند کیا۔

لیکن بالآخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعمیلِ ارشاد کے لحاظ سے راضی ہوگئیں۔ تقریباً ایک سال تک حضرت زید رضی اللہ عنہ کے نکاح میں رہیں لیکن دونوں میں ہمیشہ شکر رنجی رہتی تھی، یہاں تک کہ زید نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر شکایت کی اور اُن کو طلاق دینا چاہا۔

فجاء زید بن حارثہ فقال یارسول اللہ ان زینب اشتد علی لسانھا وانا ارید ان اطلقھا۔[۲]	زید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور عرض کی کہ زینب رضی اللہ عنہا مجھ سے زبان درازی کرتی ہیں، اور مَیں اُن کو طلاق دینا چاہتا ہوں۔

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بار بار اُن کو سمجھاتے تھے کہ طلاق نہ دیں۔ قرآن مجید میں ہے:

وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْۤ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَیْهِ اَمْسِكْ	اور جبکہ تم اُس شخص سے جس پر خدا نے اور تم نے احسان کیا تھا یہ کہتے تھے کہ

---

[۱] فتح الباری تفسیر سورۂ احزاب بحوالہ ابن ابی حاتم، [۲] فتح الباری تفسیر سورۂ احزاب، بحوالہ روایت عبدالرزاق از معمر از قتادہ۔

عَلَیْکَ زَوْجَکَ وَاتَّقِ اللّٰہَ۔ (احزاب ۵) اپنی بیوی کو نکاح میں لیے رہو، اور خُدا سے خوف کرو۔

لیکن کسی طرح صحبت برآر نہ ہو سکے، اور آخر زید رضؓ نے ان کو طلاق دے دی حضرت زینب رضؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بہن تھیں اور آپؐ ہی کی تربیت میں پلی تھیں، آپؐ کے فرمانے سے اُنھوں نے یہ رشتہ منظور کر لیا تھا، جو اُن کے نزدیک اُن کے خلافِ شان تھا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو مساواتِ اسلامی قائم کرنا چاہتے تھے اس میں آزاد و غلام کی کوئی تمیز نہ تھی۔ بہرحال جب وہ مطلقہ ہو گئیں تو آپؐ نے اُن کی دلجوئی کے لیے خود اُن سے نکاح کر لینا چاہا، لیکن عرب میں اس وقت تک متبنّیٰ اصلی بیٹے کے برابر سمجھا جاتا تھا، اس لیے عام لوگوں کے خیال سے آپؐ تامّل فرماتے تھے۔ لیکن چونکہ یہ محض جاہلیت کی رسم تھی اور اس کا مٹانا مقصود تھا۔ اس لیے یہ آیت نازل ہوئی:

وَتُخْفِیْ فِیْ نَفْسِکَ مَا اللّٰہُ مُبْدِیْہِ وَتَخْشَی النَّاسَ وَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰہُ۔ (احزاب ۵) اور تم اپنے دل میں وہ بات چھپاتے ہو جس کو خُدا ظاہر کر دینے والا ہے اور تم لوگوں سے ڈرتے ہو حالانکہ ڈرنا خُدا سے چاہیے۔

غرض آپؐ نے حضرت زینب رضؓ سے نکاح کر لیا اور جاہلیت کی ایک قدیم رسم کہ متبنّیٰ اصلی بیٹے کا حکم رکھتا ہے، مِٹ گئی۔ اس پر منافقوں اور بدگویوں نے بہت طعنے دیے، لیکن امرِ حق کے اجراء میں مطاعن کا آماجگاہ بننا لازمی ہے۔

واقعہ کی اصلی اور سادہ حقیقت یہ تھی، مخالفوں نے اس واقعہ کو جس طرح بیان کیا ہے، گو سرتاپا کذب و افترا ہے لیکن ہم کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اُنھوں نے رنگ آرائی کے لیے سیاہی ہمارے ہی ہاں سے مستعار لی ہے۔

تاریخ طبری میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زید سے ملنے

کے لیے اُن کے گھر گئے۔ زید نہ تھے۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کپڑے پہن رہی تھیں، اسی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھ لیا اور یہ الفاظ کہتے ہوئے باہر نکل آئے:

سُبْحَانَ اللہِ العظیم سبحان اللہ مصرّف القلوب[۱]۔ | پاک ہے خدائے برتر پاک ہے وہ خدا جو دلوں کو پھیر دیتا ہے۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ کو یہ حالات معلوم ہوئے تو انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ زینب رضی اللہ عنہا اگر آپ کو پسند آگئی ہوں تو میں ان کو طلاق دے دوں۔

میں نے یہ بیہودہ روایت اپنے دل پر سخت جبر کرکے نقل کی ہے "نقلِ کُفر کفر نہ باشد"۔ یہی روایت ہے جو عیسائی مورّخوں کا مایۂ استناد ہے۔ لیکن ان غریبوں کو یہ معلوم نہیں کہ اصولِ فن کے لحاظ سے یہ روایت کس پایہ کی ہے۔ مورّخ طبری نے یہ روایت واقدی کے ذریعے سے نقل کی ہے جو مشہور کذاب اور دروغ گو ہے، اور جس کا مقصد اس قسم کی بیہودہ روایتوں سے یہ تھا کہ عبّاسیوں کی عیش پرستی کے لیے سند ہاتھ آئے۔

طبری کے علاوہ اور لوگوں نے بھی اسی قسم کی بیہودہ روایتیں نقل کی ہیں، لیکن محدّثین نے ان کو اس قابل نہیں سمجھا کہ اُن سے تعرّض کیا جائے۔ حافظ ابنِ حجر سخت روایت پرست ہیں تاہم فتح الباری (سورۂ احزاب کی تفسیر) میں جہاں اس واقعہ سے بحث کی ہے، لکھتے ہیں:

ووردت آثار اخرى اخرجها ابن ابی حاتم والطبری و | اور اور بہت سی روایتیں آئی ہیں جن کو ابن ابی حاتم اور طبری نے روایت

---

[۱] تاریخ طبری آغاز واقعات ۵ھ ہجری

نقلها کثیر من المفسرین لا	کیا ہے اور اکثر مفسرین نے اُن کو نقل کر دیا ہے
ینبغی التشاغل بها۔	ان روایتوں میں مشغول نہ ہونا چاہیے۔

حافظ ابن کثیر جو مشہور محدثین میں ہیں اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ذکر ابن ابی حاتم وابن جریر	ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے اس
ھٰھنا آثارًا عن بعض السلف	موقع پر بعض اسلاف سے چند روایتیں
رضی اللہ عنھم اَحْبَبْنَا اَن	نقل کی ہیں جن کو ہم اس لیے
نضرب عنها صفحا لعدم	نظر انداز کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ
صحتها فلا نوردها وقد روی	غلط ہیں، اور امام احمدؒ نے بھی
الامام احمد ھٰھنا ایضًا	اس واقعہ کے متعلق انسؓ سے
من روایة حماد بن زید عن	سے ایک روایت نقل کی ہے جو
ثابت عن انس رضی اللہ عنه	غریب ہے۔ ہم نے اس کا ذکر بھی
فیه غرابة ترکنا سیاقه	چھوڑ دیا ہے۔
ایضًا۔	

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت منافقوں کا بہت زور تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر لوگوں نے جو تہمت لگائی وہ بھی اسی سال کا واقعہ ہے۔ منافقین ان خبروں کو اس طرح پھیلاتے تھے کہ بچے بچے کی زبان پر چڑھ جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تہمت میں خود چند مسلمان بھی آلودہ ہو گئے، جن کو شریعت کے موافق قذف کی سزا دی گئی۔ یہی روایتیں ہیں جو بچی کھچی غیر محتاط کتابوں میں باقی رہ گئیں۔ لیکن محدثین جن کا معیارِ تحقیق بلند ہے اور عدالتِ روایت کے حاکمانِ مجاز ہیں، مثلاً امام بخاری، امام مسلم وغیرہ، اُن کے ہاں ان روایتوں کا ذکر تک نہیں آتا۔

واقعات متفرقہ ۵ھ | اس سال کی تاریخ مذہبی میں سب سے اہم واقعات عورتوں کے متعلق متعدد اصلاحی احکام کا نزول ہے۔ اب تک مسلمان عورتیں عام جاہلانہ طریق سے چلتی پھرتی تھیں اور اسی قسم کے لباس و زیور پہنتی تھیں۔ اب حکم ہوا کہ شریف عورتیں گھر سے نکلیں تو ایک بڑی چادر اوڑھ کر گھونگھٹ نکال لیا کریں۔ جس سے مُنہ بھی چھپ جائے۔ آنچل سینے پر ڈال کر چلیں۔ پاؤں جھٹک جھٹک کر نہ چلیں، پردے کی اوٹ سے بولیں تصنع اور بناوٹ کی بولی نہ بولیں۔ ازواج مطہرات کے لیے غیر مردوں کے سامنے آنا قطعاً ممنوع ہوا۔

مُنہ بولے لڑکے کی بیوی سے جاہلیت میں بیاہ ناجائز تھا۔ اس رسم کی اصلاح بھی اسی سال ہوئی۔ زنا کی سزا سَو کوڑے بھی اسی سال نازل ہوئی۔ عفیف عورتوں پر الزام لگانا جاہلیت کا ایک معمولی فعل تھا، اور ان کمزوروں کے پاس اس حملہ کے روکنے کے لیے کوئی قانونی سپر نہ تھی۔ اس سال "حدِ قذف" نازل ہوئی، جس کے رو سے بغیر شہادت کے تنہا اتہام جرم قرار دیا گیا۔ بصورت عدم وجودِ شہادت لعان کا طریقہ بتایا گیا۔ یعنی زن و شو دونوں اپنی سچائی اور فریق ثانی کی دروغگوئی کا بحلف اظہار کریں اور اس کے بعد ان میں تفرقہ کر دیا جائے۔[۱]

عرب میں ایک قسم کی طلاق جاری تھی، جس کو ظہار کہتے ہیں۔ اس سال

---

[۱] بخاری جلد ۲ ص ۷۰۰ و سیرت گازرونی قلمی، ابوداؤد جلد ۲ ص ۲۱۲۔ نیز فتح الباری جلد ۲ صفحہ ۱۰۶، دیکھنا چاہیے، یہ تمام احکام سورۂ نور میں بتقریب واقعہ افک ۵ھ میں نازل ہوئے۔

اس قسم کی طلاق غیر مؤثر قرار دی گئی اور اس کے لیے کفّارہ مقرّر کیا گیا۔

پانی نہ ملنے کی حالت میں تیمّم کی مشروعیّت بھی اسی سال کا حکم ہے۔

بروایتِ صحیح نمازِ خوف کا حُکم قرآن مجید میں اسی سال نازل ہُوا، جس کی تفصیل مناسب موقع پر آئے گی۔

۶ سنہ

صلح حدیبیہ و بیعت رضوان

مکہ معظمہ سے ایک منزل کے فاصلے پر ایک کنواں ہے جس کو حدیبیہ کہتے ہیں۔ گاؤں بھی کنوئیں کے نام سے مشہور ہو گیا۔ چونکہ معاہدہ صلح یہیں لکھا گیا، اس لیے اس واقعہ کو صلح حدیبیہ کہتے ہیں۔

تاریخ اسلام میں یہ واقعہ نہایت اہم یعنی اسلام کی تمام آئندہ کامیابیوں کا دیباچہ ہے۔ اور اسی بنا پر باوجود اس کے کہ وہ صرف ایک صلح کا معاہدہ تھا اور صلح بھی بظاہر مغلوبانہ تھی۔ تاہم خدا نے قرآن مجید میں اس کو فتح کا لقب دیا ہے۔

کعبہ اسلام کا اصلی مرکز تھا۔ اسلام کی بنیاد حضرت ابراہیمؑ نے قائم کی تھی، اور یہ لقب اسلام بھی انہی کی ایجاد ہے۔

هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ (الحج۔۱۰) ابراہیم ہی ہے جس نے تمہارا نام مسلمان رکھا۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جو شریعت ملی وہ کوئی نئی شریعت نہ تھی، بلکہ وہی ابراہیمی شریعت تھی۔

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ۔ (الحج۔۱۰) تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب۔

زمانہ کے امتداد سے گو اُنہی کی اولاد بُت پرست بن گئی تھی تاہم کعبہ جو ابراہیمی یادگار تھا عرب کا قبلہ گاہِ عام تھا، تمام عرب اس کو اپنا مشترک ورثہ آبائی سمجھتا تھا۔ نہ صرف وہ لوگ جو حضرت ابراہیمؑ کے خاندان سے تھے، بلکہ وہ بھی جو قحطانی تھے اور جن کا سلسلۂ نسب اس خاندان سے الگ تھا۔ عرب کے قبائل سال بھر آپس میں لڑتے رہتے تھے اور یہی غارتگریاں اُن کی بقائے زندگانی کا ذریعہ تھیں۔ کیونکہ اُن کی معاش بھی اسی پر منحصر تھی۔ تاہم چار مہینے تک جو اشہرِ حرم کہلاتے تھے۔ تمام لڑائیاں بند ہو جاتی تھیں۔ قبائلِ عرب دُور دُور سے سفر کر کے آتے اور اس قبلہ گاہِ عام میں عبادت اور عقیدت کے رسوم بجالاتے تھے۔ وہ قبائل جن میں سے ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہوتا تھا، اب یکجا جمع نظر آتے تھے، اور شیر و شکر ہو کر ملتے تھے، گویا بھائی بھائی ہیں۔ مسلمان بہ جبر مکہ سے نکالے گئے تھے، لیکن یہ خیال ان کے دل سے نہیں گیا تھا اور نہ جا سکتا تھا کہ کعبہ پر اُن کا بھی کم از کم اسی قدر حق ہے، جس قدر اور قبائل کا ہے۔ اس کے ساتھ مکہ سے مسلمانوں کو گوناگوں تعلقات تھے۔ وہ ان کا قدیم اور محبوب وطن تھا۔ مکہ کی یاد ایک پھانس تھی جو ہر وقت اُن کے کلیجے میں کھٹکتی رہتی تھی۔ حضرت بلالؓ مکہ میں اس قدر ستائے گئے تھے تاہم ان کو جب مکہ یاد آتا تو روتے تھے اور پکار کر یہ اشعار[1] پڑھتے تھے:

اَلَا لَیْتَ شعری ھل ابیتنّ لیلۃً	آہ! کیا پھر کبھی وہ دن آسکتا ہے کہ میں مکہ کی وادی
بِوادٍ وحَولی اِذْخَرٌ وجلیلُ	میں ایک رات بسر کروں اور میرے پاس اذخر

---

[1] یہ اشعار صحیح بخاری میں بھی مذکور ہیں (باب مقدم النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ المدینۃ) ص ۱۱

وَهَل اَرِدَنْ یَوْمًا مِیَاہَ مَجَنَّۃَ اور جلیل ہوں، اور کیا وہ دن بھی ہوگا کہ میں مجنہ

- وَهَل یَبْدُوَنْ لِی شَامَۃٌ وَطَفِیْل کے چشموں پر اتروں اور شامہ و طفیل مجھ کو دکھائی دیں

اکثر مہاجرین جان بچا کر نکل آئے تھے لیکن خاندان اور بال بچے وہیں رہ گئے تھے۔

اسلام کے فرائض چہارگانہ میں حج کعبہ ایک رکن اعظم ہے۔ غرض مختلف اسباب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ کا ارادہ کیا اور اس غرض سے کہ قریش کو کوئی اور احتمال نہ ہو، عمرہ[1] کا احرام باندھا اور قربانی کے اونٹ ساتھ لیے، یہ بھی حکم دیا کہ کوئی شخص ہتھیار باندھ کر نہ آئے، صرف تلوار جو عرب میں سفر کا ضروری آلہ سمجھی جاتی تھی پاس رکھ لی جائے۔ اس میں بھی یہ شرط ہے کہ نیام میں بند ہو۔

چونکہ مہاجرین عموماً اور اکثر انصار اس سعادت کے منتظر تھے۔ ۱۴۰۰ شخص اس سفر میں ہمرکاب ہوئے۔ مقام ذوالحلیفہ میں پہنچ کر قربانی کی ابتدائی رسمیں ادا ہوگئیں۔ یعنی قربانی کے اونٹ ساتھ تھے، ان کی گردنوں میں قربانی کی علامت کے طور پر لوہے کے نعل لگا دیے گئے۔

احتیاط کے لیے قبیلہ خزاعہ کا ایک شخص جس کے اسلام لانے کا حال قریش کو معلوم نہ تھا پہلے بھیج دیا گیا کہ قریش کے ارادے کی خبر لائے جب قافلہ عسفان کے قریب پہنچا، اس نے آکر خبر دی کہ قریش نے تمام قبائل (احابیش) کو یکجا کر کے کہہ دیا ہے کہ محمدؐ مکہ میں کبھی نہیں آسکتے۔

غرض قریش نے بڑے زور و شور سے مقابلے کی تیاری کی۔ قبائل متحدہ کے پاس پیغام بھیجا۔ وہ جمعیت عظیم لے کر آئے۔ مکہ سے باہر بلدح ایک مقام پر

---

[1] وساق معہ الھدی واحرم بالعمرۃ لیامن الناس من حربہ (ابن ہشام)

فوجیں فراہم ہوئیں۔ خالد بن ولید جو اب تک اسلام نہیں لائے تھے' دو سو سوار لے کر جن میں ابوجہل کا بیٹا عکرمہ بھی تھا۔ مقدمۃ الجیش کے طور پر آگے بڑھے اور غمیم تک پہنچ گئے جو رابغ اور جحفہ کے درمیان ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قریش نے خالد کو طلیعہ بنا کر بھیجا ہے اور وہ مقام غمیم تک آ گئے ہیں' اس لیے کترا کر دہنی طرف سے چلو۔ فوج اسلام جب غمیم کے قریب پہنچ گئی تو خالد کو گھوڑوں کی گرد اڑتی نظر آئی۔ وہ گھوڑا اڑاتے ہوئے گئے اور قریش کو خبر کی کہ لشکر اسلام غمیم تک آ گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھے اور حدیبیہ میں پہنچ کر قیام کیا۔ یہاں پانی کی قلت تھی۔ ایک کنواں تھا وہ پہلے ہی آمد میں خالی ہو گیا لیکن اعجاز نبوی سے اس میں اس قدر پانی آ گیا کہ سب سیراب ہو گئے۔

قبیلہ خزاعہ نے اب تک اسلام نہیں قبول کیا تھا' لیکن اسلام کے حلیف اور راز دار تھے۔ قریش اور عام کفار جو منصوبے اسلام کے خلاف کیا کرتے تھے وہ ہمیشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے مطلع کر دیا کرتے تھے۔ اس قبیلہ کے رئیس اعظم بدیل بن ورقاء تھے (فتح مکہ میں اسلام لائے)۔ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تشریف لانا معلوم ہوا تو چند آدمی ساتھ لے کر بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ قریش کی فوجوں کا سیلاب آ رہا ہے' وہ آپ کو کعبہ میں نہ جانے دیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قریش سے جا کر کہہ دو کہ ہم عمرہؓ کی غرض سے آئے ہیں' لڑنا مقصود نہیں۔ جنگ نے

ؓ عمرہ گویا ایک چھوٹا سا حج ہے جس میں حج کی اکثر رسمیں ادا کی جاتی ہیں۔ (یعنی اس میں حرم کے باہر میقات سے احرام باندھ کر صرف صفا اور مروہ کے درمیان سعی' اور کعبہ کا طواف کیا جاتا ہے اور بال منڈوائے یا کتروائے جاتے ہیں۔) "س"

قریش کی حالت زار کردی ہے اور ان کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ ان کے لیے یہ بہتر ہے کہ ایک مدت معین کے لیے معاہدۂ صلح کر لیں اور مجھ کو عرب کے ہاتھ میں چھوڑ دیں۔ اس پر بھی اگر وہ راضی نہیں تو اس خدا کی قسم، جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں یہاں تک لڑوں گا کہ میری گردن الگ ہو جائے اور خدا کو جو فیصلہ کرنا ہو کر دے۔" بدیل نے جا کر قریش سے کہا کہ "میں محمدؐ کے پاس سے پیغام لے کر آیا ہوں اجازت دو تو کہوں۔" چند شریر بول اٹھے کہ ہم کو محمدؐ کے پیغام سننے کی ضرورت نہیں۔ لیکن سنجیدہ لوگوں نے اجازت دی۔ بدیل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شرطیں پیش کیں۔ عروہ بن مسعود ثقفی نے اٹھ کر کہا "کیوں قریش! کیا میں تمہارا باپ اور تم میرے بچے نہیں۔" بولے ہاں۔ عروہ نے کہا میری نسبت تم کو کوئی بدگمانی تو نہیں، سب نے کہا، نہیں۔ عروہ نے کہا "اچھا تو مجھ کو اجازت دو کہ میں خود جا کر معاملہ طے کروں، محمدؐ نے معقول شرطیں پیش کی ہیں۔" غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے، قریش کا پیغام سنایا اور کہا، محمد فرض کرو کہ تم نے قریش کا استیصال کر دیا تو کیا اس کی اور بھی کوئی مثال ہے کہ کسی نے اپنی قوم کو خود برباد کر دیا ہو۔ اس کے سوا اگر لڑائی کا رخ بدلا تو تمہارے ساتھ جو یہ بھیڑ ہے گرد کی طرح اڑ جائے گی۔ حضرت ابوبکرؓ کو اس بدگمانی پر اس قدر غصہ آیا کہ گالی دے کر کہا کہ "کیا ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے؟" عروہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یہ کون ہیں؟ آپؐ نے فرمایا، ابوبکر۔ عروہ نے کہا "میں ان کی سخت کلامی کا جواب دیتا، لیکن ان کا ایک احسان میری گردن پر ہے، جس کا بدلہ ابھی تک میں ادا نہیں کر سکا۔"

عروہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بے تکلفانہ طریقہ سے گفتگو کر رہا تھا،

اور جیسا کہ عرب کا قاعدہ ہے کہ بات کرتے کرتے مخاطب کی داڑھی پکڑ لیتے ہیں، وہ ریش مبارک پر بار بار ہاتھ ڈالتا تھا۔ حضرت مغیرہ رضؓ بن شعبہ جو ہتھیار لگائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت پر کھڑے تھے، اس جرأت کو گوارا نہ کر سکے، عروہ سے کہا "اپنا ہاتھ ہٹا لے، ورنہ یہ ہاتھ بڑھ کر واپس نہ جا سکے گا"۔ عروہ نے حضرت مغیرہ کو پہچانا اور کہا "او دغا باز! کیا میں تیری دغا بازی کے معاملے میں تیرا کام نہیں کر رہا ہوں"۔ (حضرت مغیرہ نے چند آدمی قتل کر دیے تھے، جن کا خون بہا عروہ نے اپنے پاس سے ادا کیا تھا۔)

عروہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہ کی حیرت انگیز عقیدت کا جو منظر دیکھا اُس نے اس کے دل پر عجیب اثر کیا۔ قریش سے جا کر کہا، کہ میں نے قیصر و کسریٰ و نجاشی کے دربار دیکھے ہیں، یہ عقیدت اور وارفتگی کہیں نہیں دیکھی۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بات کرتے ہیں تو سناٹا چھا جاتا ہے۔ کوئی شخص اُن کی طرف نظر بھر کر نہیں دیکھ سکتا۔ وہ وضو کرتے ہیں تو پانی جو گرتا ہے اُس پر خلقت ٹوٹ پڑتی ہے۔ بلغم یا تھوک گرتا ہے تو عقیدت کیش ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں اور چہرہ اور ہاتھوں میں مل لیتے ہیں۔[۱]

چونکہ معاملہ ناتمام رہ گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خراش رضؓ بن اُمیہ کو قریش کے پاس بھیجا، لیکن قریش نے اُن کی سواری کے اونٹ کو۔ جو خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری کا تھا، مار ڈالا اور خود اُن پر بھی یہی گزرنے والی تھی، لیکن قبائلِ متحدہ کے لوگوں نے بچا لیا اور وہ کسی طرح جان بچا کر چلے آئے۔

---

(۱) بخاری کتاب الشروط باب الشروط فی الجہاد و المصالحۃ مع اہل الحرب و کتابۃ الشروط "س"

اب قریش نے ایک دستہ بھیجا کہ مسلمانوں پر حملہ آور ہو، لیکن یہ لوگ گرفتار کر لیے گئے۔ گو یہ سخت شرارت تھی، لیکن رحمت عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دامن عفو اس سے زیادہ وسیع تھا۔ آپؐ نے سب کو چھوڑ دیا اور معافی دے دی۔ قرآن مجید کی اس آیت میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ[1] ہے:۔

وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ	اور وہ وہی خدا ہے جس نے مکہ میں
عَنْكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ	ان لوگوں کا ہاتھ تم سے اور تمھارا ہاتھ ان
بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْ بَعْدِ أَنْ	سے روک دیا۔ بعد اس کے کہ تم کو ان
أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ (فتح-۳)	پر قابو دے دیا تھا۔

بیعت رضوان بالآخر آپؐ نے گفتگوئے صلح کے لیے حضرت عمر رضؓ کو انتخاب کیا، لیکن انھوں نے معذرت کی کہ قریش میرے سخت دشمن ہیں اور مکہ میں میرے قبیلے کا ایک شخص بھی نہیں کہ مجھ کو بچا سکے۔ آپؐ نے حضرت عثمان رضؓ کو بھیجا، وہ اپنے ایک عزیز (ابان بن سعید) کی حمایت میں مکہ گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام سنایا۔ قریش نے ان کو نظر بند کر لیا۔ لیکن عام طور پر یہ خبر مشہور ہو گئی کہ وہ قتل کر ڈالے گئے۔ یہ خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپؐ نے فرمایا کہ عثمان کے خون کا قصاص لینا فرض ہے۔ یہ کہہ کر آپؐ نے ایک ببول کے درخت کے نیچے بیٹھ کر صحابہؓ سے جان نثاری کی بیعت لی۔ تمام صحابہ رضؓ نے جن میں زن و مرد دونوں شامل تھے۔ ولولہ انگیز جوش کے ساتھ دست مبارک پر جان نثاری کا عہد کیا۔ یہ تاریخ اسلام کا ایک مہتم بالشان واقعہ ہے۔ اس کا نام بیعۃ الرضوان ہے۔ سورۂ فتح میں اس واقعہ کا اور درخت کا ذکر ہے۔

---

[1] ان آیتوں کی شان نزول میں سخت اختلاف ہے لیکن زیادہ معتبر یہی روایت ہے۔

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ	خدا مسلمانوں سے راضی تھا جب کہ
اِذْ یُبَایِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ	وہ تیرے ہاتھ پر درخت کے نیچے بیعت
فَعَلِمَ مَا فِیْ قُلُوْبِہِمْ فَاَنْزَلَ	کر رہے تھے، سو خدا نے جان لیا جو کچھ
السَّکِیْنَۃَ عَلَیْہِمْ وَ اَثَابَہُمْ	ان لوگوں کے دلوں میں تھا تو خدا نے
فَتْحًا قَرِیْبًا۔ (فتح - ۳)	اُن پر تسلی نازل کی اور عاجلانہ فتح دی۔

لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ وہ خبر صحیح نہ تھی +

قریش نے سہیل بن عمرو کو سفیر بنا کر بھیجا۔ وہ نہایت فصیح و بلیغ مقرر تھے۔ چنانچہ لوگوں نے ان کو "خطیبِ قریش" کا خطاب دیا تھا۔ قریش نے ان سے کہہ دیا، صلح صرف اس شرط پر ہو سکتی ہے کہ محمدؐ اس سال واپس چلے جائیں +

سہیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دیر تک صلح کے شرائط پر گفتگو رہی۔ بالآخر چند شرطوں پر اتفاق ہوا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضؓ کو بلا کر حکم دیا کہ معاہدہ کے الفاظ قلمبند کریں۔ حضرت علی رضؓ نے عنوان پر "بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" لکھا +

عرب کا قدیم طریقہ تھا کہ خطوط کی ابتدا میں "باسمک اللّٰھم" لکھتے تھے۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ سے وہ آشنا نہ تھے، اس بنا پر سہیل بن عمرو نے کہا کہ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ[۱] کے بجائے وہی قدیم الفاظ لکھے جائیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منظور فرمایا۔ آگے کا فقرہ تھا "ھٰذا ما قاضی علیہ محمد رسول اللہ" یعنی "وہ معاہدہ ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

[۱] زرقانی رج ۲ صـ ۲۲۳، "س"

نے تسلیم کیا"۔ سہیل نے کہا "اگر ہم آپؐ کو پیغمبر ہی تسلیم کرتے تو پھر جھگڑا کیا تھا، آپ صرف اپنا اور اپنے باپ کا نام لکھوائیں"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "گو تم تکذیب کرتے ہو، لیکن خدا کی قسم میں خدا کا پیغمبر ہوں"۔ یہ کہہ کر آپؐ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ اچھا خالی میرا نام لکھو۔ حضرت علیؓ سے زیادہ کون فرمان گزار ہو سکتا تھا، لیکن عالم محبت میں ایسے مقام بھی پیش آتے ہیں، جہاں فرمانبری سے انکار کرنا پڑتا ہے۔ حضرت علیؓ نے کہا "میں ہرگز آپ کا نام نہ مٹاؤں گا"۔ آپؐ نے فرمایا اچھا مجھ کو دکھاؤ، میرا نام کہاں ہے۔ حضرت علیؓ نے اس جگہ پر انگلی رکھ دی۔ آپؐ نے "رسول اللہ" کا لفظ مٹا دیا۔[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھنا نہیں آتا تھا، اسی بنا پر آپؐ کو "امی" کہتے ہیں۔ یہ واقعہ مسلم میں جہاں منقول ہے، لکھا ہے کہ آپؐ نے رسول اللہ کا لفظ مٹا کر ابن عبداللہ لکھ دیا۔ بخاری میں چونکہ یہ واقعہ عام روایت کے خلاف ہے اس لیے ایک معرکۃ الآرا مباحثہ بن گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ لکھنے پڑھنے کا کام روزمرہ جب نظر سے گزرتا رہتا ہے تو ناخواندہ شخص بھی اپنے نام سے حرف آشنا ہو جاتا ہے، اس سے امیت میں فرق نہیں آتا۔ بے شبہ امی ہونا آپؐ کا فخر ہے اور خود قرآن مجید میں یہ وصف، شرف و عزت کے موقع پر استعمال ہوا ہے۔ اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ۔ (اعراف ۱۹)

شرائط صلح یہ تھے:

---

[1] صحیح بخاری کی اس روایت میں حضرت علیؓ کا نام اور ان کی گفتگو مذکور نہیں۔ یہ تصریح بخاری کی اس روایت میں ہے جو کہ کتاب المغازی باب عمرۃ القضاء میں مذکور ہے صحیح مسلم میں یہ واقعہ منقول ہے۔

۱۔ مسلمان اس سال واپس چلے جائیں،

۲۔ اگلے سال آئیں اور صرف تین دن قیام کرکے چلے جائیں،

۳۔ ہتھیار لگا کر نہ آئیں، صرف تلوار ساتھ لائیں، وہ بھی نیام میں اور نیام بھی جلبان (تھیلا وغیرہ) میں،

۴۔ مکہ میں جو مسلمان پہلے سے مقیم ہیں، ان میں سے کسی کو اپنے ساتھ نہ لے جائیں اور مسلمانوں میں سے کوئی مکہ میں رہ جانا چاہے تو اس کو نہ روکیں،

۵۔ کافروں یا مسلمانوں میں سے کوئی شخص اگر مدینہ جائے تو واپس کر دیا جائے لیکن اگر کوئی مسلمان مکہ میں جائے تو وہ واپس نہیں کیا جائے گا،

۶۔ قبائل عرب کو اختیار ہوگا کہ فریقین میں سے جس کے ساتھ چاہیں معاہدہ میں شریک ہو جائیں،

یہ شرطیں بظاہر مسلمانوں کے سخت خلاف تھیں۔ اتفاق یہ کہ عین اس وقت جب کہ معاہدہ لکھا جا رہا تھا، سہیل کے صاحبزادے (حضرت ابو جندلؓ) جو اسلام لا چکے تھے اور مکہ میں کافروں نے ان کو قید کر رکھا تھا اور طرح طرح کی اذیتیں دیتے تھے، کسی طرح بھاگ کر پاؤں میں بیڑیاں پہنے ہوئے آئے اور سب کے سامنے گر پڑے۔ سہیل نے کہا "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) صلح کی تعمیل کا یہ پہلا موقع ہے، اس (ابو جندلؓ) کو شرائط صلح کے مطابق مجھ کو واپس دے دو۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ابھی معاہدہ قلمبند نہیں ہو چکا۔" سہیل نے کہا "تو ہم کو صلح بھی منظور نہیں۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نہ یہ تمام شرائط کتب سیر کے علاوہ صحیح مسلم (صلح الحدیبیہ) میں بھی ہیں۔

نے فرمایا اچھا ان کو یہیں رہنے دو سہیل نے نامنظور کیا۔ آپؐ نے چند دفعہ اصرار کیا، لیکن سہیل کسی طرح راضی نہ ہوا۔ مجبوراً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلیم کرنا پڑا۔ ابو جندل رضؓ کو کافروں نے اس قدر مارا تھا کہ ان کے جسم پر نشان تھے، مجمع کے سامنے تمام زخم دکھائے اور کہا، برادرانِ اسلام! کیا پھر مجھ کو اسی حالت میں دیکھنا چاہتے ہو؟ میں اسلام لا چکا ہوں، کیا پھر مجھ کو کافروں کے ہاتھ میں دیتے ہو۔ تمام مسلمان تڑپ اُٹھے۔ حضرت عمر رضؓ ضبط نہ کر سکے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور کہا، یارسول اللہ! کیا آپؐ پیغمبرِ برحق نہیں ہیں؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا "ہاں ہوں"۔ حضرت عمر رضؓ نے کہا، کیا ہم حق پر نہیں؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا، ہاں ہم حق پر ہیں۔ حضرت عمر رضؓ نے کہا، تو ہم دین میں یہ ذلت کیوں گوارا کریں؟ آپؐ نے فرمایا "میں خدا کا پیغمبر ہوں اور خدا کے حکم کی نافرمانی نہیں کر سکتا، خدا میری مدد کرے گا"۔ حضرت عمر رضؓ نے کہا، کیا آپؐ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم لوگ کعبہ کا طواف کریں گے؟ آپؐ نے فرمایا "لیکن یہ تو نہیں کہا تھا کہ اسی سال کریں گے"۔ حضرت عمر رضؓ اُٹھ کر حضرت ابوبکر رضؓ کے پاس آئے اور وہی گفتگو کی۔ حضرت ابوبکر رضؓ نے کہا، وہ پیغمبرِ خدا ہیں، جو کچھ کرتے ہیں خدا کے حکم سے کرتے ہیں[1]۔

حضرت عمر رضؓ کو اپنی ان گستاخانہ معروضات کا جو بے اختیاری میں اُن سے سرزد ہوئیں، تمام عمر سخت رنج رہا اور اس کے کفارہ کے لیے اُنھوں نے نمازیں پڑھیں، روزے رکھے، خیرات کی، غلام آزاد کیے۔ بخاری میں اگرچہ ان اعمال کا ذکر اجمالاً ہے لیکن ابن اسحاق نے تفصیل سے یہ تمام باتیں گنائی ہیں۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الشروط) "س"

اس حالت کا گوارا کرنا گو صحابہ کی اطاعت شعاری کا سخت خطرناک امتحان تھا۔ ایک طرف (ظاہر میں) اسلام کی توہین ہے۔ حضرت ابوجندلؓ بیڑیاں پہنے ہوا سو جاں نثاران اسلام سے استغاثہ کرتے ہیں، سب کے دل جوش سے لبریز ہیں، اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذرا ایما ہو جائے تو تلوار فیصلہ قاطع کے لیے موجود ہے۔ دوسری طرف معاہدہ پر دستخط ہو چکے ہیں، اور ایفائے عہد کی ذمہ داری ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوجندلؓ کی طرف دیکھا اور فرمایا:

یا اباجندل! اصبر واحتسب	ابوجندل! صبر اور ضبط سے کام
فان اللہ جاعل لک ولمن	لو، خدا تمھارے لیے اور مظلوموں
معک من المستضعفین	کے لیے کوئی راہ نکالے گا۔ صلح
فرجا ومخرجا انا قد عقدنا	اب ہو چکی اور ہم ان لوگوں
بیننا وبین القوم صلحا وانا	سے بدعہدی نہیں کر سکتے۔
لا نغدر بہم (ابن ہشام)	

غرض ابوجندلؓ کو اسی طرح پابہ زنجیر واپس جانا پڑا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ لوگ یہیں قربانی کریں لیکن لوگ اس قدر دل شکستہ تھے کہ ایک شخص بھی نہ اٹھا۔ یہاں تک کہ جیسا کہ صحیح بخاری میں[1] ہے، تین دفعہ بار بار کہنے پر بھی ایک شخص آمادہ نہ ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لے گئے اور ام المومنین حضرت ام سلمہؓ سے شکایت کی۔ انھوں نے کہا، آپ کسی سے کچھ نہ فرمائیں، بلکہ باہر نکل کر خود قربانی

(1 کتاب الشروط) "س"

کریں اور احرام اُتارنے کے لیے بال منڈوائیں۔ آپؐ نے باہر آکر خود قربانی کی اور بال منڈوائے۔ اب جب لوگوں کو یقین ہوگیا کہ اس فیصلے میں تبدیلی نہیں ہوسکتی تو سب نے قربانیاں کیں اور احرام اُتارا۔

صُلح کے بعد تین دن تک آپؐ نے حدیبیہ میں قیام فرمایا۔ پھر روانہ ہوئے تو راہ میں یہ سورہ اُتری:

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا (فتح-۱) ہم نے تجھ کو کھلی ہوئی فتح عنایت کی۔

(تمام مسلمان جس چیز کو شکست سمجھتے تھے، خدا نے اس کو فتح کہا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو بلا کر فرمایا کہ یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ اُنھوں نے تعجب سے پوچھا کہ کیا یہ فتح ہے) ارشاد ہوا کہ "ہاں"۔ صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت عمرؓ کو تسکین ہوگئی اور مطمئن ہو گئے۔ نتائج مابعد نے اس رازِ سربستہ کی عقدہ کشائی کی۔

اب تک مسلمان اور کفار ملتے جلتے نہ تھے۔ اب صلح کی وجہ سے آمد و رفت شروع ہوئی۔ خاندانی اور تجارتی تعلقات کی وجہ سے کفار مدینہ میں آتے، مہینوں قیام کرتے اور مسلمانوں سے ملتے جلتے تھے۔ باتوں باتوں میں اسلامی مسائل کا تذکرہ آتا رہتا تھا۔ اس کے ساتھ ہر مسلمان اخلاص، حسنِ عمل، نیکوکاری، پاکیزہ اخلاقی کی ایک زندہ تصویر تھا، جو مسلمان مکہ جاتے تھے، اُن کی صورتیں یہی مناظر

لہ صلح حدیبیہ کے واقعات صحیح بخاری میں نہایت تفصیل سے مذکور ہیں لیکن اصل موقع یعنی غزوات کے ذکر میں نہیں بلکہ کتاب الشروط میں۔ اس بنا پر ارباب سیر کی نگاہ سے یہ واقعات رہ گئے۔ غزوات میں جستہ جستہ واقعات ہیں، ہم نے ان کو بھی لیا ہے۔ باقی جزئیات صحیح مسلم اور ابن ہشام سے ماخوذ ہیں۔

پیش کرتی تھیں، اس سے خود بخود کفار کے دل اسلام کی طرف کھچتے آتے تھے۔ مورخین کا بیان ہے کہ اس معاہدۂ صلح سے لے کر فتح مکہ تک اس قدر کثرت سے لوگ اسلام لائے کہ کبھی نہیں لائے تھے۔ حضرت خالدؓ (فاتح شام) اور حضرت عمرو بن عاصؓ (فاتح مصر) کا اسلام بھی اسی زمانہ کی یادگار ہے +

معاہدۂ صلح میں یہ جو شرط تھی کہ جو مسلمان مکہ سے چلا آئے گا وہ پھر مکہ کو واپس کر دیا جائے گا، اس میں صرف مرد داخل تھے عورتیں نہ تھیں۔ عورتوں کے متعلق خاص یہ آیت اتری:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَكُمُ الْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٍ فَامْتَحِنُوهُنَّ ۖ اللَّهُ أَعْلَمُ بِإِيمَانِهِنَّ ۖ فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنَاتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ ۖ لَا هُنَّ حِلٌّ لَهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ ۖ وَآتُوهُم مَا أَنفَقُوا ۚ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ أَن تَنكِحُوهُنَّ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ ۚ وَلَا تُمْسِكُوا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ (ممتحنہ - ۲)	مسلمانو! جب تمھارے پاس عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو ان کو جانچ لو، خدا ان کے ایمان کو اچھی طرح جانتا ہے، اب اگر تم کو معلوم ہو کہ وہ مسلمان ہیں تو اُن کو کافروں کے ہاں واپس نہ بھیجو، نہ وہ عورتیں کافروں کے قابل ہیں اور نہ کافر اُن عورتوں کے قابل ہیں اور ان عورتوں پر ان لوگوں نے جو خرچ کیا ہو وہ تم ان کو دے دو، اور تم ان سے شادی کر سکتے ہو، بشرطیکہ اُن کے مہر ادا کر دو، اور کافرہ عورتوں کو اپنے نکاح میں نہ رکھو۔

جو مسلمان مکہ میں مجبوری سے رہ گئے تھے، چونکہ کفار اُن کو سخت تکلیفیں دیتے تھے، اس لیے وہ بھاگ کر مدینہ آتے تھے، سب سے پہلے حضرت عتبہؓ بن اُسید (ابوبصیر) بھاگ کر مدینہ آئے۔ قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس

دو شخص بھیجے کہ ہمارا آدمی واپس کر دیجیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عتبہ رضؓ سے فرمایا کہ واپس جاؤ۔ عتبہ نے عرض کی کہ کیا آپؐ مجھ کو کافروں کے پاس بھیجتے ہیں کہ مجھ کو کفر پر مجبور کریں؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا "خدا اس کی کوئی تدبیر نکالے گا"۔ حضرت عتبہ رضؓ مجبوراً دو کافروں کی حراست میں واپس گئے، لیکن مقام ذوالحُلیفہ پہنچ کر انھوں نے ایک شخص کو قتل کر ڈالا، دوسرا شخص جو بچ رہا، اس نے مدینہ آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی، ساتھ ہی ابوبصیر بھی پہنچے، اور عرض کی کہ آپؐ نے عہد کے موافق اپنی طرف سے مجھ کو واپس کر دیا، اب آپؐ پر کوئی ذمہ داری نہیں، یہ کہ کر مدینہ سے چلے گئے اور مقام عیص میں جو سمندر کے کنارے ذو مروۃ کے پاس ہے، رہنا اختیار کیا۔ مکہ کے بیکس اور ستم رسیدہ لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ جان بچانے کا ایک ٹھکانا پیدا ہو گیا ہے تو چوری چھپے بھاگ کر یہاں آنے لگے۔ چند روز کے بعد اچھی خاصی جمعیت ہو گئی، اور اب ان لوگوں نے اتنی قوت حاصل کر لی کہ قریش کا کاروانِ تجارت جو شام کو جایا کرتا تھا، اُس کو روک لیتے تھے۔ ان حملوں میں جو مالِ غنیمت مل جاتا تھا، وہ ان کی معاش کا سہارا تھا۔

قریش نے مجبور ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھ بھیجا کہ معاہدہ کی اس شرط سے ہم باز آتے ہیں۔ اب جو مسلمان چاہے مدینہ جا کر آباد ہو سکتا ہے۔ ہم اس سے تعرض نہ کریں گے۔ آپؐ نے آوارہ وطن مسلمانوں کو لکھ بھیجا کہ یہاں چلے آؤ۔ چنانچہ ابوجندل رضؓ اور ان کے ساتھی مدینہ میں آکر آباد ہو گئے اور کاروانِ قریش کا راستہ[1] بدستور کھل گیا۔

---

[1] یہ تفصیل اکتفاء کلاعی سے خمیس نے نقل کی ہے۔

مستورات میں سے حضرت اُمّ کلثوم جو رئیس مکّہ (عقبہ بن ابی معیط) کی صاحبزادی تھیں اور مسلمان ہو چکی تھیں، مدینہ ہجرت کر کے آئیں۔ لیکن ان کے ساتھ اُن کے دونوں بھائی عمارۃ اور ولید بھی آئے، اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم سے درخواست کی کہ ان کو واپس دے دیجیے، آپؐ نے منظور نہیں فرمایا۔ صحابہ میں سے جن لوگوں کی ازواج مکّہ میں رہ گئی تھیں، اور اب تک کافرہ تھیں صحابہ نے ان کو طلاق دے دی +

سلاطین کو اسلام کی دعوت

(آخر سنہ ۶ھ یا شروع سنہ ۷ھ)

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ

حدیبیہ کی صلح سے کسی قدر اطمینان نصیب ہوا تو وقت آیا کہ اسلام کا پیغام تمام دنیا کے کانوں میں پہنچا دیا جائے۔ اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن تمام صحابہ رضؓ کو جمع کیا اور خطبہ دیا "ایّھا النّاس! خدا نے مجھ کو تمام دنیا کے لیے رحمت اور پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ دیکھو حواریین عیسیٰ کی طرح اختلاف نہ کرنا، جاؤ میری طرف سے پیغام حق ادا کرو" اس کے بعد آپؐ نے، قیصر روم، شہنشاہِ عجم، عزیزِ مصر، اور رؤسائے عرب کے نام دعوتِ اسلام کے خطوط ارسال فرمائے۔ جو لوگ خطوط لے کر گئے، اور جن کے نام لے کر گئے ان کی تفصیل یہ ہے[۱]:

(حضرت) دحیۃ رضؓ کلبی، قیصر روم

---

[۱] طبری (ج ۳ ص ۱۵۵۹) "س" اور ابن ہشام (باب خروج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی الملوک) "س"

(حضرت) عبداللہؓ بن حذافہ سہمی	خسرو پرویز کجکلاہِ ایران
(حضرت) حاطبؓ بن (ابی) بُلتعہ	عزیز مصر
(حضرت) عمروؓ بن امیہؓ	نجاشی بادشاہ حبش
(حضرت) سَلیطؓ بن عمر بن عبدشمس	روسائے یمامہ
(حضرت) شجاعؓ بن وہب الاسدی	رئیس حدودِ شام حارث غسانی

ایرانیوں نے چند برس پہلے بلادِ شام پر حملہ کر کے رومیوں کو شکست دی تھی، جس کا ذکر قرآن مجید کی اس آیت غُلِبَتِ الرُّومُ میں ہے۔ ہرقل نے اُس کے انتقام کے لیے بڑے سروسامان سے فوجیں تیار کیں اور ایرانیوں پر حملہ کر کے اُن کو سخت شکست دی تھی، اس کا شکرانہ ادا کرنے کے لیے وہ حمص سے بیت المقدس آیا تھا اور اس شان سے آیا تھا کہ جہاں چلتا تھا، زمین پر فرش اور فرش پر پھول بچھاتے جاتے تھے[۱]۔

شام میں عرب کا جو خاندان قیصر کے زیرِ حکومت رہا تھا وہ غسانی خاندان تھا اور اس کا پایۂ تخت بصریٰ تھا جو دمشق کے علاقے میں ہے اور آجکل حوران کہلاتا ہے۔ اس زمانہ میں اس خاندان کا تخت نشین حارث غسانی تھا۔ دحیہ کلبی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نامۂ مبارک یہیں بُصریٰ میں حارث غسانی کو لاکر دیا، اس نے قیصر کے پاس بیت المقدس

---

[۱] ہرقل کا پورا واقعہ فتح الباری (ج اوّل ص۳۱ "س") شرح صحیح بخاری سے لیا گیا ہے۔ اصل صحیح بخاری (بخاری کیف کان بدء الوحی و کتاب الجہاد باب دعاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی الاسلام والنبوۃ "س" میں مجمل واقعہ ہے۔ زاید تفصیلیں حافظ ابن حجر نے اور کتابوں سے بڑھائی ہیں۔

میں بھیج دیا۔ قیصر کو خط ملا تو اس نے حکم دیا کہ عرب کا کوئی شخص مل سکے تو لاؤ۔ اتفاق یہ کہ ابوسفیان تُجّارِ عرب کے ساتھ غزہ میں مقیم تھے، قیصر کے آدمی ان کو غزہ سے جا کر لائے۔

قیصر نے بڑے سامان سے دربار منعقد کیا۔ خود تاجِ شاہی پہن کر تخت پر بیٹھا۔ تخت کے چاروں طرف بطارقہ، قسیس اور رہبان کی صفیں قائم کیں، اہلِ عرب کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ "تم میں سے اس مدّعیِ نبوّت کا رشتہ دار کون ہے"؟ ابوسفیان نے کہا "میں" پھر حسب ذیل گفتگو ہوئی:

قیصر — مُدّعی نبوّت کا خاندان کیسا ہے؟

ابوسفیان — شریف ہے۔

قیصر — اس خاندان میں کسی اور نے بھی نبوّت کا دعویٰ کیا تھا؟

ابوسفیان — نہیں۔

قیصر — اس خاندان میں کوئی بادشاہ گزرا ہے؟

ابوسفیان — نہیں۔

قیصر — جن لوگوں نے یہ مذہب قبول کیا ہے، وہ کمزور لوگ ہیں یا صاحبِ اثر؟

ابوسفیان — کمزور لوگ ہیں۔

قیصر — اس کے پیرو بڑھ رہے ہیں یا گھٹتے جاتے ہیں؟

ابوسفیان — بڑھتے جاتے ہیں۔

قیصر — کبھی تم لوگوں کو اسکی نسبت جھوٹ کا بھی تجربہ ہے؟

ابوسفیان — نہیں۔

قیصر — وہ کبھی عہد و اقرار کی خلاف ورزی بھی کرتا ہے ؟

ابوسفیان — ابھی تک تو نہیں کی لیکن اب جو نیا معاہدہ صلح ہے اس میں دیکھیں وہ عہد پر قائم رہتا ہے یا نہیں ؟

قیصر — تم لوگوں نے اس سے کبھی جنگ بھی کی ؟

ابوسفیان — ہاں +

قیصر — نیتجۂ جنگ کیا رہا ؟

ابوسفیان — کبھی ہم غالب آئے اور کبھی وہ +

قیصر — وہ کیا سکھاتا ہے ؟

ابوسفیان — کہتا ہے کہ ایک خدا کی عبادت کرو، کسی اور کو خدا کا شریک نہ بناؤ، نماز پڑھو، پاک دامنی اختیار کرو، سچ بولو، صلۂ رحم کرو +

اس گفتگو کے بعد قیصر نے مترجم کے ذریعے سے کہا کہ "تم نے اس کو شریف النسب بتایا، پیغمبر ہمیشہ اچھے خاندانوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ تم نے کہا کہ اس کے خاندان سے کسی اور نے نبوّت کا دعویٰ نہیں کیا۔ اگر ایسا ہوتا تو مَیں سمجھتا کہ یہ خاندانی خیال کا اثر ہے۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ اس خاندان میں کوئی بادشاہ نہ تھا، اگر ایسا ہوتا تو مَیں سمجھتا کہ اس کو بادشاہت کی ہوس ہے۔ تم مانتے ہو کہ اس نے کبھی جھوٹ نہیں کہا، جو شخص آدمیوں سے جھوٹ نہیں بولتا، وہ خدا پر کیونکر جھوٹ باندھ سکتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ کمزوروں نے پیروی کی ہے، پیغمبروں کے ابتدائی پیرو ہمیشہ غریب ہی لوگ ہوتے ہیں تم نے تسلیم کیا کہ اس کا مذہب ترقی کرتا جاتا ہے، سچے مذہب کا یہی حال ہے کہ بڑھتا جاتا ہے۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ اس نے کبھی فریب نہیں کیا، پیغمبر کبھی فریب

نہیں کرتے۔ تم کہتے ہو کہ وہ نماز اور تقویٰ و عفاف کی ہدایت کرتا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو میری قدمگاہ تک اس کا قبضہ ہو جائے گا۔ مجھ کو یہ ضرور خیال تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے۔ لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ عرب میں پیدا ہوگا۔ میں اگر وہاں جا سکتا تو خود اس کے پاؤں دھوتا۔"

اس گفتگو کے بعد حکم دیا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا خط پڑھا جائے۔[1]

فرمانِ رسالت کے یہ الفاظ تھے:

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ	بسم اللہ الرحمن الرحیم، محمدؐ کی طرف سے
من محمّد عبد اللہ و رسولہٖ	جو خدا کا بندہ اور رسول ہے، یہ خط
الیٰ ھرقل عظیم الروم ،	ہرقل کے نام ہے جو روم کا رئیسِ
سلامٌ علیٰ من اتبع الھدیٰ ،	اعظم ہے، اس کو سلامتی ہو جو ہدایت
امّا بعد فانّی ادعوك بدعاية	کا پیرو ہے، اس کے بعد میں تجھ کو اسلام
الاسلام اَسْلِمْ تَسْلَمْ یُؤتِكَ	کی دعوت کی طرف بلاتا ہوں، اسلام
اللہ اجرك مرتین فان تولیت	لا تو سلامت رہے گا، خدا تجھ کو دگنا اجر
فان علیك اثم الاریسیین	دے گا۔ اور اگر تو نے نہ مانا تو اہلِ ملک کا
و یا اَھْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا	گناہ تیرے اوپر ہوگا۔ اے اہلِ کتاب!
اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَ	ایک ایسی بات کی طرف آؤ جو ہم میں
بَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَ	اور تم میں یکساں ہے۔ وہ یہ کہ ہم خدا کے
لَا نُشْرِكَ بِہٖ شَیْئًا وَّلَا	سوا کسی کو نہ پوجیں اور ہم میں سے کوئی

---

[1] یہ پوری گفتگو صحیح بخاری کے متعدد ابواب میں منقول ہے۔ ابتدائے کتاب میں بھی اور باب الجہاد میں بھی۔

یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا	کسی کو (خدا کو چھوڑ کر) خدا نہ بنائے اور
مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا	تم نہیں مانتے تو گواہ رہو کہ ہم مانتے
اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝	ہیں ÷

قیصر نے ابوسفیان سے جو گفتگو کی تھی اُس سے بطارقہ اور اہلِ دربار سخت برہم ہو چکے تھے۔ نامۂ مبارک کے پڑھے جانے پر اور بھی برہم ہوئے، یہ حالت دیکھ کر قیصر نے اہلِ عرب کو دربار سے اُٹھا دیا۔ اور گو اس کے دِل میں نورِ اسلام آچکا تھا، لیکن تاج و تخت کی تاریکی میں وہ روشنی بُجھ کر رہ گئی ÷

خسرو پرویز (شہنشاہِ ایران) کے نام جو نامۂ مبارک حضرت عبداللہ بن

لہ مسند ابن حنبل صفحہ ۴۴۲ جلد ۴ میں ہے کہ حضرت دحیہؓ کے ساتھ قیصر نے اپنا ایک سفیر خط کا جواب دے کر خدمت نبویؐ میں بھیجا تھا، اور سفیر کو نبوّت کے چند سوالات بتا دیے تھے۔ اس نے سوالات پوچھے، آپ نے جوابات دیے اور آخر بغیر اسلام لائے وہ واپس گیا۔ لیکن یہ حدیث صحیح نہیں، اس میں ہے کہ قیصر کا خط پڑھنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہؓ کو بُلایا اور انھوں نے پڑھ کر سُنایا، حالانکہ وہ اس وقت اسلام بھی نہیں لائے تھے۔

(جامع کے نزدیک حسب تحقیق ابن حجر فتح الباری ج ۸ صفحہ ۹۷ و زرقانی ج ۳ صفحہ ۸۸ و صفحہ ۸۹ یہ واقعہ دوسرا ہے اور اس کے بعد کا ہے اور خود اس حدیث میں تصریح ہے کہ یہ تبوک کا واقعہ ہے، اور غزوۂ تبوک فتح مکہ کے بعد رجب سنہ ۹ھ میں پیش آیا ہے، اور حضرت معاویہؓ اس سے ایک یا دو سال پہلے حدیبیہ یا فتح مکہ میں مسلمان ہو چکے تھے، مگر تبوک میں حضرت معاویہؓ کی شرکت کہیں مذکور نہیں۔ یہ روایت اسی سند کے ساتھ کتاب الاموال ابوعبید القاسم بن سلام صفحہ ۲۵۵ مصر میں بھی موجود ہے) "س"

حذافہ لے کر گئے تھے، یہ تھا:

بسم اللہ الرحمن الرحیم	خدائے رحمن و رحیم کے نام سے، محمد
من محمد رسول اللہ الی کسریٰ	پیغمبر کی طرف سے کسریٰ رئیس فارس
عظیم فارس سلام علیٰ من	کے نام، سلام ہے اس شخص پر جو ہدایت
اتبع الھدیٰ وامن باللہ و	کا پیرو ہو اور خدا اور پیغمبر خدا پر ایمان
رسولہ وشھد ان لا الہ الا	لائے اور یہ گواہی دے کہ خدا صرف
اللہ وانی رسول اللہ الی الناس	ایک خدا ہے اور یہ کہ خدا نے مجھ کو تمام
کافۃ لینذر من کان حیا	دنیا کا پیغمبر مقرر کرکے بھیجا ہے تاکہ
اسلم تسلم فان ابیت	وہ ہر زندہ شخص کو خدا کا خوف دلائے، تو اسلام
فعلیک اثم المجوس۔	قبول کر، تو سلامت رہیگا ورنہ مجوسیوں کا وبال
	تیری گردن پر ہوگا۔

خسرو پرویز بڑی شوکت و شان کا بادشاہ تھا۔ اس کی سلطنت میں دربار کو جو عظمت و جلال حاصل ہوا کبھی نہیں ہوا تھا۔ عجم کا طریقہ یہ تھا کہ سلاطین کو جو خطوط لکھتے تھے، ان میں عنوان پر پہلے بادشاہ کا نام ہوتا تھا۔ نامۂ مبارک میں پہلے خدا کا نام اور پھر عرب کے دستور کے دستور کے موافق رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نام تھا۔ خسرو نے اس کو اپنی تحقیر سمجھا اور بولا کہ "میرا غلام ہو کر مجھ کو یوں لکھتا ہے"! پھر نامۂ مبارک کو چاک کر ڈالا۔ لیکن چند روز کے بعد خود سلطنت عجم کے پرزے اڑ گئے۔

نظامی نے شیریں خسرو میں یہ داستان مفصل لکھی ہے، اور اسلامی جوش سے لکھی ہے۔ ہم اس کے چند اشعار اس موقع پر نقل کرتے ہیں:

دراں دوراں کہ گیتی رام او بود[۱] — زمشرق تا بہ مغرب نام او بود

[۱] اس سے خسرو مراد ہے۔

رسولِ ما بہ حجت ہائے قاہر | نبوت در جہاں می کرد ظاہر
گہے با سنگ خارا راز می گفت | گہے ریگش حکایت باز می گفت
خلائق را ز دعوت در داد | بہ ہر کشور صلائے عام در داد
بفرمود از عطا عطرے سرشتند | بہ نامِ ہر یکے سطرے نوشتند
چو از نامِ نجاشی باز پرداخت | ز بہرِ نامِ خسرو نامہ ساخت
چو قاصد عرضہ کرد آں نامۂ نو | بجوشید از غضب اندامِ خسرو
ز تیزی گشت ہر مویش سنانی | ز گرمی ہر رگش آتش فشانی
سوادے دید روشن ہیبت انگیز | نوشتہ از محمد سوے پرویز
چو عنواں گاہِ عالم تاب را دید | تو گفتی سگ گزیدہ آب را دید
غرورِ بادشاہی بردش از راہ | کہ گستاخی کہ یارد؟ با چو من شاہ
کرا زہرہ کہ با ایں احترامم | نویسد نامِ خود بالائے نامم
رخ از گرمی چو آتش گاہِ خود کرد | بخود اندیشۂ بد کرد، دید کرد
درید آں نامۂ گردن شکن را | نہ نامہ بلکہ نامِ خویشتن را
فرستادہ چو دید آں خشمناکی | بہ رجعت پائے خود را کرد خاکی
از آں آتش کہ آں دود تہی داشت | چراغِ آگہاں[1] را آگہی داشت
زگرمی آں چراغِ گردن افراز | دعا را داد چوں پروانہ پرواز
عجم را زاں دعا کسریٰ در افتاد | کلاہ از تارکِ کسریٰ در افتاد
زہے شاہنشہے کز بیم و امید | قلم راندہ بر افریدون و جمشید

---

[1] آگہان یعنی اربابِ علم چراغِ آگہاں سے "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں"۔ "آگہی داشت" یعنی خبر کی۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نامۂ مبارک پہنچنے کے بعد خسرو پرویز نے گورنر یمن کو جس کا نام باذان تھا فرمان بھیجا کہ کسی شخص کو حجاز بھیجو کہ اس نئے مدعی نبوت کو پکڑ کر میرے دربار میں لائے۔ باذان نے دو شخصوں کو جن میں سے ایک کا نام بابویہ اور دوسرے کا خرخسرہ تھا، مدینہ منورہ روانہ کیا۔ ان دونوں نے بارگاہ رسالت میں آکر عرض کی کہ شاہنشاہ عالم (کسریٰ) نے تم کو بلایا ہے۔ اگر تعمیلِ حکم نہ کرو گے تو وہ تم کو اور تمھارے ملک کو برباد کر دے گا۔ آپؐ نے فرمایا تم واپس جاؤ اور کہ دینا کہ اسلام کی حکومت کسریٰ کے پایۂ تخت تک پہنچے گی[1] یہ لوگ پیغام پہنچا کر یمن میں آئے تو خبر آئی کہ شیرویہ (خسرو پرویز کا بیٹا) نے خسرو پرویز کو قتل کر ڈالا۔

نجاشی (بادشاہ حبش) کو آپؐ نے دعوتِ اسلام کا جو خط بھیجا تھا، اس کے جواب میں اس نے عریضہ بھیجا کہ "میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ خدا کے سچے پیغمبر ہیں"۔ حضرت جعفر طیارؓ جو ہجرت کر کے حبش چلے گئے تھے، یہیں موجود تھے۔ نجاشی نے ان کے ہاتھ پر بیعت اسلام کی۔ ابنِ اسحاق نے روایت کی ہے کہ نجاشی نے اپنے بیٹے کو ساٹھ مصاحبوں کے ساتھ بارگاہ رسالت میں عرضِ نیاز کے لیے بھیجا، لیکن جہاز سمندر میں ڈوب گیا اور یہ سفارت ہلاک ہو گئی[2]

عام اربابِ سیر لکھتے ہیں کہ نجاشی نے ۹ھ میں وفات پائی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف رکھتے تھے، یہ خبر سن کر آپؐ نے غائبانہ

---

[1] طبری (ج ۳، صفحہ ۱۵۷۲) [2] طبری (ج ۳ ص ۱۵۶۹)۔

اُس کے جنازہ کی نماز پڑھائی۔ لیکن یہ غلط ہے۔ صحیح مسلم میں تصریح کی ہے کہ جس نجاشی کی نماز جنازہ آپؐ نے پڑھی وہ یہ نہ تھا لیکن ابن قیم نے ارباب سیر کی روایت کی تائید کی ہے اور مسلم کی روایت کے اس ٹکڑے کو راوی کا وہم[1] بتایا ہے۔

جو لوگ ہجرت کرکے حبش چلے گئے تھے، اُن میں حضرت اُمّ حبیبہؓ (حضرت امیر معاویہؓ کی بہن) بھی تھیں۔ اُن کے شوہر کا انتقال ہوچکا تھا۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کو لکھ بھیجا کہ امّ حبیبہ کو شادی کا پیغام سُنادو، اور میرے پاس بھیج دو۔ نجاشی نے خالد بن سعید ابن العاص کو مقرر کیا۔ اُنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایجاب وقبول ادا کیا۔ نجاشی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مہر ادا کیا، جس کی تعداد چار سو اشرفیاں تھیں۔ نکاح کے بعد حضرت امّ حبیبہؓ جہاز میں بیٹھ کر روانہ ہوئیں اور مدینہ کی بندرگاہ میں اُتریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت خیبر میں تشریف رکھتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر نجاشی کے حالات حضرت اُمّ حبیبہؓ سے پوچھا کرتے تھے[2]۔

عزیز مصر (مقوقس) کو آپؐ نے جو خط لکھا تھا، اس کے جواب میں اس نے عربی زبان میں یہ خط لکھا:

لمحمد بن عبد اللہ من المقوقس	محمد بن عبداللہ کے نام مقوقس رئیس قبط
عظیم القبط سلام علیک	کی طرف سے سلام علیک کے بعد میں نے
امّا بعد فقد قرأت کتابک	آپؐ کا خط پڑھا اور اس کا مضمون

---

(۱) زاد المعاد "س" (۲) تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۵۷۰ "س"

وفهمت ما ذكرت فيه و	اور مطلب سمجھا، مجھ کو اس قدر معلوم
ما تدعوا اليه وقد علمت	تھا کہ ایک پیغمبر آنے والے ہیں لیکن
انّ نبيا بقى وكنتُ اظن	میں یہ سمجھا تھا کہ وہ شام میں ظہور
ان يخرج من الشام وقد	کریں گے، میں نے آپؐ کے قاصد کی
اكرمت رسولك وبعثته	عزت کی اور دو لڑکیاں[1] بھیجتا ہوں
اليك بجاريتين لهما مكان	جن کی قبطیوں میں (مصر کی قوم) بہت
من القبط عظيم وكسوة	عزت کی جاتی ہے، اور میں آپؐ
واهديت اليك بغلة	کے لیے کپڑا اور سواری کا ایک خچر
لتركبها والسّلامُ عليك ۔	بھیجتا ہوں ۔

با ایں ہمہ عزیز مصر اسلام نہیں لایا۔ دو لڑکیاں جو بھیجی تھیں اُن میں ایک ماریہ قبطیہ تھیں جو حرم نبویؐ میں داخل ہوئیں۔ دوسری سیرین تھیں جو حضرت حسان رضؓ کے مِلک میں آئیں۔ خچر کا نام دلدل تھا، جس کا ذکر اکثر حدیث کی کتابوں میں آتا ہے۔ جنگِ حنین میں آپؐ اسی پر سوار تھے۔ طبری نے لکھا ہے کہ ماریہ اور سیرین حقیقی بہنیں تھیں اور حضرت حاطبؓ ابن بلتعہ جن کو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مقوقس کے پاس خط دے کر بھیجا تھا، ان کی تعلیم سے دونوں خاتونیں خدمتِ نبویؐ میں پہنچنے سے پہلے اسلام قبول کر چکی

---

[1] ہم نے جاریہ کا ترجمہ لڑکی کیا ہے۔ عربی میں جاریہ لڑکی کو بھی کہتے ہیں اور لونڈی کو بھی۔ اربابِ سیرت ماریہ قبطیہ کو لونڈی کہتے ہیں۔ لیکن مقوقس نے جو لفظ ان کی نسبت لکھا ہے یعنی کہ "مصریوں میں بڑی عزت ہے" یہ لونڈیوں کی شان میں استعمال نہیں کیے جا سکتے ۔

تھیں، اس واقعہ کو اس حیثیت سے دیکھنا چاہیے کہ یہ خاتونیں لونڈیاں نہ تھیں اور اسلام قبول کر چکی تھیں۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ماریہؓ سے نکاح کیا ہوگا، نہ کہ لونڈی کی حیثیت سے وہ آپؐ کے حرم میں آئیں۔

رؤسائے عرب کو جو خط لکھے گئے تھے، ان کے جواب بھی مختلف آئے۔[1]
ہوذہ ابن علی رئیس یمامہ نے لکھا، "تم جو باتیں کہتے ہو وہ نہایت اچھی ہیں۔ اگر حکومت میں کچھ میرا بھی حصہ ہو تو میں تمہاری اقتدا کے لیے تیار ہوں۔ اسلام ہوسِ ملک کے لیے نہیں آیا تھا۔ آپؐ نے فرمایا "زمین کا ایک ٹکڑا بھی ہو تو میں نہ دوں گا"۔

حارث غسانی جو حدود شام کا رئیس تھا اور رومیوں کے ماتحت اطراف کے عربوں میں حکومت کرتا تھا، خط پڑھ کر برہم ہوا اور فوج کو تیاری کا حکم دیا۔ مسلمان اس جرم کی پاداش میں ہر وقت اس کے حملے کے منتظر رہتے تھے۔ اور آخر موتہ اور تبوک وغیرہ کی لڑائیاں پیش آئیں۔

واقعات متفرقہ

حضرت خالدؓ بن ولید اور حضرت عمرو بن العاص کا اسلام

(حدیبیہ کی صلح کو خدا نے فتح کہا ہے، لیکن اجسام کی نہیں، قلوب کی۔ اسلام کو اپنی اشاعت کے لیے امن درکار تھا اور وہ اس صلح سے حاصل ہو گیا۔ اس صلح کو خود دشمن فتح سمجھتے تھے۔ قریش اور مسلمانوں میں اب تک جو معرکے ہوئے، فوجی حیثیت سے قریش کی صف میں ہر جگہ

---

[1] اور جن رؤسائے قبائل اور امرائے عرب کو دعوتی خطوط لکھے گئے تھے، اُن کی تفصیل دوسری جلد کے تبلیغی واقعات میں آئے گی)۔ "س"

خالد بن ولید کا نام ممتاز نظر آتا ہے۔ جاہلیت میں رسالہ کی افسری ان ہی کے سپرد تھی۔ اُحد میں قریش کے اُکھڑے ہوئے پاؤں ان ہی کی کوشش سے سنبھلے تھے۔ حدیبیہ کے موقع پر بھی قریش کا طلایہ ان ہی کی زیر افسری نظر آتا تھا۔ لیکن قریش کا یہ سپہ سالارِ اعظم بھی آخر اسلام کے حملہ کاری سے نہ بچ سکا۔

صلح حدیبیہ کے بعد حضرت خالدؓ نے مکہ سے نکل کر مدینہ کا رُخ کیا۔ راستے میں حضرت عمروؓ بن العاص ملے، پوچھا کدھر کا قصد ہے؟ بولے اسلام لانے جاتا ہوں، آخر کب تک؟ حضرت عمروؓ بن العاص نے کہا ہمارا بھی یہی ارادہ ہے۔ دونوں صاحب ایک ساتھ بارگاہِ نبویؐ میں حاضر ہو کر اسلام سے مشرف ہوئے[1]، اور اب وہ جوہر جو اسلام کی مخالفت میں صرف ہو رہا تھا اسلام کی محبت میں صرف ہونے لگا۔

فتحِ مکہ میں حضرت خالدؓ جب ایک مسلمان دستہ کے افسر بن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سے گزرے تو آپؐ نے پوچھا کون ہے؟ لوگوں نے کہا خالدؓ ہیں۔ آپؐ نے فرمایا "خدا کی تلوار ہے"[2]۔

غزوہ موتہ میں جب حضرت جعفرؓ، زید بن حارثہؓ اور عبداللہؓ بن رواحہ کے بعد حضرت خالدؓ نے علم اپنے ہاتھ میں لیا تو مسلمان خطرہ سے باہر تھے۔

عہدِ خلافت میں ایک خالدؓ نے شام کا مُلک قیصر سے چھین لیا اور دوسرا عمرو بن العاصؓ مصر کا فاتح ہوا۔

---

[1] اصابہ ابن حجر بہ روایت ابن اسحاق (ج اوّل ص ۴۱۳)، [2] ترمذی، مناقب۔

سنہ ۷ھ

خیبر

آخر سنہ ۶ھ یا اوائل سنہ ۷ھ

خیبر غالباً عبرانی لفظ ہے جس کے معنی قلعہ کے ہیں۔ یہ مقام مدینہ منورہ سے آٹھ منزل پر ہے۔ یورپین سیاحوں میں ڈاوٹی کئی مہینے تک یہاں ۱۸۷۷ء میں مقیم رہا۔ اس نے مدینہ سے اس مقام کا فاصلہ ۲۰۰ میل لکھا[۱] ہے۔ وہ نخلستان جس کے کنارے پر خیبر ہے نہایت زرخیز ہے۔ یہاں یہود نے نہایت مضبوط متعدد قلعے بنائے تھے۔ جن میں سے بعض کے آثار اب تک باقی ہیں۔

عرب میں یہودی قوت کا یہ سب سے بڑا مرکز تھا۔ مدینہ سے جب رؤسائے بنو نضیر جلا وطن ہو کر خیبر میں آباد ہوئے تو انھوں نے تمام عرب کو اسلام کی مخالفت پر برانگیختہ کر دیا، جس کا پہلا منظر احزاب کا معرکہ تھا۔ ان رؤسا میں سے حُیَیّ بن اخطب جنگِ قریظہ میں قتل ہوا، جس کے بعد

---

[۱] مارگولیس صفحہ ۳۵۶

ابورافع سلام بن ابی الحقیق اس کا جانشین ہوا۔ یہ بہت بڑا تاجر اور صاحب اثر تھا۔ قبیلہ غطفان جو عرب کا بہت بڑا صاحب اثر قبیلہ تھا۔ ان کی آبادی خیبر سے متصل تھی، اور ہمیشہ سے یہود خیبر کے حلیف اور ہم عہد[1] تھے۔ سنہ ۶ھ میں سلام نے خود جاکر قبیلہ غطفان اور اُن کے آس پاس کے قبیلوں کو اسلام کے مقابلے کے لیے آمادہ کیا۔ یہاں تک کہ ایک عظیم الشان فوج لے کر مدینہ پر حملے کی تیاریاں کیں[2]۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبریں معلوم ہوئیں تو آپؐ کے ایما سے ۱۷ رمضان سنہ ۶ھ میں حضرت عبداللہؓ بن عتیک ایک خزرجی انصاری کے ہاتھ سے اپنے قلعہ خیبر میں سوتا ہوا مارا گیا، سلام کے بعد یہودیوں نے اُسیر بن رزام کو مسند ریاست پر بٹھایا، اس نے قبائل یہود کو جمع کر کے تقریر کی اور کہا کہ "میرے پیشروؤں نے محمد

---

[1] ابن خلدون جلد ۲ ذکر قبائل عرب (وتاریخ خمیس جلد ۲ ص ۴۳ باب غزوہ خیبر) "س"

[2] ابن سعد صفحہ ۶۶۔ اصلی الفاظ یہ ہیں:

کان ابورافع بن ابی الحقیق قد اجلب فی غطفان ومن حوله من مشرکی العرب وجعل لهم الحفل العظیم لحرب رسول الله	(ابورافع نے غطفان اور آس پاس کے مشرکین عرب کو جنگ پر آمادہ کیا تھا، اور ایک بہت بڑی بھیڑ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑنے کے لیے جمع کی۔

صحیح بخاری باب قتل ابی رافع میں ہے وکان ابورافع یوذی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و یعین علیہ یعنی ابورافع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچایا کرتا تھا اور آپ کے دشمنوں کو آپ کے مقابلے میں مدد دیا کرتا تھا۔ اس امداد و اعانت کی تفصیل بہ روایت عروہ فتح الباری (ج ۷، ص ۲۶۳) "س" میں مفصل مذکور ہے۔

(صلی اللہ علیہ وسلم) کے مقابلے میں جو تدبیریں اختیار کیں وہ غلط تھیں۔ صحیح تدبیر یہ ہے کہ خود محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دار الریاست پر حملہ کیا جائے، اور میں یہی طریقہ اختیار کروں گا۔[۱] اس غرض سے اُسیر نے غطفان اور دیگر قبائل میں دورہ کیا اور ایک فوجِ گراں تیار کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبریں پہنچیں تو آپؐ نے اس افواہ پر اعتماد نہیں کیا بلکہ حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کو بھیجا کہ خود خیبر جاکر اصل واقعہ کی تحقیق کریں۔ چنانچہ وہ چند آدمیوں کو لے کر خیبر گئے اور چھُپ کر خود اسیر کی زبانی اُس کے مشورے اور تدبیریں سُنیں۔ یہ حالات آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیے۔ آپؐ نے حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کو ۳۰ آدمی دے کر خیبر کو روانہ کیا۔ اِن لوگوں نے اُسیر سے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو اس لیے بھیجا ہے کہ تم اگر حاضر ہو جاؤ تو خیبر کی حکومت تم کو دے دی جائے۔ چنانچہ وہ ۳۰ آدمی لے کر خیبر سے نکلا، اور احتیاط کی بنا پر یہ مخلوط قافلہ اس طرح چلا کہ دو دو شخص ہمرکاب چلتے تھے۔ جن میں ایک یہودی دوسرا مسلمان ہوتا تھا۔ قرقرہ پہنچ کر اُسیر کے دل میں بدگمانی پیدا ہوئی، اس نے ہاتھ بڑھا کر عبداللہؓ بن انیس کی تلوار چھیننی چاہی۔ اُنھوں نے کہا، او دشمنِ خدا! بدعہدی کرنا چاہتا ہے؟[۲] یہ کہہ کر سواری بڑھائی، اور جب اُسیر زد پر آگیا تو تلوار ماری کہ اس کی ران کٹ گئی۔ وہ گھوڑے سے گرا اور گرتے گرتے اُس نے حضرت عبداللہؓ کو زخمی کیا۔ اب مسلمان پیش دستی

---

(۱) زرقانی علی المواہب ج ۲ ص ۱۹۶ مصر "س"۔ (۲) یہ تمام واقعہ طبقات ابن سعد سے منقول ہے۔ بہت سی کتابوں میں لکھا ہے کہ عبداللہ بن انیس نے خود ابتدا کی اور اُسیر بن رزام کو قتل کر ڈالا لیکن صحیح واقعہ وہی ہے جو ابن سعد سے منقول ہے اور یہی اس معرکہ کی وجہ ہوسکتا ہے۔ ۱۲

کرکے یہود پر ٹوٹ پڑے۔ نتیجہ جنگ یہ تھا کہ یہود میں ایک کے سوا کوئی نہیں بچا۔ یہ اخیر ۵ھ یا محرم ۶ھ کا واقعہ ہے۔

خیبر اب اسلام کا سب سے بڑا حریف اور اسلام کے لیے سب سے زیادہ خطرناک تھا۔ ان لوگوں نے مکہ جاکر قریش کے ذریعے سے تمام عرب میں بغاوت کی ایک عالمگیر جنبش پیدا کردی۔ جس نے واقعۂ احزاب میں مرکز اسلام (مدینہ منورہ) کو متزلزل کر دیا تھا۔ یہ کوشش اگرچہ ناکام رہی، لیکن جو دست و بازو کام کر رہے تھے اب بھی موجود تھے۔

جن لوگوں نے جنگ احزاب برپا کرائی تھی، ان میں زیادہ با اثر ابن ابی الحقیق کا خاندان تھا، جو قبیلہ بنی نضیر سے تھا اور مدینہ سے جلاوطن ہو کر آیا تھا، اس نے خیبر کے مشہور قلعہ قموص پر قبضہ کیا تھا۔ سلام ابن ابی الحقیق جس کا ذکر ابھی اوپر گزر چکا ہے، اسی خاندان کا رئیس تھا۔ اس کے قتل کے بعد اس کا بھتیجا کنانہ بن الربیع بن ابی الحقیق خاندان کی ریاست پر ممتاز ہوا۔

خیبر کے یہود ادھر تو غطفان سے اسلام کے مقابلے کے لیے سازش کر رہے تھے، ادھر مدینہ کے منافقین ان کو مسلمانوں کی خبریں پہنچاتے رہتے تھے اور ان کو ہمت دلاتے تھے کہ مسلمان تم سے سر بر نہیں ہو سکتے۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے چاہا کہ ان لوگوں سے معاہدہ ہو جائے۔ اس بنا پر آپؐ نے حضرت عبداللہ بن رواحہ کو بھیجا تھا۔ لیکن ادھر تو یہود خود سخت دل اور ایک بدگمان قوم تھی۔ ادھر منافقین ان کو ابھارتے تھے۔ اسی زمانہ میں راس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول نے اہل خیبر کے پاس کہلا بھیجا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، لیکن تم ان سے نہ ڈرنا، ان کی ہستی کیا ہے؟ مٹھی بھر آدمی ہیں، جن کے پاس ہتھیار تک نہیں۔ یہود

نے یہ خبر سُن کر کنانہ اور ہودہ ابن قیس کو غطفان کے پاس بھیجا کہ ہمارے ساتھ مل کر مدینہ پر حملہ کرو تو ہم نخلستان کی نصف پیداوار تم کو دیں گے، ایک روایت میں ہے کہ غطفان نے اس کو منظور کیا[۱]

غطفان کا ایک قوی ور قبیلہ بنو فزارہ تھا اُن کو جب معلوم ہُوا کہ خیبر والے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کرنا چاہتے ہیں تو وہ خود خیبر میں آئے کہ ہم تمہارے شریک ہو کر لڑیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ معلوم ہُوا تو آپؐ نے بنو فزارہ کو خط لکھا کہ "تم خیبر والوں کی مدد سے باز آؤ، خیبر فتح ہو جائے گا تو تم کو بھی حصہ دیا جائے گا، لیکن بنو فزارہ نے انکار کیا[۲]

ذی قرد محرم ۷ھ

غطفان کی شرکت جنگ کا دیباچہ یہ تھا کہ ذی قرد کی چراگاہ پر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنیوں کی چراگاہ تھا اس قبیلہ کے چند آدمیوں نے بہ سرداری عبد الرحمٰن ابن عینیہ، چھاپہ مارا، اور ۲۰ اُونٹنیاں پکڑ کر لے گئے۔ حضرت ابوذر رضؓ کے صاحبزادے کو جو اونٹنیوں کی حفاظت پر

---

[۱] تاریخ خمیس (ج ۲ ص ۴۳) عام روایتوں میں گو یہ ہے کہ غطفان نے مسلمانوں کے خوف سے اس کو منظور نہیں کیا، تاہم یہ ظاہر ہے کہ ان کی اس ناطرفداری پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا، "س" [۲] یہ واقعہ معجم البلدان لفظ حبقار کے ذیل میں موسیٰ بن عقبہ کی مغازی سے بالفاظہا نقل کیا ہے۔ اصل الفاظ یہ ہیں:

روی موسیٰ بن عقبة عن ابن شہاب قال کانت بنو فزارة ممن قدم علی اھل خیبر لیعینوھم فراسلھم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لا یعینوھم وسال لھم ان یخرجوا عنھم، الخ (ج ۳ ص ۱۵۲ مصر)

متعین تھے قتل کر دیا اور ان کی بیوی کو گرفتار کر کے لے گئے۔ مسلمانوں نے جب تعاقب کیا تو وہ درے میں گھس گئے وہاں عینیہ بن حصن جو قبائل غطفان کا سپہ سالار تھا ان کی امداد کو موجود تھا، مسلمانوں میں حضرت سلمہؓ بن الاکوع ایک مشہور قدر انداز صحابی تھے۔ سب سے پہلے ان کو اس غارت گری کی خبر معلوم ہوئی۔ انھوں نے واصباحاہ کا نعرہ مارا اور دوڑ کر حملہ آوروں کو جا لیا، وہ اونٹوں کو پانی پلا رہے تھے سلمہؓ نے تیر برسانے شروع کیے، حملہ آور بھاگ نکلے۔ انھوں نے تعاقب کیا اور لڑ بھڑ کر تمام اونٹنیاں چھڑا لائے۔ دربارِ نبوت میں آ کر عرض کی کہ میں دشمنوں کو پیاسا چھوڑ آیا ہوں، اگر ... آدمی مل جائیں تو ایک ایک کو گرفتار کر لاتا ہوں۔ آپؐ نے رحمتِ عام کے لحاظ سے فرمایا[۱]

ملکت فاسجح — قابو پاؤ تو عفو سے کام لو۔

اس واقعہ کے تین دن[۲] بعد خیبر کی جنگ پیش آئی :

---

[۱] یہ واقعہ بخاری و مسلم میں بھی مذکور ہے لیکن زیادہ تفصیل ابن سعد و ابن اسحاق سے لی گئی ہے۔ [۲] ارباب سیر نے متفقاً اس واقعہ کو خیبر کے واقعہ سے ایک سال ماقبل بیان کیا ہے، لیکن طبری نے یہ روایت سلمہ جو اس غزوہ کے ہیرو تھے اور نیز امام بخاری نے صاف تصریح کی ہے کہ خیبر سے تین دن پہلے کا واقعہ ہے۔ (حافظ ابن حجر نے ارباب سیر کا بیان لکھ کر لکھا ہے :

فعلی ھذا ما فی الصحیح من التاریخ لغزوۃ ذی قرد اصح مما ذکرہ اھل السیر۔ — تو اس بنا پر جو کچھ صحیح بخاری میں غزوہ ذی قرد کے متعلق مذکور ہے وہ ارباب سیر کی روایت سے زیادہ صحیح ہے۔

خیبر کا آغاز اور غزوات کی بہ نسبت ایک امتیازِ خاص رکھتا ہے اور اگرچہ ارباب سیر کی نظر اس نکتہ پر نہیں پڑی کہ اس امتیاز کے اسباب کیا تھے۔ تاہم واقعہ کی حیثیت سے امتیازی امور ان کی زبان سے بھی بلا قصد نکل گئے ہیں۔ سب سے مقدم یہ کہ جب آپؐ نے خیبر کا قصد کیا تو اعلانِ عام کر دیا کہ:

لا یخرجن معنا الا راغب فی الجہاد (ابن سعد) ہمارے ساتھ صرف وہ لوگ آئیں جو طالب جہاد ہوں۔

اب تک جو لڑائیاں وقوع میں آئیں محض دفاعی تھیں۔ یہ پہلا غزوہ ہے جس میں غیر مسلم رعایا بنائے گئے اور طرزِ حکومت کی بنیاد قائم ہوئی۔ اسلام کا اصلی مقصد تبلیغ دعوت ہے۔ اب اگر کوئی قوم اس دعوت کی سدِّ راہ نہ ہو تو اسلام کو نہ تو اس سے جنگ ہے، نہ اُس کے رعایا بنانے کی ضرورت ہے، صرف معاہدۂ صلح کافی ہے۔ جس کی بہت سی مثالیں اسلام میں موجود ہیں لیکن جب کوئی قوم خود اسلام کی مخالفت پر کمربستہ ہو اور اس کو مٹا دینا چاہے تو اسلام کو مدافعت کے لیے تلوار ہاتھ میں لینا پڑتی ہے اور اُس کو اپنے زیرِ اثر رکھنا پڑتا ہے۔ خیبر اس قاعدہ کے موافق اسلام

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۹۲) حافظ ابن حجر نے دونوں روایتوں میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ عینیہ بن حصن نے ذوقرد پر دو دفعہ حملہ کیا تھا۔ عام ارباب سیر کا ذکر کرتے ہیں، وہ پہلا حملہ تھا اور یہ بالکل قرین قیاس ہے (فتح الباری ج ۷، صفحہ ۳۵۲ باب غزوہ ذی قرد) "س" عام ارباب سیر کو غزوۂ خیبر (بلکہ تمام غزوات) کے متعلق چونکہ کسی سبب کی تلاش و جستجو نہیں، اس لیے ان کو اس سے کچھ بحث نہیں کہ واقعات کا تسلسل اور غزوات کے اسباب کیا ہیں لیکن زیادہ تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سب واقعات ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

کا پہلا مفتوحہ ملک تھا۔

غزوات کے خاتمے کے بعد یہ بحث بہ تفصیل آئے گی کہ ایک مدت تک لوگ[1] جہاد کو عرب کے قدیم طریقہ کے موافق معاش کا ذریعہ سمجھتے رہے، اس لڑائی (خیبر) تک بھی یہ غلط فہمی رہی۔

یہ پہلا غزوہ ہے جس میں یہ پردہ اُٹھا دیا گیا اور اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ اس لڑائی میں صرف وہ لوگ شریک ہوں، جن کا مقصد محض جہاد اور اعلائے کلمۃ اللہ ہو۔

غرض آپؐ غطفان اور یہود کے حملے کی مدافعت کے لیے مدینہ سے محرم[2] سنہ ۷ھ میں حضرت سباع بن عُرفُطہ غفاری رضؓ کو مدینہ کا افسر مقرر کر کے مدینہ سے روانہ ہوئے، ازواج مطہراتؓ میں سے حضرت اُم سلمہ رضؓ ساتھ تھیں۔ فوج کی تعداد ۱۶۰۰ تھی جن میں ۲۰۰ سوار اور باقی پیدل تھے۔ اس

---

(۱) یہاں "لوگ" سے مُراد منافقین ہیں۔ یہ لوگ غزوات میں محض غنیمت کے لالچ میں شریک ہوتے تھے، جہاں تحت مقابلہ پیش آنے اور مالِ غنیمت کے نہ ملنے کا گمان ہوتا وہاں غزوات کی شرکت سے کتراتے تھے، چنانچہ انہی وجوہ سے وہ حدیبیہ میں شریک نہیں ہوئے اور اس پر سُورۂ فتح میں اللہ تعالیٰ نے اس پر اپنی ناراضی ظاہر فرمائی اور یہ ارشاد فرمایا کہ آئندہ غنیمت والے غزوہ میں بھی شریک نہ کیے جائیں۔ اسی لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر اعلان فرمایا کہ اس غزوہ میں بھی وہی شرکت کا ارادہ کریں، جن کی غرض محض جہاد و اعلاء کلمۃ اللہ ہو، دُنیاوی مال و متاع نہ ہو، (زرقانی و ابن سعد باب غزوہ خیبر) "س"

(۲) ابن سعد جزء مغازی صفحہ ۷۷، میں جمادی الاولیٰ سنہ ۷ھ ہے جو بہ تحقیق مذکورہ بالا صحیح نہیں ہے) "س"

وقت تک لڑائیوں میں علم کا رواج نہ تھا۔ چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں ہوتی تھیں، یہ پہلا مرتبہ تھا کہ آپؐ نے تین عَلَم تیار کرائے۔ دو حضرت خبابؓ بن منذر اور حضرت سعدؓ بن عبادہ کو عنایت ہوئے، اور خاص عَلَم نبویؐ جس کا پھریرا حضرت عائشہؓ کی چادر سے تیار ہوا تھا، جناب امیرؓ کو مرحمت ہوا۔ فوج جب روانہ ہوئی تو حضرت عامرؓ ابن الاکوع (جو مشہور شاعر تھے) یہ رجز پڑھتے ہوئے آگے چلے:

اللھم لولا انت ما اھتدینا	اے خدا اگر تو ہدایت نہ کرتا تو ہم ہدایت نہ پاتے،
ولا تصدقنا ولا صلّینا	نہ خیرات کرتے، نہ نماز پڑھتے،
فاغفر فداء لک ما اتقینا	ہم تجھ پر فدا ہوں، ہم جو احکام نہیں بجا لائے
والقین سکینۃ علینا	ان کو معاف کر دے اور ہم پر تسلّی نازل کر،
انا اذا صیح بنا اتینا	ہم جب فریاد میں پکارے جاتے ہیں تو پہنچ
وثبت الاقدام ان لاقینا	جاتے ہیں اور جب مڈبھیڑ ہو تو ہم کو ثابت قدم
وبالصیّاح عولوا علینا	رکھ، لوگوں نے پکار کر ہم سے استغاثہ کیا ہے۔

یہ اشعار صحیح (مسلم و) بخاری میں نقل کیے ہیں۔ مسند حنبل میں بعض اشعار زیادہ ہیں، (پہلے دو مصرع کسی قدر اختلاف کے ساتھ صحیح مسلم (خیبر) میں بھی ہیں۔

ان الذین قد بغوا علینا	جن لوگوں نے ہم پر دست اندازی کی ہے
اذا ارادوا فتنۃ ابینا	جب وہ کوئی فتنہ برپا کرنا چاہتے ہیں تو ہم ان سے
ونحن عن فضلک ما استغنینا	دبتے نہیں اور اے خدا ہم تیری عنایت سے بے نیاز نہیں۔

لہ ان اشعار میں صاف تصریح ہے کہ تعدی اور حملے کی ابتدا دشمنوں کی طرف سے تھی۔ اشعار کے بعض بعض الفاظ میں روایات کا اختلاف ہے۔

راہ میں ایک میدان آیا: صحابہ رضؓ نے تکبیر کے نعرے بلند کیے، چونکہ تعلیم و تلقین کا سلسلہ ہر وقت جاری رہتا تھا اور بات بات میں نکاتِ شریعت کی تعلیم ہوتی رہتی تھی، ارشاد ہُوا کہ آہستہ، کیونکہ کسی بہرے اور دُور از نظر کو نہیں پکار رہے ہو، تم جس کو پکارتے ہو وہ تمہارے پاس ہی ہے[1]

اس غزوہ میں چند خاتونیں بھی اپنی خواہش سے فوج کے ساتھ ہولی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپؐ نے ان کو بلا بھیجا اور غضب کے لہجے میں فرمایا "تم کس کے ساتھ آئیں اور کس کے حکم سے آئیں"؟ بولیں کہ یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم اس لیے آئے ہیں کہ چرخہ کات کر کچھ پیدا کریں گے اور اس کام میں مدد دیں گے۔ ہمارے پاس زخمیوں کے لیے دوائیں بھی ہیں، اس کے علاوہ ہم تیر اُٹھا کر لائیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح کے بعد جب مالِ غنیمت تقسیم کیا تو ان کا بھی حصہ لگایا۔ لیکن یہ حصہ کیا تھا؟ زر و جواہر تھے، مال و اسباب نہ تھا، درہم و دینار نہ تھے، بلکہ صرف کھجوریں تھیں۔ تمام مجاہدین کو یہی ملا تھا اور ان پردہ نشینوں نے بھی یہی پایا تھا۔

یہ واقعہ ابوداؤد (باب فی المرأۃ والعبد یحذیان من الغنیمۃ) میں مذکور ہے۔ حدیث اور سیرت کی تمام کتابوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اکثر غزوات میں مستورات ساتھ رہتی تھیں، جو زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی اور پیاسوں کو پانی پلاتی تھیں۔ جنگِ اُحُد میں حضرت عائشہ رضؓ کا مشک میں پانی بھر بھر کر لانا اور زخمیوں کو پلانا اُوپر گزر چکا ہے۔ لیکن یہ امر کہ عورتیں میدانِ جنگ سے تیر اُٹھا اُٹھا کر بھی لاتی اور مجاہدین کو دیتی تھیں، صرف ابوداؤد نے ذکر کیا ہے اس لیے

---

[1] صحیح بخاری غزوۂ خیبر۔

شک کی گنجائش نہیں۔ یوں بھی عرب کی مستورات سے کم سے کم یہی توقع کی جا سکتی ہے۔

چونکہ معلوم تھا کہ غطفان اہل خیبر کی مدد کو آئیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقام رجیع میں فوجیں اُتاریں جو غطفان اور خیبر کے بیچ میں ہے۔ اسباب باربرداری، خیمہ و خرگاہ اور مستورات یہاں چھوڑ دی گئیں[1] اور فوجیں خیبر کی طرف بڑھیں۔ غطفان یہ سُن کر کہ اسلامی فوجیں خیبر کی طرف بڑھ رہی ہیں، ہتھیار سج کر نکلے، لیکن آگے بڑھ کر جب اُن کو معلوم ہوا کہ خود اُن کا گھر خطرے میں ہے تو واپس چلے[2] گئے۔

خیبر میں چھ قلعے تھے، سالم، قموص، نطاۃ، قصارۃ، شق، مربطہ اور جیسا کہ یعقوبی نے تصریح کی ہے اُن میں بیس ہزار سپاہی تھے۔ ان سب میں قموص نہایت مضبوط اور محفوظ قلعہ تھا۔ مرحب عرب کا مشہور پہلوان جو ہزار سوار کے برابر مانا جاتا تھا، اسی قلعہ کا رئیس[3] تھا۔ ابن ابی الحقیق کا خاندان جس نے مدینہ سے جلا وطن ہو کر خیبر کی ریاست حاصل کر لی تھی یہیں رہتا تھا۔

لشکر اسلام جب خیبر کے قریب یعنی مقام صہبا میں پہنچا تو نماز عصر کا وقت آچکا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں ٹھہر کر نماز عصر ادا کی، پھر

---

[1] یہ تفصیل معجم البلدان (ج ۴ ص ۲۲۹) ذکر رجیع میں ہے۔ [2] طبری (ج ۳)، صفحہ ۱۵۷۵، اصل عبارت یہ ہے: فبلغنی ان غطفان لما سمعت بمنزل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیبر جمعوا لہ ثم خرجوا لیظاہروا یہود علیہ حتی اذا ساروا الخ [3] تاریخ یعقوبی (ج ۲ ص ۵۶)

کھانا طلب فرمایا۔ رسد کا ذخیرہ صرف ستو تھا وہی آپؐ نے بھی پانی میں گھول کر نوش فرمایا[1]۔ رات ہوتے ہوتے فوجِ اسلام خیبر کے سواد میں پہنچ گئی، عمارتیں نظر آئیں تو آپ نے صحابہؓ سے ارشاد فرمایا کہ ٹھہر جاؤ۔ پھر خدا کا نام لے کر یہ دعا مانگی :

اِنّا نسئلک خیر ھذہ القریۃ	اے خدا! ہم تجھ سے اس گاؤں
وخیر اھلھا وخیر مافیھا	کی اور گاؤں والوں کی اور گاؤں کی
ونعوذ بک من شرھا و	چیزوں کی بھلائی چاہتے ہیں
شر اھلھا وشر مافیھا۔	اور ان سب کی برائیوں سے پناہ
(ابن ہشام)	مانگتے ہیں۔

ابن ہشام نے لکھا ہے کہ یہ آپؐ کا معمول تھا۔ یعنی جب کسی مقام میں داخل ہوتے تھے، تو پہلے یہ دعا مانگ لیتے تھے۔ چونکہ سنّتِ نبوی یہ تھی کہ رات کو کسی مقام پر حملہ[2] نہیں کیا جاتا تھا اس لیے رات وہیں بسر کی۔ صبح کو خیبر میں داخلہ ہوا۔ یہودیوں نے مستورات کو ایک محفوظ مقام میں پہنچا دیا۔ رسد اور غلہ قلعۂ ناعم میں یکجا کیا اور فوجیں قلعۂ نطاۃ اور قموص میں فراہم کیں۔ سلام بن مشکم نضری بیمار تھا۔ تاہم اُس نے سب سے زیادہ حصہ لیا اور خود قلعۂ نطاۃ میں آکر فوج کی شرکت کی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود جنگ نہ تھا لیکن جب یہود نے بڑے سروسامان کے ساتھ جنگ کی تیاری کی تو آپؐ نے صحابہؓ کو مخاطب

---

[1] صحیح بخاری [2] صحیح بخاری میں اصل عبارت یہ ہے : اذا اتی قوما بلیل لم یغز بھم حتی یصبح (باب غزوہ خیبر)

کر کے وعظ فرمایا اور جہاد کی ترغیب دی، تاریخ خمیس میں اس موقع پر لکھا ہے:

ولما تیقن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان الیھود تحارب وعظ اصحابہ ونصحھم وحرضھم علی الجہاد۔	اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یقین ہو گیا کہ یہود لڑنے پر آمادہ ہیں تو آپ نے صحابہ کو نصیحت کی اور جہاد کی ترغیب دی۔

سب سے پہلے قلعہ ناعم پر فوجیں بڑھیں۔ حضرت محمود رضؓ بن مسلمہ نے بڑی دلیری سے حملہ کیا اور دیر تک لڑتے رہے، لیکن چونکہ سخت گرمی تھی، تھک کر دم لینے کے لیے قلعہ کی دیوار کے سایے میں بیٹھ گئے۔ کنانہ بن الربیع نے قلعہ کی فصیل سے چکی کا پاٹ اُن کے سر پر گرایا، جس کے صدمہ سے وفات پائی، لیکن قلعہ بہت جلد فتح ہو گیا۔[۱]

ناعم کے بعد اور قلعے بآسانی فتح ہوتے گئے لیکن قلعہ قموص مرحب کا تخت گاہ تھا، اس مہم پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کو بھیجا لیکن دونوں ناکام واپس آئے۔ طبری میں روایت ہے کہ جب خیبری قلعہ سے نکلے تو حضرت عمرؓ کے پاؤں نہ جم سکے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی کہ فوج نے نامردی کی، لیکن فوج نے اُن کی نسبت خود یہی شکایت کی۔

اس روایت کو طبری نے جس سلسلۂ سند سے نقل کیا ہے اُس کے راوی عوف ہیں۔ ان کو بہت سے لوگوں نے ثقہ کہا ہے لیکن بندار جب اُن کی روایت

---

[۱] ابن ہشام نے دو موقعوں پر اس واقعہ کا الگ ٹکڑا لکھا ہے۔ یہ تفصیل خمیس سے لی گئی ہے۔

بیان کرتے تھے تو کہتے تھے کہ "وہ رافضی اور شیطان تھا" یہ لفظ بہت سخت ہے، لیکن اُن کی شیعیت سب کو تسلیم ہے۔ اور گو شیعہ ہونا بے اعتباری کی دلیل نہیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ جس روایت میں حضرت عمرؓ کے بھاگنے کا واقعہ بیان کیا جائے، شیعہ کی زبان سے اس روایت کا رتبہ کیا رہ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اوپر کے راوی عبداللہ بن بریدہ ہیں جو اپنے والد سے روایت کرتے ہیں۔ لیکن محدثین کو اس بات میں شبہہ ہے کہ ان کی جو روایتیں باپ کے سلسلے سے منقول ہیں صحیح بھی ہیں یا نہیں۔

تاہم اس قدر ضرور صحیح ہے کہ اس مہم پر پہلے اور بڑے بڑے صحابہ بھیجے گئے تھے لیکن فتح کا فخر کسی اور کی قسمت میں تھا۔ جب مہم میں زیادہ دیر ہوئی تو ایک دن شام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "کل میں اُس شخص کو علم دوں گا جس کے ہاتھ پر خدا فتح دے گا، اور جو خدا اور خدا کے رسول کو چاہتا ہے، اور خدا اور خدا کا رسول بھی اس کو چاہتے ہیں[1]" یہ رات نہایت اُمید اور انتظار کی رات تھی۔ صحابہؓ نے تمام رات اسی بیقراری میں کاٹی کہ دیکھیے یہ تاجِ فخر کس کے ہاتھ میں آتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے قناعت پسندی اور بلند نظری کی بنا پر کبھی حکومت اور سرداری کی تمنا نہیں کی۔ لیکن جیسا کہ صحیح مسلم باب فضائل علی میں مذکور ہے، اُن کو خود اعتراف ہے کہ اس موقع کی تمنا میں اُن کی خودداری بھی قائم نہ رہ سکی۔

صبح کو دفعۃً یہ آواز کانوں میں آئی کہ علیؓ کہاں ہیں؟ یہ بالکل غیر متوقع آواز تھی۔ کیونکہ جنابِ موصوف کی آنکھوں میں آشوب تھا، اور سب کو معلوم

---

[1] صحیح بخاری کے الفاظ ہیں۔

تھا کہ وہ جنگ سے معذور ہیں۔ غرض حسبِ طلب وہ حاضر ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی آنکھوں میں اپنا لعابِ دہن لگایا اور دُعا فرمائی۔ جب اُن کو علَم عنایت ہوا تو انھوں نے عرض کی کہ "کیا یہود کو لڑ کر مسلمان بنا لیں"! ارشاد ہوا کہ "بہ نرمی اُن پر اسلام کو پیش کرو۔ اگر ایک شخص بھی تمھاری ہدایت سے اسلام لائے تو سُرخ اونٹوں سے بہتر ہے"۔[1]

لیکن یہود اسلام یا صلح قبول کرنے پر راضی نہیں ہو سکتے تھے۔ مرحب قلعہ سے یہ رجز پڑھتا ہوا باہر نکلا:

قد علمت خیبر انی مرحب	خیبر جانتا ہے کہ میں مرحب ہوں
شاکی السلاح بطل مجرّب	دلیر ہوں تجربہ کار ہوں، سلاح پوش ہوں۔

مرحب کے سر پر یمنی زرد رنگ کا مغفر اور اس کے اُوپر سنگی خود تھا۔ قدیم زمانے میں گول پتھر بیچ سے خالی کر لیتے تھے، یہی خود کہلاتا تھا۔

مرحب کے جواب میں حضرت علیؓ نے یہ رجزیہ پڑھا:

انا الذی سمتنی امی حیدرہ	مَیں وہ ہوں کہ میری ماں نے میرا نام شیر رکھا تھا
کلیث غابات کریہ المنظرہ	مَیں شیرِ نیستان کی طرح مہیب بد منظر ہوں۔

مرحب بڑے طمطراق سے آیا لیکن حضرت علیؓ نے اس زور سے تلوار ماری کہ سر کو کاٹتی ہوئی دانتوں تک اُتر آئی، اور ضربت کی آواز فوج تک پہنچی۔[2] پہلوان کا مارا جانا عظیم الشان واقعہ تھا۔ اس لیے عجائب پسندی نے اس کے متعلق نہایت مبالغہ آمیز افواہیں پھیلا دیں۔ معالم التنزیل میں ہے کہ

---

[1] یہ واقعہ بہ تفصیل مذکور صحیح بخاری میں منقول ہے۔ [2] طبری صفحہ ۱۵۷۹
(یہ اشعار اور مختصر واقعات صحیح مسلم غزوۂ خیبر میں بھی ہیں)۔

حضرت علیؓ نے جب تلوار ماری تو مرحب نے سپر پر روکا۔ لیکن ذوالفقار خود اور سر کو کاٹتی ہوئی دانتوں تک اتر آئی۔ مرحب کے مارے جانے پر یہود نے جب عام حملہ کیا تو اتفاق سے حضرت علیؓ کے ہاتھ سے سپر چھوٹ کر گر پڑی۔ آپؓ نے قلعہ کا در جو سرتاپا پارۂ سنگ تھا، اکھاڑ کر اس سے سپر کا کام لیا۔ اس واقعہ کے بعد ابو رافع نے سات آدمیوں کے ساتھ مل کر اس کو اٹھانا چاہا، تو جگہ سے بھی نہ ہل سکا۔ یہ روایتیں ابن اسحاق اور حاکم نے روایت کی ہیں، لیکن بازاری قصے ہیں۔ علامہ سخاوی نے مقاصدِ حسنہ میں تصریح کی ہے کہ:

کلھا واھیۃ — سب لغو روایتیں ہیں۔

علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں علی بن احمد فرخ کے حال میں اس روایت کو نقل کر کے لکھا ہے کہ "یہ روایت منکر ہے۔" ابن ہشام نے جن سلسلوں سے یہ روایتیں نقل کی ہیں، اُن میں سے ایک روایت میں تو بیچ کے ایک راوی کا نام سرے سے چھوڑ دیا ہے، اور دوسرے میں اس مشترک نقص کے ساتھ بریدہ بن سفیان بھی ایک راوی ہیں۔ جن کو امام بخاری اور ابوداؤد اور دارقطنی قابلِ اعتبار نہیں[1] سمجھتے۔

ابن اسحاق، موسیٰ بن عقبہ اور واقدی کا بیان ہے کہ مرحب کو محمد بن مسلمہ نے مارا تھا۔ مسند ابن حنبل اور نووی شرح صحیح مسلم میں بھی ایک روایت ہے لیکن صحیح مسلم (اور حاکم ج ۲ ص ۳۹) میں حضرت علی رضی ہی کو مرحب کا قاتل اور فاتح خیبر لکھا ہے اور یہی اصح الروایات ہے۔

---

[1] میزان الاعتدال ترجمہ بریدہ بن سفیان۔

غرض یہ قلعہ (قموص) ۲۰ دن کے محاصرے کے بعد فتح ہوگیا۔ ان معرکوں میں ۹۳ یہود مارے گئے، جن میں حارث، مرحب، اسیر، یاسر، عامر، زیادہ مشہور ہیں۔ صحابہؓ میں سے ۱۵ بزرگوں نے شہادت حاصل کی۔ جن کے نام ابن سعد نے بہ تفصیل لکھے ہیں۔

فتح کے بعد زمین مفتوحہ پر قبضہ کرلیا گیا۔ لیکن یہود نے درخواست کی کہ زمین ہمارے قبضے میں رہنے دی جائے، ہم پیداوار کا نصف حصّہ ادا کریں گے۔ یہ درخواست منظور ہوئی۔ بٹائی کا وقت آتا تو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم عبداللہؓ بن رواحہ کو بھیجتے تھے۔ وہ غلّہ کو دو حصّوں میں تقسیم کرکے یہود سے کہتے تھے، کہ اس میں سے جو حصّہ چاہو لے لو۔ یہود اس عدل پر متحیّر ہوکر کہتے تھے، کہ "زمین اور آسمان ایسے ہی عدل سے قائم ہیں"۔ خیبر کی زمین تمام مجاہدین پر جو اس جنگ میں شریک تھے تقسیم کردی گئی۔ اسی میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا خمس بھی تھا۔[۱]

عام روایت ہے کہ مالِ غنیمت میں سے خمس کے علاوہ ایک حصّہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے لیے خاص طور پر کرلیا جاتا تھا جس کو "صفی" کہتے ہیں۔ اس بناء پر حضرت صفیہؓ زوجہ کنانہ بن الربیع، کو آپ نے لے لیا، اور آزاد کرکے اُن سے نکاح کرلیا۔

حضرت صفیہؓ کے واقعہ کی تحقیق

حضرت صفیہؓ کی نسبت بعض کتب حدیث و سیر میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے پہلے ان کو دحیہ کلبیؓ کو دیا تھا، پھر کسی نے اُن کے حُسن کی تعریف کی تو ان سے

---

[۱] فتوح البلدان بلاذری (ص ۲۷) فتح خیبر و طبری صفحہ ۱۵۸۹۔ اصل روایت ابوداؤد و باب المساقات میں موجود ہے۔

مانگ لیا، اور اس کے معاوضے میں ان کو سات لونڈیاں دیں۔ مخالفین نے اس روایت کو نہایت بدنما پیرایہ میں ادا کیا ہے، اور جب اصل روایت میں اتنی بات موجود ہے تو ظاہر ہے کہ مخالف اس سے کہاں تک کام لے سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت صفیہؓ کا یہ واقعہ حضرت انسؓ سے منقول ہے لیکن خود حضرت انسؓ سے متعدد روایتیں ہیں اور وہ باہم مختلف ہیں۔ بخاری کی جو روایت غزوۂ خیبر کے ذکر میں ہے، اس میں یہ تصریح ہے کہ جب قلعۂ خیبر فتح ہوا تو لوگوں نے آپؐ کے سامنے حضرت صفیہؓ کے حسن کا ذکر کیا، آپؐ نے اُن کو اپنے لیے لے لیا۔ اصلی الفاظ یہ ہیں:

فلما فتح اللّٰہ علیہ الحصن ذکر لہ جمال صفیة بنت حیی بن اخطب وقد قتل زوجھا وکانت عروسا فاصطفاھا النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم لنفسہ،	(جب خدا نے قلعہ فتح کرا دیا تو لوگوں نے آپؐ سے صفیہ بنت حیی کے حسن و جمال کی تعریف کی، اس کا شوہر اس جنگ میں مارا گیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اپنے لیے پسند کر لیا۔)

لیکن بخاری کتاب الصلوٰۃ (باب ما یذکر فی الفخذ) (صحیح مسلمؒ باب فضل عتق الامة) میں خود حضرت انسؓ کی یہی روایت اس طریقہ سے منقول ہے، کہ جب لڑائی کے بعد قیدی جمع کیے گئے تو حضرت دحیہ کلبیؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی ان میں سے ایک لونڈی مجھ کو عنایت ہو، آپؐ نے اُن کو اختیار دیا کہ خود جا کر کوئی لونڈی لے لو۔ انھوں نے حضرت صفیہؓ کو انتخاب کیا۔ لیکن لوگوں کو اعتراض ہوا۔ ایک شخص نے آکر آنحضرت

ؒ صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۵۴۶ باب فضل عتق الامة ثم التزوج بہا

صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا:

یا نبی اللہ اعطیت دحیۃ صفیۃ بنت حیی سیدۃ قریظۃ والنضیر لا تصلح الا لک۔

اے پیغمبر خدا! آپؐ نے صفیہ کو دحیہ کے حوالے کیا، وہ قریظہ اور نضیر کی رئیسہ ہے اور آپؐ کے سوا اور کوئی اس کے لائق نہیں۔

اس کے بعد آپؐ نے حضرت صفیہ رضؓ کو آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا۔"

ابوداؤدؒ میں یہ دونوں روایتیں ہیں۔ اور دونوں حضرت انسؓ سے مروی ہیں۔ ابوداؤد کی شرح میں مازری (مشہور محدث) کا یہ قول نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صفیہ رضؓ کو اس لیے حضرت دحیہ سے لیکر ان سے عقد کیا کہ:

لما فیہ من انتہا کہا مع مرتبتہا وکونہا بنت سیدھم۔

چونکہ وہ عالی رتبہ اور رئیس یہود کی صاحبزادی تھیں، اس لیے ان کا کسی اور کے پاس جانا اُن کی توہین تھی۔

حافظ ابن حجر نے بھی فتح الباری میں اس کے قریب قریب لکھا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ حضرت صفیہ رضؓ خاندان کے تباہ ہونے کے بعد خاندان سے باہر بیوی یا کنیز بن کر رہتیں، وہ رئیس خیبر کی بیٹی تھیں۔ اُن کا شوہر بھی قبیلہ نضیر کا رئیس تھا۔ باپ اور شوہر دونوں قتل کیے جا چکے تھے۔ اس حالت میں اُن کے پاسِ خاطر، حفظِ مراتب اور رفعِ غم کے لیے اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اپنے عقد میں

لہ (ابوداؤد باب ماجاء فی سہم الصفی)

بے لیں، وہ کنیز ہو کر بھی رہ سکتی تھیں۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی خاندانی عزت کے لحاظ سے اُن کو آزاد کر دیا اور پھر نکاح پڑھایا (بلکہ مسند ابن حنبل میں ہے کہ آپؐ نے ان کو اختیار دیا کہ وہ آزاد ہو کر اپنے گھر چلی جائیں یا آپؐ کے نکاح میں آنا قبول کریں۔ انھوں نے دوسری صورت پسند کی یعنی یہ کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آجائیں[۱]) حسنِ خلق، رحم اور مصیبت کی چارہ نوازی کے علاوہ سیاسی اور مذہبی حیثیت سے بھی یہ کارروائی نہایت موزوں اور بجا تھی۔ اس قسم کے طرزِ عمل سے عرب کو اسلام کی طرف رغبت اور کشش ہوتی تھی کہ اسلام اپنے دشمنوں کے ورثے کے ساتھ بھی کس قسم کا محسنانہ اور ہمدردانہ سلوک کرتا ہے۔

غزوۂ بنی المصطلق میں حضرت جویریہؓ کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا اور اس سلوک کا جو اثر ہوا وہ اوپر گزر چکا ہے۔

فتح کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند روز خیبر میں قیام کیا۔ اگرچہ یہود کو کامل امن وامان دیا گیا اور ان کے ساتھ ہر طرح کی مراعات کی گئی تاہم ان کا طرزِ عمل مفسدانہ اور باغیانہ رہا۔ پہلا دیباچہ یہ تھا، کہ ایک دن زینب نے جو سلام بن مشکم کی بیوی اور مرحب کی بھاوج تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چند صحابہ کے ساتھ دعوت کی، آپؐ نے فرطِ کرم سے قبول فرمایا۔ زینب نے کھانے میں زہر ملا دیا تھا، آپؐ نے ایک لقمہ کھا کر ہاتھ کھینچ لیا۔ لیکن حضرت بشرؓ بن براءؓ نے پیٹ بھر کر کھایا اور زہر کے اثر سے بالآخر ہلاک ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زینب کو بلا کر پوچھا، اس

---

(۱) مسند ابن حنبل ج ۳ ص ۱۳۸ (مصر) "س"

نے جرم کا اقبال کیا۔ یہود نے کہا "ہم نے اس لیے زہر دیا کہ اگر آپؐ پیغمبر ہیں تو زہر خود اثر نہ کرے گا اور پیغمبر نہیں ہیں تو ہم کو آپؐ کے ہاتھ سے نجات مل جائے گی۔"[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی اپنی ذات کے لیے کسی سے انتقام نہیں لیتے تھے، اس بنا پر آپؐ نے زینب سے تعرض نہیں فرمایا، لیکن جب دو تین دن کے بعد حضرت بشرؓ زہر کے اثر سے انتقال کر گئے تو وہ قصاص میں قتل کر دی گئی۔

ایک دفعہ صحابہ میں سے حضرت عبداللہؓ بن سہیل اور حضرت محیصہؓ قحط سالی کے زمانے میں خیبر گئے۔ یہود نے حضرت عبداللہؓ کو دھوکے سے قتل کر کے ایک نہر میں ڈال دیا۔ حضرت محیصہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر واقعہ بیان کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم قسم کھا سکتے ہو کہ یہودیوں نے قتل کیا؛ عرض کیا کہ حضورؐ وہ تو پچاس مسلمانوں کو قتل کر کے بھی جھوٹی قسم کھالیں گے۔ غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے تعرض نہیں کیا۔ اور بیت المال سے مقتول کا خون بہا دلا دیا۔

حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں یہود نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو سوتے میں کوٹھے پر سے گرا دیا کہ ان کا ہاتھ اور پاؤں ٹوٹ گیا۔ اس طرح ہمیشہ فساد انگیزیاں کرتے رہتے تھے، مجبور ہو کر حضرت عمرؓ نے ان کو شام کے اضلاع میں جلاوطن کر دیا (یہ جملۂ معترضہ کلام میں آگیا تھا)۔

---

[1] فتوح البلدان، بلاذری (ص ۲۸) اور صحیح بخاری مطبوعۂ مصطفائی جلد اول ص ۳۷۷ (باب اذا اشترط فی المزارعۃ اذا شئت اخرجتک)۔

خیبر کے واقعات میں ارباب سیر نے ایک سخت غلط روایت نقل کی ہے، اور وہ اکثر کتابوں میں منقول ہو کر متداول ہو گئی ہے۔ یعنی یہ کہ اول آپؐ نے یہود کو اس شرط پر امن عام دیا تھا کہ کوئی چیز نہ چھپائیں گے۔ لیکن جب کنانہ بن الربیع نے خزانہ بتانے سے انکار کیا تو آپؐ نے زبیرؓ کو حکم دیا کہ سختی کرکے اس سے خزانے کا پتہ لگائیں۔ حضرت زبیرؓ چقماق جلا کر اس کے سینے کو داغتے تھے۔ یہاں تک کہ اس کی جان نکلنے کے قریب ہو گئی۔ بلآخر آپؐ نے کنانہ کو قتل کرا دیا اور تمام یہودی لونڈی غلام بنا لیے گئے۔[۱]

اس روایت کا اس قدر حصہ صحیح ہے کہ کنانہ قتل کر دیا گیا۔ لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ خزانہ بتانے سے انکار کرتا تھا بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ کنانہ نے محمود بن مسلمہ کو قتل کیا تھا، طبری میں تصریح ہے:

ثم دفعه رسول الله الى محمّد بن مسلمة فضرب عنقه باخيه محمود بن مسلمة۔ (صفحہ ۱۵۸۲)	پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کنانہ کو محمد بن مسلمہ کے حوالے کیا۔ انہوں نے اپنے بھائی محمود ابن مسلمہ کے قصاص میں اس کو قتل کر دیا۔

باقی روایت کا یہ حال ہے کہ یہ روایت طبری اور ابن ہشام دونوں نے ابن اسحاق سے روایت کی ہے۔ لیکن ابن اسحاق نے اُوپر کے کسی راوی کا نام نہیں بتایا۔ محدثین نے رجال کی کتابوں تصریح کی ہے کہ ابن اسحاق یہودیوں سے مغازی نبوی کے واقعات روایت کرتے تھے۔ اس روایت کو بھی انہی

---

[۱] یہ پوری تفصیل تاریخ طبری میں مذکور ہے۔ ابن ہشام میں بھی اس کے قریب قریب ہے [۲] فتوح البلدان بلاذری، (ص ۲۴)۔

روایتوں میں سمجھنا چاہیے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ابن اسحاق ان راویوں کا نام نہیں لیتے۔

کسی شخص پر خزانہ بتانے کے لیے اس قدر سختی کرنا کہ اس کے سینے پر چقماق سے آگ جھاڑی جائے رحمۃ للعالمین کی شان سے بہت ارفع ہے۔

وہی شخص جو اپنے زہر دینے والے سے مطلق تعرض نہیں کرتا، کیا چند سکوں کے لیے کسی کو آگ سے جلانے کا حکم دے سکتا ہے؟

اصل واقعہ اس قدر تھا کہ کنانہ بن ابی الحقیق کو اس شرط پر امان دی گئی تھی کہ کسی قسم کی بدعہدی اور خلاف بیانی نہ کرے گا (بلکہ ایک روایت میں ہے کہ) اس نے یہ بھی منظور کیا تھا کہ اگر اس کے خلاف اس نے کچھ کیا تو وہ قتل کا مستحق ہوگا۔[۱]

کنانہ نے بدعہدی کی اور جو امن اس کو دیا گیا تھا ٹوٹ گیا۔ کنانہ نے محمود بن مسلمہ کو قتل کیا تھا، اب اس کے قصاص میں وہ قتل کر دیا گیا۔ جیسا کہ ابھی ہم نے طبری کی روایت سے نقل کیا ہے۔

اب دیکھو اس روایت میں کیا کیا واقعات اضافہ ہو گئے:

(۱) قتل کا واقعہ کنانہ کے ساتھ خاص تھا۔ خزانہ کے چھپانے کا وہی مجرم تھا۔ محمود بن مسلمہ کو اسی نے قتل کیا تھا، اس لیے وہی قتل بھی کیا جا سکتا تھا۔ اضافے کا پہلا قدم یہ ہے کہ ابن سعد نے بکر بن عبدالرحمٰن سے جو روایت متصل نقل کی ہے، اس میں کنانہ کے ساتھ اس کے بھائی کا بھی نام بڑھا دیا ہے، یعنی دونوں قتل کیے گئے:

---

[۱] ابوداؤد باب حکم ارض خیبر [۲] طبقات ابن سعد غزوۂ خیبر ص ۸۱ سطر ۲۴،

فضرب اعناقہما وسبیٰ — تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو قتل کرا دیا،
اہلیہما[۱] — ان کی عورتوں اور بچوں کو لونڈی غلام بنالیا۔

(۲) یہاں تک بھی خیریت تھی، لیکن ابن سعد نے عفان بن مسلم سے جو روایت نقل کی ہے وہ اس سے بھی زیادہ وسیع ہو گئی ہے، یعنی دونوں بھائیوں کے ساتھ تمام یہودی گرفتار اور لونڈی غلام بنالیے گئے۔

فلما وجد المال الذی — تو جب وہ خزانہ مل گیا جس کو انھوں نے اونٹ
غیبوہ فی مسك الجمل — کی کھال میں چھپا رکھا تھا تو ان کی عورتیں
سبیٰ نساء ھم[۲] — گرفتار کیں اور لونڈیاں بنالیں۔

لیکن جب یہ روایتیں محدثانہ اصولِ تنقید سے جانچی جاتی ہیں تو چھلکے اُترتے جاتے ہیں اور اصل حقیقت رہ جاتی ہے یہود کا قتل اور زن و بچہ کا گرفتار ہونا ایک طرف، خود صحیح بخاری سے ثابت ہے کہ کنانہ کا بھائی تک قتل نہیں کیا گیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت تک موجود تھا۔

صحیح بخاری میں ہے:-

فلما اجمع عمر علی ذالك — پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ ارادہ کرلیا
اتاہ احد بنی ابی الحقیق — تو ابو الحقیق کا ایک بیٹا ان کے پاس
فقال یا امیر المؤمنین — آیا اور کہا کہ امیر المومنین آپ ہم کو
اتخرجنا وقد اقرنا محمد — نکالتے ہیں حالانکہ ہم کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)
وعاملنا علی الاموال[۳]۔ — نے رہنے دیا تھا، اور خراج پر معاملہ کیا تھا۔

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں تصریح کی ہے کہ یہ وہی کنانہ بن ابی الحقیق

---

[۱] طبقات ابن سعد غزوۂ خیبر ص ۸۱ سطر ۲۰۔ [۲] طبقات ابن سعد غزوۂ خیبر ص ۸۔ [۳] صحیح بخاری جلد اول مطبع مصطفائی ص ۳۷۷۔ باب اذا اشترط فی المزارعۃ اذا شئت اخرجتك۔

کا بھائی تھا۔

حافظ ابن قیم نے زادالمعاد میں عام روایتوں کی وسعت کو گھٹا کر اس حد تک پہنچایا کہ:

ولم یقتل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد الصلح الا ابنی ابی الحقیق۔ (ذکر غزوہ خیبر)	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح کے بعد ابن ابی الحقیق کے دونوں بیٹوں کے سوا اور کسی کو قتل نہیں کیا۔

لیکن حافظ موصوف کو اگر صحیح بخاری کی عبارتِ مذکورہ بالا پیشِ نظر ہوتی تو غالباً یہ تعداد اور بھی گھٹ جاتی۔

ابوداؤد میں جہاں ارضِ خیبر کا عنوان باندھا ہے صرف ابن ابی الحقیق کا قتل کیا جانا لکھا ہے، یہ نکتہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ابوداؤد میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سعیۃ (حیی بن اخطب کے چچا) سے پوچھا تھا کہ وہ خزانہ کیا ہوا؟ اس نے کہا لڑائیوں میں صرف ہو گیا۔ باوجود اس کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف کنانہ کے قتل کا حکم دیا۔ یہ اس بات کی صاف دلیل ہے کہ کنانہ کا قتل محمود بن مسلمہ کے قصاص میں ہوا تھا۔ ورنہ اگر خزانہ کے چھپانے کا جرم قتل کا سبب ہوتا تو اس جرم کے مجرم اور بھی تھے۔

مؤرخین نے پہلی غلطی یہ کی کہ کنانہ کے قتل کا سبب اخفائے خزانہ سمجھے اور چونکہ اس جرم میں اور لوگ بھی شریک تھے، اس لیے یہ تعمیم خود بخود پیدا ہو گئی کہ کنانہ کا تمام خاندان قتل کر دیا گیا۔

ایک اور نکتہ اس قدر عموماً مسلّم ہے کہ خیبر کا واقعہ محرم میں پیش آیا۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب اس ارادہ سے مدینہ سے نکلے تو محرم کی اخیر تاریخیں تھیں۔ محرم میں لڑائی شرعاً ممنوع ہے، اس لیے محدثین اور فقہا میں اس کی

توجیہ کے متعلق اختلاف پیدا ہوا۔ بہت سے فقہا کا یہ مذہب ہے کہ اوائل میں البتہ ان مہینوں میں لڑائی شرعاً ممنوع تھی۔ لیکن پھر وہ حکم منسوخ ہوگیا۔ ابن قیم نے لکھا ہے کہ حرمت کا پہلا حکم جو نازل ہوا تھا، وہ اس آیت کی رُو سے تھا:

قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيلِ اللهِ۔ (بقرہ-۲۷)	کہ دو کہ اس مہینہ میں لڑنا بڑا گناہ ہے اور خدا کی راہ سے روکنا ہے۔

پھر سورۂ مائدہ میں یہ آیت اُتری:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ۔ (مائدہ-۱)	مسلمانو! خدا کی حد بندیوں کی اور ماہِ حرام کی بے حرمتی نہ کرو۔

یہ پچھلی آیت پہلی آیت کے آٹھ برس بعد نازل ہوئی۔ اس وسیع زمانہ تک تو حرمت کا حکم باقی رہا۔ اب وہ کون سی آیت یا حدیث ہے جس سے یہ حکم منسوخ ہوگیا:

وَلَيْسَ فِي كِتَابِ اللهِ وَلَا سُنَّةِ رَسُولِهِ نَاسِخٌ لِحُكْمِهَا۔	اور خدا کی کتاب اور حدیث میں ان آیتوں کے حکم کا کوئی ناسخ نہیں۔

مجوزین نے یہ استدلال کیا ہے کہ فتح حرم، طائف کا محاصرہ، بیعۃ رضوان، یہ سب ماہِ حرام میں ہوئے تھے۔ اس لیے اگر ماہِ حرام میں لڑائی جائز نہ ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو کیوں کر جائز رکھتے۔ حافظ ابن القیم نے جواب دیا ہے کہ ماہِ حرام میں ابتدائً جنگ کرنا حرام ہے، لیکن اگر دشمن کا مدافعہ مقصود ہے تو بالاتفاق جائز ہے۔ وہ سب واقعات دفاعی تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش دستی نہیں کی تھی، بلکہ دفاع کیا گیا تھا۔

بیعتِ رضوان اس لیے لی گئی کہ یہ خبر مشہور ہو گئی تھی کہ کفار نے حضرت عثمانؓ کو (جو سفیر ہو کر گئے تھے) قتل کر دیا۔ طائف کا محاصرہ کوئی مستقل جنگ نہ تھی، بلکہ غزوۂ حنین کا بقیہ تھا جس میں خود کفار ہر طرف سے جمع ہو کر حملہ آور ہوئے تھے۔ فتحِ حرم کا واقعہ حدیبیہ کی شکست کا نتیجہ تھا، جس کی ابتدا قریش نے کی تھی[۱]۔

حافظ ابن القیم نے نہایت صحیح جواب دیا لیکن خاص خیبر کے معاملے میں وہ اس گرہ کو نہ کھول سکے اور بحث نامنفصل رہ گئی۔ حافظ ابن القیم کے اُستاد علامہ ابن تیمیہ کو بھی اس موقع پر اشتباہ ہوا۔ انھوں نے الجواب الصحیح لمن بدّل دین المسیح میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس قدر لڑائیاں کیں سب دفاعی تھیں۔ صرف بدر اور خیبر اس سے مستثنیٰ ہیں۔ لیکن اگر علامہ موصوف زیادہ استقصاء کرتے تو ثابت ہوتا کہ بدر اور خیبر بھی مستثنیٰ نہیں۔ بدر کا بیان اوپر گزر چکا ہے، خیبر کے ماسبق واقعات کو ترتیب دے کر دیکھو تو صاف نظر آئے گا کہ یہود اور غطفان مدینہ پر حملے کی تیاریاں کر چکے تھے۔

تقسیم زمین خیبر کی زمین دو برابر حصّوں میں تقسیم کی گئی نصف بیت المال، مہمانی اور سفارت وغیرہ کے مصارف کے لیے خاص کر لیا گیا، باقی نصف مجاہدین پر جو اس غزوہ میں شریک تھے، مساوی حصّوں میں تقسیم کیا گیا۔ کل فوج کی تعداد چودہ سو تھی۔ دو سو سوار تھے، سواروں کو گھوڑوں کے مصارف کے لیے پیدل سے دُوگنا ملتا تھا۔ اس بنا پر یہ تعداد اٹھارہ سو

---

[۱] زاد المعاد ذکر غزوۂ خیبر۔

کے برابر تھی۔ اس حساب سے کل جائداد کے اٹھارہ سو حصے کیے گئے اور ہر مجاہد کے حصے میں ایک حصہ آیا۔ جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی عام مجاہدین کے برابر ایک ہی حصہ ملا۔[۱]

ولرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مثل سھم واحدھم۔ | اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی عام لوگوں کی طرح ایک حصہ تھا۔

ملکی حالات اور احکامِ فقہی خیبر کی فتح سے اسلام کی ملکی اور سیاسی حالت کا نیا دَور شروع ہوتا ہے۔ اسلام کے حقیقی دشمن صرف دو تھے: مشرکین اور یہود۔ عیسائی اگرچہ عرب میں موجود تھے، لیکن وہ کچھ زور اور اثر نہیں تھے۔ مشرکین اور یہود اگرچہ مذہبًا باہم مختلف تھے، لیکن سیاسی اسباب کی بنا پر اُن میں اتحاد پیدا ہو گیا تھا۔ مدینہ کے یہود عمومًا انصار کے حلیف تھے، اسی طرح خیبر کے یہود غطفان کے حلیف تھے۔ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے کے لیے مکہ اور مدینہ کے مشرکین اور منافقین سب مل کر کنفس واحدہ ہو گئے۔ خیبر کی فتح کے بعد یہود کی قوت بالکل ٹوٹ گئی اور مشرکین کا ایک بازو جاتا رہا۔

اب تک اسلام چاروں طرف سے نرغہ کی حالت میں تھا۔ اس بنا پر بجز عقائد اور ضروری عبادت کے شریعت کے اور احکام کی تاسیس و تعلیم کا موقع نہ تھا۔ شریعت کے احکام جیسا کہ حضرت عائشہ رضؓ نے فرمایا ہے، حالات کے اقتضاء سے بتدریج آئے ہیں۔ چنانچہ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ خیبر کی فتح

---

[۱] فتوح البلدان بلاذری، ذکر غزوۂ خیبر، ابوداؤد حکم ارض خیبر میں ہے۔ النبی صلی اللہ علیہ وسلم معھم لہ سھم کسھم احدھم، "س"

سے ادھر تو یہود کی فتنہ انگیزیوں سے نجات ملی، اُدھر حدیبیہ کی صلح سے مشرکین کی طرف سے فی الجملہ اطمینان حاصل ہُوا۔ اس بنا پر اب مسلمان جدید فقہی احکام کی تعمیل کے قابل ہو چکے تھے۔

اربابِ سیر نے غزوۂ خیبر کے تذکرے میں عموماً ذکر کیا ہے کہ اس موقع پر متعدد جدید فقہی احکام نازل[1] ہوئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تبلیغ کی، اُن کی تفصیل یہ ہے:

(۱) پنجہ دار پرند حرام ہو گئے،

(۲) درندہ جانور حرام کر دیے گئے،

(۳) گدھا اور خچر حرام کر دیا گیا،

(۴) اب تک معمول تھا کہ لونڈیوں سے فوراً تمتع جائز سمجھا جاتا تھا، اب استبراء کی قید ہو گئی۔ یعنی اگر وہ حاملہ ہے تو وضعِ حمل تک، ورنہ ایک مہینہ تک تمتع جائز نہیں،

(۵) چاندی سونے کا بہ تفاضل خریدنا حرام ہُوا،

(۶) بعض روایتوں میں ہے کہ متعہ بھی اسی غزوہ میں حرام ہُوا،

وادی القریٰ اور فدک تیمار اور خیبر کے درمیان ایک وادی ہے جس میں بہت سی بستیاں آباد ہیں، اس کو وادی القریٰ کہتے ہیں۔ قدیم زمانے میں عاد و ثمود یہاں آباد تھے۔ یاقوت نے معجم البلدان میں لکھا ہے کہ عاد و ثمود کے آثار اب بھی باقی ہیں۔ اسلام سے پہلے ان بستیوں میں یہود آکر آباد ہوئے اور زراعت اور آب رسانی کو بہت ترقی دی، اور اب یہ یہود کا

---

[1] یہاں نزول سے وحی متلو یعنی قرآن مراد نہیں ہے۔

مخصوص مرکز بن گیا تھا۔[1]

خیبر کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وادی القریٰ کا رُخ کیا، لیکن لڑنا مقصود نہ تھا۔ مگر یہود پہلے سے تیار تھے، انھوں نے فوراً تیر اندازی شروع کردی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا محمل آپؐ کے غلام (حضرت مدعمؓ) اُتار رہے تھے، کہ ایک تیر آیا اور وہ جان بحق ہوئے۔ عام مورخین نے یہود کی تیاری کا ذکر نہیں کیا ہے۔ لیکن امام بیہقی نے صاف تصریح کی ہے:

وقد استقبلتنا یھود بالرمی ولم نکن علیٰ تعبیة۔[2]	یہود ہمارے مقابلہ کو تیر چلاتے ہوئے نکلے اور ہم تیار نہ تھے۔

بہرحال جنگ شروع ہوگئی۔ لیکن تھوڑے سے مقابلہ کے بعد یہود نے سپر ڈال دی اور خیبر کے شرائط کے موافق صلح ہوگئی۔

ادائے عمرہ صلح حدیبیہ میں قریش سے معاہدہ ہوا تھا کہ اگلے سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں آکر عمرہ ادا کریں گے اور تین دن قیام کرکے واپس چلے جائیں گے۔ اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سال عمرہ ادا کرنا چاہا، اور اعلان کرادیا کہ جو لوگ واقعہ حدیبیہ میں شریک تھے، ان میں کوئی رہ نہ جائے۔ چنانچہ بجز اُن لوگوں کے جو اس اثنا میں مر چکے تھے، سب نے یہ سعادت حاصل کی۔

معاہدہ میں شرط تھی کہ مسلمان مکہ میں آئیں تو ہتھیار ساتھ نہ لائیں۔ اس لیے اسلحہ جنگ بطن یاجج میں جو مکہ سے آٹھ میل ادھر ہے چھوڑ دیے گئے،

---

[1] معجم البلدان لفظ قریٰ ج ۷، ص ۲ "س" [2] زرقانی بر موطا، بہ حوالہ بیہقی باب الجہاد ذکر غلول ج ۳ ص ۱۲ "س"

اور دو سو سواروں کا ایک دستہ اسلحہ کی حفاظت کے لیے متعین کر دیا گیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لبیک کہتے ہوئے حرم کی طرف بڑھے۔ حضرت عبداللہ بن رواحہ اونٹ کی مہار تھامے ہوئے آگے آگے یہ رجز پڑھتے جاتے تھے[۱]

خلوا بنی الکفار عن سبیلہ	کافرو! سامنے سے ہٹ جاؤ،
الیوم نضربکم علی تنزیلہ	آج جو تم نے اترنے سے روکا تو ہم تلوار کا وار کریں گے
ضربا یزیل الهام عن مقیلہ	وہ وار جو سر کو خوابگاہ سر سے الگ کر دے
ویذهل الخلیل عن خلیلہ	اور دوست کے دل سے دوست کی یاد بھلا دے،

صحابہ کا جم غفیر ساتھ تھا، اور برسوں کی دیرینہ تمنا اور فرض مذہبی بڑے جوش کے ساتھ ادا کر رہا تھا۔ اہل مکہ کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو مدینہ کی آب و ہوا نے کمزور کر دیا ہے، اس بنا پر آپؐ نے حکم دیا کہ لوگ طواف کے تین پہلے پھیروں میں اکڑتے ہوئے چلیں۔ عربی زبان میں اس کو "رمل" کہتے ہیں۔ چنانچہ آج تک یہ سنت باقی ہے۔

اہل مکہ نے اگرچہ چار ناچار عمرہ کی اجازت دے دی، تاہم ان کی آنکھیں اس منظر کے دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتی تھیں۔ رؤسائے قریش نے عموماً شہر خالی کر دیا، اور پہاڑوں پر چلے گئے۔ تین دن کے بعد حضرت علیؓ کے پاس آئے اور کہا "محمد سے کہہ دو کہ شرط پوری ہو چکی اب مکہ سے نکل جائیں" حضرت علیؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی، آپ اسی وقت روانہ ہو گئے۔ چلتے وقت حضرت حمزہؓ کی صغیر السن

---

[۱] یہ اشعار اور یہ واقعہ ترمذی نے شمائل میں نقل کیا ہے۔

صاحبزادی امامہ جو مکہ میں رہ گئی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس "چچا چچا" کہتی دوڑی آئیں۔ حضرت علیؓ نے ہاتھوں میں اٹھا لیا لیکن حضرت جعفر (حضرت علیؓ کے بھائی) اور زیدؓ بن حارثہ نے اپنے دعوے پیش کیے۔ حضرت جعفرؓ کہتے تھے کہ یہ میرے چچا کی لڑکی ہے۔ زیدؓ کہتے تھے کہ حمزہؓ میرے مذہبی بھائی تھے۔ اس رشتہ سے یہ میری بھتیجی ہے۔ حضرت علیؓ کو دعویٰ تھا کہ میری ہمشیرہ بھی ہے اور پہلے میری ہی گود میں آئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کے دعوے مساوی الدرجہ دیکھ کر ان کو اسماء کی گود میں دیا، وہ امامہ کی خالہ تھیں، پھر فرمایا کہ "خالہ ماں کے برابر ہوتی ہے[۲]"۔

---

[۱] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رشتہ میں ان کے بھائی تھے لیکن انھوں نے تعظیماً کہا، یا اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت حمزہ دونوں رضاعی بھائی تھے۔ [۲] اس واقعہ کا بڑا حصہ صحیح بخاری سے ماخوذ ہے۔ بعض زائد تفصیلیں زرقانی سے لی گئی ہیں جو کتب حدیث کے حوالے سے زرقانی نے نقل کی ہیں۔

۸ھ

غزوۂ مُوتہ

جمادی الاولیٰ ۸ھ

مُوتہ شام میں ایک مقام کا نام ہے جو بَلقاء سے اس طرف ہے۔ عرب میں جو مشرقی تلواریں مشہور ہیں، وہ یہیں بنتی تھیں[1] کثیر مشہور شاعر کہتا ہے:

صَوَارِمُ یجلوھا بمُوتہ صَیقلُ (وہ تلواریں جن کو موتہ میں صیقل گر جلا دیتا ہے)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہِ بُصریٰ یا قیصرِ روم کے نام ایک خط لکھا تھا۔ عرب اور شام کے سرحدی علاقوں میں جو عرب رؤسا حکمران تھے، اُن میں ایک شُرَحبیل بن عمرو بھی تھا، جو اسی علاقہ بلقاء کا رئیس اور قیصر کا ماتحت تھا۔ یہ عربی خاندان ایک مُدت سے عیسائی تھا اور شام کے سرحدی مقامات میں حکمران تھا۔ یہ خط حارث بن عمیرؓ لے کر گئے تھے۔ شُرَحبیل نے ان کو قتل کر دیا۔ اس کے قصاص کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین ہزار فوج تیار کر کے شام کی طرف روانہ کی۔ زیدؓ بن حارثہ کو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

---

[1] معجم البلدان لفظ موتہ (ج ۸ ص ۱۹۰)

آزاد کردہ غلام تھے سپہ سالاری ملی۔ اور ارشاد ہوا کہ اگر ان کو دولت شہادت نصیب ہو تو جعفر طیار اور وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہ فوج کے سردار ہوں[۱]۔ حضرت زیدؓ غلام تھے گو آزاد ہو چکے تھے۔ حضرت جعفر طیارؓ حضرت علیؓ کے حقیقی بھائی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرب خاص تھے۔ حضرت عبداللہ بن رواحہؓ معزز انصاری اور مشہور شاعر تھے۔ اس بنا پر لوگوں کو تعجب ہوا کہ حضرت جعفرؓ و حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کے ہوتے حضرت زیدؓ کو افسر کرنا کس بنا پر ہے۔ چنانچہ لوگوں میں چرچے ہوئے[۲]۔ لیکن اسلام جس مساوات عام کے قائم کرنے کے لیے آیا تھا، اس کے لیے اسی قسم کا ایثار درکار تھا۔ حضرت اسامہؓ کی مہم میں جس میں تمام مہاجرین کو شرکت کا حکم ہوا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی زیدؓ کے صاحبزادے حضرت اسامہؓ کو فوج کا افسر مقرر کیا تھا۔ اس وقت بھی لوگوں میں چرچے ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو خطبہ دیا اور فرمایا کہ "تم لوگوں نے اُن کے باپ کی افسری پر بھی اعتراض کیا تھا۔ حالانکہ یقیناً وہ افسری کے قابل تھے۔" چنانچہ صحیح بخاری لبعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم اسامۃ بن زید فی مرضہ الذی توفی فیہ (باب المغازی) میں بہ تفصیل یہ واقعہ منقول ہے[۳]

گو یہ مہم قصاص لینے کی غرض سے تھی، لیکن چونکہ تمام مہمات کا اصلی محور تبلیغ اسلام تھا، ارشاد ہوا کہ پہلے ان کو دعوت اسلام دی جائے۔ اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو جنگ کی ضرورت نہیں۔ یہ بھی حکم ہوا کہ اظہار ہمدردی

---

[۱] صحیح بخاری غزوۂ موتہ۔ [۲] فتح الباری، ج ۷، ص ۳۹۳، "س" [۳] طبقات ابن سعد (جزء مغازی ص ۹۳) "س"

کے لیے اس مقام پر جانا جہاں حارث بن عمیرؓ نے ادائے فرض میں جان دی۔[1] ثنیۃ الوداع تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود فوج کی مشایعت کے لیے تشریف لے گئے۔ صحابہؓ نے پکار کر دعا کی کہ خدا سلامت اور کامیاب لائے۔

فوج مدینہ سے روانہ ہوئی تو جاسوسوں نے شرحبیل کو خبر دی، جس نے مقابلے کے لیے کم و بیش ایک لاکھ فوج تیار کی۔ ادھر خود قیصر روم (ہرقل) قبائل عرب کی بے شمار فوج لے کر تاب میں خیمہ زن ہوا، جو بلقار کے اضلاع میں ہے۔ حضرت زیدؓ نے یہ حالات سن کر چاہا کہ ان واقعات سے دربار رسالت کو اطلاع دی جائے اور حکم کا انتظار کیا جائے لیکن حضرت عبداللہؓ بن رواحہ نے کہا، ہمارا اصل مقصد فتح نہیں بلکہ دولت شہادت ہے[2]، جو ہر وقت حاصل ہو سکتی ہے۔ غرض یہ مختصر گروہ آگے بڑھا اور ایک لاکھ فوج پر حملہ آور ہوا۔ حضرت زید برچھیاں کھا کر شہید ہوئے۔ ان کے بعد حضرت جعفرؓ نے علم ہاتھ میں لیا۔ گھوڑے سے اتر کر پہلے خود اپنے گھوڑے کے پاؤں پر تلوار ماری کہ اس کی کونچیں کٹ گئیں۔ پھر اس بے جگری سے لڑے کہ تلواروں سے چور ہو کر گر پڑے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ میں نے ان کی لاش دیکھی تھی، تلواروں اور برچھیوں[3] کے ۹۰ زخم تھے، لیکن سب کے سب سامنے کی جانب تھے۔ پشت نے یہ داغ نہیں اٹھایا تھا۔ حضرت جعفرؓ کے بعد عبداللہؓ بن رواحہ نے علم ہاتھ میں لیا اور وہ بھی داد شجاعت دے کر شہید ہوئے۔ اب حضرت خالدؓ سردار بنے اور نہایت بہادری سے لڑے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ آٹھ تلواریں ان کے ہاتھ سے ٹوٹ ٹوٹ کر گریں[4]۔ لیکن ایک لاکھ سے تین ہزار

---

(۱) ابن ہشام غزوۂ موتہ ص (۲) صحیح بخاری (۳) صحیح بخاری غزوۂ موتہ ص

کا کیا مقابلہ تھا، بڑی کامیابی یہی تھی کہ فوجوں کو دشمن کی زد سے بچالاتے۔
جب یہ شکست[لہ] خوردہ فوج مدینہ کے قریب پہنچی اور اہلِ شہر ان کی مشایعت کو نکلے تو لوگ غمخواری کے بجائے ان کے چہروں پر خاک پھینکتے تھے کہ او فراریو! تم خدا کی راہ سے بھاگ آئے۔

لہ مصنف نے یہاں ابن اسحاق کی روایت پر اعتماد کر کے اس فوج کو شکست خوردہ لکھا ہے، اور ان کی واپسی پر اُن سب کو بلا امتیاز فراری ہونے کا مستحق ظاہر کیا ہے لیکن جیسا کہ صحیح بخاری غزوہ موتہ میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم نے از روئے وحی فرمایا کہ پھر اللہ کی ایک تلوار یعنی خالد سیف اللہ نے مسلمانوں کے علم کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں کو اپنے دشمن پر غلبہ دیا (فتح اللہ علیھم) ارباب سیر اور اہلِ روایت اور شراحِ حدیث اس غلبہ یا فتح کی تشریح میں مختلف ہیں۔ ایک فریق کا بیان ہے کہ مسلمانوں کو پوری فتح حاصل ہوئی۔ دوسرے کا خیال ہے کہ مسلمانوں کا غلبہ اور فتح یہ ہے کہ مسلمان اس قلتِ تعداد اور کفار اپنی کثرت کے باوجود تھک کر غیر منفصل جنگ کی صورت میں ایک دوسرے کے مقابلے سے ہٹ آئے۔ تیسرا فریق یہ ظاہر کرتا ہے کہ مسلمانوں کو فتح کفار کے ایک خاص دستہ کے مقابلے میں حاصل ہوئی اور اس سے مالِ غنیمت بھی حاصل کیا۔ چوتھا بیان یہ ہے کہ مسلمانوں کا غلبہ یہ ہے کہ حضرت خالدؓ کی قیادت میں اتنے بڑے لشکر کے حملوں کو روک دیا۔ اور بسلامت پیچھے ہٹ آئے۔ اس مقام پر فتح الباری، روض الانف سہیلی اور البدایہ ابن کثیر ملاحظہ کرنا چاہیے۔ اسی طرح مسلمانوں کی جس فوج کو اپنے اوپر فراری ہونے کا گمان تھا یا مسلمانوں نے ان کو فراری کہا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے ان کو تسلّی دی کہ نہیں تم فراری نہیں، بلکہ پھر دوبارہ حملہ کرنے کی نیت سے پیچھے ہٹ آنے والے ہو۔ اس کی مخاطب پوری اسلامی فوج نہیں بلکہ ان کی فوج کا ایک خاص دستہ تھا جو جلدی کر کے پہلے مدینہ چلا آیا تھا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے فتح الباری و روض الانف سہیلی و البدایہ ابن کثیر باب غزوۂ موتہ) "س"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کا سخت صدمہ ہوا حضرت جعفرؓ سے آپؐ کو خاص محبت تھی۔ ان کی شہادت کا نہایت قلق تھا۔ آپؐ مسجد میں جا کر غمزدہ بیٹھے۔ اسی حالت میں ایک شخص نے آکر کہا کہ جعفرؓ کی مستورات رو رہی ہیں اور ماتم کر رہی ہیں۔ آپؐ نے منع کرا بھیجا۔ وہ گئے اور واپس آکر کہا کہ میں نے منع کیا لیکن وہ باز نہیں آتیں۔ آپؐ نے دوبارہ بھیجا، وہ پھر گئے اور واپس آکر عرض کی کہ ہم لوگوں کی نہیں چلتی۔ آپؐ نے فرمایا کہ "تو اُن کے مُنہ میں خاک بھر دو۔" یہ واقعہ حضرت عائشہؓ سے صحیح بخاری میں منقول ہے۔ صحیح بخاری میں یہ بھی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے اس شخص سے کہا کہ خدا کی قسم! تم یہ نہ کرو گے (مُنہ میں خاک ڈالنا) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف سے نجات نہ ملے گی +

فتحِ مکّہ

رمضان ۸ھ مطابق جنوری ۶۳۰ء

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا

جانشینِ ابراہیم (علیہما الصلوٰۃ والسلام) کا سب سے مقدم فرض، توحیدِ خالص کا احیار اور حرمِ کعبہ کا آلائش سے پاک کرنا تھا لیکن قریش کے پے درپے حملوں اور عرب کی مخالفتِ عام نے پورے اکیس برس تک اس فرض کو روک رکھا۔ صلحِ حدیبیہ کی بدولت اتنا ہوا کہ چند روز کے لیے امن و امان قائم ہوگیا اور دلدادگانِ حرم ایک دفعہ یادگارِ ابراہیمی کو غلط انداز نظر سے دیکھ آئے۔ لیکن معاہدہ حدیبیہ بھی قریش سے نہ نبھ سکا، حلم وعفو وتحمل کی حد ہو چکی۔ اب وقت آگیا کہ آفتابِ حق حجابہائے حائل کو چاک کرکے باہر نکل آئے۔

صلحِ حدیبیہ کی بنا پر قبائلِ عرب میں خزاعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف ہوگئے تھے، اور ان کے حریف بنوبکر نے قریش سے محالفت کا معاہدہ کرلیا تھا۔ ان دونوں حریفوں میں مدت سے لڑائیاں چلی آتی تھیں، اسلام کے ظہور نے عرب کو ادھر متوجہ کیا تو وہ لڑائیاں رُک گئیں، اور اب تک رُکی رہیں۔ کیونکہ قریش اور عرب کا سارا زور اسلام کے مقابلے

میں صرف ہو رہا تھا۔ صلح حدیبیہ نے لوگوں کو مطمئن کیا تو بنوبکر سمجھے کہ اب انتقام کا وقت آگیا۔ دفعۃً وہ خزاعہ پر حملہ آور ہوے اور رؤسائے قریش نے علانیہ اُن کو مدد دی۔ عکرمہ بن ابی جہل، صفوان بن اُمیہ، سہیل بن عمرو وغیرہ نے راتوں کو صورتیں[1] بدل کر بنوبکر کے ساتھ تلواریں چلائیں۔ خزاعہ نے مجبور ہو کر حرم میں پناہ لی۔ بنوبکر رُک گئے کہ حرم کا احترام ضرور ہے۔ لیکن اُن کے رئیسِ اعظم نوفل نے کہا یہ موقع پھر کبھی ہاتھ نہیں آسکتا۔ غرض عین حدودِ حرم میں خزاعہ کا خون بہایا گیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے کہ دفعۃً یہ صدا بلند ہوئی:

لاھُمَّ اِنّی ناشدٌ محمدا	اے خدا میں محمدؐ کو وہ وعدہ یاد دلاؤں گا
حِلفَ ابینا وابیہ الاتلدا	جو ہمارے اور ان کے قدیم خاندان میں ہوا ہے
فانصر رسول اللہ نصرًا عتدًا	اے پیغمبرِ خدا! ہماری اعانت کر اور خدا کے بندوں
وادعُ عبادَ اللہ یاتوا مددًا	کو بلا، سب اعانت کے لیے حاضر ہونگے۔

معلوم ہوا کہ خزاعہ کے چالیس[2] ناقہ سوار جن کا پیشرو عمرو بن سالم ہے، فریاد لے کر آئے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعات سُنے تو آپؐ کو سخت رنج ہوا۔ تاہم آپؐ نے قریش کے پاس قاصد بھیجا اور تین شرطیں پیش کیں کہ ان میں سے کوئی منظور کی جائے:

(۱) مقتولوں کا خونبہا دیا جائے،

---

[1] طبری ص ۱۶۲۰ (ج ۳) (ابن سعد جزء مغازی صفحہ ۹۷ میں کچھ اور نام بھی ہیں۔ "س"

[2] طبقات ابن سعد جزء مغازی ص ۹۷) "س"

(۲) قریش، بنو بکر کی حمایت سے الگ ہو جائیں،

(۳) اعلان کر دیا جائے کہ حدیبیہ کا معاہدہ ٹوٹ گیا،

قرطہ بن عمر نے قریش کی زبان سے کہا کہ "صرف تیسری شرط منظور ہے"[۱] لیکن قاصد کے چلے جانے کے بعد قریش کو ندامت ہوئی۔ انھوں نے ابوسفیان کو سفیر بنا کر بھیجا کہ حدیبیہ کے معاہدے کی تجدید کرا لائیں۔ ابوسفیان نے مدینہ آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں درخواست کی، بارگاہ رسالت سے کچھ جواب نہ ملا۔ ابوسفیان نے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کو بیچ میں ڈالنا چاہا، لیکن سب نے کانوں پر ہاتھ رکھا۔ ہر طرف سے مجبور ہو کر جناب فاطمہؓ زہرا کے پاس آیا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ پانچ برس کے بچے تھے، ابوسفیان نے ان کی طرف اشارہ کر کے کہا، "اگر یہ بچہ اتنا زبان سے کہہ دے، کہ میں نے دونوں فریقوں میں بیچ بچاؤ کرا دیا، تو آج سے عرب کا سردار پکارا جائے گا۔" جناب سیدہ نے فرمایا، "بچوں کو ان معاملات میں کیا دخل"؟ بالآخر ابوسفیان نے حضرت علیؓ کے ایما سے مسجد نبویؐ میں جا کر اعلان کر دیا کہ "میں نے معاہدۂ حدیبیہ کی تجدید کر دی"[۲]۔

ابوسفیان نے مکہ میں جا کر لوگوں سے یہ واقعہ بیان کیا تو سب نے کہا یہ نہ صلح ہے کہ ہم اطمینان سے بیٹھ جائیں، نہ جنگ ہے کہ لڑائی کا سامان کیا جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کی تیاریاں کیں، اتحادی قبائل کے پاس

---

[۱] زرقانی (ج ۲ ص ۳۳۶) نے یہ واقعہ مغازی ابن عائذ سے نقل کیا ہے تعجب ہے کہ اور مورخین اور ارباب سیر ایسے ضروری واقعہ کو قلم انداز کر گئے۔ [۲] زرقانی علی المواہب ج ۲ صفحہ ۳۴۰)۔

قاصد بھیجے کہ تیار ہو کر آئیں۔ احتیاط کی گئی کہ اہل مکہ کو خبر نہ ہونے پائے۔

حضرت حاطب رضی بن ابی بلتعہ ایک معزز صحابی تھے۔ انھوں نے قریش کو مخفی خط لکھ بھیجا۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع ہو گئی۔ حضرت علی رضی اور حضرت زبیر رضی، حضرت مقداد رضی اور حضرت ابو مرثد رضی غنوی) کو بھیجا کہ قاصد سے خط چھین لائیں۔ خط آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا، تو تمام لوگوں کو حاطب کے افشائے راز پر حیرت ہوئی۔ حضرت عمر رضی بے تاب ہو گئے اور عرض کی کہ "حکم ہو تو ان کی گردن اڑادوں"؟ لیکن جبین رحمت پر شکن نہ تھی۔ ارشاد ہوا، عمر! تم کو کیا معلوم ہے کہ خدا نے اہلِ بدر کو مخاطب کر کے کہہ دیا ہو کہ تم سے مواخذہ نہیں ہے۔

حضرت حاطب رضی کے عزیز و اقارب اب تک مکہ میں تھے اور ان کا کوئی حامی نہ تھا، اس لیے انھوں نے قریش پر احسان رکھنا چاہا کہ اس کے صلے میں اُن کے عزیزوں کو ضرر نہ پہنچائیں گے۔ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہی عذر پیش کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمایا۔[1]

غرض ۱۰ رمضان ۸ھ کو کوکبۂ نبوی نہایت عظمت و شان سے مکہ معظمہ کی طرف بڑھا۔ دس ہزار آراستہ فوجیں رکاب میں تھیں۔ قبائلِ عرب راہ میں آکر ملتے جاتے تھے۔ مرّ الظہران پہنچ کر لشکر نے پڑاؤ ڈالا اور فوجیں دُور دُور تک پھیل گئیں۔ یہ مقام مکہ معظمہ سے ایک منزل یا اس سے بھی کم فاصلے پر ہے۔

---

(1) زرقانی علی المواہب ج ۲ صفحہ ۳۳۹) "س"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے تمام فوج نے الگ الگ آگ روشن کی جس سے تمام صحرا وادیِ ایمن بن گیا۔ فوج کی آمد کی بھنک قریش کے کانوں میں پڑ چکی تھی، تحقیق کے لیے انھوں نے حکیم بن حزام (حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے) ابوسفیان اور بدیل بن ورقا کو بھیجا۔ خیمۂ نبوی کی دربانی پر جو دستہ متعین تھا اُس نے ابوسفیان کو دیکھ لیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جذبۂ انتقام کو ضبط نہ کر سکے، تیز قدمی سے آگے بڑھے اور بارگاہِ رسالت میں آ کر عرض کی کہ کفر کے استیصال کا وقت آ گیا لیکن حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے جان بخشی کی درخواست کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دوبارہ عرض کیا، حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا "عمر! اگر یہ تمھارے قبیلے کا آدمی ہوتا تو تم اس قدر سخت دلی نہ کرتے"۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا آپ یہ نہ فرمائیں، آپ جس دن اسلام لائے تھے مجھ کو جو مسرت ہوئی تھی، خود میرا باپ خطاب اسلام لاتا تو مجھ کو اس قدر خوشی نہ ہوتی[۱]۔

ابوسُفیان کے تمام پچھلے کارنامے اب سب کے سامنے تھے اور ایک ایک چیز اُس کے قتل کی دعویدار تھی، اسلام کی عداوت، مدینہ پر بار بار حملہ، قبائلِ عرب کا اشتعال، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خفیہ قتل کرانے کی سازش، ان میں سے ہر چیز اُس کے خون کی قیمت ہو سکتی تھی۔ لیکن ان سب سے بالاتر ایک اور چیز (عفوِ نبوی) تھی، اس نے ابوسفیان کے کان میں آہستہ سے کہا کہ

۱؎ اصل واقعہ صحیح بخاری میں کافی تفصیل کے ساتھ موجود ہے لیکن مزید تفصیل اور جزئیات حافظ ابن حجر نے بخاری کی شرح میں موسیٰ بن عقبہ اور ابن عائذ وغیرہ سے نقل کیے ہیں مَیں نے ان کو بھی لے لیا ہے۔ بعض واقعات طبری سے ماخوذ ہیں۔

(۲؎ طبری ج ۳ ص ۱۶۳۲) "س"

"خوف کا مقام نہیں"

صحیح بخاری میں ہے کہ گرفتار ہونے کے ساتھ ابوسفیان نے اسلام قبول کر لیا۔ لیکن طبری وغیرہ میں اس اجمال کی تفصیل میں حسب ذیل مکالمہ لکھا ہے:

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) : کیوں ابوسفیان کیا اب بھی تم کو یقین نہیں آیا کہ خدا کے سوا اور کوئی معبود نہیں؟

ابوسفیان : کوئی اور خدا ہوتا تو آج ہمارے کام آتا۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) : کیا اس میں کچھ شک ہے کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں؟

ابوسفیان : اس میں تو ذرا شبہہ ہے۔

بہرحال ابوسفیان نے اسلام کا اظہار کیا اور اس وقت گو ان کا ایمان متزلزل تھا، لیکن مورخین لکھتے ہیں کہ بالآخر وہ سچے مسلمان بن گئے چنانچہ غزوۂ طائف میں ان کی ایک آنکھ زخمی ہوئی، اور یرموک میں وہ بھی جاتی رہی۔

لشکر اسلام جب مکہ کی طرف بڑھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس سے ارشاد فرمایا کہ ابوسفیان کو پہاڑ کی چوٹی پر لے جا کر کھڑا کر دو کہ افواج الٰہی کا جلال آنکھوں سے دیکھیں۔ کچھ دیر کے بعد دریائے اسلام میں تلاطم شروع ہوا، قبائل عرب کی موجیں جوش مارتی ہوئی بڑھیں۔ سب سے پہلے غفار کا پرچم نظر آیا، پھر جُہینہ، (سعد بن) ہُذیم، سُلیم، ہتھیاروں میں

ڈبلے ہوئے تکبیر کے نعرے مارتے ہوئے نکل گئے۔ ابوسفیان ہر دفعہ مرعوب ہو ہو جاتے تھے۔ سب کے بعد انصار کا قبیلہ اس سر و سامان سے آیا کہ آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ ابوسفیان نے متحیر ہو کر پوچھا، یہ کون لشکر ہے؟ حضرت عباس رضؓ نے نام بتایا۔ دفعتہً سردار فوج حضرت سعد بن عبادہ رضؓ ہاتھ میں علَم لیے ہوئے برابر سے گزرے اور ابوسفیان کو دیکھ کر پکار اٹھے:

الیوم یوم الملحمہ الیوم تُستحل الکعبۃ۔ آج گھمسان کا دن ہے۔ آج کعبہ حلال کر دیا جائے گا۔

سب سے اخیر کوکبۂ نبوی نمایاں ہوا۔ جس کے پرتو سے سطح خاک پر نور کا فرش بچھتا جاتا تھا۔ حضرت زبیر رضؓ بن العوام علمبردار تھے۔ ابوسفیان کی نظر جمالِ مبارک پر پڑی تو پکار اٹھے کہ "حضورؐ نے سنا؟ عبادہ کیا کہتے ہوئے گئے؟" ارشاد ہوا کہ "عبادہ نے غلط کہا، آج کعبہ کی عظمت کا دن ہے!" یہ کہہ کر حکم دیا کہ فوج کا علَم عبادہ سے لے کر ان کے بیٹے کو دے دیا جائے[1]۔

مکہ پہنچ کر آپؐ نے حکم دیا کہ علم نبوی مقام حجون پر نصب کیا جائے۔ حضرت خالد رضؓ کو حکم ہوا کہ فوجوں کے ساتھ بالائی حصہ کی طرف آئیں[2]۔ اعلان کر دیا گیا کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے گا، یا ابوسفیان کے ہاں پناہ

---

[1] یہ خاص صحیح بخاری کی روایت ہے [2] مصنف نے یہاں حضرت عروہ رضؓ کی روایت لی ہے جو گو صحیح بخاری میں ہے مگر مرسل ہے۔ صحیح و مرفوع روایات جو صحیح بخاری میں ہیں ان کے مطابق صورت حال یہ ہے کہ حضرت خالد رضؓ مکہ کے زیریں حصہ سے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بالائی حصہ سے مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔ فتح الباری ج ۸ صفحہ ۸ "س"

دے گا، یا دروازہ بند کرلے گا (یا خانہ کعبہ میں داخل ہوجائے گا) اس کو امن دیا جائے گا۔ تاہم قریش کے ایک گروہ نے مقابلے کا قصد کیا، اور خالدؓ کی فوج پر تیر برسلئے۔ چنانچہ تین صاحب (یعنی حضرت کُرز بن جابر فہری اور حضرت حبیش بن اشعر اور حضرت سلمہؓ بن المیلاء) نے شہادت پائی۔[۱] حضرت خالدؓ نے مجبور ہو کر حملہ کیا۔ یہ لوگ ۱۳ لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تلواروں کا چمکنا دیکھا تو حضرت خالدؓ سے باز پرس کی۔ لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ ابتدا مخالفین نے کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "قضائے الٰہی یہی تھی"۔

لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ حضورؐ قیام کہاں فرمائیں گے؟ کیا اپنے قدیم مکان میں؟ شریعت میں مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوسکتا۔ ابو طالب (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عم) نے جب انتقال کیا تھا تو اُن کے صاحبزادے عقیل اُس وقت کافر تھے، اس لیے وہی وارث ہوئے۔ اُنھوں نے یہ مکانات ابوسفیان کے ہاتھ بیچ ڈالے تھے۔ اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "عقیل نے گھر کہاں چھوڑا کہ اس میں اُتروں۔[۲] اس لیے مقام خیف میں ٹھہروں گا" (جہاں قریش نے

[۱] ان کی شہادت کا ذکر صحیح بخاری میں بھی ہے [۲] صحیح بخاری فتح مکہ میں حضرت اسامہؓ بن زید سے روایت ہے اس میں تصریح ہے کہ حضورؐ نے یہ ارشاد فتح مکہ کے موقع پر کیا لیکن اس میں خیف کے قیام کا ذکر نہیں لیکن جو روایت ابوہریرہؓ سے ہے اس میں یہ تصریح ہے کہ یہ حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد فرمایا اور اس میں خیف کی تصریح ہے۔ ابن حجر نے یہ تطبیق کی ہے کہ ممکن ہے کہ دونوں موقعوں پر لوگوں کے سوال پر یہ ارشاد فرمایا ہو۔ فتح الباری جلد ۸ صفحہ ۱۳ و جلد ۲ صفحہ ۳۶۰) "س"

(ہمارے خلاف کُفر کی تائید پر باہم عہد و پیمان کیا تھا) ۔

خُدا کی شان، حرمِ محترم، جو خلیلِ بُت شکن کی یادگار تھا، اُس کے آغوش میں ۳۶۰ بُت جاگزیں تھے۔ آنحضرت صَلّی اللہ علیہ وَسَلّم ایک ایک کو لکڑی کی نوک سے ٹھوکے دیتے جاتے اور یہ پڑھتے جاتے تھے :۔

جَاءَ الحَقُّ وَ زَهَقَ البَاطِلُ (جَاءَ الحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ البَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ) اِنَّ البَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا[1]

حق آگیا اور باطل مٹ گیا، اور باطل مٹنے ہی کی چیز تھی۔

عین کعبہ کے اندر بہت سے بُت تھے، جن کو قریش خُدا مانتے تھے۔ آنحضرت صَلّی اللہ علیہ وَسَلّم نے کعبہ میں داخل ہونے سے پہلے حکم دیا کہ سب نکلوا دیے جائیں۔ حضرت عمرؓ نے اندر جا کر جس قدر تصویریں تھیں وہ بھی مٹا دیں۔ حرم ان آلائشوں سے پاک ہو چکا تو آپؐ نے عثمان بن طلحہ سے جو کعبہ کے کلید بردار تھے، کنجی طلب کی اور دروازہ کھلوایا۔ آپؐ حضرت بلالؓ اور طلحہ رضؓ کے ساتھ اندر داخل ہوئے اور نماز ادا کی۔ بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے کعبہ کے اندر تکبیریں کہیں لیکن نماز نہیں ادا کی ۔

خطبۂ فتح شاہنشاہیِ اسلام[2] پہلا دربارِ عام تھا خطبۂ سلطنت یعنی

---

(۱) اس موقع پر اس پوری آیت پاک کے پڑھنے کا ذکر ابن سعد فتح مکہ میں ہے۔ صحیح بخاری فتح مکہ میں الفاظ آئے ہیں جَاءَ الحَقُّ وَ زَهَقَ البَاطِلُ وَمَا يُبْدِئُ البَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ یعنی حق آگیا اور باطل مٹ گیا اور اب باطل پھر نہ آئے گا)۔ "س" (۲) صحیح بخاری فتح مکہ۔

بارگاہ احدیت کی تقریر خلافتِ الٰہی کے منصب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادا کی جس کا خطاب صرف [illegible] سے نہیں بلکہ تمام عالم سے تھا:

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا	ایک خدا کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے
شَرِیْکَ لَہٗ صدق وعدہٗ	اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اس نے
ونصر عبدہٗ ھزم الاحزاب	اپنا وعدہ سچا کیا، اس نے اپنے بندے
وحدہٗ الاکل مَاثرۃٍ او	کی مدد کی اور تمام جتھوں کو تنہا توڑ دیا۔
دمٍ اومالٍ یُدعٰی فھو	ہاں تمام مفاخر، تمام انتقامات، خونہائے
تحت قدمی ھاتین الّا	قدیم، تمام خونبہا، سب میرے قدموں
سِدانۃ البیت وسِقایۃ	کے نیچے ہیں، صرف حرم کعبہ کی تولیت اور
الحجّاج	حجاج کی آب رسانی اس سے مستثنیٰ ہیں۔
یَا مَعْشَرَ قریش اِنَّ اللّٰہ قد	اے قوم قریش! اب جاہلیت کا
اَذْھَبَ عنکم نخوۃ الجاھلیۃ	غرور اور نسب کا افتخار خدا نے مٹا دیا
وتعظمھا بِالْاٰبَاءِ، النَّاسُ	تمام لوگ آدم کی نسل سے ہیں، اور
من اٰدَمَ واٰدم من تُرابٍ	آدم مٹی سے بنے ہیں +

پھر قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ	لوگو! میں نے تم کو مرد اور عورت سے پیدا کیا
مِّنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وجَعَلْنٰکُمْ	اور تمہارے قبیلے اور خاندان بنائے کہ
شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا	آپس میں ایک دوسرے سے پہچان
اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (حجرات)	لیے جاؤ۔ لیکن خدا کے نزدیک شریف وہ ہے
اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ (ابن ہشام مختصراً)	جو زیادہ پرہیزگار ہو، خدا دانا اور واقف کار ہے۔
ان اللّٰہ وَرَسُوْلَہٗ حَرَّمَ بَیْعَ الْخَمْرِ (بخاری)	خدا نے شراب کی خرید و فروخت حرام کر دی۔

تمام عقائد اور اعمال کا اصل الاصول اور دعوتِ اسلام کا اصلی پیغام توحید ہے، اس لیے سب سے پہلے اسی سے ابتدا کی گئی +

خطبہ کے اصولی مطالب

عرب میں دستور تھا۔ کوئی شخص کسی کو قتل کر دیتا تھا تو اُس کے خون کا انتقام لینا خاندانی فرض قرار پا جاتا تھا۔ یعنی اگر اُس وقت قاتل ہاتھ آسکا تو خاندانی دفتر میں مقتول کا نام لکھ جاتا اور سیکڑوں برس گزرنے کے بعد بھی انتقام کا فرض ادا کیا جاتا تھا۔ قاتل اگر مر چکا ہے تو اس کے خاندان یا قبیلے کے آدمی کو قتل کرتے تھے۔ اسی طرح خونبہا کا مطالبہ بھی ابا عن جدٍّ چلا آتا تھا۔ یہ خون کا انتقام عرب میں سب سے بڑے فخر کی بات تھی۔ اس طرح اور بہت سی لغو باتیں مفاخر قومی میں داخل ہو گئی تھیں۔ اسلام ان سب کے مٹانے کے لیے آیا تھا، اور اس بنا پر آپؐ نے (اس طریق) انتقام اور خونبہا اور نیز اور تمام غلط مفاخر کی نسبت فرمایا کہ "میں نے ان کو پاؤں تلے کچل دیا" +

عرب اور تمام دنیا میں نسل اور قوم و خاندان کے امتیاز کی بنا پر ہر قوم میں فرقِ مراتب قائم کیے گئے تھے۔ جس طرح ہندوؤں نے چار ذاتیں قائم کیں، اور شودر کو وہ درجہ دیا جو جانوروں کا درجہ ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ بندش کر دی کہ وہ کبھی اپنے رتبہ سے ایک ذرہ آگے نہ بڑھنے پائے +

اسلام کا سب سے بڑا احسان جو اس نے تمام دنیا پر کیا، مساواتِ عام کا قائم کرنا تھا۔ یعنی عرب و عجم، شریف و رذیل، شاہ و گدا، سب برابر ہیں۔ ہر شخص ترقی کر کے ہر انتہائی درجے پر پہنچ سکتا ہے۔ اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی آیت پڑھی اور پھر توضیح فرمائی کہ "تم سب

اولادِ آدم ہو، اور آدم مٹی سے بنے تھے"۔

خطبہ کے بعد آپؐ نے مجمع کی طرف دیکھا تو جبارانِ قریش سامنے تھے۔ ان میں وہ حوصلہ مند بھی تھے جو اسلام کے مٹانے میں سب سے پیش رو تھے۔ وہ بھی تھے جن کی زبانیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر گالیوں کے بادل برسایا کرتی تھیں، وہ بھی تھے جن کی تیغ و سناں نے پیکرِ قدسی صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے میں کانٹے بچھائے تھے، وہ بھی تھے جو وعظ کے وقت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایڑیوں کو لہو لہان کر دیا کرتے تھے۔ وہ بھی تھے جن کے حملوں کا سیلاب مدینہ کی دیواروں سے آ آ کر ٹکراتا تھا، وہ بھی تھے جو مسلمانوں کو جلتی ہوئی ریگ پر لٹا کر ان کے سینوں پر آتشیں مہریں لگایا کرتے تھے۔

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف دیکھا اور خوف انگیز لہجہ میں پوچھا "تم کو کچھ معلوم ہے؟ میں تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں"؟

یہ لوگ اگرچہ ظالم تھے، شقی تھے، بے رحم تھے لیکن مزاج شناس تھے۔ پکار اُٹھے کہ:

أَخٌ كَرِيمٌ وَابْنُ أَخٍ كَرِيمٍ — تو شریف بھائی ہے اور شریف برادر زادہ ہے۔

ارشاد ہوا:

لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ اِذْهَبُوْا فَانتم الطلقاء۔ — تم پر کچھ الزام نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔

کفارِ مکہ نے تمام مہاجرین کے مکانات پر قبضہ کر لیا تھا۔ اب وہ وقت تھا کہ ان کو ان کے حقوق دلائے جاتے۔ لیکن آپؐ نے مہاجرین کو حکم دیا کہ وہ بھی اپنی مملوکات سے دستبردار ہو جائیں۔

نماز کا وقت آیا تو حضرت بلال رضؓ نے بامِ کعبہ پر چڑھ کر اذان دی۔ وہی سرکش جو ابھی رام ہو چکے تھے، اُن کی آتشِ غیرت پھر مشتعل تھی۔ عتاب بن اسید نے کہا "خدا نے میرے باپ کی عزت رکھ لی کہ اس آواز کے سُننے سے پہلے اس کو دُنیا سے اُٹھا لیا"۔[ل] ایک اور سردارِ قریش نے کہا "اب جینا بیکار ہے"[ع]

مقامِ صفا میں آپؐ ایک بلند مقام پر بیٹھے، جو لوگ اسلام قبول کرنے آتے تھے آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کرتے تھے، مردوں کی باری ہو چکی تو مستورات آئیں۔ عورتوں سے بیعت لینے کا یہ طریقہ تھا کہ ان سے ارکانِ اسلام اور محاسنِ اخلاق کا اقرار لیا جاتا تھا۔ پھر پانی کے ایک لبریز پیالہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دستِ مبارک ڈبو کر نکال[ع] لیتے تھے۔ آپؐ کے بعد عورتیں اسی پیالہ میں ہاتھ ڈالتی تھیں اور بیعت کا معاہدہ پختہ ہو جاتا تھا۔

ان مستورات میں ہند بھی آئی۔ یہ وہی ہند ہے جو رئیس العرب عتبہ کی بیٹی اور امیر معاویہؓ کی ماں تھی حضرت حمزہؓ کو اسی نے قتل کرایا تھا اور ان کا سینہ چاک کر کے کلیجہ چبا گئی تھی، وہ نقاب پہن کر آئی شریف عورتیں عموماً نقاب پہنتی تھیں لیکن اس وقت یہ غرض بھی تھی کہ کوئی اس کو پہچاننے نہ پائے بیعت کے وقت اس نے نہایت دلیری بلکہ گستاخی سے باتیں کیں جو حسبِ ذیل ہیں[ع]:

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)	:	خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا۔
ہند	:	یہ اقرار آپ نے مردوں سے تو نہیں لیا لیکن بہرحال ہم کو منظور ہے۔

ل ابن ہشام (حضرت عتاب رضؓ بعد کو مسلمان ہوئے) "س" ع اصابہ تذکرہ عتاب بن اسید (ج ۲ ص ۴۵۱) "س" ع طبری ج ۲ ص ۱۶۴۴ "س" ع طبری ج ۲ صفحہ ۳۴ مختصراً۔ "س"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : چوری نہ کرنا۔

ہند : مَیں نے اپنے شوہر (ابوسفیان) کے مال میں سے دو چار آنے کبھی لے لیا کرتی ہوں، معلوم نہیں یہ بھی جائز ہے یا نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : اولاد کو قتل نہ کرنا۔

ہند : ربّیناھم صغاراً و قتلتھم کبارا فانت وھم اعلم۔ ہم نے تو اپنے بچوں کو پالا تھا، بڑے ہوئے تو جنگِ بدر[1] میں آپ نے اُن کو مار ڈالا۔ اب آپؐ اور وہ باہم سمجھ لیں۔

رؤسائے عرب میں دس شخص تھے جو قریش کے سرتاج تھے۔ ان میں صفوان بن اُمیہ جدہ بھاگ گئے۔ عمیر بن وہب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کی کہ رئیسِ عرب مکّہ سے جلاوطن ہُوا جاتا ہے۔ آپؐ نے علامتِ امان کے طور پر اپنا عمامہ عنایت کیا۔ عمیر جدّہ پہنچ کر ان کو واپس لائے۔ حنین کے معرکے تک یہ اسلام نہیں لائے[2] بعد کو مسلمان ہو گئے۔

عبداللہ بن زبعری عرب کے مشہور شاعر جو (پہلے) آنحضرت صلی اللہ

---

[1] جنگِ بدر میں ہند کے لڑکے کافروں کے ساتھ شریک ہو کر لڑے تھے اور لڑ کر مارے گئے تھے [2] طبری (ج ۳ ص ۵ ۱۶۴۴) "س" و اصابہ ذکر صفوان ابن امیہ (ج ۲ ص ۱۸۷) "س"

علیہ وسلم کی ہجو میں کہا کرتے تھے، اور قرآن مجید پر نکتہ چینیاں کرتے تھے، نجران بھاگ گئے، لیکن پھر آکر اسلام لائے[1]

ابو جہل کے بیٹے عکرمہ یمن چلے گئے۔ لیکن ان کی حرم (ام حکیم) نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے امان لی، اور جا کر یمن سے لائیں[2]۔ یہ واقعہ ابو جہل سے کہنے کے قابل نہیں کہ اس کا جگر بند کفر کی گود سے نکل کر اسلام کے آغوش میں آگیا، اور اب ہم اس کو حضرت عکرمہ رضی کہتے ہیں۔

اشتہاریانِ قتل ارباب سیر کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گو اہلِ مکہ کو امن عطا کیا تھا، تاہم دس شخصوں[3] کی نسبت حکم دیا کہ جہاں ملیں قتل

---

[1] ابن ہشام ("س") [2] طبری ج ۳ صفحہ ۱۶۴۲ ("س") [3] حافظ مغلطائی نے پندرہ نام مختلف حوالوں سے جمع کیے ہیں، جو خود محدثین کے نزدیک غیر محتاط ہیں۔ عام اربابِ سیرت نے دس شخصوں کے نام لیے ہیں۔ ابن اسحاق نے آٹھ نام گنائے ہیں۔ ابو داؤد اور دار قطنی کی روایت میں صرف چھ ہیں۔ بخاری میں صرف ابن خطل کا واقعہ مذکور ہے۔ اس سے ظاہر ہوگا کہ تحقیق کا دائرہ جس قدر وسیع ہوتا جاتا ہے، اسی قدر تعداد کم ہوتی جاتی ہے۔

عام روایت کی رو سے جن دس شخصوں کی سزائے موت کا اعلان کیا گیا تھا، ان کا حال یہ ہے کہ وہ شدید مجرم تھے۔ تاہم سات اشخاص خلوص سے ایمان لائے اور ان کو معافی دے دی گئی۔ صرف چار شخص قتل ہوئے۔ تین مرد اور ایک عورت، عبد اللہ بن خطل، مقیس بن صبابہ، حویرث بن نقید اور ابن خطل کی لونڈی قریبہ، ابن خطل اور ابن صبابہ دونوں خونی مجرم تھے۔ ابن خطل نے جو اسلام لا چکا تھا، اپنے ایک مسلمان خادم کو قتل کر کے مرتد ہو گیا تھا۔ مقیس بن صبابہ کا واقعہ یہ ہے کہ اس کا ایک بھائی ایک انصاری کے

کر دیے جائیں۔ ان میں سے بعض مثلاً عبداللہ ابن خطل، مقیس بن صبابہ، خونی مجرم تھے اور قصاص میں قتل کیے گئے۔ لیکن متعدد ایسے تھے کہ اُن کا صرف یہ جُرم تھا کہ وہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کو مکّہ میں ستایا کرتے تھے، یا آپؐ کی ہجو میں اشعار کہا کرتے تھے، ان میں سے ایک عورت اس جُرم پر قتل کی گئی کہ وہ آپؐ کے ہجو یہ اشعار گایا کرتی تھی۔

لیکن محدثانہ تنقید کی رُو سے یہ بیان صحیح نہیں۔ اس جُرم کا مجرم تو سارا مکّہ تھا۔ کفارِ قریش میں سے (بجز دو چار کے) کون تھا جس نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کو سخت سے سخت ایذائیں نہیں دیں؟ با ایں ہمہ انہی لوگوں کو یہ مژدہ سنایا گیا کہ انتم الطلقاء، جن لوگوں کا قتل بیان کیا جاتا ہے وہ تو نسبتہً کم درجہ کے مجرم تھے۔ حضرت عائشہؓ صدیقہ کی یہ روایت صحاح ستّہ میں موجود ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے کسی سے ذاتی انتقام نہیں لیا۔ خیبر میں جب یہودی نے آپؐ کو زہر دیا، اس کی نسبت لوگوں نے دریافت بھی کیا کہ اس کے قتل کا حکم ہوگا۔ ارشاد ہُوا کہ نہیں۔ خیبر کے کفرستان میں ایک یہودیہ زہر دے کر رحمتِ عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے طفیل سے جانبر ہو سکتی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۳۸) ہاتھ سے غلطی سے مارا گیا تھا، آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس کی دیت ادا کر دی تھی۔ تاہم مقیس منافقانہ اسلام لایا اور غدر سے اس انصاری کو قتل کر دیا۔ اور حویرث نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی دو صاحبزادیوں کے ساتھ جب وہ ہجرت کر رہی تھیں شرارت کی تھی اور ان دونوں کو اُونٹوں سے گرا دینا چاہا تھا۔ حضرت علیؓ بن ابی طالب نے اس کو قتل کر دیا۔

قُریبہ جو ابن خطل کی لونڈی تھی، مکّہ کی ایک مغنّیہ تھی جو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ہجو میں گیت گایا کرتی تھی) (دیکھو زرقانی اور ابن ہشام ذکر فتح مکّہ)

ہے تو حرم میں اس سے کم درجہ کے مجرم عفو نبوی سے کیونکر محروم رہ سکتے ہیں۔ اگر درایت پر قناعت نہ کی جائے تو روایت کے لحاظ سے بھی یہ واقعہ بالکل ناقابلِ اعتبار رہ جاتا ہے۔ صحیح بخاری میں ابن خطل کا قتل مذکور ہے[۱]۔ اور یہ عموماً مسلم ہے کہ وہ قصاص میں قتل کیا گیا۔ مقیس کا قتل بھی شرعی قصاص تھا۔ باقی جن لوگوں کی نسبت حکمِ قتل کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ کسی زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ستایا کرتے تھے، وہ روایتیں صرف ابن اسحاق تک پہنچ کر ختم ہو جاتی ہیں۔ یعنی اصولِ حدیث کی رُو سے وہ روایت منقطع ہے جو قابلِ اعتبار نہیں۔ ابن اسحاق کا فی نفسہٖ جو درجہ ہے، وہ ہم کتاب کے دیباچے میں لکھ آئے ہیں۔

سب سے زیادہ معتبر روایت جو اس بارہ میں پیش کی جا سکتی ہے، وہ ابوداؤد کی روایت ہے[۲]، جس میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن فرمایا کہ چار شخصوں کو کہیں امن نہیں دیا جا سکتا ہے لیکن ابوداؤد نے اس حدیث کو نقل کر کے لکھا ہے کہ اس روایت کی سند جیسی چاہیے مجھ کو نہیں ملی[۳]۔ پھر اس کے بعد ابن خطل کی روایت نقل کی ہے اور شروع میں

(۱؎ بخاری فتح مکہ) "س" ۲؎ ابوداؤد باب قتل الاسیر ۳؎ ابوداؤد نے باب قتل الاسیر میں اس معنی کی تین روایتیں درج کی ہیں۔ پہلی وہ روایت ہے جس کا ذکر مصنف نے اخیر میں کیا ہے۔ یہ روایت احمد بن المفضل، اسباط بن نصر، سدی کبیر، مصعب بن سعد اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے ہے۔ اس میں چار مرد اور دو عورتوں کے قتل کا حکم مذکور ہے، جن میں سے ایک ابن ابی سرح ہے، جس کو حضرت عثمانؓ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا کے بغیر آپؐ کی خدمت میں لا کر پیش کیا، اور اس کو کچھ دیر کے تامل کے بعد پناہ

جو روایت ہے) اس کا ایک راوی احمد بن المفضل ہے جس کو ازدی نے منکر الحدیث لکھا ہے اور ایک راوی اسباط بن نصر ہے، جس کی نسبت نسائی کا قول ہے کہ "قوی نہیں ہے"۔ اگرچہ صرف اس قدر جرح کسی روایت کے نامعتبر ہونے کے لیے کافی نہیں لیکن واقعہ جس درجہ اہم ہے اس کے لحاظ سے راوی کی اس قدر جرح بھی روایت کے مشکوک ہونے کے لیے کافی ہے۔

(بقیہ حاشیہ ص۵۴۱) دی اور وہ مسلمان ہوا۔ اس روایت میں احمد بن مفضل اور اسباط بن نصر اور سدی کبیر تینوں پر علمائے رجال نے جرحیں کی ہیں، اور خصوصاً اسباط بن نصر پر اور زیادہ جرحیں کی ہیں۔ یہ روایت اسی سلسلہ سے نسائی نے باب قتل المرتدین اور حاکم نے مستدرک کتاب المغازی میں اس کو نقل کیا ہے۔ اس سلسلہ کے یہ تینوں راوی شیعہ ہیں اور حاکم نے مستدرک میں اس پہلو سے اپنا اظہار خیال کر دیا ہے۔ ابوداؤد کی دوسری روایت عمرو بن عثمان بن عبدالرحمان بن سعید مخزومی سے ہے کہ انھوں نے اپنے دادا سے اور انھوں نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چار مردوں اور دو عورتوں کے بارے میں فرمایا کہ ان کو پناہ نہیں دی جا سکتی۔ ان دو عورتوں میں سے جو دونوں مغنیہ لونڈیاں تھیں۔ ایک مسلمان ہوگئی، اور ایک قتل کی گئی۔ اس روایت کے متعلق ابوداؤد نے لکھا ہے کہ میں نے اپنے شیخ ابوالعلاء سے اس کی سند اچھی طرح سمجھی نہیں، یہی روایت اسی سلسلہ سے دارقطنی اواخر کتاب الحج میں ہے۔ اس میں سند کے آخر میں یوں ہے۔ عمرو بن عثمان نے اپنے باپ سے اور انھوں نے اپنے دادا سے یہ روایت سنی۔ اس سے ظاہر ہے کہ سند کے اسی حصہ میں ابوداؤد کو شک ہے۔ ابوداؤد کی تیسری روایت میں صرف ابن خطل کے قتل کا ذکر ہے جو صحیح بخاری وغیرہ کی روایت سے بھی ثابت ہے۔ بیہقی نے حکم بن عبدالملک، قتادہ اور حضرت انسؓ بن مالک سے ایک روایت ہے جس میں تین مرد اور ایک عورت

اس میں شبہہ نہیں کہ بعض سردارانِ قریش جو مخالفینِ اسلام کے پیشرو تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی خبر سُن کر مکہ سے بھاگ گئے۔ لیکن صرف یہ ابن اسحاق کا قیاس ہے کہ وہ اس وجہ سے بھاگے تھے کہ اُن کے قتل کا حکم دیا گیا تھا۔ ان اشتہاری مفرورین میں ابن اسحاق نے عکرمہ کو بھی شمار کیا ہے، جو ابوجہل کے فرزند تھے۔ لیکن موطائے امام مالک میں جس کی نسبت امام شافعی کا قول ہے کہ آسمان کے نیچے (قرآن کے علاوہ) کوئی کتاب اس سے زیادہ صحیح نہیں۔ یہ واقعہ جس طرح منقول ہے، اس کا لفظی ترجمہ حسب ذیل ہے:

"حارث بن ہشام کی صاحبزادی، ام حکیم، عکرمہ بن ابی جہل کی زوجہ تھیں، وہ فتح مکہ کے دن اسلام لائیں۔ لیکن اُن کے شوہر عکرمہ بن ابوجہل اسلام سے بھاگ کر یمن چلے گئے۔ ام حکیم یمن گئیں اور ان کو اسلام کی دعوت دی اور وہ مسلمان ہوگئے اور مکہ میں آئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کو دیکھا تو فرطِ مسرت سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور اس تیزی سے ان کی طرف بڑھے کہ جسم مبارک پر چادر تک نہ تھی۔ پھر اُن سے بیعت لی۔" (کتاب النکاح)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۴۱) یعنی چار شخصوں کے قتل کا حکم ہے۔ تین مرد یہ ہیں، ابن خطل، مقیس بن صبابہ اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح اور عورت کا نام اُم سارہ تھا۔ عبداللہ بن سعد کے قتل کی ایک انصاری نے نذر مانی تھی مگر حضرت عثمانؓ کی سفارش سے ان کی جان بخشی ہوئی اور ام سارہ وہی عورت ہے جو فتح مکہ سے پہلے مسلمانوں کے مکہ پر حملہ کرنے کا خط خفیہ لے چلی تھی۔ اس روایت میں حکیم بن عبدالملک متفقاً ناقابلِ اعتبار ہے، اور اس کی اس روایت کی عقیلی نے لکھا ہے کہ کوئی تائید اس کے رفقاء میں سے کسی نے نہیں کی ہے۔ تہذیب ابن حجر) "س"

یہ بات بھی اس موقع پر خاص طور پر لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ جن لوگوں کو امن دیا جاتا تھا، وہ اسلام لانے پر مجبور نہیں کیے جاتے تھے تمام مورخین اور ارباب سیر نے تصریح کی ہے کہ حنین کی لڑائی میں جو فتح مکہ کے بعد پیش آئی۔ لشکر اسلام میں مکہ کے بہت سے کفار بھی شامل تھے جو اس وقت تک کافر تھے اور شکست بھی زیادہ تر اسی وجہ سے ہوئی کہ پہلے حملہ میں انہی کافروں کے قدم اکھڑے اور اس ابتری کی وجہ سے مسلمانوں کے قدم بھی نہ ٹھہر سکے۔

خزائن حرم حرم میں نذر اور ہدایا کا خزانہ ایک مدت سے جمع ہوتا چلا آتا تھا وہ محفوظ رکھا گیا۔ لیکن مجسمہ جات اور تصویریں برباد کر دی گئیں۔ ان میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کے مجسمے بھی تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصویر بھی تھی[۱] جس سے لوگوں نے قیاس کیا کہ کسی زمانے میں عیسائیت کا اثر زیادہ غالب ہوگیا تھا۔ رنگین تصویریں جو دیواروں پر تھیں مٹانے پر بھی ان کے دھندلے نشان رہ گئے تھے اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی تعمیر تک باقی رہے[۲]۔

مکہ معظمہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام پندرہ دن تک رہا جب یہاں سے روانہ ہوئے تو حضرت معاذ بن جبل کو اس خدمت پر مقرر کرتے گئے کہ لوگوں کو اسلام کے مسائل اور احکام سکھائیں۔

فتح مکہ اور بت شکنی فتح مکہ کا اصلی مقصد اشاعت توحید اور اعلاء کلمۃ اللہ

---

[۱] فتح الباری ذکر فتح مکہ [۲] فتح الباری ذکر فتح مکہ (اخبار مکہ ازرقی میں یہ تفصیل یہ واقعات مذکور ہیں)۔

کعبہ میں سیکڑوں بُت تھے، جن میں ہبل بھی تھا، جو بت پرستوں کا خدائے اعظم تھا۔ یہ انسان کی صورت کا تھا اور یاقوتِ احمر سے بنا تھا۔ سب سے پہلے جس نے اس کو کعبہ میں لاکر رکھا تھا، خزیمہ بن مدرکہ تھا جو مضر کا پوتا، اور عدنان کا پرپوتا تھا۔ ہبل کے سامنے سات تیر رہتے تھے جن پر "لا" و "نعم" لکھا ہوا تھا۔ عرب جب کوئی کام کرنا چاہتے تھے تو ان تیروں پر قرعہ ڈالتے اور "ہاں" یا "ناں" جو کچھ نکلتا اُس پر عمل کرتے۔[1] جنگِ اُحد میں ابوسفیان نے اسی ہبل کی جے پکاری تھی۔ وہ عین کعبہ کے اندر تھا۔ چنانچہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ میں داخل ہوئے تو اور بُتوں کے ساتھ وہ بھی برباد کر دیا گیا۔

مکہ کے اطراف میں اور بہت سے بڑے بڑے بُت تھے جن کے لیے حج کی رسمیں ادا کی جاتی تھیں۔ ان میں سب سے بڑے لات، مناۃ اور عزیٰ تھے۔ عزیٰ قریش کا اور لات اہلِ طائف کا معبود تھا۔ مکہ معظمہ سے ایک منزل کے فاصلے پر نخلہ ایک مقام ہے، عزیٰ یہیں منصوب تھا۔ بنو شیبان اس کے متولی تھے۔ اہلِ عرب کا اعتقاد تھا کہ خدا جاڑوں میں "لات" کے ہاں اور گرمیوں میں "عزیٰ" کے ہاں بسر کرتا تھا۔ عزیٰ کے سامنے عرب وہ تمام مناسک اور رسوم بجالاتے تھے جو کعبہ میں بجالاتے تھے۔ اس کا طواف کرتے اور اس پر قربانیاں چڑھاتے۔[2]

مناۃ کا تخت گاہ مشلل تھا، جو قدید کے پاس مدینہ منورہ سے سات

---

[1] معجم البلدان ذکر ہبل بحوالہ ہشام بن محمد کلبی [2] یہ تمام تفصیل زرقانی جلد دوم صفحہ ۴۰۰ میں ہے۔

میلی ادھر ہے، وہ ایک بن گھڑا پتھر تھا۔ ازد، غسان، اَوس اور خزرج اُس کا حج کرتے تھے۔ عمرو بن لحی نے جو اصنام قائم کئے تھے۔ یہ اُن سب میں بالاتر تھا۔ اَوس اور خزرج جب کعبہ کا حج کرتے تو احرام اُتارنے کی رسم (بال منڈانا) اسی کے پاس آکر ادا کرتے تھے[1]

قبیلۂ ہذیل کا بُت سواع تھا، جو ینبع کے اطراف رہاط میں تھا، یہ ایک پتھر تھا، اس کے متولی بنو لحیان تھے۔

بُت پرستی کے یہ وہ طلسم تھے، جن میں سارا عرب گرفتار تھا۔ اب ان کی بربادی کا وقت آچکا تھا، اور دفعۃً ہر جگہ خاک اُڑنے لگی۔

---

[1] معجم البلدان، ذکر مناۃ۔

ہوازن وثقیف

غزوۂ حُنین، واَوطاس، وطائف

شوّال ۸ھ

وَ یَوْمَ حُنَیْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْکُمْ کَثْرَتُکُمْ

حُنین حنین مکہ اور طائف کے درمیان ایک وادی کا نام ہے۔ ذوالمجاز عرب کا مشہور بازار اور عرفہ سے تین میل[۱] ہے، یہ اس کے دامن میں ہے۔ اس مقام کو اوطاس بھی کہتے ہیں[۲]۔ ہوازن ایک بڑے قبیلے کا نام ہے، جس کی بہت سی شاخیں ہیں۔

اسلام کی فتوحات کا دائرہ گو وسیع ہوتا جاتا تھا، لیکن اہلِ عرب یہ

---

(۱) یہاں مصنف کی عبارت میں کچھ اغلاق ہے، مطلب یہ ہے کہ حنین زرقانی کی تصریح کے مطابق مکہ اور طائف کے درمیان عرب کے مشہور بازار ذوالمجاز کے پاس ہے جو عرفہ سے تین میل ہے۔ ابن سعد نے تصریح کی ہے کہ یہ مکہ سے تین دن کے سفر کی مسافت پر واقع ہے) "س"

(۲) قاضی عیاض کی یہی رائے ہے لیکن حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ ابن اسحاق کی تصریح کے مطابق یہ حنین کے علاوہ دیار ہوازن میں دوسری وادی کا نام ہے، (فتح الباری و زرقانی ذکر غزوۂ ہوازن و اوطاس) "س"

دیکھ رہے تھے کہ ان کا قبلۂ اعظم یعنی مکہ اب تک محفوظ ہے، ان کا خیال تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اگر قریش پر غالب آ گئے اور مکہ فتح ہو گیا، تو بے شبہ وہ سچے پیغمبر ہیں۔ مکہ جب فتح ہوا تو تمام قبائل نے خود پیش قدمی کی اور اسلام قبول کرنا شروع کیا[۱] لیکن ہوازن اور ثقیف پر اس کا اُلٹا اثر پڑا۔ یہ قبیلے نہایت جنگجو اور فنونِ جنگ سے واقف تھے۔ اسلام کو جس قدر غلبہ ہوتا جاتا تھا، یہ زیادہ مضطر ہوتے تھے[۲] کہ ان کی ریاست اور امتیاز کا خاتمہ ہُوا جاتا ہے۔ اس بنا پر فتح مکہ (کے بعد) ہوازن (اور ثقیف) کے رؤسائے (یہ سمجھ لیا کہ اب اُن کی باری ہے، اس لیے اُنھوں نے ایک دوسرے سے مل کر مشورہ کیا اور آپس میں قرارداد ہو گئی کہ (مسلمانوں کے خلاف جو اس وقت مکہ میں جمع ہیں) ایک عام حملہ کر دیا جائے۔

(اس قرارداد کے مطابق یہ قبائل) بڑے زور شور کے ساتھ خود حملہ کے لیے بڑھے۔ جوش کا یہ عالم تھا کہ ہر قبیلہ اپنا تمام اہل و عیال لے کر آیا تھا، کہ بچے اور عورتیں ساتھ ہوں گی تو ان کی حفاظت کی غرض سے لوگ جانیں دے دیں گے۔

اس معرکہ میں اگرچہ ثقیف اور ہوازن کی تمام شاخیں شریک تھیں، تاہم کعب اور کلاب الگ رہے۔ فوج کی سرداری کے لیے انتخاب (تو مالک بن[۳] عوف کا کیا گیا جو) قبیلہ ہوازن کا رئیس اعظم تھا (لیکن مشیر کی حیثیت سے)

---

[۱] صحیح بخاری ذکر فتح مکہ (بعد) باب مقام النبیؐ بمکہ۔ [۲] مارگولیوس صاحب لکھتے ہیں "حکومت اسلامی کی وسعت اور استحکام سے بدوی قبائل جن کو ریگستان کی آزادی بہت عزیز تھی نہایت خائف تھے۔" (۳) مالکؓ بن عوف غزوۂ طائف کے بعد مسلمان ہو گئے تھے اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں جنگ قادسیہ میں شریک اور دمشق کے حاکم ہوئے۔ زرقانی ج ۳ ص ۶ "س"

دُرَیدبن الصّمّۃ (کو بھی ساتھ لے لیا گیا جو) عرب کا مشہور شاعر اور قبیلہ جُشَم کا سردار تھا۔ اس کی شاعری اور بہادری کے معرکے اب تک عرب کی تاریخ میں یادگار ہیں۔ لیکن اس کی عمر سَو برس سے زیادہ ہو چکی تھی اور صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ تاہم چونکہ عرب اس کو مانتا تھا اور اسکی رائے و تدبیر پر تمام ملک کو اعتماد تھا۔ خود مالک بن عوف نے اس سے شرکت کی درخواست کی۔ پلنگ پر اُٹھا کر اس کو میدانِ جنگ میں لائے۔ اس نے پوچھا کہ یہ کون سا مقام ہے؟ لوگوں نے کہا "اوطاس"۔ بولا کہ "ہاں یہ مقام جنگ کے لیے موزوں ہے۔ اس کی زمین نہ بہت سخت ہے اور نہ اس قدر نرم کہ پاؤں دھنس جائیں۔" پھر پوچھا کہ "یہ بچّوں کے رونے کی آوازیں کیسی آرہی ہیں" لوگوں نے کہا کہ "بچّے اور عورتیں ساتھ آئی ہیں کہ کوئی شخص پاؤں پیچھے نہ ہٹائے"۔ بولا کہ "جب پاؤں اُکھڑ جاتے ہیں تو کوئی چیز روک نہیں سکتی میدانِ جنگ میں صرف تلوار کام دیتی ہے۔ بد قسمتی سے اگر شکست ہوئی تو عورتوں کی وجہ سے اور بھی ذلّت ہوگی"۔

پھر پوچھا کہ "کعب اور کلاب بھی شریک ہیں یا نہیں؟" اور جب یہ معلوم ہوا کہ ان معزز قبیلوں کا ایک شخص بھی میدانِ جنگ میں نہیں تو کہا "اگر آج کا دن عزت و شرف کا دن ہوتا تو کعب و کلاب غیر حاضر نہ ہوتے"۔ اس کی رائے تھی کہ میدان سے ہٹ کر کسی محفوظ مقام میں فوجیں جمع کی جائیں اور وہیں اعلانِ جنگ کیا جائے۔ لیکن مالک بن عوف نے جو سن ۳۰ سالہ نوجوان تھا، جوشِ شباب میں اس رائے کے قبول کرنے سے انکار کیا کہ آپ خرف ہو چکے، آپ کی عقل بے کار ہو چکی[۵]

---

[۵] یہ تمام تفصیل طبری میں ہے (ج ۳ ص ۱۶۵۵ تا ۱۶۵۷) "س"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو (مکہ میں) ان واقعات کی خبر پہنچی تو آپؐ نے تصدیق کے لیے حضرت عبداللہ بن ابی حَدْرَد کو بھیجا۔ وہ جاسوس بن کر حنین میں آئے اور کئی دن فوج میں رہ کر تمام حالات تحقیق کیے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجبوراً مقابلہ کی تیاریاں کیں۔ رسد اور سامانِ جنگ کے لیے قرض کی ضرورت پیش آئی۔ عبداللہ بن ربیعہ جو ابوجہل کے ماں جائے بھائی تھے، نہایت دولتمند تھے۔ ان سے تیس ہزار درہم قرض[۱] لیے۔ صفوان بن امیہ جو مکہ کا رئیس اعظم تھا اور مہمان نوازی میں مشہور تھا، لیکن اب تک اسلام نہیں لایا تھا۔ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلحہ جنگ مستعار مانگے۔ اس نے سو زرہیں اور ان کے لوازمات پیش[۲] کیے۔

شوال ۸ھ مطابق جنوری و فروری ۶۳۰ء میں اسلامی فوجیں جن کی تعداد بارہ ہزار تھی، اس سر و سامان سے حنین پر بڑھیں کہ بعض صحابہ کی زبان سے بے اختیار یہ لفظ نکل گیا کہ "آج ہم پر کون غالب آسکتا ہے"۔ لیکن بارگاہِ ایزدی میں یہ نازش پسند نہ تھی:

وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ	اور حنین کا دن یاد کرو جب تم اپنی کثرت
كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ	پر نازاں تھے، لیکن وہ کچھ کام نہ آئی
شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ	اور زمین باوجود وسعت کے تنگی کرنے
بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُم	لگی۔ پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے،

---

[۱] مسند ابن حنبل جلد ۴ صفحہ ۳۶۔ اصابہ میں امام بخاری سے بھی یہ روایت نقل کی ہے لیکن اس میں دس ہزار کی تعداد ہے [۲] موطا میں ہے کہ جب آپؐ نے اس سے ہتھیار مانگے تو اس نے کہا، جبراً یا طوعاً (یعنی جبراً مانگتے ہو تو میں نہیں دیتا) آپؐ نے فرمایا جبراً نہیں طوعاً۔ (ابوداؤد و باب الضمانہ میں بھی اسی قسم کی روایت ہے)۔

مُّدْبِرِيْنَ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ	پھر اللہ نے اپنے رسول پر اور مسلمانوں
سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى	پر تسلّی نازل کی اور ایسی فوجیں بھیجیں
الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا	جو تم نے نہیں دیکھیں، اور کافروں
لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ	کو عذاب دیا اور کافروں کی یہی
كَفَرُوْا وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ۔	سزا ہے۔

(توبہ۔۴)

فتح کے بجائے وہلہ اوّل ہیں مطلع صاف تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو رفقائے خاص ہیں سے بھی کوئی پہلو میں[۱] نہ تھا حضرت ابو قتادہ[۲]

---

[۱] لیکن اور روایتوں میں چند اصحاب کا ثابت قدم رہنا مذکور ہے۔ ان دونوں روایتوں کی تطبیق یہ ہے کہ یہ دو مختلف وقفوں کے حالات ہیں۔ راوی نے اپنا مشاہدہ لکھا ہے تفصیل آگے آئے گی (مصنّف نے آئندہ تفصیل کا جو وعدہ کیا تھا وہ پورا نہیں ہو سکا ہے۔ اس لیے تفصیل کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں چند باتیں قابل تشریح ہیں:

(۱) پہلی یہ کہ مصنّف نے اوّل وہلہ میں مسلمانوں کی شکست تسلیم کی ہے۔ یہ ابن اسحاق وغیرہ اہلِ سیر کی رائے ہے لیکن حدیث صحیح کا بیان ہے کہ مسلمانوں کو پہلے کامیابی ہوئی، لوگ غنیمت پر ٹوٹ پڑے۔ دشمن کے تیر اندازوں نے موقع پاکر تیر اندازی شروع کر دی۔ جس سے مسلمانوں کی صفوں میں بے ترتیبی، انتشار اور پراگندگی پیدا ہوگئی۔ بخاری میں حضرت براء کے الفاظ یہ ہیں:

وانا لما حملنا علیهم انکشفوا	اور ہم نے جب ان پر حملہ کیا تو وہ شکست کھا کر
فاکببنا علی الغنائم فاستقبلنا	پیچھے ہٹ گئے تو ہم لوگ مالِ غنیمت پر ٹوٹ
بالسهام (بخاری غزوۂ حنین)	پڑے تو انھوں نے ہم کو تیروں پر دھر لیا۔

جو شریکِ جنگ تھے، ان کا بیان ہے کہ جب لوگ بھاگ نکلے تو میں نے ایک کافر کو دیکھا کہ ایک مسلمان کے سینے پر سوار ہے۔ میں نے عقب سے

(بقیہ حاشیہ ۵۵ صفحہ) ۲، دوسری بات یہ ہے کہ شکست کے ظاہری اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس جنگ میں کچھ لوگ محض اس غرض سے شریک ہی ہوئے تھے کہ مسلمانوں کو عین جنگ میں دھوکا دیں۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت ام سلیم رضؓ نے جو اس جنگ میں شریک تھیں، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ یا رسول اللہ! ان طلقاء کو قتل کر دیجیے، انہی کی وجہ سے شکست ہوئی ہے۔ الفاظ یہ ہیں:

اقتل من بعدنا من الطلقاء	ہمارے سوا ان طلقاء کو قتل کر دیجیے
انھزموا بك (غزوۃ النساء مع الرجال)	انہی نے آپؐ کو شکست دلوائی۔

امام نووی اسکی شرح میں لکھتے ہیں:

لم یحصل الفرار من جمیعھم	سب لوگ نہیں بھاگے تھے، بلکہ مکہ کے
وانما فتحہ علیھم من فی قلبہ	مؤلفۃ القلوب میں جو منافق تھے اور مکہ
مرض من مسلمۃ اھل مکۃ	کے مشرکین (جو اس جنگ میں شریک
المؤلفۃ ومشرکیھا الذین	ہو گئے تھے اور جو اب تک مسلمان نہیں
لم یکونوا اسلموا وانما کانت	ہوئے تھے) انھوں نے بھاگنا شروع
ھزیمتھم فجاءۃ لانصبابھم	کیا تھا، اور یہ ناگہانی ہزیمت اس وجہ سے
علیھم دفعۃ واحدۃ ورشقھم	ہوئی کہ دشمنوں نے ایک ساتھ تیروں
بالسھام ولاختلاط اھل مکۃ	کی بارش شروع کر دی تھی اور فوج میں
معھم ممن لم یستقر الایمان	ایسے اہل مکہ بھی تھے جن کے دلوں میں
فی قلبہ وممن یتربص بالمسلمین	ایمان راسخ نہیں ہوا تھا اور مسلمانوں پر

اس کے شانے پر تلوار ماری جو زرہ کو کاٹ کر اندر اتر گئی۔ اس نے مڑ کر مجھ کو اس زور سے دبوچا کہ میری جان پر بن گئی۔ لیکن پھر وہ ٹھنڈا ہو کر گر پڑا۔ اسی اثنا میں میں نے حضرت عمرؓ کو دیکھا، پوچھا کہ مسلمانوں کا کیا حال

(بقیہ حاشیہ ملٹ)

الدوائر وفیھم نساء و صبیان	مصائب کے منتظر تھے۔ اس میں عورتیں اور
خرجوا للغنیمۃ (غزوہ حنین)	بچے بھی تھے جو غنیمت کے لیے آئے تھے۔

مؤرخ طبری نے اس موقع پر مکہ کے ان طلقاء کی زبان سے جو فقرے نقل کیے ہیں وہ بھی اسی راز کی پردہ کشائی کرتے ہیں کہ اہل مکہ اس جنگ میں مسلمانوں کے ساتھ دل سے نہ تھے (ج ۳ صفحہ ۱۶۶۰ لائیڈن)۔

متقدم مفسروں میں سے ابن جریر طبری نے لکھا ہے ان الطلقاء انجفلوا یومئذ بالناس وجلوا عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم، (ابن جریر طبری جلد ۱۰ ص ۶۲)

عہد متوسط کے مفسروں میں سے ابو حیان اندلسی کے الفاظ یہ ہیں:

یقال ان الطلقاء من اھل مکۃ	کہا جاتا ہے کہ مکہ کے طلقاء بھاگے تھے
فروا وقصدوا القاء الھزیمۃ	اور ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو
فی المسلمین (بحر المحیط ج ۵ ص ۲۴)	شکست ہو جائے۔

متاخر مفسروں میں سے صاحب روح المعانی نے تفسیر سورۂ توبہ میں یہ الفاظ لکھے ہیں:

وکان اول من انھزم الطلقاء	سب سے پہلے طلقاء مکر و فریب سے شکست
مکرا منھم وکان ذالک سببا	کھا کر پیچھے ہٹ گئے۔ اس سے مسلمانوں
لوقوع الخلل وھزیمۃ غیرھم	میں بے ترتیبی اور پسپائی کی صورت پیدا ہوئی۔

(ج ۱۰ ص ۶۶)

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ پسپائی کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسلمانوں

ہے۔ بولے کہ قضائے الٰہی یہی تھی[1]

شکست کے مختلف اسباب تھے۔ مقدمۃ الجیش میں جو حضرت خالدؓ کی افسری میں تھا۔ زیادہ تر فتح مکہ کے جدید الاسلام نوجوان تھے۔ وہ جوانی کے

---

[1] صحیح بخاری غزوۂ حنین (ج ۱ ص ۶۱۸) "س"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۵۲) کی ایک جماعت ثابت قدم رہی۔

اس سلسلہ میں بنائے اشتباہ بخاری کی حضرت انس والی روایت ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

فادبروا عنه حتی بقی وحده (لوگ پیچھے ہٹ گئے، یہاں تک کہ آپ تنہا رہ گئے)

مصنف نے ان الفاظ کو اپنے پیشِ نظر رکھا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ جس جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، وہاں کوئی نہ تھا۔ اسی لیے اسی روایت میں حضرت انسؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ جب حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو آواز دی تو انصار نے یہ الفاظ کہے، لبیك یا رسول اللّٰہ ابشر نحن معك! (ہم حاضر ہیں یا رسول اللہ آپؐ خوش ہیں کہ ہم آپؐ کے پاس ہیں) اسی باب میں حضرت انسؓ کی ایک روایت اس سے پہلے ہے جس میں انصار کے الفاظ یہ ہیں: لبیك یا رسول اللّٰہ وسعدیك نحن بین یدیك (بخاری غزوۂ طائف) (ہم حاضر ہیں یا رسول اللہ ہم آپؐ کے سامنے ہیں)۔

حافظ ابن حجر نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تنہائی اور رفقائے خاص کے پاس رہنے کی تطبیق ان الفاظ میں کی ہے:

ویجمع بین قوله حتی بقی وحده	اور اس قول میں کہ حضور تنہا رہ گئے اور
وبین الاخبار الدالة علی انه	ان واقعات میں جو اس پر دال ہیں کہ
بقی معه جماعة بان المراد	حضورؐ کے ساتھ صحابہ کی ایک جماعت
بقی وحده متقدما علی العدو	تھی تطبیق یہ ہے کہ حضور دشمن کے سامنے

کے غرور میں اسلحہ جنگ پہن کر بھی نہیں آئے تھے۔ فوج میں دو ہزار طلقاء یعنی وہ لوگ تھے، جو اب تک اسلام نہیں لائے تھے۔[۲] ہوازن قدر اندازی میں تمام عرب میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ میدان جنگ میں ان کا ایک تیر بھی

---

[۱] بخاری باب الجہاد (باب من صف اصحابہ عند الہزیمۃ و نزل عن دابتہ) "س" [۲] مصنف کا یہ فقرہ واضح نہیں ہے مقصود یہ ہے کہ گو وہ کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو چکے تھے جیسا کہ عمدۃ القاری ج ہشتم ص ۲۵۹ مصر اور شرح مسلم نووی غزوۃ النساء مع الرجال میں ہے۔ لیکن ہنوز وہ تازہ مسلمان تھے۔ راسخ الاسلام نہیں ہوئے تھے، اس لیے مہاجرین و انصار جیسا استقلال و ثبات ان میں اس وقت تک پیدا نہیں ہوا تھا۔ "س"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۵۳) والذین ثبتوا معہ کانوا وراءہ - (ج ۸ ص ۲۴ مصر) سب سے آگے مقام میں تھے اور جو آپ کے ساتھ ثابت قدم تھے وہ آپ کے پیچھے تھے۔

دوسرے یہ کہ بخاری ہی میں حضرت براء کی جو روایت ہے، اس میں حضرت براء تصریح کرتے ہیں کہ ابو سفیان بن حارث اس وقت حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھے، اور آپ کی سواری کی لگام تھامے تھے۔ (غزوۂ حنین بخاری)

مسلم میں حضرت عباسؓ کے پرزور الفاظ یہ ہیں کہ میں نے اور ابو سفیان بن حارث نے حضور سے علیحدگی اختیار نہیں کی۔

فلزمت انا و ابو سفیان بن الحارث بن عبد المطلب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلم نفارقہ (مسلم غزوۂ حنین) صحیحین کی ان روایات کے سوا روایات ذیل بھی پیش نظر رہنا ضروری ہے:

(۱) ابن ابی شیبہ کی ایک مرسل روایت میں جو حکم بن عتیبہ سے مروی ہے، چار آدمیوں کا حضور کی خدمت میں باقی رہنا بتایا گیا ہے۔ (فتح الباری ج ۸ ص ۲۳)

خالی نہیں جاتا تھا۔[1] کفار نے معرکہ گاہ میں پہلے پہنچ کر مناسب مقامات پر قبضہ کر لیا تھا اور تیر اندازوں کے دستے پہاڑ کی گھاٹیوں، کھوؤں اور دروں میں جا بجا جما دیے تھے۔ فوجِ اسلام نے صبح کے وقت جب خوب اُجالا بھی

---

[1] بخاری باب الجہاد (باب مذکور) "س"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۵۴) (۲) ترمذی نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ اس دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ سو آدمی نہیں باقی رہ گئے تھے (ترمذی ابواب الجہاد باب ماجاء فی الثبات عند القتال)

(۳) مسند احمد (ج اوّل ص ۴۵۳ و حاکم میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ اس دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ اسّی آدمی باقی رہ گئے تھے (فتح الباری ج ۸ ص ۲۳)

(۴) بیہقی نے حارثہ بن نعمان سے روایت کیا ہے کہ سو آدمی باقی رہ گئے تھے۔ (زرقانی ج ۲ ص ۲۲)

ابو نعیم نے دلائل میں سو کی تفصیل بتائی ہے کہ تیس سے کچھ زائد مہاجرین تھے، بقیہ انصار تھے۔ (فتح الباری ج ۸ ص ۲۳)

(۵) ابن اسحاق کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس وقت مہاجرین، انصار اور اہل بیت میں سے حسبِ ذیل اصحاب موجود تھے۔

حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عباس بن عبد المطلب، حضرت ابو سفیانؓ بن حارث، حضرت جعفرؓ بن ابی سفیان بن حارث، حضرت فضلؓ بن عباس، حضرت ربیعہؓ بن حارث، حضرت اسامہؓ بن زید، حضرت ایمنؓ بن ام ایمن۔

اس تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ حضرت انسؓ کے الفاظ "بقی وحدہ" اپنے ظاہری معنی پر باقی نہیں رہ سکتے۔ حافظ ابن حجر نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ ان الفاظ کا مطلب

نہیں ہوا تھا حملہ کیا۔ میدانِ جنگ اس قدر نشیب میں تھا کہ پاؤں جم نہیں سکتے تھے۔ حملہ آوروں کا بڑھنا تھا کہ سامنے سے ہزاروں فوجیں ٹوٹ پڑیں۔ ادھر کمینگاہوں سے قدر اندازوں کے دستے نکل آئے اور تیروں کا مینہ برسا دیا۔ مقدمۃ الجیش ابتری کے ساتھ بے قابو ہو کر پیچھے ہٹا اور پھر تمام فوج کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ صحیح بخاری میں ہے فادبروا عنہ حتی بقی وحدہ[1] یعنی سب لوگ ٹل گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکیلے رہ گئے۔

تیروں کا مینہ برس رہا تھا۔ بارہ ہزار فوجیں ہوا ہو گئی تھیں۔ لیکن ایک پیکرِ مقدس پا برجا تھا جو تنہا ایک فوج، ایک مُلک، ایک اقلیم، ایک عالم، بلکہ مجموعۂ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے داہنی جانب دیکھا اور پکارا یا معشر الانصار! آواز کے ساتھ صدا آئی "ہم حاضر ہیں"۔ پھر آپ نے بائیں جانب مُڑ کر پکارا، اب بھی وہی آواز آئی۔ آپ سواری سے اُتر پڑے اور جلالِ نبوت کے لہجے میں فرمایا "میں خدا کا بندہ اور اس کا پیغمبر ہوں[2]"۔

(۱؎ بخاری غزوۂ طائف) ۲؎ صحیح بخاری جلد دوم صفحہ ۶۲۱ غزوہ (طائف)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۵۵) یہ ہے کہ حضورؐ آگے اور بقیہ لوگ پیچھے تھے۔ لیکن اس کی صاف توجیہ یہ ہے کہ ان الفاظ سے ثابت قدم رہنے والوں کی کمی کا ظاہر کرنا مقصود ہے ورنہ حقیقت یہ نہ تھی۔

دوسری روایات میں ثابت قدم رہنے والوں میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کی مختلف توجیہیں کی گئی ہیں (ملاحظہ ہو زرقانی ج ۳ ص ۲۲) لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ حضرت سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے آس پاس تھے اور تھوڑی تھوڑی تعداد میں حضورؐ کے پاس پہنچنے لگے یہاں تک کہ خاصی جماعت حضور کے گرد جمع ہو گئی۔ اسی وجہ سے مختلف لوگوں نے مختلف تعداد بتلائی ہے۔ "س"

بخاری کی دوسری روایت میں ہے :

انا النبی لا کذب — مَیں پیغمبر ہوں اور یہ جھوٹ نہیں ہے.

انا ابن عبد المطلب — میں عبد المطلب کا بیٹا ہوں +

حضرت عباسؓ نہایت بلند آواز تھے۔ آپؐ نے اُن کو حکم دیا کہ مہاجرین اور انصار کو آواز دو، انھوں نے نعرہ مارا :

یا معشر الانصار — او گروہِ انصار،

یا اصحاب الشجرۃ — او اصحاب الشجرۃ (بیعت رضوان والے)

اس پُر اثر آواز کا کانوں میں پڑنا تھا کہ تمام فوج دفعتہً پلٹ پڑی۔ جن لوگوں کے گھوڑے کش مکش اور گھمسان کی وجہ سے مُڑ نہ سکے۔ انھوں نے زرہیں پھینک دیں اور گھوڑوں سے کُود پڑے۔ دفعتہً لڑائی کا رنگ بدل گیا۔ کفّار بھاگ نکلے اور جورہ گئے، اُن کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔ بنو مالک (ثقیف کی ایک شاخ تھی) جم کر لڑے، لیکن ان کے ستّر آدمی مارے گئے۔ اور جب ان کا علَم بردار عثمان بن عبداللہ مارا گیا تو وہ بھی ثابت قدم نہ رہ سکے +

شکست خوردہ فوج ٹوٹ پھوٹ کر (کچھ اوطاس میں جمع ہوئی اور کچھ) طائف میں جاکر پناہ گزیں ہوئی، جس کے ساتھ سپہ سالار لشکر (مالک بن عوف) بھی تھا +

اوطاس — درید بن الصمۃ کئی ہزار کی جمعیت لے کر اوطاس میں آیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (حضرت ابو عامرؓ اشعری کے ماتحت) تھوڑی سی فوج اس کے استیصال کے لیے بھیج دی۔ (حضرت ابو عامرؓ، درید کے بیٹے کے ہاتھ سے مارے گئے اور علم اسلام اُسکے ہاتھ میں تھا۔ یہ حالت دیکھ کر حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے آگے بڑھ کر حملہ کیا۔ دشمن کو قتل کر کے علَم اس کے ہاتھ سے چھین لیا)

(لہ مسند احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۳۹۹)

درید ایک شتر پر ہودج میں سوار تھا۔ ربیعہ بن رفیع نے اس پر تلوار کا وار کیا لیکن اچٹ کر رہ گئی۔ اس نے کہا "تیری ماں نے تجھ کو اچھے ہتھیار نہیں دیئے"۔ پھر کہا کہ "میرے محمل میں تلوار ہے نکال لو، اور جب اپنی ماں کے پاس جانا تو کہنا کہ میں نے درید کو قتل کر دیا"۔ ربیعہ نے جاکر ماں کو اس کے قتل کی خبر دی تو اس نے کہا "خدا کی قسم درید نے تیری تین ماؤں کو آزاد کرایا تھا"۔[1]

اسیرانِ جنگ کی تعداد ہزاروں سے زیادہ تھی۔ اُن میں حضرت شیماؓ[2] بھی تھیں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی بہن تھیں۔ لوگوں نے جب اُن کو گرفتار کیا تو انھوں نے کہا "میں تمھارے پیغمبرؐ کی بہن ہوں"۔ لوگ تصدیق کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے۔ اُنھوں نے پیٹھ کھول کر دکھائی کہ ایک دفعہ بچپن میں آپؐ نے دانت سے کاٹا تھا۔ یہ اس کا نشان ہے"۔ فرطِ محبت سے آپؐ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ان کے بیٹھنے کے لیے خود ردائے مبارک بچھائی، محبت کی باتیں کیں، چند شتر اور بکریاں عنایت فرمائیں اور ارشاد کیا کہ "جی چاہے تو میرے گھر چل کر رہو، اور گھر جانا چاہو تو وہاں پہنچا دیا جائے"۔ انھوں نے خاندان کی محبت سے وطن جانا چاہا۔ چنانچہ عزت و احترام کے ساتھ پہنچا دی گئیں۔

محاصرۂ طائف حنین کی بقیہ شکست خوردہ فوج طائف میں جاکر پناہ گزیں ہوئی، اور جنگ کی تیاریاں شروع کیں۔ طائف نہایت محفوظ مقام تھا۔ طائف اس کو اس لیے کہتے ہیں کہ اس کے گرد، شہر پناہ کے طور پر چار دیواری

---

[1] طبری (ج ۳) صفحہ ۱۶۶۶ مطبوعہ یورپ [2] طبقات ابن سعد و اصابہ و طبری (ج ۳ ص ۱۶۶۸)۔

تھی۔ یہاں ثقیف کا جو قبیلہ آباد تھا نہایت شجاع، تمام عرب میں ممتاز اور قریش کا گویا ہمسر تھا۔ عروہ بن مسعود جو یہاں کا رئیس تھا، ابوسفیان (حضرت امیر معاویہ رضؓ کے باپ) کی لڑکی اس کو بیاہی تھی۔ کفارِ مکہ کہتے تھے کہ قرآن اگر اترتا تو مکہ یا طائف کے رؤساء پر اترتا۔ یہاں کے لوگ فنِ جنگ سے بھی واقف تھے۔ طبری اور ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ عروہ بن مسعود اور غیلان بن سلمہ نے جرش (یمن کا ایک ضلع) میں جاکر قلعہ شکن آلات یعنی دبابہ، ضبور اور منجنیق کے بنانے اور استعمال کرنے کا فن سیکھا تھا[1]۔

یہاں ایک محفوظ قلعہ تھا۔ اہل شہر اور حنین کی شکست خوردہ فوج نے اس کی مرمت کی۔ سال بھر کا رسد کا سامان جمع کیا۔ چاروں طرف منجنیق اور جابجا قدر انداز متعین کیے[2]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حنین کے مالِ غنیمت اور اسیرانِ جنگ کے متعلق حکم دیا کہ جعرانہ میں محفوظ رکھے جائیں اور خود طائف کا عزم کیا۔ حضرت خالد مقدمۃ الجیش کے طور پر پہلے روانہ کر دیے گئے تھے۔ غرض محاصرہ ہوا اور اسلام میں یہ پہلا موقع تھا کہ قلعہ شکن آلات یعنی دبابہ اور منجنیق استعمال کیے گئے۔ دبابہ پر اہل قلعہ نے لوہے کی گرم سلاخیں برسائیں، اور اس شدت کی تیر باری کی کہ حملہ آوروں کو ہٹنا پڑا۔ بہت سے لوگ زخمی ہوئے۔ بیس دن تک محاصرہ رہا، لیکن شہر فتح نہ ہو سکا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نوفل ابن معاویہ کو بلا کر پوچھا کہ تمھاری کیا رائے ہے؟ انھوں نے کہا کہ لومڑی بھٹ میں گھس گئی ہے، اگر کوشش جاری رہی تو پکڑ لی جائے گی۔ لیکن چھوڑ دی

---

[1] طبری (ج ۳) ص ۱۶۶۹ مطبوعہ یورپ [2] تاریخ خمیس جلد دوم صفحہ ۱۲۲ و ابن سعد،

جلائے تب بھی کچھ اندیشہ نہیں۔

چونکہ صرف مدافعت مقصود تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ محاصرہ اٹھا لیا جائے۔ صحابہؓ نے عرض کی آپؐ ان کو بددعا دیں، آپؐ نے یہ دعا دی[۱]

اللھم اھد ثقیفا وائت بھم، | اے خدا ثقیف کو ہدایت کر اور توفیق دے کہ میرے پاس حاضر ہو جائیں۔

تقسیمِ غنائم محاصرہ چھوڑ کر آپؐ جعرانہ تشریف لائے۔ غنیمت کا بے شمار ذخیرہ تھا۔ چھ ہزار اسیرانِ جنگ، چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار (سے زیادہ) بکریاں اور چار ہزار اوقیہ چاندی[۲] تھی۔ اسیرانِ جنگ کے متعلق آپؐ نے انتظار کیا اُن کے عزیز و اقارب آئیں تو اُن سے گفتگو کی جائے، لیکن کئی دن گزرنے پر کوئی نہ آیا۔ مالِ غنیمت کے پانچ حصے کیے گئے۔ چار حصے حسبِ قاعدہ اہلِ فوج کو تقسیم کیے گئے۔ خمس بیت المال اور غربا اور مساکین کے لیے رکھا گیا۔

مکہ کے اکثر رؤسا جنھوں نے حال میں اسلام قبول کیا تھا، ابھی تک مذبذب الاعتقاد تھے۔ انہی کو قرآن مجید میں مولفۃ القلوب کہا ہے۔ قرآن مجید میں جہاں زکوٰۃ کے مصارف بیان کیے ہیں، ان لوگوں کا نام بھی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو نہایت فیاضانہ انعامات دیے جن کی تفصیل یہ ہے:

ابوسفیان، مع اولاد	۳۰۰ اونٹ اور ۱۲۰۔ اوقیہ چاندی
حکیم بن حزام	۲۰۰ اونٹ۔

---

[۱] ابن سعد جزء مغازی ص ۱۱۵ "س" [۲] طبقات ابن سعد (جزء مغازی ص ۱۱۰) "س"

نُفَیر بن حارث بن کلدہ ثقفی۔ ۱۰۰ اُونٹ۔

صفوان بن امیہ ۱۰۰ اُونٹ

قیس بن عدی ۱۰۰ اونٹ

سہیل بن عمرو ۱۰۰ اونٹ

حویطب بن عبدالعزیٰ ۱۰۰ اونٹ

(ان کے علاوہ تین غیر مکی نومسلم رئیس بھی ان انعامات کے مستحق ٹھہرے)۔

اقرع بن حابس (تمیمی) ۱۰۰ اونٹ

عُیینہ بن حصن (فزاری) ۱۰۰ اونٹ

مالک بن عوف (نصری) ۱۰۰ اونٹ

ان کے سوا بہت سے لوگوں کو پچاس پچاس اُونٹ عطا فرمائے۔ عام تقسیم کی رُو سے فوج کے حصے میں جو آیا وہ فی کس چار اُونٹ اور چالیس بکریاں تھیں۔ لیکن چونکہ سواروں کو تگنا حصہ ملتا تھا، اس لیے ہر سوار کے حصے میں بارہ اونٹ اور ایک سو بیس بکریاں آئیں[1]۔

جن لوگوں پر انعام کی بارش ہوئی عموماً اہلِ مکہ اور اکثر جدید الاسلام تھے، اس پر انصار کو رنج ہوا۔ بعضوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو انعام دیا اور ہم کو محروم رکھا، حالانکہ ہماری تلواروں سے اب تک قریش کے خون کے قطرے ٹپکتے ہیں[2]۔ بعض بولے کہ مشکلات میں ہماری یاد ہوتی ہے اور غنیمت اوروں کو ملتی ہے[3]۔

(۱؎ طبقات ابن سعد، جزء مغازی، اور زرقانی علی المواہب ج ۳ صفحہ ۴۲) "س"

۲؎ صحیح بخاری مطبوعہ مطبع نظامی صفحہ ۶۲۱ ۳؎ صحیح بخاری صفحہ ۶۲۰ (باب غزوہ طائف) "س"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ چرچے سُنے تو انصار کو طلب فرمایا۔ ایک چرمی خیمہ نصب کیا گیا جس میں لوگ جمع ہوئے۔ آپؐ نے انصار کی طرف خطاب کیا کہ تم نے ایسا کہا؟ لوگوں نے عرض کی کہ "حضور! ہمارے سربرآوردہ لوگوں میں سے کسی نے یہ نہیں کہا، نوخیز نوجوانوں نے یہ فقرے کہے تھے۔[۱] صحیح بخاری باب مناقب الانصار میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو بلا کر پوچھا کہ یہ کیا واقعہ ہے؟ تو چونکہ انصار جھوٹ نہیں بولتے تھے، انہوں نے کہا "آپؐ نے جو سنا ہے صحیح ہے۔"

آپؐ نے ایک خطبہ دیا، جس کی نظیر فن بلاغت میں نہیں مل سکتی۔ انصار کی طرف خطاب فرما کر کہا:

"کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم پہلے گمراہ تھے، خدا نے میرے ذریعے سے تم کو ہدایت کی؟ تم منتشر اور پراگندہ تھے، خدا نے میرے ذریعے سے تم میں اتفاق پیدا کیا؟ تم مفلس تھے، خدا نے میرے ذریعے سے تم کو دولتمند کیا؟"

آپؐ یہ فرماتے جاتے تھے اور ہر فقرے پر انصار کہتے جاتے تھے کہ "خدا اور رسولؐ کا احسان سب سے بڑھ کر ہے۔"[۲]

آپؐ نے فرمایا نہیں تم یہ جواب دو کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تجھ کو جب لوگوں نے جھٹلایا تو ہم نے تیری تصدیق کی۔ تجھ کو جب لوگوں نے چھوڑ

---

[۱] صحیح بخاری صفحہ ۶۲۰ (باب غزوۂ طائف) "س" [۲] صحیح بخاری صفحہ ۶۲۰ (باب غزوہ طائف و فتح الباری ج ۸ ص ۴۱) "س"

دیا تو ہم نے پناہ دی۔ تو مفلس آیا تھا، ہم نے ہر طرح کی مدد کی۔

یہ کہہ کر آپؐ نے فرمایا کہ "تم یہ جواب دیتے جاؤ اور میں یہ کہتا جاؤں گا کہ تم سچ کہتے ہو۔ لیکن اے انصار! کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے کر جائیں، اور تم محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو لے کر اپنے گھر آؤ" انصار بے اختیار چیخ اُٹھے کہ "ہم کو صرف محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم درکار ہیں" اکثروں کا یہ حال ہُوا کہ روتے روتے داڑھیاں تر ہوگئیں۔ آپؐ نے انصار کو سمجھایا کہ مکّہ کے لوگ جدید الاسلام ہیں، مَیں نے ان کو جو کچھ دیا، حق کی بنا پر نہیں بلکہ تالیفِ قلب[۱] کے لیے دیا۔

حنین کے اسیرانِ جنگ اب تک جعرانہ میں محفوظ تھے۔ ایک معزز سفارت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی کہ اسیرانِ جنگ رہا کر دیے جائیں۔ یہ وہ قبیلہ تھا کہ آپؐ کی رضاعی والدہ حضرت حلیمہ اسی قبیلہ کی تھیں۔ رئیسِ قبیلہ (زُہیر بن صُرَد) نے کھڑے ہو کر تقریر کی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مخاطب ہو کر کہا "جو عورتیں چھپروں میں محبوس ہیں انہی میں تیری پھوپھیاں اور تیری خالائیں ہیں۔ خدا کی قسم اگر سلاطینِ عرب میں سے کسی نے ہمارے خاندان کا دُودھ پیا ہوتا تو اُن سے بہت کچھ اُمیدیں ہوتیں، اور تجھ سے تو اور بھی زیادہ توقعات ہیں۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "خاندانِ عبد المطلب کا جس قدر حصّہ ہے وہ تمھارا ہے، لیکن عام رہائی کی تدبیر یہ ہے کہ نماز کے بعد جب مجمع ہو تو سب کے سامنے یہ درخواست پیش کر دو۔" نمازِ ظہر کے بعد ان لوگوں نے یہ درخواست مجمع کے

---

[۱] صحیح بخاری و فتح الباری، پوری تفصیل فتح الباری میں ہے۔

سامنے پیش کی۔ آپؐ نے فرمایا "مجھ کو صرف اپنے خاندان پر اختیار ہے۔ لیکن مَیں تمام مسلمانوں سے اُن کے لیے سفارش کرتا ہوں"۔ مہاجرین اور انصار بول اُٹھے، ہمارا حصّہ بھی حاضر ہے۔ اس طرح چھ ہزار دفعتہً آزاد تھے[1]۔

واقعات متفرقہ | حضرت ماریہؓ کے بطن سے اسی سال ایک لڑکا پیدا ہوا۔ جس کا نام آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ابراہیم رکھا۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اس بچّے سے نہایت محبت تھی (۱۷ یا اٹھارہ مہینے) زندہ رہا۔ جس دن ابراہیم نے وفات پائی، سُورج گرہن ہُوا۔ عرب کا عقیدہ تھا کہ سورج گرہن کسی عظیم الشان انسان کی موت کی علامت ہے۔ لوگوں نے سمجھا کہ یہ ابراہیمؑ کی موت کا نتیجہ ہے۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے لوگوں کو جمع کر کے خطبہ دیا کہ "سُورج اور چاند خدا کی قدرت ہیں کسی کے مرنے اور جینے سے اُن میں گرہن نہیں لگتا"۔ اس کے بعد آپؐ نے کسوف کی نماز با جماعت ادا فرمائی[2]۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کا بھی اسی سال انتقال ہوا۔

---

(۱) طبری ج ۳ ص ۱۶۷۶) "س" (۲) بخاری باب کسوف

۹ھ

واقعۂ ایلاء و تخییر اور غزوۂ تبوک

ایلاء اور تخییر ۹ھ[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زاہدانہ اور تمام زخارف دنیوی سے بیگانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ دو دو مہینے گھر میں آگ نہیں جلتی تھی۔ آئے دن فاقے ہوتے رہتے تھے۔ مدۃ العمر دو وقت برابر سیر ہو کر کھانا نصیب نہیں ہوا؟

ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن اس جنسِ لطیف میں شامل تھیں جن کی مرغوب ترین چیز عموماً زیب و زینت اور ناز و نعمت ہے۔ گو شرفِ صحبت نے ان کو تمام ابنائے جنس سے ممتاز کر دیا تھا۔ تاہم بشریت بالکل معدوم نہیں

---

[1] بعض محدثین کی رائے ہے کہ یہ ذوالحجہ ۵ھ کا واقعہ ہے۔ اس اشتباہ کا سبب یہ ہے کہ بعض روایتوں میں یہ مذکور ہوا ہے کہ یہ نزولِ حجاب سے پہلے کا واقعہ ہے لیکن آگے چل کر حضرت عمر رض کی روایت میں مذکور ہے کہ جب اس حادثہ کی مبہم خبر سے مسلمانوں میں اضطراب دیکھا تو سمجھے کہ غسان کا بادشاہ حملہ آور ہوا، جس کی اطلاع پہلے ہو چکی تھی۔ غسان کا حملہ ۹ھ میں ہونے والا تھا۔ حافظ ابن حجر اور محدث دمیاطی نے یہ دلائل ثابت کیا ہے کہ یہ اوائل ۹ھ کا واقعہ ہے، (دیکھو فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۲۵۰)۔ "س"

ہوسکتی تھی، خصوصاً وہ دیکھتی تھیں کہ فتوحاتِ اسلام کا دائرہ بڑھتا جاتا ہے اور غنیمت کا سرمایہ اس قدر پہنچ گیا ہے کہ اس کا ادنیٰ حصہ بھی ان کی راحت و آرام کے لیے کافی ہوسکتا ہے۔ ان واقعات کا اقتضا تھا کہ ان کے صبر و قناعت کا جام لبریز ہوجاتا تھا۔

ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن میں بڑے بڑے گھرانوں کی خاتونیں تھیں۔ حضرت امّ حبیبہ رضی اللہ عنہا تھیں جو رئیس قریش کی صاحبزادی تھیں۔ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا تھیں، جو قبیلہ بنی المصطلق کے رئیس کی بیٹی تھیں۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا تھیں جن کا باپ خیبر کا رئیسِ اعظم تھا۔ حضرت عائشہ تھیں جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی تھیں۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا تھیں جن کے والد فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ تھے۔ بشریت کے اقتضا سے اُن میں منافست بھی تھی اور حریف کے مقابلے میں اپنے رتبہ اور شان کا خیال رہتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہر ایک کو جو شدید محبّت تھی وہ ع "با سایہ ترا نمی پسندم" کی حد تک تھی۔

ایک دفعہ کئی دن تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے پاس معمول سے زیادہ بیٹھے جس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت زینب کے پاس کہیں سے شہد آگیا تھا، انھوں نے آپؐ کے سامنے پیش کیا۔ آپؐ کو شہد بہت مرغوب تھا، آپؐ نے نوش فرمایا۔ اس میں وقت مقررہ سے دیر ہوگئی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو رشک ہوا، حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے کہا، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہمارے یا تمھارے گھر میں آئیں تو کہنا چاہیے کہ آپؐ کے مُنہ سے مغافیر کی بُو آتی ہے (مغافیر کے پھولوں سے شہد کی مکھیاں رس چُوستی ہیں)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھائی کہ مَیں شہد نہ کھاؤں گا۔ اس پر قرآن مجید[۱] کی یہ آیت اُتری:

[۱] صحیح بخاری تفسیر سورۂ تحریم، اس واقعہ کو بخاری کتاب الطلاق میں زیادہ تفصیل سے

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ - (تحریم - ۱)

اے پیغمبر! اپنی بیویوں کی خوشی کے لیے تم خدا کی حلال کی ہوئی چیز کو حرام کیوں کرتے ہو۔

علامہ عینی نے بخاری کی شرح میں لکھا ہے:

فان قلت کیف جاز لعائشه وحفصة الکذب والمواطأة التی فیها ایذاء رسول الله صلی الله علیه وسلم قلت کانت عائشة صغیرة مع انها وقعت منها من غیر قصد الایذاء بل علی ما هو من جبلة النساء فی الغیرة علی الضرائر - (تفسیر سورۂ تحریم)

اگر کوئی یہ کہے کہ حضرت عائشہ رضؓ اور حضرت حفصہ رضؓ کو جھوٹ بولنا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سازش کرنا کیونکر جائز تھا تو یہ جواب ہے کہ حضرت عائشہ رضؓ کمسن تھیں، اس کے علاوہ ان کا مقصود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا دینا نہیں تھا بلکہ جیسا کہ عورتیں اپنی سوکنوں کے مقابلے میں رشک سے تدبیریں اختیار کرتی ہیں۔ اس طرح کی ایک تدبیر تھی۔

لیکن علامہ موصوف کا جواب تسلیم کرنا مشکل ہے۔ اوّل تو یہ واقعہ ایلاء کے واقعہ کے سلسلے میں ہے جو ۹ھ میں واقع ہوا تھا۔ اس وقت حضرت عائشہ رضؓ سترہ برس کی ہو چکی تھیں، دوسرے حضرت عائشہ رضؓ کمسن تھیں لیکن ازواج مطہرات جو اس میں شریک ہوئیں، وہ تو پوری عمر کی تھیں۔ خود حضرت حفصہ رضؓ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۶۶) لکھا ہے جس میں یہ بھی ہے کہ اس تدبیر میں اور ازواج مطہرات بھی شریک کرلی گئیں، اور جس نے اوّل اس کا اظہار کیا وہ حضرت سودہ رضؓ تھیں۔ ۱۲

کی عمر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی کے وقت ۳۵ برس کی تھی۔

ہمارے نزدیک مغافیر کی بو کا اظہار کرنا کوئی جھوٹ بات نہ تھی۔ تمام روایتوں سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لطیف المزاج تھے اور رائحہ کی ذراسی ناگواری کو برداشت نہیں فرما سکتے تھے[۱] مغافیر کے پھولوں میں اگر کسی قسم کی کرختگی ہو تو تعجب کی بات[۲] نہیں۔ البتہ ازواج مطہرات کا ایکا کرنا بہ ظاہر محل اعتراض ہو سکتا ہے لیکن یہ کسی کا اعتقاد نہیں کہ ازواج مطہرات معصوم تھیں یا اپنے انجاح مقصد کے لیے جائز وسائل نہیں اختیار کرتی تھیں۔ اسی زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی راز کی بات حضرت حفصہ رضی سے فرمائی اور تاکید کر دی کہ کسی سے نہ کہنا۔ لیکن انھوں نے حضرت عائشہ رضی سے کہہ دیا۔ اس پر یہ آیت اُتری:

وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِہٖ حَدِیْثًا فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِہٖ وَاَظْہَرَہُ اللّٰہُ عَلَیْہِ عَرَّفَ بَعْضَہٗ وَاَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّاَہَا بِہٖ قَالَتْ مَنْ اَنْبَاَکَ ہٰذَا قَالَ نَبَّاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ۔ (تحریم۔۱)	اور جب کہ پیغمبرؐ نے اپنی بعض بیویوں سے راز کی بات کہی اور انھوں نے فاش کر دی اور خدا نے پیغمبر کو اس کی خبر کر دی تو پیغمبر نے اس کا کچھ حصہ اُن سے کہا اور کچھ چھوڑ دیا، پھر جب ان سے کہا تو انھوں نے کہا کہ آپ کو کس نے خبر دی؟ پیغمبر نے کہا مجھ کو خدائے عالم خبیر نے خبر دی۔

(تحریم۔۱)

شکر رنجیاں بڑھتی گئیں اور حضرت عائشہ رضی و حضرت حفصہ رضی نے باہم مظاہرہ

---

[۱] (مسند احمد ج ۶ ص ۲۴۹) "س"
[۲] عمدۃ القاری ج ۹ ص ۲۲۶ "س"

کیا، یعنی دونوں نے اس پر اتفاق کیا کہ دونوں مل کر زور ڈالیں۔ اس پر حضرت عائشہ رضؓ و حضرت حفصہ رضؓ کی شان میں یہ آیتیں اُتریں:

اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ	اگر تم دونوں خدا کی طرف رجوع کرو
قُلُوْبُكُمَا وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ	تو تمھارے دل مائل ہو چکے ہیں اور اگر
فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَ	ان کے (یعنی رسول اللہؐ) کے مقابلہ میں
جِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ	ایکا کرو تو خدا اور جبریلؑ اور نیک
وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ	مسلمان اور سب کے بعد فرشتے رسول اللہ
ظَهِيْرٌ۔ (سورہ تحریم-۱)	کے مددگار ہیں۔

حضرت عائشہ رضؓ اور حضرت حفصہ رضؓ نے جن معاملات کی وجہ سے ایکا کیا تھا وہ خاص تھے لیکن توسیع نفقہ کے تقاضے میں تمام ازواجِ مطہرات شریک تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سکونِ خاطر میں یہ تنگ طلبی اس قدر خلل انداز ہوئی کہ آپؐ نے عہد فرمایا کہ ایک مہینہ تک ازواجِ مطہرات سے نہ ملیں گے، اتفاق یہ کہ اسی زمانے میں آپؐ گھوڑے سے گر پڑے اور ساقِ مبارک پر زخم آیا۔ آپؐ نے بالاخانے[1] پر تنہا نشینی اختیار کی۔ واقعات کے قرینے سے

---

(۱) بالاخانہ کے لیے احادیث میں مشربہ کا لفظ آیا ہے۔ مشربہ کے نام سے زیادہ تر مشربۂ ام ابراہیم (ماریہ) مشہور ہے۔ اسی لیے بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوا ہے کہ یہ وہی بالاخانہ تھا۔ لیکن یہ قطعاً غلط ہے۔ مشربۂ ام ابراہیم مدینہ سے باہر واقع تھا۔ حضرت عمر رضؓ کی جو روایت تمام صحاح میں موجود ہے اور جس کو مصنف نے آگے نقل کیا ہے، اس سے بھی متبادر ہوتا ہے کہ یہ وہ مقام تھا جو حضرت حفصہ رضؓ کے گھر اور مسجد نبویؐ سے بالکل متصل تھا کہ حضرت عمر رضؓ دوڑ دوڑ کر جلدی جلدی کبھی ادھر کبھی اُدھر جاتے تھے۔ ابوداؤد میں تصریح

لوگوں نے خیال کیا کہ آپؐ نے تمام ازواج کو طلاق دی۔ اس کے بعد جو واقعات پیش آئے اُن کو ہم حضرت عمرؓ کی زبان سے نقل کرتے ہیں، کہ انھوں نے تفصیل کے ساتھ اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ اس بیان میں کچھ ابتدائی واقعات بھی آگئے ہیں، جن سے اصل معاملہ پر زیادہ روشنی پڑتی ہے[۱]۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ "میں اور ایک انصاری (اوس بن خولی یا عتبان بن مالک) ہمسایہ تھے، اور معمول تھا کہ باری باری سے ایک دن بیچ دے کر ہم دونوں خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا کرتے تھے۔

قریش کے لوگ عورتوں پر قابو رکھتے تھے اور اُن پر غالب رہتے تھے۔ لیکن جب مدینہ میں آئے تو یہاں انصار کی عورتیں مردوں پر غالب تھیں۔ ان کا انداز دیکھ کر ہماری عورتوں نے بھی ان کی تقلید شروع کی۔ ایک دن میں نے کسی بات پر اپنی بیوی کو ڈانٹا۔ انھوں نے اُلٹ کر جواب دیا۔ میں نے کہا تم میری بات کا جواب دیتی ہو؟ بولیں تم کیا ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں اُن کو برابر کا جواب دیتی ہیں، یہاں تک کہ دن بھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے رُوٹھی رہتی ہیں۔ میں نے دل میں کہا، غضب ہوگیا۔ اُٹھ کر حفصہ (حضرت عمرؓ کی صاحبزادی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۶۹) ہے کہ یہ مشربہ حضرت عائشہؓ کے حجرے کا بالاخانہ تھا جو مسجد نبویؐ ہی سے متصل دیگر ازواجِ مطہرات کے حجروں کے برابر تھا (ابوداؤد باب الامام یصلی من قعود) "س"

[۱] یہ واقعہ بخاری کے متعدد ابواب یعنی کتاب النکاح، طلاق، کتاب العلم میں باختلاف عبارت منقول ہے۔ صحیح مسلم باب النکاح میں بھی کئی طریق سے مذکور ہے۔ ان روایتوں میں باہم جزئیات میں اختلاف ہے۔ ہم نے تاامکان سب روایتوں کو جمع کیا ہے۔

کی زوجۂ مطہرہ) کے پاس آیا اور پوچھا، کیا تو واقعی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے رات بھر روٹھی رہتی ہے۔ حفصہ نے اقرار کیا۔ میں نے کہا تجھ کو یہ خیال نہیں کہ رسولؐ کی ناراضی خدا کی ناراضی ہے۔ بخدا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میرا خیال فرماتے ہیں ورنہ تجھ کو طلاق دے چکے ہوتے۔ پھر حضرت ام سلمہ رضی کے پاس گیا اور ان سے بھی یہی شکایت کی۔ بولیں کہ عمر! تم ہر معاملے میں دخل دینے لگے۔ یہاں تک کہ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی ازواج کے معاملات میں بھی دخل دیتے ہو، میں چپ رہ گیا اور اٹھ کر چلا آیا۔"

"کچھ رات گئے، میرے ہمسایہ انصاری باہر سے آئے، اور بڑے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں گھبرا کر اٹھا اور دروازہ کھول کر پوچھا خیر ہے؟ انھوں نے کہا غضب ہو گیا، میں نے کہا کیا غسانی[1] مدینہ پر چڑھ آئے، بولے کہ نہیں اس سے بھی بڑھ کر یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج کو طلاق دے دی۔ میں صبح کو مدینہ آیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نمازِ فجر ادا کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہو کر بالاخانہ میں تنہا جا کر بیٹھ گئے۔ میں حفصہ کے پاس آیا، تو دیکھا وہ بیٹھی رو رہی ہے۔ میں نے کہا "میں نے تجھ سے پہلے ہی کہا تھا" حفصہ کے پاس سے اٹھ کر مسجد نبویؐ میں آیا۔ دیکھا تو صحابہ منبر کے پاس بیٹھے رو رہے ہیں۔ میں اُن کے پاس بیٹھ گیا۔ لیکن طبیعت کو سکون نہیں ہوتا تھا۔ اٹھ کر بالاخانہ کے پاس آیا اور رباح (خادم خاص) سے کہا اطلاع کرو، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ جواب نہیں دیا۔ میں اٹھ کر پھر مسجد میں چلا آیا۔

---

[1] غسانی عرب کا ایک خاندان تھا جو شام میں رومیوں کے ماتحت بادشاہی کرتا تھا، وہ رومیوں کی تحریک سے مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔

اور پھر تھوڑی دیر کے بعد بیتاب ہو کر بالاخانہ کے نیچے آیا اور دربان سے
دوبارہ اذن طلبی کی درخواست کی۔ جب کچھ جواب نہیں ملا تو میں نے پکار کر
کہا، رباح میرے لیے اذن مانگ، شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ
خیال ہے میں حفصہ کی سفارش کرنے آیا ہوں۔ خدا کی قسم، رسول اللہ فرمائیں
تو حفصہ کی گردن اڑا دوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی۔ اندر
گیا تو دیکھا آپ کھری چارپائی[1] پر لیٹے ہیں اور جسم مبارک پر بانوں کے نشان
پڑ گئے ہیں۔ ادھر اُدھر نظر اٹھا کر دیکھا تو ایک طرف مٹھی بھر جَو رکھے ہوئے
تھے۔ ایک کونے میں کسی جانور کی کھال کھونٹی پر لٹک رہی تھی۔ میری آنکھوں
سے آنسو جاری ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سبب پوچھا۔ میں نے عرض
کی، اس سے بڑھ کر رونے کا اور کیا موقع ہوگا۔ قیصر و کسریٰ باغ و بہار کے
مزے لوٹ رہے ہیں، اور آپ پیغمبر ہو کر آپ کی یہ حالت ہے؟ آپ نے
ارشاد فرمایا کہ "تم اس پر راضی نہیں کہ قیصر و کسریٰ دنیا لیں اور ہم آخرت"
میں نے عرض کی، کہ کیا آپ نے ازواج کو طلاق دے دی؟ آپ نے
فرمایا "نہیں"۔ میں اللہ اکبر پکار اٹھا۔ پھر عرض کی، کہ مسجد میں تمام صحابہ مغموم
بیٹھے ہیں، اجازت ہو تو جا کر خبر کر دوں کہ واقعہ غلط ہے۔ چونکہ ایلاء کی
مدت یعنی ایک مہینہ گزر چکا تھا، آپ بالاخانے سے اتر آئے[2] اور عام بازیابی

---

[1] بعض روایتوں میں حصیر (چٹائی) کا لفظ آیا ہے اور بعض میں سریر (چارپائی) ابن حجر
نے تطبیق دی ہے کہ وہ تھی چارپائی لیکن چٹائی جیسے بنی جاتی ہے۔ اس سے بنی ہوئی تھی
(فتح الباری جلد ۹ ص ۲۵۱)۔ [2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بالاتفاق ۲۹ روز بالا
پر تشریف فرما رہے۔ حضرت عمرؓ کا یہ مکالمہ پہلے روز کا واقعہ ہے یا آخر روز کا، اس

کی اجازت ہوگئی۔ اس کے بعد آیت تخییر نازل ہوئی:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ إِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا وَإِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنكُنَّ أَجْرًا عَظِيمًا (احزاب)

(اے پیغمبر اپنی بیویوں سے کہ دے کہ اگر تم کو دنیاوی زندگی اور دنیا کا زیب و آرائش مطلوب ہے تو آؤ میں تم کو رخصتی جوڑے دے کر بہ طریق احسن رخصت کر دوں اور اگر خدا، خدا کا رسول اور آخرت مطلوب ہے تو خدا نے تم میں سے نیکوکاروں کے لیے بڑا ثواب مہیا کر رکھا ہے)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۷۲) روایت کے جتنے طرق ہیں' ان کا ابتدائی ٹکڑا ظاہر کرتا ہے کہ یہ پہلے ہی دن کا واقعہ ہے اور آخر کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اُنتیسویں روز کا واقعہ ہے مصنف مرحوم نے آخری فقروں کا لحاظ کیا ہے اور بظاہر اس کو انتیسویں روز کا واقعہ سمجھا ہے لیکن اس بنا پر لازم آتا ہے کہ ۲۸ دن تک گویا حضرت عمرؓ اور صحابہ کو واقعہ ایلاء کی اطلاع ہی نہ تھی' حالانکہ اس کو کوئی تسلیم نہیں کر سکتا۔ اس بنا پر محدثین نے یہ تاویل کی ہے کہ اس مکالمے کا اکثر حصہ پہلے روز کا واقعہ ہے لیکن صرف اُترنے کا بیان آخر روز کا واقعہ ہے۔ راوی نے بیچ کا سلسلہ چھوڑ دیا۔ بخاری کی اس روایت سے جو کتاب النکاح باب موعظۃ الرجل ابنتہ لحال زوجہا اور کتاب اللباس باب ما کان یتجوز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من اللباس میں مذکور ہے' یہ صاف تصریح موجود ہے۔ اس بنا پر اس فقرے کو یوں پڑھنا چاہیے۔ جب ایلاء کی مدت یعنی ایک مہینہ گزر چکا)

"س"

اس آیت کی رُو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ ازواجِ مطہرات کو مطلع فرما دیں کہ دو چیزیں تمہارے سامنے ہیں۔ دُنیا اور آخرت، اگر تم چاہتی ہو تو آؤ میں تم کو رُخصتی جوڑے دے کر عزت و احترام کے ساتھ رخصت کر دوں، اور اگر تم خدا اور رسول اور زندگانی ابدی کی طلبگار ہو تو خدا نے نکوکاروں کے لیے بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔

مہینہ ختم ہو چکا تھا۔ آپؐ بالا خانے سے اُترے۔ اور چونکہ ان تمام معاملات میں حضرت عائشہ رضؓ پیش پیش تھیں اُن کے پاس تشریف لے گئے اور مطلع فرمایا۔ اُنھوں نے کہا میں سب کچھ چھوڑ کر خدا اور رسول کو لیتی ہوں۔ تمام ازواجِ مطہرات رضؓ نے بھی یہی جواب دیا۔

ایلاء، تخییر، مظاہرۂ حفصہ و عائشہ، یہ واقعات عام طور پہ اس طرح بیان کیے گئے ہیں کہ گویا مختلف زمانوں کے واقعات ہیں۔ اور اُن سے ایک ظاہر بین یہ دھوکا کھا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ازواجِ مطہرات کے ساتھ ہمیشہ ناگواری کے ساتھ بسر کرتے تھے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تینوں واقعے ہم زمان، اور ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ صحیح بخاری باب النکاح (باب موعظۃ الرجل ابنتہ) میں حضرت ابنِ عباس رضؓ کی زبانی جو نہایت تفصیلی روایت ہے اس میں صاف تصریح ہے کہ مظاہرۂ ازواجِ مطہرات رضؓ نے اعتزال، افشائے راز، آیت تخییر کا نزول سب ایک ہی سلسلہ کے واقعات ہیں۔

حافظ ابن حجر انعزال کے متعدد اسباب لکھ کر لکھتے ہیں:

وھذا ھو اللائق بمکارم	(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکارمِ
اَخلاقہ صلی اللہ علیہ وسلم	اخلاق، کشادہ دلی اور کثرتِ عفو کے
وسعۃ صدرہ وکثرۃ صفحہ	یہی مناسب ہے اور آپؐ نے اُس وقت

وَاِنَّ ذَالِكَ لَمْ يَقَعْ مِنْهُ حَتّٰى تَكَرَّرَ مُوْجِبُهُ مِنْهُنَّ (فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۲۵۴)

تک ایسا نہیں کیا ہوگا جب تک اُن سے اس قسم کی حرکتیں متعدد بار ظہور پذیر نہ ہوئیں۔)

مظاہرہ کے متعلق جو آیت نازل ہوئی اس سے بظاہر مفہوم ہوتا ہے کہ کوئی بہت بڑی ضرر رساں سازش تھی جس کا اثر بہت پُر خطر تھا۔ آیت مذکور یہ ہے:

وَاِنْ تَظَاهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ (تحریم-۱)

اور اگر تم دونوں (حضرت عائشہؓ و حضرت حفصہؓ) رسولؐ کے برخلاف ایکا کرو تو خدا اس کا مولا ہے اور جبریل اور نیک مسلمان اور ان سب کے ساتھ فرشتے بھی مددگار ہیں

اس آیت میں تصریح ہے کہ اگر ان دونوں کا ایکا قائم رہا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کو خدا، اور جبریلؑ اور نیک مسلمان موجود ہیں۔ اور اسی پر بس نہیں بلکہ فرشتے بھی اعانت کے لیے تیار ہیں۔

روایتوں سے مظاہرہ کا جو سبب معلوم ہوتا ہے، وہ صرف یہی کہ اس کے ذریعے سے وہ نفقہ کی توسیع چاہتی تھیں۔ اور اگر ماریہ قبطیہ کی روایت تسلیم کر لی جائے تو صرف یہ کہ وہ الگ کر دی جائیں۔ لیکن یہ ایسی کیا اہم باتیں ہیں اور حضرت عائشہؓ و حضرت حفصہؓ کی کسی قسم کی سازش ایسی کیا پُر خطر ہو سکتی ہے، جس کی مدافعت کے لیے ملاء اعلیٰ کی اعانت کی ضرورت ہو۔

اس بنا پر بعضوں نے قیاس کیا ہے کہ یہ مظاہرہ کوئی معمولی معاملہ نہ تھا۔ مدینہ منورہ میں منافقین کا ایک گروہ کثیر موجود تھا جن کی تعداد (۴۰۰) تک بیان کی گئی ہے۔ یہ شریر النفس ہمیشہ اس تاک میں رہتے تھے کہ کسی تدبیر سے خود

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان اور رفقائے خاص میں پھوٹ ڈلوادیں۔

(ابن حجر نے اصابہ میں ام جلدح کے حال میں لکھا ہے وکانت تحرش بین ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم وہ ازواج مطہرات کو باہم بھڑکایا کرتی تھیں) افک کے واقعہ میں ان کو کامیابی کی جھلک نظر آچکی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پندرہ دن تک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کبیدہ خاطر رہے حضرت حسان رضی اللہ عنہ افک میں شریک ہوگئے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سالی حمنہ جو حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی بہن تھیں، سازش میں آگئی تھیں۔ چنانچہ اس روایت کو علانیہ شہرت دیتی تھیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک قریبی عزیز مسطح کو جو شریک تہمت تھے، مالی اعانت سے محروم کردیا تھا۔ غرض اگر حضرت عائشہ کی برارت پر وحی نہ آجاتی تو ایک فتنۂ عظیم برپا ہوچکا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ جب ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کی کشمکش خاطر اور کبیدگی اور تنگ طلبی کا حال منافقوں کو معلوم ہوا تو ان بدنفسوں نے اشتعال دے کر بھڑکانا چاہا ہوگا۔ چونکہ مظاہرہ کے ارکان اعظم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا و حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ ان کو خیال ہوا ہوگا کہ اُن کے ذریعے سے اُن کے والدین (حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و حضرت عمر رضی اللہ عنہ) کو اس سازش میں شریک کرلینا ممکن ہے لیکن ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو رسول کی خاک پر قربان کرسکتے تھے۔ چنانچہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اذن نہ ملا تو انھوں نے پکار کر کہا کہ ارشاد ہو تو حفصہ کا سر لے کر آدُں۔

آیت میں رُوئے سخن منافقین کی طرف ہے۔ یعنی اگر حضرت عائشہ و حفصہ سازش بھی کریں گی، اور منافقین اس سے کام لیں گے تو خدا پیغمبر کی

اعانت کے لیے موجود ہے، اور خدا کے ساتھ جبریلؑ و ملائکہ بلکہ تمام عالم ہے۔

روایاتِ کاذبہ ان واقعات میں کذابین رواۃ نے اس قدر تلبیسات، اور خداعیاں کی ہیں کہ بڑے بڑے مورخین وارباب سیر نے یہ روایتیں اپنی تصانیف میں اسناداً درج کر دیں، اس لیے ہم اس بحث کو کسی قدر تفصیل سے لکھنا چاہتے ہیں۔

اس قدر عموماً مسلّم ہے اور خود قرآن مجید میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات کی خاطر کوئی چیز اپنے اوپر حرام کر لی تھی۔ اختلاف اس میں ہے کہ وہ کیا چیز تھی؟ بہت سی روایتوں میں ہے کہ وہ ماریہ قبطیہ ایک کنیز تھیں جن کو عزیز مصر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تحفۃً بھیجا تھا۔ ماریہ قبطیہ کی روایت تفصیل کے ساتھ مختلف طریقوں سے بیان کی گئی ہے۔ جن میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا راز جو حضرت حفصہ رضؓ نے فاش کر دیا تھا، ان ہی ماریہ قبطیہ کا راز تھا۔

اگرچہ یہ روایتیں بالکل موضوع اور ناقابل ذکر ہیں۔ لیکن چونکہ یورپ کے اکثر مورخوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معیارِ اخلاق پر حرف نگیریاں کی ہیں، ان کا کُل سرسید یہی ہیں، اس لیے ان سے تعرض کرنا ضروری ہے۔

ان روایتوں میں واقعہ کی تفصیل کے متعلق اگرچہ نہایت اختلاف ہے لیکن اس قدر سب کا قدر مشترک ہے کہ ماریہ قبطیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موطوءۃ کنیزوں میں تھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہ رضؓ کی ناراضی کی وجہ سے اُن کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔

حافظ ابن حجر شرح صحیح بخاری تفسیر سورۂ تحریم میں لکھتے ہیں :

ووقع عند سعید بن منصور باسناد صحیح الی مسروق قال حلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لحفصہ لا یقرب امتہ الخ

(صفحہ ۵۰۳ ج ۸)

اور سعید بن منصور نے سند صحیح کے ساتھ جو مسروق تک منتہی ہوتی ہے، یہ روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے سامنے قسم کھائی کہ اپنی کنیز سے مقاربت نہ کریں گے۔

اس کے بعد حافظ موصوف نے مسند (ہثیم بن کلیب) اور طبرانی سے متعدد روایتیں نقل کی ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے :

وللطبرانی من طریق الضحاک عن ابن عباس قال دخلت حفصۃ بیتھا فوجدہ یطاء ماریۃ فعاتبتہ۔

(فتح الباری مطبوعہ مصر جلد ۸ صفحہ ۵۰۳)

اور طبرانی نے ضحاک کے سلسلے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا اپنے گھر میں گئیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ماریہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ہمبستر دیکھا۔ اس پر انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معاتب کیا۔

ابن سعد اور واقدی نے اس روایت کو زیادہ بدنما پیرایوں میں نقل کیا ہے۔ ہم ان کو قلم انداز کرتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تمام روایتیں محض افترا اور بہتان ہیں۔

علامہ عینی شرح صحیح بخاری باب النکاح جلد ۹ صفحہ ۵۴۸ میں لکھتے ہیں :

والصحیح فی سبب نزول

اور آیت کی شانِ نزول کے باب میں

الاٰیة انہ فی قصة العسل	صحیح روایت یہ ہے کہ وہ شہد کے
لا فی قصة ماریة المروی	واقعہ میں ہے، ماریہ رضؓ کے قصہ کے باب
فی غیر الصحیحین وقال	میں نہیں ہے جو صحیحین کے سوا اور
النووی ولم تات قصة	کتابوں میں مذکور ہے نووی نے کہا ہے
ماریة من طریق صحیح ،	کہ ماریہ کا واقعہ کسی صحیح طریقہ سے مروی
	نہیں ہے۔

یہ حدیث تفسیر ابن جریر، طبرانی، مسند، ہیثم میں مختلف طریقوں سے مروی ہے۔ ان کتابوں میں عموماً جس قسم کی رطب یابس روایتیں مذکور ہیں۔ اُس کے لحاظ سے جب تک ان کی صحت کے متعلق کوئی خاص تصریح نہ ہو لائق التفات نہیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے ان میں ایک طریقہ کی توثیق کی ہے۔ یعنی وہ روایت جس کے راوی اخیر مسروقؒ ہیں۔

لیکن اولاً تو اس روایت میں ماریہ قبطیہ کا نام مطلق نہیں۔ صرف اس قدر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہ رضؓ کے سامنے قسم کھائی تھی کہ میں اپنی کنیز کے پاس نہ جاؤں گا اور وہ مجھ پر حرام ہے۔ اس کے علاوہ مسروق تابعی ہیں، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے یہ روایت اصول حدیث کی رُو سے منقطع ہے۔ یعنی اس کا سلسلۂ سند صحابی تک نہیں پہنچتا۔

اس حدیث کے ایک اور طریقہ کو حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں صحیح کہا ہے لیکن اس طریقہ کے ایک اور راوی عبد الملک رقاشی ہیں جن کی

لہ فتح الباری تفسیر سورۂ تحریم۔

نسبت دار قطنی نے لکھا ہے :

کثیر الخطاء فی الاسانید والمتون یحدث عن حفظه	سندوں میں اور اصل الفاظِ حدیث میں بہت خطا کرتے ہیں۔

یہ امر مسلّم ہے کہ ماریہ کی روایت صحاح ستہ کی کتاب میں مذکور نہیں ہے۔[1] یہ بھی تسلیم ہے کہ سورۂ تحریم کا شانِ نزول جو صحیح بخاری اور مسلم میں مذکور ہے، (یعنی شہد کا واقعہ) قطعی طریقہ سے ثابت ہے۔ امام نووی نے جو ائمۂ محدثین میں سے ہیں صاف تصریح کی ہے کہ ماریہ کے باب میں کوئی صحیح روایت موجود نہیں۔ حافظ ابن حجر اور ابن کثیر نے جن طریقوں کو صحیح کہا اُن میں سے ایک منقطع اور دوسرے کا راوی کثیر الخطاء ہے۔ ان واقعات کے بعد کون کہ سکتا ہے کہ یہ روایت استناد کے قابل ہے؟

یہ بحث اصولِ روایت کی بنا پر تھی، درایت کا لحاظ کیا جائے تو مطلق کدو کاوش کی حاجت نہیں، جو رکیک واقعہ ان روایتوں میں بیان کیا گیا ہے اور خصوصاً طبری وغیرہ میں جو جزئیات مذکور ہیں وہ ایک معمولی آدمی کی طرف منسوب نہیں کیے جاسکتے، نہ کہ اُس ذاتِ پاک کی طرف جو تقدس و نزاہت کا پیکر تھا، صلی اللہ علیہ وسلم۔

---

(1) یعنی ماریہ کے نام سے اور مشہور لغو واقعات کے شمول کے ساتھ نہیں۔ ورنہ نسائی باب الغیرۃ میں اس قدر مذکور ہے کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کے اصرار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لونڈی کو اپنے اوپر حرام کرلیا تھا لیکن اس کا ایک راوی مجروح ہے)" س"

غزوۂ تبوک

رجب ۹ھ مطابق نومبر ۶۳۵ء

تبوک ایک مشہور مقام ہے، جو مدینہ اور دمشق کے وسط میں نصف راہ پر مدینہ سے چودہ[۱۴] منزل ہے۔

جنگ موتہ کے بعد سے رومی سلطنت نے عرب پر حملہ کرنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ غسانی خاندان جو شام میں رومیوں کے زیر اثر حکومت کر رہا تھا۔ مذہباً عیسائی تھا، اس لیے قیصر روم نے اسی کو اس مہم پر متعین کیا۔ مدینہ میں یہ خبریں اکثر مشہور ہوتی رہتی تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایلام کے واقعہ میں حضرت عمرؓ سے جب عتبان بن مالک نے دفعۃً آکر یہ کہا کہ "غضب ہوگیا"، تو انھوں نے کہا کیوں خیر ہے؟ کیا غسانی آگئے؟[۱]

شام کے نبطی سوداگر مدینہ میں روغن زیتون بیچنے آیا کرتے تھے۔ انھوں نے خبر دی کہ رومیوں نے شام میں لشکر گراں جمع کیا ہے، اور فوج کو سال بھر کی تنخواہیں تقسیم کردی ہیں۔ اس فوج میں لخم، جذام اور غسان کے تمام عرب شامل ہیں، اور مقدمۃ الجیش بلقا تک آگیا ہے۔ مواہب لدنیہ میں طبرانی سے روایت نقل کی ہے کہ عرب کے عیسائیوں نے ہرقل کو لکھ بھیجا تھا کہ محمد

---

[۱] (بخاری ذکر واقعہ ایلام) [۲] مواہب لدنیہ (مع زرقانی ج ۳ ص ۷۲)

(صلی اللہ علیہ وسلم) نے انتقال کیا اور عرب سخت قحط کی وجہ سے بھوکوں مر رہے ہیں" اس بنا پر ہرقل نے چالیس ہزار فوجیں روانہ کیں۔

بہرحال یہ خبریں تمام عرب میں پھیل گئیں اور قرائن اس قدر قوی تھے کہ غلط ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فوج کی تیاری کا حکم دیا۔ سوء اتفاق یہ کہ سخت قحط اور شدت کی گرمیاں تھیں، ان اسباب سے لوگوں کو گھر سے نکلنا نہایت شاق تھا[۱]۔ منافقین جو بظاہر اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے اُن کا پردہ فاش ہو چلا، وہ خود بھی جی چراتے[۲] تھے اور دوسروں کو بھی منع کرتے تھے کہ:

لَا تَنْفِرُوا فِی الْحَرِّ، گرمی میں نہ نکلو

سویلم ایک یہودی تھا اُس کے گھر پر منافقین جمع ہوتے اور لوگوں کو لڑائی پر جانے سے روکتے۔ چونکہ مُلک پر رومیوں کے حملے کا اندیشہ تھا اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام قبائلِ عرب سے فوجیں اور مالی اعانت طلب کی[۳]۔ صحابہ میں سے حضرت عثمانؓ نے دو سو اوقیہ چاندی اور دو سو[۴] اُونٹ پیش کیے[۵]۔ اکثر صحابہ نے بڑی بڑی رقمیں لا کر حاضر کیں۔ تاہم بہت سے مسلمان اس بنا پر جانے سے رہ گئے کہ سفر کا سامان نہیں رکھتے تھے۔ یہ لوگ

---

[۱] مارگولیوس صاحب فرماتے ہیں کہ "چونکہ حنین میں انصار مالِ غنیمت سے محروم رہے تھے، اس لیے وہ بے دل ہو گئے تھے کہ ہم کیا لڑیں۔ جب فوائدِ جنگ دوسروں کو حاصل ہوں گے" لیکن یہ مارگولیوس صاحب کا حُسنِ ظن ہے۔ (قرآن نے خود بتا دیا ہے تو قیاس کی کیا حاجت ہے) "س" [۲] ابن ہشام، (۳) ابن سعد جز المغازی ص ۱۱۹) "س" (۴) زرقانی ج ۳ ص ۶۷) "س"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور اس درد سے روئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن پر رحم آیا، تاہم اُن کے چلنے کا کچھ سامان نہ ہوسکا۔

انہی کی شان میں سورہ توبہ کی یہ آیتیں اتری ہیں:

وَلَا عَلَى الَّذِينَ إِذَا مَآ أَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ أَجِدُ مَآ أَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَّأَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا أَلَّا يَجِدُوا مَا يُنفِقُونَ (توبہ ۱۲)	اور ان لوگوں پر کچھ اعتراض ہے کہ جب تمہارے پاس آئے کہ ہم کو سواری دیجیے اور تم نے کہا کہ میرے پاس سواری کہاں ہے جس پر تم کو سوار کرسکوں تو وہ واپس گئے اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے کہ افسوس ہمارے پاس خرچ نہیں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا جب آپؐ مدینہ سے تشریف لے جاتے تو کسی کو شہر کا حاکم مقرر فرما کر جاتے۔ چونکہ اس غزوہ میں بخلاف اور معرکوں کے ازواج مطہرات ساتھ نہیں گئی تھیں۔ اہل حرم کی حفاظت کے لیے کسی عزیز خاص کا رہنا ضرور تھا۔ اس لیے اب کی یہ منصب جناب امیرؓ کو ملا۔ لیکن انھوں نے شکایت کی کہ "آپؐ مجھ کو بچوں اور عورتوں میں چھوڑے جاتے ہیں۔" آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ "تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تم کو مجھ سے وہ نسبت ہو جو ہارون کو موسیٰؑ کے ساتھ تھی[1]۔"

غرض آپؐ تیس ہزار فوج کے ساتھ مدینہ سے نکلے۔ جس میں دس ہزار گھوڑے تھے[2]۔ راہ میں وہ عبرت ناک مقامات تھے جن کا ذکر قرآن مجید

---

[1] صحیح بخاری غزوہ تبوک [2] طبقات ابن سعد (جزء مغازی ص ۱۱۹) "س"

میں آیا ہے۔ یعنی قوم ثمود کے مکانات جو پہاڑوں میں تراش کر بنائے گئے تھے۔ چونکہ اس مقام پر عذاب الٰہی نازل ہو چکا تھا، آپؐ نے حکم دیا کہ کوئی شخص یہاں قیام نہ کرے، نہ پانی پیے اور نہ کسی کام میں لائے۔

تبوک[1] پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ خبر صحیح نہ تھی، لیکن اصلیت سے بالکل خالی بھی نہ تھی۔ غسانی رئیس عرب میں ریشہ دوانیاں کر رہا تھا۔ صحیح بخاری (غزوۂ تبوک) میں جہاں حضرت کعبؓ بن مالک کا واقعہ مذکور ہے، لکھا ہے کہ شام سے ایک قاصد آیا اور حضرت کعبؓ بن مالک کو رئیس غسان کا ایک خط دیا جس میں لکھا تھا کہ "میں نے سنا ہے کہ محمدؐ نے تمہاری قدر نہ کی۔ اس لیے تم میرے پاس چلے آؤ، میں تمہاری شان کے موافق تم سے برتاؤ کروں گا۔" حضرت کعب گو معتوب نبویؐ تھے، لیکن انھوں نے اس خط کو تنور میں ڈال دیا۔

تبوک پہنچ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیس دن تک قیام کیا۔ ایلہ کا سردار جس کا نام یوحنا تھا، حاضر خدمت ہو کر جزیہ دینا منظور کیا۔ ایک سفید خچر بھی نذر میں پیش کیا۔ جس کے صلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ردائے مبارک عنایت فرمائی[2]۔ جربا اور اذرح کے عیسائی بھی حاضر ہوئے اور جزیہ پر رضامندی ظاہر کی۔ دومۃ الجندل جو دمشق سے پانچ منزل پر ہے۔ وہاں ایک عربی سردار جس کا نام اُکید رتھا قیصر کے زیر اثر تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالدؓ کو چار سو (بیس) کی جمعیت کے ساتھ اس

---

[1] یہ مقام خلیج عقبہ کے پاس ہے (مارگولیس) [2] زرقانی بحوالہ ابن ابی شیبہ (ج ۳ ص ۸۶) "س"۔

کے مقابلے کے لیے بھیجا۔ حضرت خالدؓ نے اس کو گرفتار کیا اور اس شرط پر رہائی دی کہ خود دربارِ رسالتؐ میں حاضر ہو کر شرائطِ صلح پیش کرے۔ چنانچہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ مدینہ میں آیا۔ آپؐ نے اس کو امان دی [1]

تبوک سے جب آپؐ واپس پھرے اور مدینہ کے قریب پہنچے تو لوگ عالمِ شوق میں استقبال کو نکلے، یہاں تک کہ پردہ نشینانِ حرم بھی جوش میں گھروں سے نکل پڑیں، اور لڑکیاں یہ اشعار گاتی نکلیں [2]:

طلع البدرُ علینا من ثنیاتِ الوداع

وداع کی گھاٹیوں سے ہم پر چاند طلوع ہوا

وجب الشکر علینا ما دعا للہ داع

جب تک خدا کو پکارنے والا دُنیا میں کوئی باقی ہے ہم پر خدا کا شکر واجب ہے۔

مسجدِ ضرار منافقین ہمیشہ اس فکر میں رہتے تھے کہ مسلمانوں میں کسی طرح پھوٹ ڈال دیں۔ ایک مدت سے وہ اس خیال میں تھے کہ مسجدِ قبا کے توڑ پر وہیں ایک اور مسجد اس حیلہ سے بنائیں کہ جو لوگ ضعف یا کسی اور وجہ سے مسجدِ نبوی میں نہ پہنچ سکیں، یہاں آکر نماز ادا کر لیا کریں۔ ابو عامر جو انصار میں سے عیسائی ہو گیا تھا، اُس نے منافقین سے کہا کہ تم سامان کرو میں قیصر کے پاس جاکر وہاں سے فوجیں لاتا ہوں کہ اس ملک کو اسلام سے پاک کر دوں [3]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تبوک تشریف لے جانے لگے تو منافقین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کی کہ ہم نے بیماروں

---

[1] زرقانی ج ۳ ص ۹۲ "س" [2] زرقانی بحوالہ ابن جریر ج ۳ ص ۹۱ "س"

اور معذروں کے لیے ایک مسجد تیار کی ہے آپؐ چل کر اس میں ایک دفعہ نماز پڑھا دیں تو مقبول ہو جائے۔ آپؐ نے فرمایا اس وقت میں مہم پر جارہا ہوں۔ جب تبوک سے واپس پھرے تو مالک اور معن بن عدی کو حکم دیا کہ جاکر مسجد میں آگ لگا دیں۔ اسی مسجد کی شان میں یہ آیتیں اُتری ہیں:

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَا اِلَّا الْحُسْنٰى وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ۝ (توبہ - ۱۳)	اور وہ لوگ جنھوں نے ایک مسجد ضرر اور پھوٹ ڈالنے اور کفر کی غرض سے تیار کی، اور اس غرض سے کہ جو لوگ پہلے سے خدا اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اُن کو ایک کمین گاہ ہاتھ آئے، اور وہ قسم کھاتے ہیں کہ ہم نے صرف بھلائی کے لحاظ سے ایسا کیا، اور خدا گواہی دیتا ہے کہ یہ جھوٹ کہتے ہیں۔ محمدؐ! تو کبھی اس مسجد میں جاکر نہ کھڑا ہو، وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے ہی دن سے پرہیزگاری پر رکھی گئی ہے، وہ اس بات کی زیادہ مستحق ہے کہ تو اس میں نماز پڑھے۔ وہاں ایسے لوگ ہیں جنکو صفائی محبوب ہے، اور خدا صفائی پسند کرنے والوں کو چاہتا ہے۔

حج اسلام اور اعلانِ براءت

مکہ ۸ھ میں فتح ہوا، لیکن چونکہ ابھی تک ملک میں اچھی طرح امن و امان نہیں قائم ہوا تھا اس لیے اس سال مشرکین

ہی کے اہتمام سے ارکانِ حج انجام پائے۔ مسلمانوں نے حضرت عتابؓ بن اسید کے ساتھ جو مکہ کے امیر مقرر ہوئے تھے۔ فریضۂ حج ادا کیا۔ اب ۹ھ پہلا موقع ہے کہ کعبہ کفر و شرک کی ظلمت سے پاک ہو کر عبادتِ ابراہیمی کا مرکز قرار پاتا ہے۔ غزوۂ تبوک سے واپسی کے بعد ذیقعدہ یا ذوالحجہ ۹ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین سو ۳۰۰ مسلمانوں کا ایک قافلہ مدینہ منورہ سے حج کے لیے روانہ فرمایا۔ ان میں حضرت ابوبکرؓ قافلہ سالار، حضرت علیؓ نقیبِ اسلام اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت جابرؓ، حضرت ابوہریرہؓ وغیرہ معلم تھے۔ قربانی کے لیے (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے) بیس اونٹ ساتھ تھے۔

قرآن نے اس حج کو حجِ اکبر کہا ہے کہ یہ پہلا موقع تھا کہ رسمِ حج اصل ابراہیمی سنت میں جلوہ گر ہوئی۔ اس حج کا مقصد یہ تھا کہ خانۂ خلیل میں عہدِ جاہلیت کے اختتام اور حکومتِ اسلام کی ابتدا کا اعلان کیا جائے۔ مناسک و رسومِ حج کی عام طور سے تعلیم دی جائے، زمانۂ جاہلیت کے رسوم و عادات کا ابطال کیا جائے۔

حضرت ابوبکرؓ نے مناسکِ حج کی لوگوں کو تعلیم دی۔ یوم النحر میں خطبہ

---

(۱) بخاری کتاب المناسک باب لا یطوف عریان، و باب حج ابی بکر بالناس (تفسیر سورۃ البراۃ)۔ (۲) سورۃ توبہ میں ہے، یوم الحج الاکبر، مصنف نے اس حج کو حجِ اکبر کہنے کی جو توجیہ لکھی ہے، اس کو بھی گو بعض علما نے اختیار کیا ہے لیکن عام خیال یہ ہے کہ خاص اسی سال کے حج کو حجِ اکبر نہیں کہا گیا ہے بلکہ ہر حج عمرہ کے مقابلے میں حجِ اکبر ہے اور عمرہ حجِ اصغر ہے۔ ملاحظہ ہو روح المعانی ج ۱۰ صفحہ ۲۴۲) "س"

دیا، جس میں حج کے مسائل بیان کیے۔ اس کے بعد حضرت علیؓ کھڑے ہوئے سورۂ برأت کی چالیس[۴۰] آیتیں پڑھ کر سنائیں اور اعلان کر دیا کہ اب کوئی مشرک خانۂ کعبہ میں نہ داخل ہو سکے گا، نہ کوئی برہنہ اب حج کرنے پائے گا، اور وہ تمام معاہدے جو مشرکین سے تھے، اُن کے نقضِ عہد کے سبب سے آج سے چار مہینے کے بعد ٹوٹ جائیں گے۔ حضرت ابوہریرہؓ وغیرہ نے اس اعلان کی اس زور زور سے منادی کی کہ گلا پڑ پڑ گیا۔[۱]

سورۂ برأت کی ابتدائی آیتیں جس میں خدا نے اس اعلان کا حکم فرمایا[۲] یہ ہیں:

بَرَاءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ	اے مسلمانو! جن مشرکین سے تم نے
اِلَى الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ	معاہدہ کیا تھا (اور انھوں نے اپنا
الْمُشْرِكِيْنَ فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ	معاہدہ توڑ دیا) ان کو خدا اور خدا کے
اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا	رسول کی طرف سے کوئی ذمہ داری
اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ	نہیں ہے، اب (اے معاہدہ شکن

---

(۱) ابن حنبل صفحہ ۲۹۹ جلد ۲۔ عام تفصیل زرقانی ج ۳ ص ۱۰۲ وغیرہ میں موجود ہے) "س"

(۲) ان آیات میں یہ بیان ہے کہ مسجد حرام کے پاس (صلح حدیبیہ میں) جو معاہدے ہوئے تھے، وہ ٹوٹ گئے، لیکن وہ معاہدے تو فتح مکہ سے پہلے ہی ٹوٹ گئے تھے اور اسکے بعد کفار سے کوئی معاہدہ نہیں ہوا۔ مصنف نے اس بنا پر اپنے ایک مکتوب ۷۔۲۔۱۰ میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ آیتیں سنہ ۸ھ میں فتح مکہ کے وقت نازل ہوئی ہونگی، اور شاید اسی لیے مصنف نے یہ واقعات قلم انداز کر دیے ہیں لیکن خاکسار جامع کا خیال یہ ہے کہ ممکن ہے کہ معاہدہ کے متعلق یہ آیتیں گو سنہ ۸ھ میں نازل ہوئی ہوں لیکن ان کا عام اعلان مع دیگر ضروری احکام کے جیسا کہ صحاح ستہ کے مستند روایات میں مذکور ہے سنہ ۹ھ کے موسم حج میں ہوا ہو)۔ "س"

وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ
وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ
اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ
اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ
وَرَسُوْلُهٗ ۚ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ
خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ
فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي
اللّٰهِ ۗ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ
عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ
ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا
وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ
اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَ
هُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۭ اِنَّ
اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ

(ع-۱)

مشرکو!) چار مہینے کی تم کو مہلت ہے،
اس میں تم ملک میں چلو پھرو اور جان
لو کہ تم خدا کو عاجز نہ کرسکو گے۔ حج
اکبر کے دن لوگوں کو اعلانِ عام ہے
کہ خدا اور اس کا رسول ان مشرکین کا
ذمہ دار نہیں۔ اگر (تم نے اے مشرکین!)
توبہ کرلی تو یہ تمھارے لیے بہتر ہے، اور
اگر اب بھی پھرے رہو تو یقین کرو کہ
تم خدا کو نہ ہرا سکو گے۔ اے پیغمبر تو
کافروں کو دردناک عذاب کی خوشخبری
سنادے لیکن وہ مشرکین جن سے
تم نے معاہدہ کیا اور انھوں نے اس
کے ایفا میں تمھارے ساتھ کچھ کمی نہ کی
اور تمھارے مقابلے میں انھوں نے
تمھارے دشمنوں کی مدد کی تو زمانہ معاہدہ
کو تم پورا کرو، خدا پرہیزگاروں کو دوست
رکھتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا
الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا
الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ
هٰذَا ج (رکوع-۴)

اے مسلمانو! مشرکین تو ناپاک ہیں
اب وہ اس سال کے بعد کعبہ
کے قریب نہ آئیں۔

طبری نے بواسطہ سدی روایت کی ہے کہ اس اعلان کے بعد کفار عام طور سے مسلمان ہو گئے۔[1]

واقعاتِ متفرقہ (نو سال کے بعد اب مُلک میں امن و امان کا دور شروع ہوا، اب حصولِ دولت کے مواقع حاصل تھے۔ اس بناپر زکوٰۃ کا حکم اس سال نازل ہوا، اور تحصیلِ زکوٰۃ کے لیے عمال، قبائل میں مقرر ہوئے۔[2]

اسلام کے سایہ میں بعض مُسلم قومیں بھی داخل ہو چکی تھیں، ان کے لیے جزیہ کی یہ آیت اُتری:

حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُوْنَ۔	تا آنکہ چھوٹے بن کر وہ جزیہ ادا کریں۔

(توبہ-۴)

سُود کی تحریم بھی اسی سال نازل ہوئی اور اس کے ایک سال بعد سنہ ۱۰ھ میں حجۃ الوداع میں آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے اس کا اعلان عام فرمایا۔

نجاشی جس کے ظلِ حمایت میں مسلمانوں نے چند سال حبشہ میں بسر کیے، اس نے امسال انتقال کیا۔ آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے اس کی وفات کا خود اعلان فرمایا کہ "مسلمانو! آج تمہارے برادر صالح اصحمہ نے وفات پائی، اس کے لیے دُعائے مغفرت مانگو" اس کے بعد نجاشی کے لیے غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی۔

---

(۱) ج ۴ ص ۱۷۲۱ "س" (۲) طبری ج ۴ ص ۱۷۲۲ "س"

غزوات پر دوبارہ نظر

کتاب کا یہ حصّہ سادہ سوانح زندگی پر محدود ہے، بحث و تدقیقات اور رفعِ شکوک کے لیے دُوسرے حصّے ہیں۔ اس بنا پر مناسب یہ تھا کہ غزوات کے متعلق جو مباحث ہیں انہی حصّوں میں لکھے جاتے۔ لیکن کتبِ سیر میں کثرت اور اہمیت دونوں حیثیتوں سے جو واقعات زیادہ تر نمایاں ہیں صرف غزوات ہیں۔ اگر صرف تصانیفِ سیرت کو پیشِ نظر رکھا جائے تو نظر آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمامتر سوانح عمری غزوات ہی کا نام ہے۔ چنانچہ پہلے سیرت پر جو کتابیں لکھی گئیں، وہ سیرت نہیں بلکہ مغازی ہی کے نام سے مشہور ہیں۔ مثلاً مغازی ابن عقبہ، مغازی ابن اسحاق، مغازی واقدی، یہ اندازِ تحریر آج تک چلا آیا۔ اس لیے اگر یہ طرز بالکل بدل دی جائے تو جو شخص کوئی قدیم تاریخ پہلے پڑھ چکا ہوگا وہ اس جدید تصنیف کو پڑھ کر سمجھے گا کہ سیرت کے بجائے کوئی اور چیز پڑھ رہا ہے۔

ان اسباب سے ہم کو بھی غزوات کو تفصیل سے لکھنا پڑا لیکن غزوات کو پڑھ کر جو سوالات دلوں میں پیدا ہو جاتے ہیں اُن کو دوسرے موقع کے لیے اُٹھا رکھنا ناظرین کے لیے اضطراب کا باعث ہوگا۔

غیر مذہب والوں نے غزوات کے مقاصد اور اسباب کے سمجھنے میں سخت غلطیاں کی ہیں۔ نہ صرف بدنیتوں نے، بلکہ نیک دِلوں نے بھی لیکن یہ تعجب کی بات نہیں۔ اسباب ایسے جمع ہیں کہ اس قسم کی غلطیوں پر نہ صرف دوستوں

کو بلکہ دشمنوں کو بھی معذور رکھ سکتے ہیں۔

عرب اور جنگ و غارت گری اس باب میں سب سے مقدم اور سب سے اہم اس حقیقت کا معلوم کرنا ہے کہ عرب کی قومیت کو "جنگ و غارت گری" سے کیا تعلق ہے؟ ہر قوم کے اخلاق و عادات، رسوم و معاملات، محاسن اوصاف معائب و مثالب، غرض اُس کی کل قومی زندگی کا ایک خاص اساس الامر ہوتا ہے کہ سب چیزیں اُسی سے بنتی اور اُسی سے نشو و نما پاتی ہیں۔ عرب میں یہ چیز "جنگ و غارت گری" تھی۔ اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ عرب ایک ویران مُلک تھا۔ کسی قسم کی پیداوار وہاں نہیں ہوتی تھی۔ لوگ اَن پڑھ اور جاہل تھے۔ خورش اور پوشش کا قدرتی سامان صرف بھیڑ بکریاں اور اُونٹ تھے کہ اُن کا دُودھ اور گوشت کھاتے اور بالوں کو بُن کر کمبل بناتے تھے لیکن یہ جائداد بھی ہر شخص کو نصیب نہ تھی، یا تھی تو بقدر ضرورت نہ تھی۔ اس لیے حملہ اور غارت گری شروع ہوئی اور معاش کا سب سے بڑا بلکہ تنہا ذریعہ غارت گری قرار پایا۔ ابوعلی قالی نے کتاب الامالی میں لکھا ہے:

(و ذالک انھم کانوا یکرھون	(یہ اس لیے کہ وہ ناپسند کرتے تھے کہ
ان تتوالی علیھم ثلاثۃ	اُن پر تین ماہ متواتر اس طرح گزر جائیں
اشھر لا تمکنھم الاغارۃ	کہ ان میں وہ غارتگری نہ کر سکیں کیونکہ
فیھا لان معاشھم کان	ان کی معاش کا ذریعہ یہی تھا۔)
من الاغارۃ)	

چونکہ لُوٹ میں زیادہ تر بکریاں ہاتھ آتی تھیں اور بکری کو عربی میں "غنم"

۱؎ کتاب الامالی جلد اوّل صفحہ ۲ مطبوعہ مصر۔

کہتے ہیں۔ اِس لیے لوٹ کے مال کو عربی میں "غنیمت" کہنے لگے[۱] اس لفظ نے پھر یہ وسعت حاصل کی کہ قیصر و کسریٰ کا تاج و تخت لُٹ کر آیا تو اسی نام سے پکارا گیا۔

رفتہ رفتہ یہی لفظ عربی قوم، عربی زبان، عربی تاریخ کا سب سے زیادہ محبوب، سب سے زیادہ نمایاں، سب سے زیادہ وسیع الاثر لفظ بن گیا۔ آج بھی ایک سلطان، ایک رئیس، ایک شیخ القبائل اپنے عزیز و اقارب کو سفر کے وقت رخصت کرتا ہے تو کہتا ہے، سالماً غانماً یعنی "سلامت آنا اور لُوٹ کر لانا"۔ ہماری زبان میں سب سے عزیز چیز کو جو "غنیمت" کہتے ہیں (مثلاً آپ کا تشریف لانا نہایت غنیمت ہے) یہ وہی لفظ ہے اور عربی زبان سے آیا ہے۔

ضرورت معاش کی وجہ سے تمام عرب میں غارت گری اور جنگ عام ہو گئی تھی۔ تمام قبائل ایک دوسرے پر ڈاکہ ڈالتے اور لُوٹ مار کرتے رہتے تھے۔ صرف حج کے زمانے میں مذہبی خیال سے چار مہینے مخصوص کر دیے تھے، جن کو "اشہر حرم" کہتے تھے۔ ان مہینوں میں لڑائیاں بند ہو جاتی تھیں لیکن متصل تین تین مہینے تک معاش کا معطل رہنا سخت گراں تھا۔ اس لیے نسئی ایک رسم ایجاد کر لی تھی۔ یعنی ان مہینوں کو حسب ضرورت دوسرے مہینوں سے بدل لیتے تھے۔

حافظ ابن حجر، صحیح بخاری کی شرح (تفسیر سورۂ توبہ میں لکھتے ہیں:

کانوا یجعلون المحرم صفرًا — وہ محرم کو صفر اور صفر کو محرم کر دیا

---

(۱) یہ مصنف کی ذاتی تحقیق ہے جس کی تائید کتب لغت سے ہاتھ نہیں آئی) "س"

ویجعلون صفوًا المحرم لئلا	کرتے تھے تاکہ پے در پے تین
یتوالی علیھم ثلاثۃ اشھر	مہینے تک لڑائی سے محروم نہ
لا یتعاطون فیھا القتال الخ	ہو جائیں ۔

(ج ۸ ص ۴۴۴)

ثار کا عقیدہ لڑائی کا اصلی ابتدائی سبب یہ تھا، لیکن جب یہ سلسلہ چھڑا تو اور اسباب بھی پیدا ہو گئے اور یہ اسباب اہمیت اور وسعت کے لحاظ سے اصلی سبب سے کم نہ تھے۔ ان میں سب سے مقدم اور شدید الاثر ثار کا قانون تھا۔ یعنی جب کسی قبیلے کا کوئی شخص کسی موقع پر قتل ہو جاتا تھا تو مقتول کے قبیلے کو اس کا انتقام لینا فرض ہو جاتا تھا۔ گو سینکڑوں برس گزر جاتے تھے اور قاتل بلکہ اس کے خاندان کا نام و نشان مٹ جاتا تھا۔ تاہم جب تک قاتل کے قبیلے کے ایک آدمی کو قتل نہیں کر لیتا تھا قومی فرض سے ادا نہیں ہو سکتا تھا، اسی کو ثار کہتے ہیں۔ اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ایک معمولی قتل پر سیکڑوں بلکہ ہزاروں برس تک مسلسل لڑائیاں قائم ہو جاتی تھیں۔ اسی طریقہ کے ابطال کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں اعلان کیا تھا اور اپنے قبیلہ کے قاتلوں کا خون معاف کر دیا تھا۔ لیکن صحرا نشین عربوں میں آج تک یہ طریقہ قائم اور ان کے قومی خصائص کا جزو اعظم ہے ۔

ثار کے متعلق عجیب عجیب قسم کے معتقدات پیدا ہو گئے تھے۔ مثلاً یہ کہ مقتول جب مر جاتا ہے تو اس کی روح پرند بن جاتی ہے اور جب تک اس کا انتقام نہیں لیا جاتا مقام قتل پر شور کرتی رہتی ہے کہ "مجھ کو پلاؤ میں پیاسی ہوں"۔ اس پرند کو صدیٰ یا ہامہ کہتے ہیں ۔

ابو دؤاد ادیادی کہتا ہے:

سلط الموت والمنون علیھم　　فلھم فی صدی المقابر ھام

ان پر موت مسلط ہوگئی اور مقبروں کے "صدی" میں ان کے لیے "ہام" ہے

ذوالاصبع العدوانی کا شعر ہے:

یا عمرو ان لا تدع شتمی و منقصتی　　اضربک حیث تقول الھامۃ اسقونی

اے عمرو! اگر تو مجھ کو گالی دینا اور میری تحقیر کرنا نہ چھوڑے گا، تو میں تجھ کو اس طرح ماروں گا کہ ہامہ کہیگی کہ مجھ کو سیراب کرو

ایک یہ خیال تھا کہ جس مقتول کا انتقام نہیں لیا جاتا اس کی قبر میں ہمیشہ اندھیرا رہتا ہے۔ عمرو بن معدی کرب کی بہن مقتول کی زبان سے کہتی ہے:

واترك فی قبر بصعدۃ مظلم　　خون بہا لو گے تو میں اندھیری قبر میں پڑا رہونگا۔

اسی بنا پر خون بہا لینے کو عیب سمجھتے تھے۔ اسی شاعرہ کا مصرع ہے:

ومشوا باذان النعام المصلم

اور خون بہا لینا ہے تو بوچے شترمرغ کا کان پکڑ کرلے جاؤ

غیرت اور حمیت کی بنا پر اس بات کو عیب سمجھتے تھے کہ مقتول پر نوحہ کیا جائے:

ولا تراھم وان جلت مصیبتھم　　مع البکاۃ علی من مات یبکونا

گو کتنی ہی بڑی مصیبت ہو لیکن ان کو مرنے والے پر روتا ہوا نہ دیکھو گے

عمرو بن کلثوم:

معاذ الالٰہ ان ینوح نساءنا　　علی ھالك او ان نضج من القتل

خدا نہ کرے کہ ہماری عورتیں مقتول پر نوحہ کریں یا ہم قتل سے گھبرا جائیں۔

مقتول پر نوحہ کرتے تھے تو اس وقت کرتے تھے جب خون کا انتقام

لے لیتے تھے +

مَن کان مسرورًا بمقتل مالکٍ
فلیات نسوتنا بوجہ نہار

جو شخص مالک کے قتل سے خوش تھا
وہ دن کو ہماری عورتوں کے پاس آئے

یجد النساء حواسرا یندبنہ
یلطمن اوجھن بالاسحار

وہ دیکھیگا کہ عورتیں ننگے سر نوحہ کر رہی ہیں
اور صبح کو اپنے چہروں پر دو ہتڑ مار رہی ہیں

ایک خیال یہ تھا کہ جو شخص زخم کھا کر مرتا ہے، اس کی رُوح زخم کی راہ سے نکلتی ہے، ورنہ ناک کی راہ سے نکلتی ہے اور یہ نہایت عیب سمجھا جاتا تھا۔ اسی بنا پر بیماری سے مرنے کو "حتف الف" کہتے تھے، یعنی "ناک کی موت" اور ایسے مرنے کو نہایت عار سمجھتے تھے +

وما مات منّا سیدٌ حتف انفہ
ولا طُلّ منّا حیث کان قتیلُ

ہمارا کوئی سردار ناک کی راہ سے نہیں مرا
اور نہ ہمارے کسی مقتول کا خون ھدر ہوا

رفتہ رفتہ عرب کے تمام قومی مفاخر اور اخلاق و عادات کا اصلی محور جنگ بن گیا تھا۔ یعنی اُن کے اوصاف و اخلاق میں جس چیز کا اصلی سبب تلاش کیا جائے یہی چیز نکلتی تھی۔ یہی چیز تھی جس نے ایک مدت تک قبائل عرب کو اسلام لانے سے باز رکھا حضرت عمروؓ بن مالک جب آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں اسلام لاکر اپنے قبیلہ میں واپس گئے اور اسلام کی دعوت دی تو انھوں نے کہا "بنو عقیل پر ہمارا اثار باقی ہے وہ لے لیں تو اسلام لائیں"۔ چنانچہ اُسی وقت بنو عقیل پر جو اسلام لاچکے تھے حملہ آور ہُوے، اور خود حضرت عمروؓ بن مالک نے اس میں شرکت کی۔ گو پھر اُن کو بہت ندامت ہُوئی کہ اُن کے ہاتھ سے ایک مسلمان مارا گیا +

لہ اصابہ فی احوال الصحابہ ذکر عمروؓ بن مالک (ج ۳ ص ۱۳) "س"

لوٹ کا مال چونکہ، جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں لڑائیوں کی اصل بنیاد ضرورت معاش سے شروع ہوئی تھی، اس لیے عرب کے نزدیک مالِ غنیمت سے زیادہ کوئی شے محبوب نہ تھی اور ذرائعِ معاش میں سب سے زیادہ حلال و طیّب اسی کو سمجھتے تھے۔ یہ خیال اس قدر دلوں میں راسخ اور رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا کہ اسلام کے بعد بھی ایک مدت تک قائم رہا اور جس طرح شارع نے ممنوعاتِ شرعیہ کو بتدریج حرام اور ممنوع کیا تھا، غنیمت کے متعلق نہایت تدریج اور آہستگی سے کام لینا پڑا۔

شراب کو جب شارع نے حرام کرنا چاہا تو پہلے یہ آیت اتری:

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَا اِثْمٌ كَبِيْرٌ (بقرہ-۲۷)	لوگ تجھ سے شراب اور قمار کی بابت پوچھتے ہیں، کہہ دے کہ دونوں میں بڑا گناہ ہے۔

اس پر حضرت عمرؓ نے کہا:

اَللّٰهُمَّ بين لنا فی الخمر بيانا شافيا۔	اے خدا شراب کے متعلق ہم کو صاف احکام بتا۔

پھر یہ آیت اتری:

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى (نساء-۷)	نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو۔

چنانچہ نماز کا وقت آتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ایک شخص منادی پکارتا کہ کوئی شخص نشہ میں نماز کو نہ آئے۔ پھر یہ آیت اتری:

ل مسند امام احمد ابن حنبل مطبوعہ مصر (ج ۱ صفحہ ۵۳) و ابوداؤد کتاب الاشربۃ باب تحریم الخمر) (س)

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ، إِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ؟	مسلمانو! شراب، جوا، انصاب، فال کے تیر، یہ سب ناپاک اور شیطان کے کام ہیں، تو ان سے بچو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ شیطان تو صرف یہ چاہتا ہے کہ شراب اور قمار کے ذریعے سے تم لوگوں میں عداوت اور بغض ڈالے اور تم کو خدا کی یاد سے اور نماز سے روکے۔ تو تم باز آؤگے؟

(مائدہ - ۱۲)

باوجود اس کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کی حرمت کے متعلق اس قدر تاکید و تصریح کی ضرورت خیال کی کہ جس قسم کے برتنوں میں شراب پیتے تھے، تڑوا دیے۔ لوگوں نے عرض کی کہ شراب کا سرکہ بنالیں، اس سے بھی منع فرمایا۔ ان سب باتوں پر بھی حضرت عمرؓ کے زمانے میں بعض لوگوں نے شرابیں پیں، اور جب اُن سے باز پرس کی گئی تو اُنھوں نے نیک نیتی سے کہا کہ نیک اور اچھے آدمیوں کے لیے شراب کہاں حرام ہے؟ قرآن مجید میں خود شراب کی حُرمت کے بعد یہ تصریح موجود ہے:

لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ	جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کیے انھوں نے جو کچھ کھایا پیتی

فِیْمَا طَعِمُوْا ۔ (مائدہ۔۱۲) شراب پی ، اُن پر کچھ الزام نہیں۔

اس موقع پر بہت سے صحابہ موجود تھے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی طرف دیکھا کہ اس آیت سے کیا مُراد ہے ؟ اُنھوں نے کہا کہ یہ ان صحابہ کی نسبت ہے جو شراب کی حرمت نازل ہونے سے پہلے مر گئے۔ حضرت عمرؓ نے تصدیق کی اور ان لوگوں کو سزا دی۔ چنانچہ یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ تاریخ طبری میں مذکور ہے +

اس تفصیل سے مقصود یہ ہے کہ جب کوئی چیز زمانہ دراز سے رسم و عادات میں داخل ہو جاتی ہے تو اس کے آثار اور مخفی نتائج مدتوں تک قائم رہتے ہیں ، اور غنیمت کا بھی یہی حال ہے +

سب سے پہلے جنگِ بدر میں قبل اس کے کہ مالِ غنیمت یکجا جمع کیا جاتا ، لوگ غنیمت میں مصروف ہو گئے ، اس پر یہ آیت اُتری :

لَوْلَا کِتَابٌ مِّنَ اللّٰہِ سَبَقَ لَمَسَّکُمْ فِیْمَا اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝ (انفال ۔ ۹)

اگر خدا کی طرف سے پہلے حکم نہ ہو چکا ہوتا تو جو کچھ لیا اس پر تم کو عذاب ہوتا +

چنانچہ صحیح ترمذی تفسیر انفال میں یہ واقعہ بہ تصریح مذکور ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا تھا کہ " جو شخص کسی کافر کو قتل کرے گا ، اُس کا مال و اسباب قاتل کو ملے گا " [1] اس بنا پر لوگوں نے مسلوبہ مال کا دعویٰ کیا جو صحابہ خود لڑے نہ تھے بلکہ علَم اور رایت کے محافظ تھے ، اُن کا دعویٰ تھا کہ اس میں ہمارا بھی حق ہے ، اس پر یہ آیت اُتری :

---

[1] سنن ابی داؤد باب النفل ۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۔ (انفال - ۱)

لوگ تجھ سے مالِ غنیمت کے متعلق پوچھتے ہیں، کہ دے غنیمت خدا اور رسول کی ہے ۔

اس آیت سے مقصود یہ ہے کہ مجاہدین مالِ غنیمت کا خود دعویٰ نہیں کر سکتے اس کی تقسیم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار میں ہے، جس طرح آپؐ چاہیں تقسیم فرمائیں۔ اس سے اتنا ہوا کہ لڑائیوں میں ہر شخص خود لوٹ کر جو چیز چاہتا تھا، لیتا تھا، بند ہو گیا۔ لیکن میدانِ جنگ کے علاوہ اور موقعوں پر لوٹنا مدتوں موقوف نہیں ہوا۔ سُنن ابی داؤد میں ایک انصاری سے روایت ہے کہ ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں شریک تھے۔ بھوک کی سخت تکلیف ہوئی۔ اتفاقاً سامنے بکریاں نظر پڑیں، اُن کو لُوٹ لائے اور ذبح کر کے ہانڈیاں چڑھا دیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپؐ تشریف لائے، اور کمان جو ہاتھ میں تھی اس سے دیگچیاں اُلٹ دیں اور فرمایا کہ "لوٹ کی چیز مُردہ سے بڑھ کر حلال نہیں"۔[1]

خیبر کی لڑائی ۷ھ میں ہوئی، اس وقت تک یہ حال تھا کہ امن کے بعد لوگوں نے یہودیوں کے جانور اور پھل لُوٹ لیے۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت غصّہ آیا، آپؐ نے تمام صحابہ کو جمع کیا اور فرمایا:

ان اللّٰہ تعالیٰ لم یحل لکم ان تدخلوا بیوت اھل الکتاب الا باذن ولا ضرب

خدا نے تم لوگوں کے لیے یہ نہیں جائز کیا ہے کہ اہلِ کتاب کے گھروں میں گھس جاؤ مگر بہ اجازت اور

---

[1] کتاب الجہاد باب فی النہی

نسائھم ولا اکل ثمارھم اذا اعطوکم الذی علیھم۔ | نہ یہ کہ ان کی عورتوں کو مارو نہ یہ کہ ان کے پھل کھاجاؤ، جب کہ وہ تم کو وہ ادا کریں جو ان پر فرض ہے۔

(سنن ابی داؤد باب تعشیر الذمۃ اذا اختلفوا فی التجارۃ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ غنیمت کے ساتھ لوگوں کا جو شغف ہے کم ہوجائے، لیکن مدت تک غنیمت کی محبت اور وارفتگی نہ گئی۔ غزوۂ اُحد میں صرف اس وجہ سے شکست ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ تیر اندازوں کو سخت تاکید فرمادی تھی کہ گو لڑائی کی کچھ حالت ہو تم اپنی جگہ سے نہ ہٹنا۔ تاہم جب فتح ہوئی تو لوگ بے اختیار لوٹ میں مصروف ہوگئے ان کا ہٹنا تھا کہ دشمن نے موقع پاکر پشت کی طرف سے حملہ کردیا۔ حنین میں بھی شکست کی اصلی وجہ یہی تھی کہ قبل از وقت لوگوں نے غنیمت لوٹنی شروع کردی تھی +

"غنیمت" اس قدر محبوب تھی کہ بعض صاحبوں کو کسی کافر کے مسلمان ہونے پر اس بنا پر رنج ہوا کہ اسلام لانے کی وجہ سے اس کا مال نہ مل سکا۔ سنن ابی داؤد میں ہے کہ ایک صحابی نے ایک سریہ میں حملہ کرنا چاہا' قبیلہ والے روتے ہوئے آئے۔ انھوں نے کہا لا الٰہ الا اللہ کہو تو تمھاری جان اور مال بچ جائے گا۔ انھوں نے لا الٰہ الا اللہ کہا اور ان کو امن دے دیا گیا۔ جب یہ اپنے ساتھیوں میں آئے تو لوگوں نے ان کو ملامت کی کہ:

احرمتنا الغنیمۃ | تم نے ہم کو غنیمت سے محروم کردیا۔

لہ ابوداؤد باب مایقول اذا اصبح، کتاب الادب۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب یہ لوگ گئے تو آپ نے اس صحابی کی تحسین کی اور فرمایا کہ "تم کو ایک ایک آدمی کے بدلے (جس کو تم نے چھوڑ دیا) اس اس قدر ثواب ملے گا"۔

سب سے بڑھ کر عجیب بات یہ تھی کہ مدت تک لوگ یہ سمجھا کیے کہ غنیمت حاصل کرنا ثواب کا کام ہے سنن ابی داؤد میں ہے کہ ایک صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ "یا رسول اللہ! ایک شخص جہاد پر جانا چاہتا ہے کہ کچھ مال ہاتھ آئے"۔ آپ نے فرمایا کہ "اس کو کچھ ثواب نہیں ملے گا"۔ یہ جواب انھوں نے آکر لوگوں سے بیان کیا تو لوگوں کو بہت تعجب ہوا، اور ان سے کہا کہ تم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلب نہیں سمجھا، پھر جاکر پوچھو۔ انھوں نے دوبارہ پوچھا اور وہی جواب ملا۔ لوگوں نے پھر ان کو بھیجا، اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فرمایا کہ اس کو کچھ ثواب نہیں ملے گا[۱]۔

اس قسم کے اور بہت سے واقعات ہیں۔

وحشیانہ افعال عرب میں لڑائیوں کی شدت اور وسعت نے نہایت وحشیانہ رسمیں قائم کر دی تھیں، جن میں سے چند کی تفصیل یہ ہے:

(۱) اسیرانِ جنگ کو جب قتل کرتے تھے تو چھوٹے چھوٹے بچوں اور عورتوں کو بھی قتل کرتے تھے بلکہ آگ میں جلا دیتے تھے[۲]۔

(۲) غفلت یا نیند کی حالت میں دفعۃً دشمن پر جا پڑتے تھے اور قتل و غارت گری شروع کر دیتے تھے۔ یہ طریقہ عام اور کثرت سے رائج تھا۔

---

[۱] سنن ابی داؤد کتاب الجہاد فی من یغزو و یلتمس الدنیا [۲] مجمع الامثال کرمانی مطبوعہ ایران صفحہ ۲۴۲۔

بہت سے بہادر اس خاص طریقہ میں زیادہ ممتاز تھے، اور ان کو فاتک یا فتاک کہتے تھے۔ تابط شرا، سلیک ابن السلکہ اسی قسم کے لوگ تھے۔

(۳) زندوں کو آگ میں جلادیتے تھے۔ عمرو بن ہند (عرب کا ایک بادشاہ تھا) کے بھائی کو جب بنو تمیم نے قتل کر دیا تو اس نے منت مانی کہ ایک کے بدلے سو آدمیوں کو قتل کروں گا۔ چنانچہ بنو تمیم پر حملہ کیا، وہ لوگ بھاگ گئے صرف ایک بڑھیا رہ گئی تھی جس کا نام حمراء تھا، اس کو گرفتار کر کے زندہ آگ میں ڈال دیا۔ اتفاق یہ کہ ایک سوار جس کا نام عمار تھا آنکلا۔ عمرو نے پوچھا تو کیوں آیا؟ اس نے کہا میں کئی دن کا بھوکا تھا۔ دھواں اٹھتے دیکھا تو سمجھا کھانا ہوگا۔ عمرو نے حکم دیا کہ وہ بھی آگ میں ڈال دیا جائے۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل کی گئی۔ جریر نے اپنے شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے:

وخزاکم عمرو کما خزیتھم   وادرک عمارا اشقی البراجم

(۴) بچوں کو نشانہ بنا کر تیروں سے مارتے تھے۔ داحس اور غبراء کی لڑائیوں میں قیس نے بنو ذبیان کے پاس اپنے بچے ضمانت کے طور پر رکھے تھے۔ حذیفہ نے جو بنو ذبیان کا رئیس تھا، ان بچوں کو لے جا کر ایک وادی میں کھڑا کیا اور ان کو نشانہ بنا کر قدر اندازی کرتا تھا۔ اتفاق سے کوئی لڑکا نہ مرا تو دوسرے دن پر اٹھا رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ دوسرے دن یہ تفریح انگیز چاند ماری پھر شروع ہوتی تھی اور لوگ یہ تماشا دیکھتے تھے۔

(۵) قتل کا ایک یہ طریقہ تھا کہ ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضا کاٹ کر چھوڑ دیتے تھے کہ وہ تڑپ تڑپ کر مر جاتا۔ غطفان اور عامر کی لڑائی میں اسی خوف

۱؎ مجمع الامثال صفحہ ۷۷، ۴۔

سے حکم بن الطفیل نے اپنے آپ کو خود گلا گھونٹ کر مار ڈالا تھا، جیسا کہ عقد الفرید میں یہ تفصیل مذکور ہے۔

عرنیہ کے لوگ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بظاہر اسلام لاکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام کو پکڑ کر لے گئے تو اُن کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے، پھر اُن کی آنکھوں اور زبان میں کانٹے چبھوئے، یہاں تک کہ وہ تڑپ تڑپ کر مر گئے[۱]۔

(۶) مرنے کے بعد بھی انتقام کا جوش طرح طرح کی نفرت انگیز صورتوں میں ظاہر ہوتا تھا۔ مُردوں کے ہاتھ، پاؤں، کان وغیرہ کاٹ لیتے تھے۔ ہند نے جنگ اُحد میں اسی رسم کے موافق حضرت حمزہ رضؓ اور دیگر شہداء کے اعضا کاٹ کر ہار بنایا اور گلے میں پہنا تھا۔

(۷) منت مانتے تھے کہ دشمن پر قابو ہاتھ آئے گا تو اس کی کھوپڑی میں شراب پئیں گے۔ سلافہ کے دو بیٹے جنگ اُحد میں عاصم کے ہاتھ سے مارے گئے تھے۔ اس پر سلافہ نے منت مانی کہ عاصم کی کھوپڑی میں شراب ڈال کر پیے گی۔ یہ بھی معمول تھا کہ مقتول کا کلیجہ نکال کر کھا جاتے تھے۔ ہند نے حضرت حمزہ کا کلیجہ جو نکال کر چبا لیا تھا۔ اس کا حال اوپر گزر چکا ہے۔

(۸) حاملہ عورتوں کا پیٹ چاک کر ڈالتے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ عامر بن طفیل عرب کا مشہور بہادر اور رئیس ہوازن کہتا ہے:

---

[۱] یہ واقعہ تمام کتب حدیث میں مذکور ہے لیکن یہ تفصیل طبقات ابن سعد ج ۲ قسم اول) صفحہ ۶۷ سے ماخوذ ہے مسلم میں صرف آنکھوں کا اندھا کرنا مذکور ہے [۲] طبقات ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۳۹ (سریہ مرثد بن ابی مرثد) "س"

بقرنا الحبالی من شنوۃ بعدما جطن بفیف الرمح نهداۃ خثما

غزواتِ نبوی کے اسباب[1] اور انواع

تفصیلِ مذکورۂ بالا کے بعد اب ہم اس واقعہ کی تحقیق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ غزواتِ نبوی کن اسباب سے وجود میں آئے اور شارع علیہ السلام نے طریقۂ قدیم میں کیا اصلاحیں فرمائیں۔

مورّخین نے "غزوہ" کے لفظ کو اس قدر وسعت دی ہے کہ امن و امان قائم رکھنے کے لیے دو چار آدمی بھی کہیں بھیج دیے گئے تو اس کو بھی انھوں نے غزوہ میں شمار کر لیا۔ غزوہ کے علاوہ ایک اور لفظ ہے یعنی "سریہ" غزوہ اور سریہ میں لوگوں کے نزدیک یہ فرق ہے کہ غزوہ میں کم سے کم آدمیوں کی ایک خاص تعداد ضروری ہے، سریہ میں کوئی قید نہیں۔ ایک آدمی بھی کہیں لڑائی کی دیکھ بھال کو بھیج دیا گیا تو یہ بھی سریہ ہے۔ بعضوں کے نزدیک غزوہ کے لیے یہ شرط ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے بہ نفسِ نفیس اس میں شرکت کی ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ جن واقعات کو مورّخین سریہ کہتے ہیں، وہ چند قسموں پر منقسم ہے:

(۱) محکمۂ تفتیش یعنی دشمنوں کی نقل و حرکت کی خبر رسانی؛

(۲) دشمنوں کے حملے کی خبر سن کر مدافعت کے لیے پیشقدمی کرنا؛

(۳) قریش کی تجارت کی روک ٹوک تاکہ وہ مجبور ہو کر مسلمانوں کو حج و عمرہ کی اجازت دیں؛

---

[1] یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ یہ بحث تمام تر تاریخی حیثیت سے ہے۔ جہاد کی اصل حقیقت پر بحث کتاب کی دوسری جلدوں میں آئے گی۔

(۴) امن و امان قائم کرنے کے لیے تعزیری فوجیں بھیجنا؛

(۵) اشاعت اسلام کے لیے یہ لوگ بھیجے گئے، اور حفاظت کے خیال سے کچھ فوج ساتھ کر دی گئی، اس صورت میں تاکید کر دی جاتی تھی کہ تلوار سے کام نہ لیا جائے۔

غزوہ کی صرف دو صورتیں تھیں:

(۱) دشمنوں نے دارالاسلام پر حملہ کیا اور ان کا مقابلہ کیا گیا۔

(۲) یہ معلوم ہوا کہ دشمن مدینہ پر حملے کی تیاری کر رہے ہیں اور پیش قدمی کی گئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جو لڑائیاں واقع ہوئیں یا اس قسم کے جو واقعات پیش آئے انہی مختلف اغراض سے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے چلے آئے تو قریش نے فیصلہ کر لیا کہ اسلام کو مٹا دیا جائے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر اسلامی تحریک قائم رہی تو ایک طرف ان کے مذہب کو صدمہ پہنچے گا، دوسری طرف تمام عرب میں ان کا جو تفوق اور اثر اور مرجعیت عام ہے سب جاتا رہے گا۔ اس بنا پر ایک طرف تو قریش نے خود مدینہ پر حملے کی تیاریاں شروع کیں، دوسری طرف تمام قبائل عرب کو بھڑکایا کہ یہ نیا گروہ اگر کامیاب ہو گیا تو تمہاری آزادی بلکہ ہستی بھی فنا ہو جائے گی۔

بیعت عقبہ میں جب انصار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے تو ایک انصاری نے کہا "برادرانِ من! جانتے ہو کس چیز پر بیعت کر رہے ہو؟ یہ عرب و عجم سے اعلانِ جنگ ہے۔" اوپر ہم مسند دارمی کے حوالے سے نقل کر آئے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

جب مدینہ میں تشریف لائے تو تمام عرب مدینہ پر حملہ کے لیے تیار ہو گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ مدینہ میں مہاجرین اور انصار رات کو سوتے تھے تو ہتھیار باندھ کر سوتے تھے، اوپر گزر چکا ہے (بحوالہ[1] ابوداؤد) کہ قریش نے عبداللہ ابن ابی کو پیغام بھیجا کہ "محمدؐ کو وہاں سے نکال دو، ورنہ ہم خود مدینہ آکر تمہارا اور محمدؐ دونوں کا فیصلہ کر دیں گے۔"

محکمہ تفتیش

ان واقعات کی بناء پر ضرور تھا کہ اسلام اور دارالاسلام کی حفاظت کے لیے ضروری تدبیریں اختیار کی جائیں۔ اس سلسلے کا سب سے پہلا کام یہ تھا کہ خبر رسانی اور جاسوسی کا انتظام وسیع پیمانے پر کیا جائے۔ چنانچہ ابتدا ہی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس انتظام پر توجہ کی۔ وقتاً فوقتاً چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں بنا کر مختلف مقامات پر بھیجتے رہتے تھے۔ یہ ٹکڑیاں گو محض خبر رسانی کے لیے جاتی تھیں، لیکن حفاظت کی غرض سے مسلح اور جمعیت کی صورت میں جاتی تھیں۔

یہی واقعات ہیں جن کو مورخین "سرایا" سے تعبیر کرتے ہیں اور ان کے نزدیک اس کا مقصد کسی قافلے کا لوٹنا یا کسی جماعت پر بے خبری کی حالت میں جا پڑنا ہوتا تھا۔

ایک بڑا قرینہ اس بات کا کہ ان دستوں کے بھیجنے سے حملہ کرنا مقصود نہیں ہوتا تھا یہ ہے کہ دستے اکثر دس دس بارہ بارہ آدمیوں سے زیادہ نہیں ہوتے تھے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اتنے تھوڑے سے آدمی لڑنے کے لیے نہیں بھیجے جا سکتے تھے۔

---

[1] باب فی خبر النضیر

سریۂ ابن جحش رض مثلاً سنہ ۲ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ رض بن جحش کو بارہ آدمیوں کے ساتھ مکہ کی طرف بھیجا اور ایک سربمہر تحریر دی کہ دو دن کے بعد اس خط کو کھولنا۔ دو دن کے بعد انھوں نے کھولا تو اس میں یہ الفاظ تھے:

فسر حتی تنزل نخلة بین	برابر چلے جاؤ یہاں تک کہ نخلہ میں جا کر
مکة والطائف فترصد	ٹھہرو جو مکہ اور طائف کے بیچ میں ہے
بها قریشا وتعلم لنا من	اور قریش کی دیکھ بھال کرتے رہو اور
اخبارهم۔ (طبری صفحہ ۱۲۷۴)	ان کی خبریں دریافت کرو۔

مدافعت اس انتظام کا یہ نتیجہ تھا کہ جب کوئی مدینہ پر حملہ کرنے کا ارادہ کرتا تو فوراً خبر ہو جاتی اور پیش دستی کر کے فوجیں بھیج دی جاتیں۔ اکثر سرایا اسی قسم کے تھے۔ اور چونکہ ہم سرایا کا ذکر زیادہ تر قلم انداز کر آئے ہیں، اس لیے مثال کے طور پر چند سرایا کا ذکر کرتے ہیں۔ اور قدمائے اہل سیر کی تصریحات سے ثابت کرتے ہیں کہ یہ مہمیں مدافعت کی غرض سے تھیں۔

سریۂ غطفان
سنہ ۳ھ

وذلك انه بلغ رسول الله	اس غزوہ کا سبب یہ تھا کہ آنحضرت
صلی الله علیه وسلم ان جمعا	صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر پہنچی کہ قبیلہ
من بنی ثعلبة ومحارب	بنو ثعلبہ اور محارب کی ایک فوج ذوامر
بذی امر قد تجمعوا یریدون	میں اس غرض سے جمع ہوئی ہے کہ
ان یصیبوا من اطراف	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف
رسول الله صلی الله علیه وسلم	حملہ کرے۔ اس فوج کو ایک

جمعھم رجل منھم یقال لہ دعثور بن الحارث۔ الخ (طبقات صفحہ ۲۳)

شخص نے فراہم کیا، جس کا نام دعثور ہے۔

سریہ ابوسلمہ سنہ ۲ھ

وذالک انہ بلغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان طلیحۃ وسلمۃ ابنی خویلد قد سارا فی قومھما ومن اطاعھما یدعونھم الی حرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ الخ (ابن سعد صفحہ ۳۵)

اس سریہ کی وجہ یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر لگی کہ طلیحۃ اور سلمۃ (پسران خویلد) دونوں اپنی قوم اور اپنے پیروؤں کو لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑنے کے لیے روانہ ہوئے ہیں۔

سریہ عبداللہ بن انیس بہ غرض قتل سفیان بن خالد سنہ ۳ھ

وذالک انہ بلغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سفیان بن خالد الھذلی ثم اللحیانی وکان ینزل عرنہ وما والاھا فی ناس من قومۃ وغیرھم قد جمع الجموع لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

ابن انیس اس لیے بھیجے گئے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر لگی کہ سفیان بن خالد اپنے قبیلہ کو اور باہر کے لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑنے کے لیے جمع کر رہا ہے۔

غزوهٔ ذات الرقاع
۵ھ

فاخبر اصحاب رسول الله صلّی اللہ علیہ وسلم ان انمار و ثعلبۃ قد جمعوا لهم الجموع ..... فمضی)

ایک جاسوس نے آکر صحابہ کو اطلاع کی کہ انمار اور ثعلبہ وغیرہ مسلمانوں سے لڑنے کے لیے فوجیں جمع کر رہے ہیں آپ چل کھڑے ہوئے۔

غزوهٔ دومۃ الجندل
۵ھ

قالوا بلغ رسول الله صلّی الله علیه وسلم ان بدومة الجندل جمعاً کثیراً ..... وانهم یریدون ان یدنوا من المدینة۔ (ابن سعد ص ۳۳)

رواۃ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کو خبر لگی کہ دومۃ الجندل میں ایک گروہ کثیر جمع ہے اور مدینہ پر بڑھنا چاہتا ہے۔

غزوهٔ مُریسیع
۵ھ

ان بنو مُصطلق من خزاعة وهم من حلفاء بنی مدلج وکان راسهم وسیدهم الحارث بن ابی ضرار فسار فی قومه ومن قدر علیه من العرب فدعاهم الی حرب

قبیلہ بنو مصطلق خزاعہ کی شاخ ہے اور یہ لوگ بنو مدلج کے حلیف ہیں اور ان کا سردار حارث بن ابی ضرار تھا، وہ اپنی قوم کو اور نیز اور لوگوں کو جو اس کے قابو میں تھے، لے کر چلا۔ اور لوگوں کو رسول اللہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاجابوہ۔ (ابن سعد ص۴۵)

صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑنے کی دعوت دی، اور لوگوں نے منظور کی۔

سریۂ فدک

سریۂ علی بن ابی طالب، بہ طرف فدک، ۶ھ

بلغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لھم جمعاً وانہ یریدون ان یمدوا یہود خیبر۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ بنو سعد فدک میں یہود خیبر کی کمک کے لیے فوج جمع کر رہے ہیں۔

سریۂ بشیر بن سعد شوال ۷ھ

بلغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان جمعاً من غطفان بالجناب قد واعدھم عیینۃ بن حصن لیکون معھم لیزحفوا الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر پہنچی کہ غطفان کا ایک گروہ مقام جناب میں جمع ہے اور ان سے عیینہ بن حصن نے وعدہ کیا ہے کہ ان کے ساتھ مل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ آور ہوگا۔

سریۂ عمرو بن العاص ذات سلاسل ۸ھ

یہ مقام مدینہ سے ۸ منزل ہے۔

بلغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان جمعا من قضاعۃ قد تجمعوا یریدون ان یدنوا الی اطراف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر پہنچی کہ قضاعہ کا ایک گروہ جمع ہوا ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف بڑھے۔

قریش کی تجارت کی روک ٹوک

بخاری کے حوالے سے ہم اوپر نقل کر آئے ہیں کہ (قریش اور مسلمانوں میں جنگ چھڑنے سے پہلے) ابوجہل نے حضرت معاذ انصاری ؓ سے کعبہ میں یہ کہا تھا کہ "اگر تم لوگ محمد ؐ کو نکال نہ دو گے تو تم کعبہ کا طواف نہیں کر سکتے" انھوں نے جواب دیا تھا کہ "تم نے اگر ہم کو کعبہ میں آنے سے روکا تو ہم تمھاری شام کی تجارت روک دیں گے" (مکہ سے شام کو جو قافلہ جاتا تھا، مدینہ اس کی راہ میں پڑتا تھا) کعبہ مسلمانوں کی خاص چیز تھی۔ کیونکہ کعبہ جس نے تعمیر کیا تھا مسلمان اسی کے دین (ابراہیمی) کے پیرو تھے۔ باوجود اس کے قریش نے مسلمانوں کو عموماً حج اور عمرہ سے روک دیا اور اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ان کا کاروانِ تجارت روک دیا جائے کہ وہ مجبور ہو کر مسلمانوں کو کعبہ کے اندر جانے کی اجازت دے دیں +

بعض سرایا قبل حدیبیہ

سرایا کے ذکر میں اکثر جگہ اہلِ سیر لکھتے ہیں کہ "تعرض لعیر قریش" یعنی اس لیے فوجیں بھیجی گئیں۔ یا خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے کہ کاروانِ قریش کی روک ٹوک کی جائے"۔ یہ تمام مہمات اسی غرض کے لیے تھیں۔ لیکن چونکہ قریش تجارت کے لیے بھی ہتھیار بند ہو کر نکلتے تھے اور کم از کم سو دو سو کی جمعیت ساتھ لے کر جاتے تھے۔ اس لیے روک ٹوک میں کبھی کبھی مقابلہ پیش آجاتا تھا۔ اور جب قریش شکست کھا کر بھاگ جاتے تھے تو مالِ تجارت غنیمت میں ہاتھ آتا تھا۔ اہلِ سیر غلطی سے ان واقعات کو اس پیرایہ میں لکھتے ہیں کہ قافلے کا لوٹنا ہی اصلی مقصد تھا +

یہی روک ٹوک تھی جس کی بناء پر قریش نے بالآخر حدیبیہ کی صلح

کرلی جس کی رُو سے مسلمانوں کو چند خاص پابندیوں کے ساتھ حج کی اجازت مل گئی۔ قریش پر کاروانِ تجارت کی روک ٹوک کا اس قدر اثر پڑتا تھا کہ (حضرت ابو ذر غفاری رضؓ نے مکہ میں جب اپنے اسلام کا اعلان کیا اور قریش نے اس جرم میں ان کو مارنا پیٹنا شروع کیا اور حضرت عباس رضؓ نے کہا کہ غفار کا قبیلہ تمھارے کاروانِ تجارت کے سرِ راہ واقع ہے، تمھاری اس حرکت سے برہم ہو کر وہ راستہ نہ روک دے، تو یہ تدبیر پوری کارگر ہوئی اور انھوں نے ڈر کر حضرت ابو ذرؓ کو چھوڑ دیا) صلح حدیبیہ کے بعد قریش کی خواہش کے مطابق جب یہ طے ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے نومسلموں کو واپس دے دیں گے، اور ان نومسلموں نے مکہ سے بھاگ کر شام کی راہ میں اپنا ایک مستقر قائم کرلیا (اور قریش کی تجارت کی راہ کو غیر مامون کردیا) تو قریش نے بالآخر اجازت دے دی، کہ جو مسلمان چاہے مکہ سے مدینہ چلا جائے، ان کی طرف سے کوئی روک ٹوک نہ ہوگی۔ (پھر آئندہ سال انھوں نے مسلمانوں کو حج وعمرہ کی اجازت دے دی۔ اس کے بعد پھر کبھی مسلمانوں نے قریش کے کاروانِ تجارت سے تعرض نہیں کیا، بلکہ خود اس کی حفاظت کے لیے فوج بھیجتے تھے۔

امن وامان قائم کرنا اوپر گزر چکا ہے کہ عرب میں اس سرے سے اُس سرے تک مطلق امن وامان نہ تھا۔ تمام قبائل باہم لڑتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ محترم مہینوں میں بھی بہانے نکال کر مہینوں کے نام بدل دیتے تھے اور لڑتے تھے۔ تجارت بالکل غیر محفوظ تھی۔ قافلوں کا لوٹ لینا عام بات

لہ فتح الباری ج ۸ ص ۶۱ ۔ ۱۲

تھی، جیسا کہ بدقسمتی سے آج بھی بدّو قافلوں کو لوٹتے رہتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا نے اس لیے بھیجا تھا کہ نہ صرف وعظ و پند بلکہ دست و بازو سے بھی تمام عرب بلکہ تمام دُنیا میں امن و امان قائم کریں۔ کیونکہ خونریزی اور قتل سے زیادہ کوئی چیز خدا کو ناپسند نہیں؛

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًاۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا۔

اسی لیے ہم نے بنی اسرائیل کو لکھ دیا تھا کہ جس شخص نے ایک جان کو بغیر معاوضہ (یا زمین میں فساد) کے قتل کر دیا، اس نے تمام عالم کو قتل کر دیا۔

(مائدہ - ۵)

وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝ (بقرہ - ۲۵)

اور جب وہ پھر کر جاتا ہے تو کوشش کرتا ہے کہ زمین میں فساد برپا کرے، اور کھیتی اور نسل کو برباد کرے اور اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اِنَّمَا جَزٰۗؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ۔

جو لوگ خدا اور رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں فساد مچاتے ہیں، اُن کی سزا یہ ہے کہ وہ قتل کر دیے جائیں یا ان کا ہاتھ اور دوسرے طرف کا پاؤں کاٹ ڈالا جائے یا جلاوطن کر دیے جائیں۔

(مائدہ - ۵)

احادیث میں ہے کہ جب حضرت عدیؓ (حاتم طائی کے بیٹے) اسلام لائے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے ارشاد فرمایا کہ "خدا اس کام کو اس طرح پورا کرے گا کہ ایک شتر سوار صنعا سے لے کر حضرموت تک سفر کرے گا، اور اس کو خُدا کے سوا یا بھیڑیے کے سوا (کہ اس کی بکریاں نہ اُٹھا لے جائے) اور کسی کا ڈر نہ ہوگا" یہ ابوداؤد کے الفاظ ہیں۔ صحیح بخاری میں[1] ہے کہ "خدا اس کام کو اس طرح پورا کرے گا کہ ایک عورت حیرہ سے چلے گی اور آکر کعبہ کی زیارت کرے گی، اور اُس کو خُدا کے سوا کسی کا ڈر نہ ہوگا"۔ حضرت عدیؓ کہتے ہیں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ ایک عورت حیرہ سے سفر کر کے حرم تک آتی ہے اور اس کو کسی کا ڈر نہیں ہوتا۔

بہت سے واقعات ہیں جن کو اہلِ سیر سرایا میں شمار کرتے ہیں، وہ محض تجارت کی آزادی اور عام امن و امان قائم کرنے کی غرض سے تھے۔ دو تین مثالیں ہم درج کرتے ہیں:

سریۂ زید بن حارثہ ۶ھ میں حضرت زیدؓ مالِ تجارت لے کر شام گئے۔ واپس آتے ہوئے جب وادیِ قریٰ کے قریب پہنچے تو بنو فزارہ کے لوگوں نے آکر اُن کو مارا پیٹا اور تمام مال و اسباب چھین لے گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے تدارک کے لیے تھوڑی سی فوج بھیجی، جس نے ان لوگوں کو سزا دی[2]۔

اسی سنہ میں اس سے پہلے حضرت دحیہ کلبیؓ جن کو آنحضرت صلی اللہ

---

[1] صحیح بخاری باب مالقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ من المشرکین بمکۃ) "س" ۔[?] باب علامات النبوۃ، [2] طبقات ابن سعد صفحہ ۶۵، جلد غزوات۔

علیہ وسلم نے خط دے کر قیصر کے پاس بھیجا تھا۔ شام سے واپس آرہے تھے، جب حسمی پہنچے تو ہنید نے چند آدمیوں کے ساتھ اُن پر ڈاکہ ڈالا اور جو کچھ اُن کے پاس تھا سب چھین لیا۔ صرف بدن کے کپڑے (وہ بھی جو پرانے اور پھٹے تھے) چھوڑ دیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے تدارک کے لیے حضرت زید رضؓ کو بھیجا[1]۔

سریۂ دومۃ الجندل سنہ ۶ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر لگی کہ دومۃ الجندل میں جو مدینہ منورہ سے شام کی جانب پندرہ منزل پر ہے، ایک بڑا گروہ جمع ہوگیا ہے جو تاجروں کو ستاتا ہے۔ اس کے تدارک کے لیے آپؐ خود تشریف لے گئے۔ مجمع منتشر ہوچکا تھا، لیکن آپؐ نے چند روز تک وہاں قیام کیا اور انتظام کے لیے تمام اطراف میں فوج کی چھوٹی ٹکڑیاں بھیج دیں[2]۔

سریۂ خبط یا سیف البحر یہ حالت کچھ مسلمان تاجروں کے ساتھ مخصوص نہ تھی بلکہ صلح حدیبیہ کے بعد کفار قریش کے کاروانِ تجارت کی بھی اسی طرح حفاظت کی جاتی تھی۔ سنہ ۸ھ میں قریش کا کاروانِ تجارت، شام سے واپس آرہا تھا۔ قبیلہ جہینہ کی طرف سے اطمینان نہ تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوعبیدہؓ بن جراح کی سرداری میں تین سو مسلمانوں کی جمعیت جس میں حضرت عمرؓ بھی داخل تھے۔ مدینہ سے ۵ دن کی مسافت پر روانہ فرمایا۔ مسلمانوں نے اس فرض کو اس طرح انجام دیا کہ کھانے کو کچھ نہ رہا تو ایک ایک چھوہارے پر دن گزار دیا[3]۔

---

[1] ابن سعد صفحہ ۶۳ [2] ایضاً ص ۴۴ جلد غزوات [3] ابن سعد جزء مغازی سریۂ خبط۔

صحیح مسلم[۱] میں یہ واقعہ مفصل مذکور ہے لیکن اس سریہ کی غرض مختلف راویوں نے مختلف بیان کی ہے۔ اصل راوی حضرت جابرؓ ہیں جو اس واقعہ میں شریک تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ جہینہ سے لڑنے کو یہ مہم بھیجی گئی تھی۔ کتب مغازی میں بھی یہی مذکور ہے۔ دوسری روایتوں کے الفاظ یہ ہیں:

(۱) نتلقی عیر قریش۔ قافلۂ قریش سے ملنے کے لئے۔

(۲) نرصد عیر قریش۔ قافلۂ قریش کی دیکھ بھال کے لیے۔

اس سے مقصود عام طور سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ قافلۂ قریش کے لوٹنے کے لیے، لیکن یہ صریح غلطی ہے۔ کیونکہ یہ زمانہ تو صلح حدیبیہ کا تھا۔ اس بنا پر ان الفاظ کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ مہم قافلۂ قریش کی حفاظت اور جہینہ کو روکنے کے لیے بھیجی گئی تھی۔ حافظ ابن حجر کی بھی یہی تحقیق ہے[۲]۔

غزوۂ غابہ عرب کی جسارت اور رہزنی کی عادت کا یہ حال تھا کہ اگرچہ ہر دفعہ ان کو سخت سے سخت سزائیں ملتی تھیں تاہم وہ کسی طرح جرائم سے باز نہیں آتے تھے۔ یہاں تک کہ غابہ پر جو مدینہ کا چراگاہ تھا ڈاکے ڈالتے تھے۔ ۲ھ میں قبیلہ فزارہ کی آبادی میں قحط پڑا۔ عینیہ بن حصن جو یہاں کا رئیس تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرط کرم سے اس کو اجازت دی کہ اسلامی حدود میں جو سیراب تھے مویشی چرائے۔ لیکن ۶ھ میں اسی عینیہ نے غابہ پر جو مدینہ کا چراگاہ تھا، حملہ کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[۱] صحیح مسلم باب اصابۃ میتۃ البحر، صحیح بخاری باب غزوہ سیف البحر میں بھی یہ روایتیں ہیں۔ [۲] فتح الباری جلد ۸ صفحہ ۶۱ و ۶۲۔

کی بیس اونٹنیاں لوٹ لیں۔ حضرت ابوذرؓ کے بیٹے جو چراگاہ کے محافظ تھے ان کو قتل کردیا۔ چنانچہ ارباب سیر اس واقعہ کو غزوہ غابہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

عرب کا تمام ملک جو اسلام کا دشمن ہوگیا اور اخیر فتح مکہ تک کفار سے جو لڑائیاں جاری رہیں اس کی ایک بڑی وجہ یہی تھی کہ عرب کی معاش کا بڑا ذریعہ رہزنی، قطاع الطریقی اور قتل و تاراج تھا۔ اسلام ان چیزوں کو مٹاتا تھا، اس لیے عرب اسلام سے بڑھ کر کسی کو اپنا دشمن نہیں سمجھ سکتے تھے۔

بے خبری میں حملہ کرنے کا سبب

عرب کے قبائل دو قسم کے تھے۔ ایک وہ جو کسی خاص مقام پر مستقل سکونت رکھتے تھے۔ دوسرے وہ جو خیمہ نشین اور بادیہ گرد تھے۔ ان کا کوئی خاص مستقر نہ تھا، جہاں چشمہ یا سبزہ زار دیکھا خیمے ڈال دیے۔ جب وہاں بھی پانی نہ رہا تو خبر رسان کسی اور مقام کی خبر لائے اور وہاں چلے گئے۔ ان قبائل کو عربی میں اصحاب الوبر کہتے ہیں۔ زیادہ تر جو قبائل ڈاکے ڈالا کرتے اور لوٹ مار کرتے رہتے تھے۔ اسی قسم کے قبائل تھے۔ ان کا انتظام اور ان کی روک ٹوک سخت مشکل تھی۔ ان کی تعزیر کے لیے فوجیں جاتی تھیں، تو یہ پہاڑوں پر بھاگ جاتے تھے اور قابو میں نہیں آتے تھے اس لیے مجبوراً جو فوجیں ان پر بھیجی جاتی تھیں غفلت میں بھیجی جاتی تھیں کہ وہ بھاگ نہ جانے پائیں۔

اکثر سرایا کے بیان میں اہل سیر نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ فوجیں بھیجیں جو راتوں کو چلتی تھیں اور بے خبری کی حالت میں موقع پر پہنچ کر حملہ کرتی تھیں اور قبائل کو لوٹ لیتی تھیں۔ اس قسم کے تمام واقعات تمام کتابوں میں کثرت سے منقول ہیں۔ اور انہی واقعات سے یورپ کے لوگوں نے یہ خیال قائم کیا ہے کہ اسلام نے دشمن پر ڈاکہ

ڈالنا اور لوٹ مار کرنا جائز رکھا ہے۔ اسی بنا پر مارگولیوس نے یہ استدلال کیا ہے، کہ "چونکہ بہت دنوں تک مسلمانوں کے پاس معاش کا کوئی ذریعہ نہ تھا، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ قبائل پر بے خبری میں حملہ کر کے مال و اسباب لوٹ لایا کرتے تھے"!

لیکن جب زیادہ تفحص اور استقرار اور کدو کاوش سے تمام واقعات بہم پہنچائے جائیں تو ثابت ہوگا کہ اچانک حملہ انہی قوموں پر کیا جاتا جن کی نسبت یہ احتمال ہوتا تھا کہ اُن کو خبر ہوگی تو وہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر یا کسی اور مقام پر بھاگ جائیں گے، چنانچہ اکثر ایسا ہوا کہ ان لوگوں کو خبر ہوئی اور وہ کسی طرف چل دیے۔ اس قسم کے چند واقعات ہم اس موقع پر نقل کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض میں آپ خود تشریف لے گئے اور بعض میں کچھ دستے بھیج دیے:

غزوۂ بنو سلیم، ۳ھ (ابن سعد صفحہ ۲۴)

واغذ السیر۔۔۔۔ فوجدھم قد تفرقوا فی میاھھم فرجع۔	اور بہت تیزی سے یک ٹٹ گئے لیکن وہ لوگ اپنے چشموں کی طرف چل دیے تھے (اس لیے لوٹ آئے)۔

غزوۂ ذات الرقاع، ۵ھ

وھربت الاعراب الی رؤس الجبال۔	اور اعراب پہاڑوں کی چوٹیوں پر بھاگ گئے۔

سریۂ عکاشہ، ۶ھ

وجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عکاشہ بن محصن	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عکاشہ بن محصن کو ۴۰ آدمیوں کے ساتھ

الی الغمر فی اربعین رجلا	بھیجا، وہ بگ ٹٹ گئے ....
فخرج سریعا یغذ السیر	.... لیکن وہ لوگ
...... فھربوا (ص ۱۶)	بھاگ گئے۔

سریہ علی بن ابی طالب، الیٰ بنی سعد سنہ ۶ھ :

فبعث الیھم علی ابن ابی	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت
طالب فی مائۃ رجل فسار	علی کو سو آدمیوں کے ساتھ بھیجا۔
اللیل وکمن النھار حتی	وہ راتوں کو چلتے تھے اور دن کو چھپ
انتھی الی الھمج فاغاروا	رہتے تھے۔ یہاں تک کہ مقام ہمج
علیھم فاخذوا خمس مائۃ	پہنچ گئے۔ پھر ان لوگوں پر حملہ کیا
بعیر والفی شاۃ وھربت	اور پانچ سو اونٹ اور دو ہزار بکریاں
بنو سعد بالظعن۔ (ص ۶۵)	لوٹیں اور بنو سعد مستورات لے کر بھاگ گئے۔

غزوہ بنو لحیان، سنہ ۶ھ :

فسمعت بھم بنو لحیان	بنو لحیان نے اُن کی آمد سُنی تو پہاڑوں
فھربوا فی رؤس الجبال۔	کی چوٹیوں پر بھاگ گئے۔

سریہ عمر رضی اللہ عنہ بن خطاب بہ طرف تُربہ، سنہ ۷ھ :

فکان یسیر اللیل ویکمن	راتوں کو چلتے تھے اور دن کو چھپ
النھار فاتی الخبر ھوازن	جاتے تھے۔ ہوازن کو خبر لگ گئی
فھربوا وجاء عمر بن الخطاب	تو وہ فرار ہو گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ
محالھم فلم یلق منھم	ان کے پڑاؤ پر پہنچے تو کسی کو
احدا۔	نہ پایا۔

سریہ کعب بن عُمیر، ربیع الاوّل، سنہ ۸ھ :

اس سریہ کا واقعہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پندرہ شخصوں کو شام کی طرف بھیجا۔ ذات اطلاح پہنچ کر ان لوگوں کو ایک بڑی جماعت نظر آئی۔ ان لوگوں نے ان کو اسلام کی دعوت دی۔ انھوں نے انکار کیا اور ان پر تیر اندازی شروع کی۔ مجبور ہو کر یہ لوگ بھی لڑے اور بالآخر سب شہید ہوئے، صرف ایک صاحب بچے۔ انھوں نے آکر خبر کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے انتقام لینا چاہا۔ لیکن وہ لوگ یہ مقام چھوڑ کہیں اور چلے گئے۔ ابن سعد میں یہ الفاظ ہیں:

وَھَمَّ بالبعث الیھم فبلغه انھم قد ساروا الی موضع آخر۔	ان پر فوج بھیجنے کا ارادہ کیا۔ پھر معلوم ہوا کہ وہ کہیں اور چلے گئے۔

اشاعتِ اسلام ان اغراض کے علاوہ اور جو سرایا بھیجے گئے۔ ان کی غرض اشاعتِ اسلام ہوتی تھی۔ لیکن چونکہ ملک میں امن و امان نہ تھا اور نیز دشمنوں نے اس سرے سے اُس سرے تک آگ لگا رکھی تھی۔ لیکن دعوتِ اسلام کے لیے جو سرایا جاتے تھے۔ ان کی زندگی ہمیشہ معرضِ خطر میں رہتی تھی۔

سریۂ بیر معونہ صفر ۴ھ میں ستر داعیانِ اسلام کی جماعت قبیلہ کلاب میں رئیس قبیلہ کی دعوت پر اشاعتِ اسلام کی غرض سے بھیجی گئی۔ لیکن بیر معونہ کے قریب قبائل رعل و ذکوان کے ہاتھ سے کل کی کل شہید ہوئی۔ صرف ایک صاحب بچ گئے تھے، جنھوں نے مدینہ آکر خبر کی۔

سریۂ مرثد اسی زمانہ میں یعنی صفر ۴ھ میں قبیلہ عضل وقارہ نے تعلیم و ارشاد کے لیے دعاۃ اسلام کے بھیجنے کی درخواست کی۔ آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم نے حضرت عاصم رضؓ، حضرت خبیبؓ، حضرت مرثدؓ بن ابی مرثد وغیرہ دس صاحبوں کو اس غرض کے لیے روانہ فرمایا۔ مقام رجیع میں پہنچکر بنولحیان نے اُن پر حملہ کیا، اور ایک کے سوا کل صاحب شہید کر دیے گئے۔ ۶ھ میں بنولحیان کی تعزیر کے لیے مہم گئی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ وہ سُن گن پاکر بھاگ گئے تھے)۔

سریہ ابن ابی العوجاء — ۷ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے داعیوں کی ایک جماعت جس میں پچاس آدمی شامل تھے، قبیلہ بنی سلیم کے پاس بھیجی۔ اس گروہ کے سردار ابن ابی العوجاءؓ تھے۔ انھوں نے بنوسلیم کو دعوت دی، لیکن ان لوگوں نے انکار کیا اور تیراندازی شروع کی۔ یہ لوگ بھی لڑے لیکن پچاس آدمی قبیلہ کے قبیلے کا کیا مقابلہ کر سکتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ رئیس فوج یعنی ابن ابی العوجاءؓ کے سوا سب شہید ہوے۔

سریہ کعب ابن عمیر — ربیع الاول ۸ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت کعبؓ بن عمیر غفاری کو پندرہ آدمیوں کی جمعیت کے ساتھ دعوت اسلام کے لیے ذات اطلاح کی طرف روانہ کیا۔ یہ مقام شام کی حدود میں وادی القریٰ سے اس طرف ہے۔ ان لوگوں نے اسلام کی تبلیغ کی۔ لیکن جواب وہی تیغ وسناں تھا۔ یہاں تک کہ یہ جماعت بھی کل کی کل شہید ہوئی صرف ایک صاحب بچ گئے جنھوں نے آکر مدینہ میں خبر کی +

(اس بنا پر اکثر دعوت اسلام کے لیے جو سرایا بھیجے جاتے تھے اُن کے ساتھ حفاظت کی غرض سے کچھ فوج بھی ساتھ کر دی جاتی تھی۔ لیکن اس صورت میں بہ تصریح افسروں کو کہ دیا جاتا تھا کہ صرف اشاعت اسلام مقصود ہے، لڑائی بھڑائی کی اجازت نہیں۔ مثلاً فتح مکہ کے بعد جب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالدؓ بن ولید کو بنو جذیمہ کی طرف بھیجا اور ۳۵۰ آدمیوں کی جمعیت ساتھ کر دی تو صاف فرما دیا کہ صرف دعوتِ اسلام مقصود ہے، لڑائی مقصود نہیں۔ چنانچہ ابن سعد لکھتے ہیں:

بعثه الى بنى جذيمة داعيًا الى الاسلام ولم يبعثه مقاتلا۔ (صفحہ ۱۰۶)	آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خالد کو بنو جذیمہ کی طرف بھیجا، دعوتِ اسلام کے لیے نہ لڑنے کے لیے۔

علامہ طبری اس موقع پر لکھتے ہیں:

قد كان رسول الله صلى الله عليه وسلم بعث فيما حول مكة السرايا تدعوا الى الله عزو جل ولم يامرهم بقتال۔	آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مکہ کے اطراف میں سرایا بھیجے۔ دعوتِ اسلام کے لیے اور ان کو لڑائی کا حکم نہیں دیا۔

باوجود اس کے بھی حضرت خالدؓ نے تلوار سے کام لیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سُنا تو آپؐ کھڑے ہو گئے اور قبلہ رُو ہو کر کہا "اے خدا خالد نے جو کچھ کیا، مَیں اس سے بری ہوں۔" تین دفعہ اسی طرح یہ الفاظ فرمائے پھر حضرت علیؓ کو بھیجا۔ جنھوں نے ایک ایک بچے کا، یہاں تک کہ کتوں کا خوں بہا ادا کیا اور اس پر مزید رقم دی[۱]۔ یہ واقعہ باختلافِ الفاظ حدیث کی کتابوں میں بھی مذکور ہے۔

(اسی طرح سنہ ۱۰ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو جب ۳۰۰ سواروں کے ساتھ یمن بھیجا تو آپؐ نے فرمایا:

---

[۱] تاریخ طبری ص ۱۶۵۱ (ج ۳)

فاذا نزلت بساحتھم فلا تقاتلھم حتیٰ یقاتلوک۔ | جب تم وہاں پہنچ جاؤ تو جب تک تم پر کوئی حملہ نہ کرے تم نہ لڑنا۔

(ابن سعد مغازی ص۱۲۲)

اسی سلسلہ میں وہ سرایا بھی داخل ہیں جو فتح مکہ کے بعد بُت شکنی کے لیے اطرافِ ملک میں روانہ کیے گئے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ تمام عرب میں مختلف قبیلوں کے الگ الگ بت خانے تھے۔ فتح مکہ کے بعد جب عام طور سے قبائل نے اسلام قبول کر لیا تو بتوں کی عظمت اور جبّاری کا جاہلانہ اور وہم پرستانہ تخیّل بعض قبائل سے دفعۃً نہ مٹ سکا۔ اب گو وہ ان کو لائقِ پرستش نہیں سمجھتے تھے۔ تاہم اُن کے دلوں پر ان اصنام کی وراثۃً ایک مدت سے جو ہیبت بیٹھی ہُوئی تھی، اس سے یہ ہمت نہیں پڑتی تھی۔ کہ ان باطل پرستیوں کے مرکز کو خود اپنے ہاتھ سے مٹا دیں۔ جاہلوں کو یقین تھا کہ ان مقدس پتھروں کا ایک ریزہ بھی اپنی جگہ سے ہٹا تو آسمان ٹوٹ پڑے گا۔ زمین پھٹ جائے گی۔ مصائب اور بلاؤں کا ایک طوفان برپا ہو جائے گا۔

اہلِ طائف نے بیعت کرتے ہُوئے شرط پیش کی تھی کہ ان کا بُت خانہ ایک سال تک ڈھایا نہ جائے، اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ منظور نہ فرمایا تو دوسری شرط یہ پیش کی کہ ہم ان کو اپنے ہاتھ سے نہ توڑیں گے۔ بعض اور نو مسلم قبائل بھی اس اداے فرض میں جھجکتے تھے۔ اس بنا پر ان مقامات میں چند راسخ العقیدہ اور صحیح الفہم مسلمان بھیجے گئے کہ وہ ان کی طرف سے اس فرض کو انجام دیں۔ چنانچہ سریۂ خالد رضؓ ابن ولید، بُت خانہ عزّیٰ، سریۂ عمروؓ بن العاص بت خانہ سواع،

سریہ سعد بن زید اشہلی بُت خانۂ مناۃ، سریہ ابوسفیان ومغیرہ بن شیبہ بُت خانۂ لات، سریۂ جریر بُت خانۂ ذی الخلصہ[1]، سریۂ طفیل بن عمرو دوسی بُت خانۂ ذی الکفین، اور سریۂ علی بن ابی طالب بُت خانۂ فلس کے توڑنے کو روانہ کیے گئے[2]۔

جنگی اصلاحات جنگ افعالِ انسانی کا بدترین منظر ہے۔ عرب کی جنگ تو ظلم، توحش، قساوت، سفاکی، بے دردی اور درندہ پن کا تماشا گاہ تھی لیکن اعجازِ نبوت سے یہی چیز تمام نقائص سے پاک ہو کر ایک مقدس فرضِ انسانی بن گئی۔

کسی ملک میں جب ہزاروں برس سے ظلم و غارت گری متوارث چلی آتی ہے تو شروع شروع میں مہذب سے مہذب حکومت کو بھی چند روز قدیم اصول اور طرزِ عمل کو اختیار کرنا پڑتا ہے جس کو طبی اصطلاح میں علاج بالمثل کہہ سکتے ہیں۔ آغازِ اسلام میں حملہ آورجنگ کے متعلق بعض واقعات اس قسم کے ملتے ہیں جو پہلے سے رائج تھے۔ مثلاً جاہلیت میں دستور تھا کہ دشمن پر بے خبری کی حالت میں جا پڑتے تھے، اور قتل و قید کرتے تھے۔ اسلام نے اس طریقہ کو مٹایا۔ لیکن ابتدا ہی میں اگر اس پر عمل کیا جاتا تو نتیجہ یہ ہوتا کہ دشمن ہمیشہ دفعۃً حملہ آور ہو کر مسلمانوں کو قتل کیا کرتے اور مسلمان اس کے مقابلے میں کچھ نہ کر سکتے، یا کرتے تو پہلے ان کو خبر کرتے، جس کے بعد وہ کہیں ٹل جاتے یا اپنی حفاظت کا سامان کر لیتے۔

---

[1] صحیح بخاری غزوۂ ذی الخلصہ [2] اس باب میں تمام تر واقعات ابن سعد جزء مغازی سے ماخوذ ہیں۔

لیکن جس قدر اسلام کو زور و قوت حاصل ہوتی گئی، اسی قدر وہ قدیم طریقے مٹتے گئے، یہاں تک کہ ایک ایک کر کے سب کا خاتمہ ہو گیا۔

اسلام سے پہلے جنگ کا جو طریقہ تھا اور جس قسم کے وحشیانہ افعال عمل میں آتے تھے اُن کو ہم تفصیل سے اُوپر لکھ آئے ہیں۔ ان صفحات کو دوبارہ سامنے رکھ لو اور اس کے مقابلے میں، دیکھو کہ اسلام نے کیا کیا اصلاحیں کیں؟

اس بات کو قطعاً روک دیا کہ عورتیں، بوڑھے، بچے، صغیر السن، نوکر، خادم، لڑائیوں میں قتل کیے جائیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ جب کسی مہم پر فوج بھیجی جاتی تو سردار فوج کو جو احکام دیے جاتے، اُن میں یہ لازمی حکم بھی ہوتا۔[1] ابوداؤد میں یہ حکم ان الفاظ میں مذکور ہے:

لا تقتلوا شیخاً فانیا ولا طفلاً ولا صغیراً ولا امرأۃ[2]	کسی کہن سال کو، بچے کو، کمسن کو، عورت کو قتل نہ کرو۔

غزوات میں کبھی کسی عورت کی لاش آپؐ کی نظر سے گزرتی تو آپؐ نہایت سختی سے منع فرماتے۔ صحیح مسلم میں متعدد حدیثیں اس کے متعلق مذکور ہیں۔

اسلام سے پہلے معمول تھا کہ دشمن کو گرفتار کر لیتے تو کسی چیز سے باندھ کر

---

[1] صحیح مسلم باب الجہاد، ۱۲۔ [2] کتاب الجہاد باب فی دعاء المشرکین، ابوداؤد میں یہ باب کتاب الجہاد میں مکرر ہے۔ یہاں پہلا باب مراد ہے) "س"

اس کو تیروں کا نشانہ بناتے یا تلوار سے قتل کرتے۔ عربی میں اس طریقہ کو **صبر** کہتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت سختی سے اس کو روک دیا۔

ایک دفعہ حضرت خالدؓ کے صاحبزادے (عبدالرحمٰن) نے ایک لڑائی میں چند آدمیوں کو گرفتار کر کے اسی طرح قتل کرایا تھا۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ نے سُنا تو کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سُنا وہ اس سے منع فرماتے تھے۔ خدا کی قسم میں مرغ کو بھی اس طرح مارنا جائز نہیں رکھتا! عبدالرحمٰن نے اسی وقت کفارہ گناہ کے طور پر چار غلام آزاد کیے[1]۔

لڑائیوں میں عہد کی کچھ پابندی نہ تھی۔ جنگ معونہ وغیرہ میں کفار نے مسلمانوں کے ساتھ یہی معاملہ کیا۔ یعنی قول و قسم لے کر مسلمانوں کو ساتھ لوا گئے اور گھیرے جا کر قتل کر ڈالا۔ قرآن مجید میں انہی واقعات کی طرف اشارہ ہے:

لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا	کسی مسلمان کے متعلق وہ نہ قسم کا
وَلَا ذِمَّةً اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ	لحاظ رکھتے ہیں، نہ ذمہ داری کا
لَهُمْ ۔ (توبہ-۲)	اُن کی قسم قسم نہیں ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت تاکید کی کہ جو عہد کیا جائے، ہر حال میں اس کی پابندی کی جائے۔ قرآن مجید میں اس کے متعلق جا بجا تاکیدی اور صاف احکام ہیں۔ عہد نبوت اور خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں پابندیٔ عہد کی حیرت انگیز مثالیں ملتی ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ چلے آئے تھے تو بہت

---

[1] ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۱ (باب قتل الاسیر بالنبل ۱۲ س)

سے صحابہ مجبوریوں کی وجہ سے مکہ ہی میں رہ گئے تھے۔ ان میں حضرت حذیفہؓ بن یمان اور اُن کے والد بھی تھے۔ جنگِ بدر کے موقع پر حضرت حذیفہؓ بن یمان اور ان کے والد کہیں سے آرہے تھے، کفار نے ان کو پکڑ لیا کہ تم مدینہ جاکر پھر ہمارے مقابلے کو آؤ گے۔ انھوں نے کہا ہمارا مقصد صرف مدینہ جانا ہے، کفار نے اُن سے عہد لے کر چھوڑ دیا۔ یہ لوگ مقامِ بدر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے اور یہ دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کفار سے مصروفِ جنگ ہیں، خود بھی اس سعادت کی آرزو کی۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو باز رکھا کہ تم معاہدہ کر چکے ہو۔

ابو رافع کو قریش نے قاصد بنا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا تھا۔ بارگاہِ نبوت میں آکر اُن پر یہ اثر ہوا کہ مسلمان ہوگئے اور عرض کی اب میں کافروں میں واپس نہ جاؤں گا۔ آپؐ نے فرمایا، تم قاصد ہو اور قاصد کو روک لینا عہد کے خلاف ہے، اس وقت واپس جاؤ، پھر آجانا[1]۔

صلح حدیبیہ میں جب حضرت ابوجندلؓ پابہ زنجیر آئے اور بدن کے داغ دکھائے کہ قریش مجھ کو قید کرکے اس طرح ستاتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا ہاں لیکن قریش سے معاہدہ ہو چکا ہے کہ کوئی مسلمان مکہ سے بھاگ آئیگا تو ہم قریش کے پاس بھیج دیں گے۔ اس پر حضرت ابوجندلؓ نے روکر تمام مسلمانوں کو مخاطب کیا، لوگ جوشِ رقت سے بے قرار ہوگئے اور قریب تھا کہ قابو سے باہر ہو جائیں۔ حضرت عمرؓ بے تاب ہوگئے۔ حضرت ابوبکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بار بار جاتے تھے۔ یہ سب کچھ تھا، لیکن پابندیٔ عہد کی قیمت ان سب خطرات سے زیادہ تھی۔ حضرت

---

[1] ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۲۳ ا باب فی الامام یستجن بہ فی العہود "س"

ابو جندلؓ کو پابہ زنجیر واپس جانا پڑا۔

اسلام سے پہلے قاصدوں کا قتل کردینا ممنوع نہ تھا۔ صلح حدیبیہ سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے پاس جو قاصد بھیجا تھا، قریش نے اس کی سواری کے اونٹ کو مار ڈالا اور قاصد کو بھی قتل کردینا چاہا۔ لیکن باہر والوں نے بچالیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ قاصد کبھی قتل نہ کیے جائیں۔ مسیلمہ نے جب قاصد بھیجا اور اس نے گستاخانہ گفتگو کی تو آپؐ نے فرمایا کہ "قاصد کا قتل کرنا دستور نہیں ورنہ تو قتل کردیا جاتا"۔ مورخین اس واقعہ کو لکھ کر لکھتے ہیں کہ اس دن سے یہ ایک قاعدہ بن گیا کہ قاصد، قتل نہیں کیے جاتے تھے۔

اسیرانِ جنگ کے ساتھ عرب نہایت برا سلوک کرتے تھے اور تمام قوموں میں بھی یہی طریقہ جاری تھا۔ جنگِ صلیبی میں یورپین سلطنتیں جب مسلمانوں کو لڑائیوں میں گرفتار کرتی تھیں، تو ان سے جانوروں کی طرح کام لیتی تھیں۔

علامہ ابن جبیر، جب حروب صلیبیہ کے زمانے میں سسلی میں گزرے ہیں تو یہ حالت دیکھ کر تڑپ گئے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

ومن الفجائع التی یعاینہا	اور منجملہ ان دردانگیز حالات کے
من حل بلادھم اسری	جو ان شہروں میں نظر آتے ہیں،
المسلمین یرسفون فی	اسیرانِ اسلام ہیں جو بیڑیاں پہنے
القیود ویصرفون فی	نظر آتے ہیں اور جن سے سخت
الخدمۃ الشاقۃ والاسرات	محنت شاقہ لی جاتی ہے اور اسی

المسلمات کذلك فی اسو قهن خلاخیل الحدید فتنفطر لهم الافئدۃ[1]۔ | طرح مسلمان عورتیں بنڈلیوں میں لوہے کے کڑے پہنے سخت محنت شاقہ سے کام کرتی ہیں جن کو دیکھ کر دل پھٹا جاتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسیرانِ جنگ کی نسبت تاکید کی کہ اُن کو کسی طرح کی تکلیف نہ پہنچنے پائے۔ اسیرانِ بدر کو جب آپؐ نے صحابہ کے حوالے کیا تو تاکید کی کہ کھانے پینے کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ چنانچہ صحابہ خود کھجور وغیرہ کھا کر بسر کر لیتے تھے اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے تھے۔ غزوۂ حنین میں چھ ہزار اسیر تھے، سب چھوڑ دیے گئے۔ اور آپؐ نے اُن کے پہننے کے لیے چھ ہزار جوڑے (مصر کے کپڑے کے) عنایت فرمائے۔ چنانچہ ابن سعد نے اس واقعہ کی تصریح کی ہے۔

حاتم طائی کی بیٹی جب گرفتار ہو کر آئی تو آپؐ نے عزت و حرمت سے مسجد کے ایک گوشہ میں اس کو مقیم کیا اور فرمایا کہ کوئی تمہارے شہر کا آجائے تو میں اس کے ساتھ تم کو رخصت کر دوں۔ چنانچہ چند روز کے بعد سفر کا سامان کر کے ایک شخص کے ساتھ یمن بھجوا دیا۔

قرآنِ مجید میں جہاں خدا نے بندگانِ خاص کے اوصاف بتائے ہیں، وہاں فرمایا ہے:

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا (دہر-۱) | اور یہ لوگ خدا کی محبت میں مسکین کو، یتیم کو اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔

---

[1] رحلہ ابن جبیر مطبوعہ لیڈن ۱۹۰۷ء، صفحہ ۳۰۷۔

معمول تھا کہ جب کسی قوم پر حملہ ہوتا تو اہلِ فوج چاروں طرف پھیل جاتے، جس سے راستے بند ہوجاتے۔ گھروں میں آنا جانا مشکل ہوجاتا۔ راہگیروں کا مال و متاع لُٹ جاتا۔ یہ طریقہ ایک مدت سے چلا آتا تھا۔ ایک لڑائی میں قدیم دستور کے مطابق یہی حرکتیں لوگوں سے سرزد ہوئیں۔ آپؐ نے مُنادی کرادی کہ جو شخص ایسا کرے گا اُس کا جہاد جہاد نہیں ۔

ابوداؤد میں (حضرت معاذ بنؓ انس) سے روایت ہے :

غزوت مع نبی اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم غزوۃ کذا وکذا فَضَیّقَ النّاسُ المَنَازِلَ و قطعوا الطریق فبعث النبی صلّی اللہ علیہ وسلّم منادیا ینادی فی النّاس اَنَّ من ضیّق منزلا وقطع طریقا فلا جھاد لہ[1]	مَیں فلاں غزوہ میں آپؐ کے ساتھ تھا، لوگوں نے دوسروں کے پڑاؤ پر جاکر اُن کو تنگ لیا، لوٹا مارا۔ آپؐ نے ایک شخص کو بھیجا، جس نے مُنادی کی کہ جو دوسروں کو گھروں میں تنگ کرے یا لوٹے مارے اُس کا جہاد قبول نہیں۔

ابوداؤد میں ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جب یہ حکم دیا کہ لوگ اِدھر اُدھر پھیل نہ جایا کریں تو لوگ اس طرح سمٹ کر پڑاؤ ڈالتے تھے کہ ایک چادر تان دی جاتی تو سب اس کے نیچے آجاتے[2] ۔

سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ مالِ غنیمت کے ساتھ لوگوں کو اس قدر شغف

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد جلد اوّل صفحہ ۳۵۴ (باب ما یؤمر من انضمام العسکر) "س"

[2] ابوداؤد کتاب الجہاد (باب ما یؤمر من انضمام العسکر) "س"

تھا کہ لڑائیوں کا بہت بڑا سبب یہی ہوتا تھا۔ اس کی اصلاح میں نہایت تدریج سے کام لینا پڑا۔ جاہلیت میں توغنیمت محبوب ترین چیز تھی تعجب یہ ہے کہ اسلام میں بھی ایک مدت تک اس کو ثواب کی چیز سمجھتے تھے۔ ابوداؤد میں ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا:

رجل یرید الجهاد فی سبیل الله وهو یبتغی عرضاً من عرض الدنیا فقال النبی صلی الله علیه وسلم لا اجر له فاعظم ذلك الناس و قالوا للرجل عد لرسول الله صلی الله علیه وسلم فلعلك لم تفهمه۔ (ابوداؤد جلد ا ص ۳۴۲ (باب فیمن یغزو ویلتمس الدنیا) "س"

ایک شخص خدا کی راہ میں جہاد کرنا چاہتا ہے لیکن کچھ دنیاوی فائدہ بھی چاہتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا اس کو کچھ ثواب نہیں ملے گا۔ یہ امر لوگوں کو بہت عجیب معلوم ہوا۔ اور لوگوں نے اس شخص سے کہا کہ پھر جاکر پوچھو۔ غالباً تم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلب نہیں سمجھا۔

بار بار لوگ دوبارہ دریافت کرنے کے لیے بھیجتے تھے اور ان کو یقین نہیں آتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا ہوگا۔ بالآخر جب آپؐ نے تیسری دفعہ بھی یہی فرمایا کہ لا اجر لهٗ یعنی اس کو کچھ ثواب نہیں ملیگا۔ تب لوگوں کو یقین آیا۔

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند صحابہ کو ایک قبیلہ کے مقابلے کے لیے بھیجا۔ ان میں سے ایک صاحب صف سے آگے نکل گئے۔ قبیلہ والے روتے ہوئے آئے۔ انھوں نے کہا کہ لا اله الا الله کہو تو بچ جاؤ گے۔ لوگوں نے اسلام قبول کرلیا اور حملہ سے بچ گئے۔ اس پر ساتھیوں نے ان کو

ملامت کی کہ تم نے ہم لوگوں کو غنیمت سے محروم کر دیا۔ ابو داؤد میں صحابی کا قول ان الفاظ میں مذکور ہے :

فلامنی اصحابی و قالوا احرمتنا الغنیمۃ۔ (ابو داؤد باب ما یقول اذا اصبح کتاب الادب)

مجھ کو میرے ساتھیوں نے ملامت کی، تم نے ہم لوگوں کو غنیمت سے محروم کر دیا +

جب لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر ان کی شکایت کی، تو آپؐ نے اُن کی تحسین کی اور فرمایا کہ تم ایک ایک آدمی (جو چھوڑ دیے گئے) کے بدلے اتنا اتنا ثواب ملے گا، (ابو داؤد)

قرآن مجید میں غنیمت کی نسبت "متاعِ دُنیوی" کا لفظ آتا تھا اور اس کی طرف انہماک اور وارفتگی پر ملامت کی جاتی تھی۔ جنگِ اُحد میں جب اس بنا پر شکست ہوئی کہ کچھ لوگ کفار کا مقابلہ چھوڑ کر غنیمت میں مصروف ہو گئے تو یہ آیت اُتری :

مِنكُمْ مَّن يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنكُمْ مَّن يُرِيدُ الْآخِرَةَ۔ (آل عمران۔ ۱۶)

تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طلبگار تھے، اور کچھ آخرت کے +

جنگِ بدر میں لوگوں نے جب اجازت سے پہلے غنیمت لوٹنی شروع کر دی (یا) بقول بعض مفسرین فدیہ کی خواہش سے لوگوں کو گرفتار کیا تو یہ آیت اُتری :

يُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ۔ (انفال۔ ۹)

تم لوگ دُنیا کی پونجی چاہتے ہو، اور خدا آخرت چاہتا ہے +

باوجود ان تمام تصریحات اور بار بار کی تاکید کے غزوۂ حنین میں جو ۸ھ

میں واقع ہوا تھا، اس وجہ سے شکست ہوئی کہ لوگ غنیمت کے لوٹنے میں مصروف ہو گئے۔ صحیح بخاری غزوۂ حنین کے ذکر میں ہے:

فاقبل المسلمون علی الغنائم	تو مسلمان غنیمت پر ٹوٹ پڑے اور
واستقبلونا بالسھام۔	کافروں نے ہم کو تیروں پر رکھ لیا۔

اس بنا پر موقع بہ موقع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس مسئلہ کو زیادہ تر تصریح سے بیان فرماتے تھے۔ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ "کوئی شخص غنیمت کے لیے، کوئی نام کے لیے، کوئی اظہارِ شجاعت کے لیے جہاد کرتا ہے، کس کا جہاد خدا کی راہ میں سمجھا جائے گا"؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من قاتل لتکون کلمۃ اللہ	جو شخص اس لیے لڑتا ہے کہ خدا کا
ھی العلیا[1]	بول بالا ہو۔

بالآخر آپؐ نے یہ فرمادیا کہ گو جہاد کسی نیت سے کیا جائے لیکن اگر مجاہد مالِ غنیمت قبول کرتا ہے تو دو تہائی ثواب کم ہو جاتا ہے۔ پورا ثواب اُسی وقت ملتا ہے جب غنیمت کو مطلق ہاتھ نہ لگائے۔ صحیح مسلم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص الفاظ یہ ہیں:

ما من غازیۃ تغزو فی	جو غازی خدا کی راہ میں لڑتا ہے،
سبیل اللہ فیصیبون الغنیمۃ	اور مالِ غنیمت لیتا ہے وہ آخرت
الا تعجلوا ثلثی اجرھم من	کے ثواب کا دو ثلث یہیں لے لیتا
الآخرۃ و یبقی لھم الثلث	ہے اور آخرت میں اس کا حصہ ایک تہائی

---

[1] بخاری کتاب الجہاد باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا و صحیح مسلم کتاب الامارۃ "س"

وان لم يصيبوا غنيمة تم لهم اجرهم[1] — رہ جاتا ہے، البتہ اگر غنیمت مطلق نہ لے تو اس کو آخرت میں پورا اجر ملیگا۔

ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ غنیمت جو سب سے محبوب چیز تھی، دلوں سے اُتر گئی اور جہاد سے صرف اعلائے کلمۃ اللہ مقصود رہ گیا۔ واقعۂ ذیل سے اس کا اندازہ ہو سکے گا۔

حضرت واثلہ بن الاسقع ایک صحابی تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تبوک کی مہم پر روانہ ہوئے تو ان کے پاس سامان نہ تھا۔ مدینہ میں آواز دیتے پھرے کہ "کوئی ہے جو ایسے شخص کو سواری دے کہ جو کچھ مال غنیمت ہاتھ آئیگا اس میں وہ برابر کا شریک ہوگا"۔ ایک انصاری نے سواری اور خوراک سب اپنے ذمہ لی۔ اس مہم میں کئی اونٹ ہاتھ آئے۔ حضرت واثلہ رض واپس آکر انصاری کے پاس سب اونٹ لے گئے اور کہا "یہ وہ اونٹ ہیں جن کی نسبت میں نے شرط کی تھی کہ آپ بھی اس میں حصہ دار ہوں گے"۔ انھوں نے کہا "ان کو تم ہی لو، میرا شرکت سے کچھ اور ارادہ تھا"۔ (یعنی اونٹ میں نہیں، بلکہ جہاد کے ثواب میں شرکت مقصود تھی)[2]۔

دورانِ جنگ میں دشمن کے مال اور جائداد کا لوٹنا بھی عام رواج تھا۔ خصوصاً جب کہ رسد تھڑ جاتی تھی اور کھانے پینے کا انتظام نہیں ہو سکتا تھا تو ہر حال میں یہ فعل جائز سمجھا جاتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی سخت ممانعت کی اور سرے سے اس طریقہ کو روک دیا۔ ابوداؤد میں

---

[1] صحیح مسلم کتاب الامارہ باب بیان ثواب من غزا فغنم و ابوداؤد باب فی السریۃ "س"

[2] ابوداؤد، کتاب الجہاد جلد ثانی، (باب الرجل یکری دابۃ علی النصف او السہم) "س"

ایک انصاری سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ہم لوگ ایک مہم پر گئے اور غایت تنگ حالی اور مصیبت پیش آئی۔ اتفاق سے بکریوں کا ریوڑ نظر آیا، سب ٹوٹ پڑے اور بکریاں لوٹ لیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی۔ آپ موقع پر تشریف لائے تو گوشت پک رہا تھا اور ہانڈیاں اُبال کھا رہی تھیں، آپؐ کے ہاتھ میں کمان تھی، آپ نے اس سے ہانڈیاں اُلٹ دیں اور سارا گوشت خاک میں مل گیا۔ پھر فرمایا "لوٹ کا مال مُردار گوشت کے برابر ہے"[۱]۔

لڑائی عبادت بن گئی اسلام نے جہاد کو جو بظاہر ایک ظالمانہ کام ہے، اس قدر پاک اور منزہ کر دیا کہ وہ افضل ترین عبادت بن گئی۔ جہاد کا مقصد یہ قرار دیا کہ مظلوموں کو ظلم سے بچائے، جابر اور ظالم کمزور آدمیوں پر دستِ ستم دراز نہ کرنے پائیں۔

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ نِ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ، (حج - ۶)	جن لوگوں سے لوگ لڑائیاں کرتے ہیں اُن کو اس بنا پر لڑنے کی اجازت دی گئی کہ ان پر ظلم کیا گیا، اور خدا ان کی مدد پر قادر ہے، وہ لوگ جو اپنے گھروں سے صرف اس بنا پر نکال دیے گئے کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب خدا ہے۔

ملک میں جو ہمیشہ فتنہ و فساد برپا رہتا تھا اور لوگ امن و امان سے بسر نہیں کر سکتے تھے، جہاد اس غرض سے تھا کہ فساد کو مٹا دے اور امن قائم کر دے:

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَةٌ (انفال ۵) اور ان سے لڑو تا کہ فتنہ نہ رہے۔

جو لوگ خدا پر اور جزا و سزا پر اعتقاد نہیں رکھتے اور اس وجہ سے اُن کے نزدیک ہر قسم کے ظلم و ستم جائز تھے اور ان کو جائز و ناجائز کی کچھ تمیز نہ تھی جہاد سے ان کا زیر کرنا اور

---

[۱] ابوداؤد، کتاب الجہاد جلد ثانی (باب فی النہی عن النہبی اذا کان فی الطعام قلة) "س"

ان لوگوں کو ان کے ظلم سے بچانا مقصود قرار دیا گیا:

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ	ان لوگوں سے لڑو جو نہ خدا پر اعتقاد
وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ	رکھتے ہیں نہ قیامت پر، اور جن کاموں
مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ،	کو خدا اور رسول نے حرام قرار دیا ہے
(توبہ - ۴)	اس کو حرام نہیں سمجھتے

جہاد میں فتح پانے اور زمین پر قبضہ حاصل کرنے کا مقصد یہ نہیں قرار دیا گیا کہ فاتح دولت و مال اور حکومت کا لطف اٹھائیں، بلکہ یہ غرض قرار دی گئی کہ لوگوں کو عبادت و ریاضت اور فقرا کی دستگیری کی تلقین کریں اور اچھی باتیں پھیلائیں اور برے کاموں سے لوگوں کو روک دیں:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ	وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو زمین پر قبضہ
اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ	دیں تو وہ نماز کے پابند ہوں گے، زکوٰۃ
وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا	ادا کریں گے، اچھی باتوں کا حکم دیں گے اور
عَنِ الْمُنْكَرِ ، (حج ۶)	بُری باتوں سے روکیں گے

کسی ملک کی فتح سے جو دولت و مال ہاتھ آتا تھا وہ فاتح کا خاص حصہ ہوتا تھا، جس کو وہ اپنے مصارف عیش میں استعمال کرتا تھا اور دربار کے اُمرا درجہ بدرجہ اس سے مستفید ہوتے تھے لیکن اس کا مصرف یہ قرار دیا:

وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ	اور جان لو کہ تم کو جو کچھ مال غنیمت ملے تو
فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ	اس کا پانچواں حصہ[1] خدا کا ہے اور رسول
وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَ	کا اور رشتہ داروں کا اور یتیموں کا اور
الْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ، (انفال ۵)	غریبوں کا اور مسافروں کا

جہاد نہ صرف حقیقت کے لحاظ سے بلکہ صورۃً بھی عبادت بنا دیا گیا۔ مجاہدین کو تاکید تھی کہ عین جنگ کے وقت بھی خدا کا نام لیتے رہیں:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمْ	مسلمانو! جب کسی گروہ سے مٹ بھیڑ ہو جائے
فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا	تو ثابت قدم رہو، اور بار بار خدا کا نام
لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ، (انفال - ۶)	لیتے جاؤ تم کامیاب ہو گے

---

[1] پانچویں حصہ کے سوا باقی تمام مال غنیمت مجاہدین کا حق ہے

نماز میں جس طرح اٹھتے بیٹھتے تکبیر و تسبیح یعنی اللہ اکبر اور سبحان ربی الاعلیٰ کہتے ہیں، جہاد میں بھی یہی حکم تھا۔ حضرت جابر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ ہم جب کسی بلندی پر چڑھتے تھے تو اللہ اکبر کہتے تھے اور جب نیچے اترتے تو سبحان اللہ کہتے تھے۔ بخاری میں روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جہاد میں جب کسی ٹیکرے پر چڑھتے تھے تو تین دفعہ اللہ اکبر کہتے تھے۔ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جہاد پر جا رہے تھے، صحابہ زور زور سے تہلیل و تکبیر کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اس قدر شور سے نہیں کہنا چاہیے، کیونکہ خدا جس کو تم پکارتے ہو وہ بہرا نہیں[۱] ہے۔" بعینہٖ اسی طرح ایک دفعہ حضرت عمرؓ کو نماز میں پکار کر قرآن پڑھنے سے منع فرمایا تھا۔

نکتہ، ابوداؤد میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ جہاد[۲] میں دستور تھا کہ چڑھائیاں آتی تھیں تو تکبیر کہتے تھے اور اتار آتا تھا تو تسبیح پڑھتے تھے۔ نماز بھی اسی اصول پر قائم کی گئی، یعنی سر اٹھاتے ہیں تو اللہ اکبر اور سجدہ میں جاتے ہیں تو سبحان اللہ کہتے ہیں۔ اس روایت میں ادائے مطلب میں ذرا فرق آگیا ہے، جہاد کے اصول پر نماز نہیں قائم کی گئی، بلکہ جہاد میں نماز کا طریقہ ملحوظ رکھا گیا ہے۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ نماز ابتدائے اسلام سے وجود میں آئی اور جہاد کی تاریخ ہجرت کے بعد سے شروع ہوتی ہے۔ بہرحال اس روایت سے اس قدر قطعی ثابت ہوتا ہے کہ نماز اور جہاد دونوں میں ایسی مشابہت تھی کہ ایک کو اصل اور دوسرے کو اس کی نقل سمجھتے تھے۔

غرض وہی جنگ جو ہر طرح کے ظلم و ستم اور جہالت و وحشت کا مجموعہ تھی، اسلام کی تعلیمِ ربانی نے اس کو اعلائے کلمۃ اللہ، قیامِ امن، رفعِ مفاسد، نصرتِ مظلوم اور تسبیح و تہلیل کی صورت میں بدل دیا۔

فاتح اور پیغمبر کا امتیاز جہاد کے معرکوں میں آپ کے ہاتھ میں گو تیغ و سپر اور جسمِ مبارک پر خود و مغفر ہوتا تھا، لیکن اس وقت بھی پیغمبر اور سپہ سالار کا فرق صاف نظر آتا تھا۔

---

[۱] کتاب الجہاد باب التکبیر عند الحرب۔ [۲] ابوداؤد کتاب الجہاد (باب مایقول اذا سافر) جلد ۱ صفحہ ۳۵۷ مطبوعہ مجتبائی۔ اصل عبارت یہ ہے: (وکان) النبی صلی اللہ علیہ وسلم وجیوشہ اذا علوا الثنایا کبروا واذا ھبطوا سبحوا فوضعت الصلوٰۃ علیٰ ذالک۔

عین اس وقت جب کہ معرکۂ کارزار گرم ہے۔ تیروں کا مینہ برس رہا ہے، تمام میدان لالہ زار بن گیا ہے، ہاتھ اور پاؤں اس طرح کٹ کٹ کر گر رہے ہیں، جس طرح موسمِ خزاں میں پتّے جھڑتے ہیں، دشمن کی فوجیں سیلاب کی طرح بڑھی آرہی ہیں۔ عین اس حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستِ دُعا آسمان کی طرف بلند ہے۔ جنگ آور باہم نبرد آزما ہیں اور سرِ مبارک سجدۂ نیاز میں ہے۔ معرکۂ بدر میں حضرت علیؓ عین شدتِ جنگ میں تین بار خبر لینے آئے اور ہر دفعہ دیکھا کہ مقدس پیشانی خاک پر ہے۔ فوجیں تیروں کا مینہ برسا رہی ہیں اور لڑائی کا فیصلہ نہیں ہوتا۔ فاتحِ بے سلاح زمین سے مٹھی بھر خاک اُٹھالیتا ہے اور دُشمن کی طرف پھینکتا ہے۔ دفعۃً فوجوں کا بادل پھٹ کر مطلع صاف ہو جاتا ہے۔

حنین میں دشمن نے دفعۃً اس زور سے حملہ کیا کہ تمام فوج کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ ۱۲۰۰۰ ہزار آدمیوں میں سے ایک[1] بھی پہلو میں نہیں۔ سامنے سے دس ہزار قدر انداز تیر برساتے آرہے ہیں۔ لیکن مرکزِ حق اپنی جگہ پر قائم ہے، اور ایک پُر جلال آواز آرہی ہے:

انا النبی لا کذب، میں پیغمبر ہوں، اور جھوٹا پیغمبر نہیں ہوں۔

عین اُس وقت جب کہ صفیں باہم معرکہ آرا ہیں، ہر طرف تلواریں برس رہی ہیں، ہاتھ پاؤں کٹ کٹ کر زمین پر گرتے جاتے ہیں، موت کی تصویریں ہر طرف نظر آرہی ہیں، اتفاق سے نماز کا وقت آجاتا ہے، دفعۃً نماز کی صفیں قائم ہو جاتی ہیں۔ سپہ سالار امامِ نماز ہے، فوجیں

(۱؎ چند خاص رفقاء کے سوا۔) "س"

صفوفِ نماز ہیں۔ رجز کے بجائے اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہیں۔ جوش و خروش، تہوّر و جانبازی، غیظ و غضب، اب عجز و نیاز، تضرع و زاری اور خضوع و خشوع بن جاتا ہے۔ صفیں دو دو رکعتیں ادا کرکے دشمن کے مقابلے پر چلی جاتی ہیں، ان کے بجائے لڑنے والے نماز میں شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ دو رکعتیں ادا کرکے پھر اپنی پہلی خدمت پر واپس چلے جاتے ہیں اور مشغولین جنگ آکر بقیہ نمازیں پوری کر لیتے ہیں۔ لیکن یہ تبدیلیاں فوجوں میں ہوتی ہیں۔ امام (رسولؐ) اوّل سے آخر تک عبادتِ الٰہی میں مصروف ہے۔

تعلیم و ارشاد، ہدایت و تلقین، تہذیب و تزکیہ کا کام ہر وقت جاری رہتا ہے۔ عین فتح کے وقت جب کہ مجاہدین فتح کے نشے میں چور ہیں، مالِ غنیمت تقسیم ہو رہا ہے، ایک ایک کو ہزاروں کی رقمیں وصول ہو رہی ہیں۔ ایک صحابی خوش خوش آتے ہیں اور جوشِ مسرت میں کہتے ہیں "یا رسول اللہ! آج میں نے مالِ غنیمت سے جس قدر نفع اٹھایا، کبھی نہیں اٹھایا تھا۔ پورے تین سو اوقیہ ہاتھ آئے"۔ (اوقیہ دس روپیہ کے برابر ہوتا ہے) آپؐ فرماتے ہیں کہ "میں اس سے بھی زیادہ نفع بتادوں؟" وہ بڑے شوق سے پوچھتے ہیں، کیا؟ ارشاد ہوتا ہے "نمازِ فرض کے بعد دو رکعتیں[۵]"!

تَمَّ الْمُجَلَّدُ الْاَوَّلُ مِنَ السِّیْرَةِ النَّبَوِیَّةِ عَلٰی صَاحِبِهَا الصَّلٰوةُ وَالتَّحِیَّةُ

---

[۵] ابوداؤد باب التجارۃ فی الغزوہ۔

السلام علیکم

جب تک مسجد کا اعلان نہ ہو اعتکاف
سے مت نکلنا
Confirm کر لینا ورنہ اعتکاف

ممی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے بابا سے
دعا کرتے ہیں
السلام علیکم
دو رکعت نفل شکرانے کی
ادا کرنی

آپا میری امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے بھائی
جھگڑا ہوا ہے [illegible] کے بعد [illegible] اور میں
بھی [illegible] آ گئے [illegible]

دیکھو جب لکھو اپنا اتہ پتہ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] سب اچھا ہو [illegible]

آپا امی کو ہسپتال لے گئے
ان کی صحت یابی [illegible]
[illegible]

Altaf Hussain Lodhi